مجموعۂ
مقالات
مولانا وحید الدین خان
المکتبۃ الاشرفیہ
جامعہ اشرفیہ ○ فیروز پور روڈ لاہور
پاکستان

مجموعہ مقالات
مولانا وحید الدین خان
جلد دوم
المکتبۃ الاشرفیہ
جامعہ اشرفیہ ○ فیروز پور روڈ ○ لاہور

فہرست مجموعہ مقالات

جلد دوم

نمبر | صفحہ نمبر

(۱) اِنسان اپنے آپ کو پہچان ــــــــ (۱)

(۲) خدا اور انسان ــــــــ (۲۵)

(۳) مذہب اور سائنس ــــــــ (۷۳)

(۴) قرآن کا مطلوب انسان ــــــــ (۱۴۳)

(۵) زلزلہ قیامت ــــــــ (۲۲۳)

(۶) نارِ جہنم ــــــــ (۲۸۷)

(۷) آخری سفر ــــــــ (۳۳۵)

(۸) باغِ جنّت ــــــــ (۳۸۳)

(۹) سچّا راستہ ــــــــ (۴۳۱)

(۱۰) تعارفِ اسلام ــــــــ (۴۴۷)

انسان
اپنے آپ کو پہچان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سب سے بڑا مسئلہ

اگر کسی مجلس میں یہ سوال اٹھایا جائے کہ آج انسان کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے تو مختلف لوگ اس کا مختلف جواب دیں گے۔ کوئی کہے گا کہ سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ایٹمی ہتھیاروں کا تجربہ بند کیا جائے، کوئی دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کو سب سے بڑا مسئلہ قرار دے گا۔ کوئی کہے گا کہ پیداوار اور تقسیم کے نظام کو درست کرنا یہ موجودہ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ غرض طرح طرح کے جوابات سنائی دیں گے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان ابھی انسان کو نہیں جانتا اگر وہ اپنے آپ کو جانتا تو سب کے جوابات ایک ہوتے۔ سب یہ کہتے کہ آج انسان کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ انسان اپنی حقیقت کو بھول گیا ہے۔ وہ اس حقیقت سے غافل ہے کہ اسے ایک روز مرنا ہے اور مرنے کے بعد اپنے مالک کے پاس حساب کتاب کے لیے جانا ہے۔ اگر ہم زندگی کی حقیقت کو سمجھ لیں تو ہم دنیا کو نہیں بلکہ آخرت کو اپنا اصل مسئلہ قرار دیں گے۔

آج بھی دنیا کے بیشتر انسان خدا اور آخرت کو مانتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ اس کے منکر ہو گئے ہوں۔ مگر اس ماننے کا کوئی تعلق ان کے عمل سے نہیں ہے۔ حقیقی زندگی میں ہر شخص کے سامنے صرف یہ سوال ہے کہ وہ اپنی آج کی دنیا کو کس طرح کامیاب بنائے۔ اگر ہماری

رصد گاہیں کسی روز یہ اعلان کر دیں کہ زمین کی قوت کشش ختم ہو گئی ہے اور وہ چھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کی طرف کھنچی جا رہی ہے تو ساری دنیا میں کہرام مچ جائے گا۔ کیونکہ اس طرح کی ایک خبر کے معنی یہ ہیں کہ چند ہفتوں کے اندر روئے زمین سے ہر قسم کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔

مگر یہ دنیا ہر آن ایک اس سے زیادہ شدید خطرے سے دوچار ہے اور کوئی نہیں جو اس سے گھبرانے کی ضرورت محسوس کرتا ہو۔ یہ خطرہ کیا ہے! یہ قیامت کا خطرہ ہے جو زمین و آسمان کی پیدائش کے روز ہی سے اس کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔ اور جس کی طرف ہم سب لوگ نہایت تیزی سے دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ عقیدہ کی حد تک سبھی لوگ اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں جو فی الواقع اس کے بارے میں سنجیدگی سے کچھ سوچنے کی ضرورت محسوس کرتے ہوں۔

اگر آپ شام کے وقت کسی کھلے ہوئے بازار میں کھڑے ہو جائیں اور وہاں دیکھیں کہ لوگ کس لیے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آج کے انسان کس چیز کو اپنا اصل مسئلہ بنائے ہوئے ہیں۔ ذرا تصور کیجئے بھرے ہوئے بازار میں موٹروں کی آمدورفت کس لیے ہو رہی ہے، دکان دار کس لیے اپنی دکانیں سجائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ انسانوں کے غول کے غول کہاں آتے جاتے نظر آتے ہیں۔ لوگوں کی بات چیت کا موضوع کیا ہے اور ایک دوسرے کی ملاقات کس غرض سے ہو رہی ہے، کن چیزوں سے لوگ دل چسپی لے رہے ہیں۔ ان کی بہترین صلاحیتیں اور ان کی جیب کے پیسے کس مقصد کے لیے خرچ ہو رہے ہیں۔ جو خوش ہے وہ کیا چیز پا کر خوش ہے اور جو چہرے اداس نظر آتے ہیں، کس چیز کی محرومی نے انہیں اداس بنا دیا ہے۔ لوگ اپنے گھروں سے کیا چیز لے کر نکلے ہیں اور کیا چیز لے کر واپس

جانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کی مصروفیتوں سے۔ ان کے منھ سے نکلی ہوئی آوازوں سے۔ ان کی مختلف حرکات و سکنات سے ان سوالات کا جواب معلوم کر سکیں تو اسی سے آپ کو اس سوال کا جواب بھی معلوم ہو جائے گا کہ آج کا انسان کس چیز کو اپنا اصل مسئلہ سمجھتا ہے اور کیا حاصل کرنا چاہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بازاروں کی چہل پہل اور مصروف ترین سڑکوں پر انسانوں کی مسلسل آمد و رفت پکار رہی ہے کہ آج کا انسان اپنی خواہشوں کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔ وہ آخرت کو نہیں بلکہ صرف دنیا کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ خوش ہے تو اس لیے خوش ہے کہ اس کی دنیوی تمنائیں پوری ہو رہی ہیں۔ اگر وہ غمگین ہے تو اس لیے غمگین ہے کہ اس کی دنیوی خواہشیں پوری ہوتی ہوئی نظر نہیں آتیں۔ آج کی ضرورتیں، آج کا آرام، آج کی عزت، آج کے مواقع، بس انہیں کو پا لینے کا نام لوگوں کے نزدیک کامیابی ہے۔ اور انہیں سے محروم رہنے کا نام لوگوں کے نزدیک ناکامی۔ یہی وہ چیز ہے جس کے پیچھے سارا انسانی قافلہ بھاگا چلا جا رہا ہے۔ کسی کو بھی آنے والے دن کی فکر نہیں۔ ہر شخص بس آج کے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے۔

صرف بڑے بڑے شہروں کا یہ حال نہیں ہے بلکہ جہاں بھی چند انسان بستے ہیں اور کچھ چلتے پھرتے لوگ موجود ہیں۔ ان سب کا یہی حال ہے۔ آپ جس کسی کو دیکھئے وہ اسی کے خیال میں ڈوبا ہوا نظر آئے گا۔ مرد ہو یا عورت، امیر ہو یا غریب، بوڑھا ہو یا جوان، جاہل ہو یا عالم، شہری ہو یا دیہاتی حتیٰ کہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی سب کے سب اسی ایک سمت میں بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ آج آدمی کی سب سے بڑی تمنا صرف یہ ہے کہ دنیا میں وہ جتنا کچھ حاصل کر سکتا ہے حاصل کر لے۔ اسی کو وہ اپنے لیے "کام" سمجھتا ہے۔ اسی کے لیے اپنے بہترین اوقات

اور بہترین صلاحیتوں کو صرف کرتا ہے ۔ اسی کی فکر میں رات دن مشغول ہے ۔ حد یہ ہے کہ اگر ضمیر اور ایمان کو قربان کر کے یہ چیز ملے تو وہ اپنا ضمیر اور ایمان بھی اس دیوی کی نذر کرنے کے لیے تیار ہے ۔ وہ دنیا کو حاصل کرنا چاہتا ہے خواہ وہ جس طرح بھی ملے ۔

مگر اس طرح کی ہر کامیابی صرف دنیا کی کامیابی ہے ۔ آخرت میں وہ بالکل کام نہیں دے سکتی ۔ جو شخص صرف اپنی آج کی دنیا بنانے کی فکر میں ہے اور آخرت کی طرف سے غافل ہے ۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اپنی جوانی میں اپنے بڑھاپے کے لیے جمع نہیں کرتا ۔ یہاں تک کہ جب اس کی قوتیں جواب دے دیتی ہیں اور وہ کام کرنے سے معذور ہو جاتا ہے ۔ تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اب اس کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے ۔

•

وہ دیکھتا ہے کہ میرے پاس مکان نہیں ہے مگر اب وہ اپنا مکان نہیں بنا سکتا ۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس کے پاس موسموں سے بچنے کے لیے کپڑا اور بستر نہیں ہے مگر اب اس میں اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ اپنے لیے کپڑا اور بستر مہیا کر سکے ۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس کے کھانے کا کوئی انتظام نہیں ہے مگر اب وہ اپنے کھانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتا ۔ وہ حسرت کے ساتھ کسی دیوار کے سایہ میں چیتھڑا لپیٹے ہوئے پڑا رہتا ہے جس پر کتے بھونکتے ہیں اور لڑکے کنکر مارتے ہیں ۔ ہم اپنی آنکھوں سے اس طرح کی مثالیں دیکھتے ہیں جس سے ایک ہلکا اندازہ ہو سکتا ہے کہ آخرت کی کمائی نہ کرنے والے کے لیے آخرت کی زندگی کیسی ہوگی ۔ مگر اس کے باوجود ہمارے اندر کوئی کھلبلی پیدا نہیں ہوتی ۔ ہم میں کا ہر شخص صرف اپنے آج کی تعمیر میں مصروف ہے وہ اپنے کل کی کوئی فکر نہیں کرتا ۔

جنگ کے زمانے میں جب ہوائی حملے کا سائرن بجتا ہے اور اپنی مہیب آواز سے یہ اعلان کرتا ہے کہ " دشمن کے ہوائی جہاز آتشیں بموں کو لیے ہوئے غول در غول چلے آرہے ہیں

اور تھوڑی دیر میں شہر کو آگ اور دھویں سے بھر دیں گے۔ لوگ فوراً پناہ گاہوں میں چلے جائیں۔" تو یکایک ہر شخص قریب کی پناہ گاہ کے راستے پر چل پڑتا ہے اور دم بھر میں انتہائی آباد سڑکیں بالکل سنسان ہو جاتی ہیں۔ جو شخص ایسا نہ کرے اس کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ احمق ہے یا اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

یہ دنیا کے چھوٹے خطرے کا معاملہ ہے۔ دوسرا ایک اس سے بڑا اور اس سے زیادہ یقینی خطرہ ہے جس کے متعلق کائنات کے مالک کی طرف سے خبردار کیا گیا ہے۔ خدا نے اپنے رسولوں کے ذریعہ یہ اعلان کیا ہے کہ "لوگو میری عبادت کرو، ایک دوسرے کے حقوق پورے کرو اور میری مرضی کے مطابق زندگی گزارو۔ جو ایسا نہیں کرے گا میں اس کو ایسی سخت سزا دوں گا جس کا وہ تصور نہیں کر سکتا یہ ایک مستقل عذاب ہو گا جس میں وہ ہمیشہ تڑپتا رہے گا اور کبھی اس سے نکل نہ سکے گا۔"

اس اعلان کو ہر کان نے سنا ہے اور ہر زبان کسی نہ کسی شکل میں اس کا اقرار کرتی ہے مگر لوگوں کا حال دیکھئے تو ایسا معلوم ہو گا کہ جیسے یہ کوئی بات ہی نہیں ہے۔ دنیا کے فوائد حاصل کرنے کے لیے لوگ وہ سب کچھ کر رہے ہیں جو انہیں نہیں کرنا چاہیئے۔ زندگی کا قافلہ نہایت تیزی سے اس راستے پر بھاگا جا رہا ہے جدھر جانے سے اس کو منع کیا گیا ہے۔ فوجی ہیڈ کوارٹر سے جو سائرن بجتا ہے اس پر عمل کرنے کے لیے فوراً لوگ دوڑ پڑتے ہیں اور مالکِ کائنات کی طرف سے جس خطرے کا اعلان کیا گیا ہے اس سے کسی کو پریشانی لاحق نہیں ہوتی۔ لوگ اس کی پکار پر نہیں دوڑتے۔

اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ فوجی ہیڈ کوارٹر کا سائرن جس خطرے کا اعلان کرتا ہے اس کا تعلق آج کی دنیا سے ہے جس کو آدمی اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور اس

کے نتیجے کو فوراً محسوس کر لیتا ہے۔ مگر خدا کی طرف سے جس خطرے کا اعلان کیا گیا ہے وہ مرنے کے بعد پیش آئے گا۔ ہمارے اور اس کے درمیان موت کی دیوار حائل ہے۔ وہ آج کی آنکھوں سے ہمیں نظر نہیں آتا۔ ہم نہ اس کے ہوائی جہازوں کو دیکھتے ہیں نہ اس کے بموں کو اور نہ اس کی آگ اور دھوئیں کی بارش کو۔ اس لیے ہوائی حملے کے سائرن کا تو لوگ فوراً یقین کر لیتے ہیں مگر خدا نے جس عذاب کی خبر دی ہے اس کو سن کر ان کے اندر کوئی سراسیمگی پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے بارے میں وہ یقین پیدا نہیں ہوتا جو عمل کے لیے بے تاب کر دے۔

مگر اللہ تعالےٰ نے ہم کو صرف وہی دو آنکھیں نہیں دی ہیں جو پیشانی کے نیچے نظر آتی ہیں اور سامنے کی چیزوں کو دیکھ لیتی ہیں۔ ہمارے پاس ایک اور آنکھ ہے جو زیادہ دور تک دیکھ سکتی ہے۔ جو چھپی ہوئی حقیقتوں کو بھی دیکھتی ہے۔ یہ آنکھ عقل کی آنکھ ہے۔ لوگوں کی بے یقینی کی وجہ یہی ہے کہ وہ اپنی اس دوسری آنکھ کو استعمال نہیں کرتے۔ وہ سامنے جو کچھ دیکھتے ہیں سمجھتے ہیں کہ بس یہی حقیقت ہے۔ حالانکہ اگر غور و فکر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جو چیز ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اس سے زیادہ یقینی ہے وہ چیز جو ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ اس کائنات میں وہ کون سی حقیقت ہے جس کو ہر شخص مانتا ہو تو اس کا ایک ہی جواب ہوگا۔ یعنی موت۔ موت ایک ایسی حقیقت ہے جو ہر بڑے چھوٹے کو تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ کسی بھی وقت اس کی موت آسکتی ہے مگر جب موت کا خیال آتا ہے تو عام طور پر لوگ صرف اتنا سوچتے ہیں کہ "میرے مرنے کے بعد میرے بچوں کا کیا ہوگا" مرنے سے پہلے تو وہ اپنی زندگی کے بارے میں بہت سوچتے ہیں مگر مرنے کے بعد انہیں صرف گھر اور بچوں کی فکر ہوتی ہے۔ بچوں کا

مستقبل محفوظ کرنے کے لیے تو وہ ساری عمر لگا دیتے ہیں مگر جو مستقبل خود ان کے سامنے آنے والا ہے اس کی تعمیر کے لیے کوئی کوشش نہیں کرتے۔ گویا ان کے مرنے کے بعد صرف ان کے بچوں کا وجود باقی رہے گا، خود ان کا کوئی وجود نہ ہوگا جس کے لیے انہیں تیاری کرنے کی ضرورت ہو۔

اس انداز میں لوگوں کا سوچنا یہ بتاتا ہے کہ انہیں شاید اس کا احساس نہیں ہے کہ مرنے کے بعد بھی ایک زندگی ہے بلکہ اصل زندگی مرنے کے بعد ہی شروع ہوتی ہے۔ اگر انہیں اس بات کا یقین ہوتا کہ مر کر جب وہ قبر میں دفن ہوتے ہیں تو درحقیقت وہ دفن نہیں ہوتے بلکہ ایک دوسری دنیا میں داخل کر دیئے جاتے ہیں۔ تو وہ بچوں کے مستقبل کے بارے میں فکرمند ہونے سے پہلے یہ سوچتے کہ "مرنے کے بعد میرا کیا انجام ہوگا"۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا کا بیشتر انسان خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی۔ اس یقین سے خالی ہو گیا ہے کہ وہ مرنے کے بعد ختم نہیں ہو جاتا بلکہ نئی زندگی حاصل کرتا ہے۔ ایک ایسی زندگی جو موجودہ زندگی سے زیادہ حقیقی ہے، جو موجودہ زندگی سے زیادہ اہم ہے۔

موت کے بعد آنے والی زندگی کے بارے میں شبہہ دو وجہوں سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ ہر انسان مر کر مٹی میں مل جاتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ انسان مر کر ختم ہو گیا تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ دوبارہ کس طرح زندگی پائے گا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ موت کے بعد جو دنیا ہے وہ ہم کو نظر نہیں آتی۔ آج کی دنیا کو تو ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے مگر اس کے بعد والی دنیا کو اب تک کسی نے نہیں دیکھا۔ اس لیے ہم کو یقین نہیں آتا کہ اس زندگی کے بعد بھی کوئی زندگی ہو سکتی ہے۔ آیئے ان دونوں سوالوں پر غور کریں۔

موت کے بعد زندگی

"جب میں مر کر مٹی ہو جاؤں گا تو کیا مجھ دوبارہ اٹھایا جائے گا" اس سوال کو اس طرح متعین کر کے تو بہت کم لوگ سوچتے ہیں مگر ہر وہ شخص جو اس بات پر گہرا یقین نہیں رکھتا کہ مرنے کے بعد اسے ایک نئی زندگی سے سابقہ پیش آنے والا ہے۔ اس کے ذہن میں ضرور یہ سوال دبا ہوا رہتا ہے۔ جو شخص آج کی زندگی میں کل کی زندگی کے لیے فکرمند نہیں ہے وہ اس بات کا ثبوت پیش کر رہا ہے کہ وہ کل کی زندگی کے متعلق شبہہ میں مبتلا ہے۔ خواہ وہ باقاعدہ اس مسئلے پر سوچتا ہو یا نہ سوچتا ہو۔

لیکن اگر ہم سنجیدگی سے غور کریں تو نہایت آسانی سے اس کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ موت کے بعد پیش آنے والی حقیقتوں کو ہماری نگاہوں سے چھپا دیا ہے کیوں کہ وہ ہمارا امتحان لے رہا ہے۔ مگر کائنات میں ایسی بے شمار نشانیاں پھیلادی گئی ہیں جن پر غور کر کے ہم تمام حقیقتوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ یہ کائنات ایک آئینہ ہے جس میں دوسری دنیا کا عکس نظر آتا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ ہم اپنی موجودہ شکل میں اول روز سے موجود نہیں ہیں۔ انسان کی ابتدا ایک بے شکل حقیر مادے سے ہوتی ہے جو ماں کے پیٹ میں بڑھ کر انسانی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور پھر باہر آ کر مزید ترقی کر کے پورا انسان بن جاتا ہے۔ ایک بے شعور اور حقیر مادہ جو اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ خالی آنکھ سے دیکھا نہیں جا سکتا اس کا بڑھ کر چھ فٹ لمبا انسان بن جانا ایک ایسا واقعہ ہے جو روزانہ اس دنیا میں پیش آتا ہے۔ پھر یہ سمجھنے میں آپ کو کیا دقّت پیش آتی ہے کہ ہمارے جسم کے اجزا جو نہایت چھوٹے چھوٹے ذرّات بن کر زمین میں منتشر ہو جائیں گے تو دوبارہ وہ پورے انسان کی شکل اختیار کر سکتے ہیں۔

ہر انسان جس کو آپ آج چلتا پھرتا دیکھتے ہیں وہ در اصل انسان کی شکل میں بے شمار ایٹم ہیں جو پہلے ہماری زمین اور ہماری فضا کے اندر نامعلوم وسعتوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ پھر ہَوا، اور پانی اور خوراک نے ان ایٹموں کو لاکر ایک انسانی وجود میں اکٹھا کر دیا اور اب ہم انہیں منتشر ایٹموں کے مجموعے کو ایک چلتے پھرتے انسان کی شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ یہی عمل دوبارہ ہوگا۔ ہمارے مرنے کے بعد ہماری زندگی کے اجزا ہوا اور پانی اور زمین میں منتشر ہو جائیں گے اور اس کے بعد جب خدا کا حکم ہوگا تو وہ اسی طرح اکٹھا ہو کر ایک وجود کی شکل میں مجسّم ہو جائیں گے جس طرح وہ پہلی بار مجسّم ہوئے تھے۔ ایک واقعہ جو ہو چکا ہے وہی اگر دوبارہ ظہور میں آئے تو اس میں تعجّب کی کون سی بات ہے۔

خود مادّی دنیا میں ایسی مثالیں موجود ہیں جو اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ زندگی کو دوسری بار دُہرایا جا سکتا ہے۔ ہر سال برسات میں ہم دیکھتے ہیں کہ زمین میں سبزہ اُگتا ہے اور ہر طرف ہریالی پھیل جاتی ہے پھر گرمی کا زمانہ اس کے لیے موت کا پیغام بن کر آتا ہے اور ساری زمین خشک ہو جاتی ہے۔ جہاں سبزہ لہلہا رہا تھا وہاں چٹیل میدان دکھائی دینے لگتا ہے۔ اس طرح ایک زندگی پیدا ہو کر مر جاتی ہے۔ لیکن اگلی بار جب برسات کا موسم آتا ہے اور آسمان سے بارش ہوتی ہے تو وہی مرے ہوئے سبزے دوبارہ جی اٹھتے ہیں اور خشک زمین پھر سبزہ زار نظر آنے لگتی ہے۔ اسی طرح انسان بھی مرنے کے بعد زندہ کیے جائیں گے۔

ایک اور پہلو سے دیکھیے۔ زندگی بعد موت کے بارے میں شبہہ اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ ہم اپنا تصور موجودہ جسمانی وجود کی شکل میں کرتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ خارج میں جو ایک چلتا پھرتا جسم دکھائی دیتا ہے، یہی اصل انسان ہے اور جب یہ سڑ گل جائے گا اور اس کے

اجزا رمٹی میں مل چکے ہوں گے تو اس کو دوبارہ کس طرح مجسم کرکے کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ ایک زندہ انسان کی موت آتی ہے، وہ خاموش ہو جاتا ہے، اس کی حرکت رُک جاتی ہے۔ اس کی تمام صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد وہ زمین کے نیچے دبا دیا جاتا ہے یا بعض قوموں کے رواج کے مطابق جلا کر دریا میں بہا دیا جاتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد وہ ریزے ریزے ہو کر اس طرح زمین کا جزء بن جاتا ہے کہ پھر اس کا کوئی وجود ہمیں نظر نہیں آتا ایک زندہ انسان کو اس طرح ختم ہوتے ہوئے ہم روزانہ دیکھتے ہیں۔ پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ انسان جو ختم ہو چکا ہے وہ دوبارہ کیسے موجود ہو جائے گا۔

مگر ہمارا اصل وجود ہمارا یہ جسم نہیں ہے جس کو ہم بظاہر چلتا پھرتا ہوا دیکھتے ہیں۔ بلکہ اصل وجود وہ اندرونی انسان ہے جو آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ جو سوچتا ہے، جو جسم کو متحرک رکھتا ہے، جس کی موجودگی جسم کو زندہ رکھتی ہے اور جس کے نکل جانے کے بعد جسم تو باقی رہتا ہے مگر اس میں کسی قسم کی زندگی نہیں پائی جاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کسی مخصوص جسم کا نام نہیں ہے بلکہ اس روح کا نام ہے جو جسم کے اندر موجود ہوتی ہے۔ جسم کے متعلق ہم کو معلوم ہے کہ یہ بہت سے انتہائی چھوٹے چھوٹے ریزوں سے مل کر بنا ہے۔ جس کو زندہ خلیہ (Living cell) کہتے ہیں۔ ہمارے جسم میں خلیوں کی وہی حیثیت ہے جو کسی مکان میں اس کی اینٹوں کی ہوتی ہے۔ ہمارے جسمانی مکان کی یہ اینٹیں یا اصطلاحی زبان میں خلیے ہماری حرکت اور ہمارے عمل کے دوران میں برابر ٹوٹتے رہتے ہیں جس کی کمی ہم غذا کے ذریعے پوری کرتے ہیں۔ غذا ہضم ہو کر یہی مختلف قسم کے خلیے بناتی ہے جو جسم کی ٹوٹ پھوٹ کو مکمل کر دیتے ہیں۔ اس طرح انسان کا جسم مسلسل گھستا اور بدلتا رہتا ہے۔ پچھلے خلیے ٹوٹتے ہیں اور نئے خلیے ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ یہ عمل ہر روز

ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ کچھ عرصے کے بعد سارے کا سارا جسم بالکل نیا ہو جاتا ہے۔

یہ عمل اوسطاً دس سال میں مکمل ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں آپ کا جو جسم دس سال پہلے تھا۔ اس میں آج کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ آج آپ کا جسم ایک نیا جسم ہے۔ دس سال کے عرصے میں آپ کے جسم کے جو حصے ٹوٹ کر الگ ہوتے ہیں۔ اگر ان کو پوری طرح یکجا کیا جا سکے تو بعینہٖ آپ کی شکل کا ایک دوسرا انسان کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر آپ کی عمر سو سال ہو تو آپ ہی جیسے تقریباً دس انسان بنائے جا سکتے ہیں۔ یہ انسان بہ ظاہر دیکھنے میں آپ کی طرح ہوں گے مگر وہ سب کے سب مردہ جسم ہوں گے۔ جن کے اندر "آپ" موجود نہیں ہوں گے۔ کیوں کہ آپ نے پچھلے جسموں کو چھوڑ کر ایک نئے جسم کو اپنا قالب بنا لیا ہے۔

اس طرح آپ کا جسم بنتا بگڑتا رہتا ہے مگر آپ کے اندر کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ جس چیز کو آپ "میں" کہتے ہیں وہ بدستور باقی ہے۔ آپ نے اگر کسی سے دس سال پہلے ایک معاہدہ کیا تھا تو آپ ہر وقت تسلیم کرتے ہیں کہ یہ معاہدہ "میں" نے کیا تھا۔ حالاں کہ اب آپ کا پچھلا جسمانی وجود باقی نہیں ہے۔ وہ ہاتھ اب آپ کے جسم پر نہیں ہے جس نے معاہدے کے کاغذات پر دستخط کیے تھے اور نہ وہ زبان موجود ہے جس نے معاہدے کی بابت گفتگو کی تھی۔ لیکن "آپ" اب بھی موجود ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ دس سال پہلے جو معاہدہ میں نے کیا تھا وہ میرا ہی معاہدہ تھا اور اب بھی میں اس کا پابند ہوں یہی وہ اندرونی انسان ہے جو جسم کے ساتھ بدلتا نہیں بلکہ جسم کی کتنی ہی تبدیلیوں کے باوجود اپنے آپ کو باقی رکھتا ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ انسان کسی خاص جسم کا نام نہیں ہے جس کے مرنے سے انسان بھی مر جائے۔ بلکہ وہ ایک ایسی روح ہے جو جسم سے الگ اپنا وجود رکھتی ہے اور جسم کے اجزا منتشر ہونے کے بعد بھی بدستور باقی رہتی ہے۔ جسم کے بدلنے اور روح کے نہ بدلنے میں

اس حقیقت کا صاف اشارہ موجود ہے کہ جسم فانی ہے مگر روح فانی نہیں۔

بعض نادان لوگ یہ کہتے ہیں کہ زندگی اور موت نام ہے کچھ مادّی اجزاء کے اکھٹے ہونے اور پھر منتشر ہو جانے کا۔ ان اجزاء کے ملنے سے زندگی بنتی ہے اور ان کے الگ ہو جانے سے موت واقع ہوتی ہے۔ اسی نظریہ کو چکبست نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے:

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انہیں اجزاء کا پریشاں ہونا

مگر یہ ایک ایسی بات ہے جس کا علم سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر زندگی محض "عناصر میں ظہورِ ترتیب" کا نام ہے تو اس کو اس وقت تک باقی رہنا چاہیے جب تک عناصر کی یہ ترتیب موجود ہے اور یہ بھی ممکن ہونا چاہیے کہ کوئی ہوشیار سائنس داں ان عناصر کو یکجا کر کے زندگی پیدا کر سکے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ یہ دونوں باتیں ناممکن ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مرنے والوں میں صرف وہی نہیں ہیں جن کو کوئی ایسا حادثہ پیش آئے جو ان کے جسم کے ٹکڑے کر دے۔ بلکہ ہر حالت میں اور ہر عمر کے لوگ مرتے ہیں۔ بعض مرتبہ تو اچھے خاصے تندرست انسان کے دل کی حرکت یکایک اس طرح بند ہو جاتی ہے کہ کوئی ڈاکٹر بتا نہیں پاتا کہ ایسا کیوں ہوا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مرنے والے کا جسم اپنی سابقہ حالت میں لیٹا ہوا ہے دوسرے لفظوں میں "عناصر کا ترتیبی ظہور" مکمل طور پر موجود ہے۔ مگر اس کے اندر جو روح تھی وہ نکل چکی ہے۔ سارے عناصر اسی خاص ترتیب کے ساتھ اب بھی موجود ہوتے ہیں جو اب سے چند منٹ پہلے تھے مگر اس کے اندر زندگی موجود نہیں ہوتی۔ یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ مادّی عناصر کی ترتیب زندگی پیدا نہیں کرتی بلکہ زندگی اس سے الگ ایک چیز ہے جو اپنا مستقل وجود رکھتی ہے۔

کسی لیبارٹری میں زندہ انسان نہیں بنایا جاسکتا اگرچہ جسم کی شکل ہر وقت بنائی جاسکتی ہے یہ معلوم ہوچکا ہے کہ زندہ جسم کے اجزار بالکل معمولی کیمیاوی ایٹم ہوتے ہیں۔ اس میں کاربن وہی ہے جو ہم کالک میں دیکھتے ہیں۔ ہائیڈروجن اور آکسیجن وہی ہے جو پانی کی اصل ہے۔ نائٹروجن وہی ہے جس سے کرۂ ہوا کا بیشتر حصہ بنا ہے۔ اور اسی طرح دوسری چیزیں۔ مگر کیا ایک زندہ انسان محض معمولی ایٹموں کا ایک خاص مجموعہ ہے جو کسی غیر معمولی طریقے سے ترتیب دے دیا گیا ہے۔ یا وہ اس کے علاوہ کچھ اور ہے۔

سائنس داں کہتے ہیں کہ اگرچہ ہم یہ جانتے ہیں کہ انسان کا جسم فلاں فلاں مادّی اجزار سے مل کر بنا ہے۔ مگر انہی اجزار کو یکجا کر کے ہم زندگی پیدا نہیں کرسکتے۔ دوسرے لفظوں میں ایک زندہ انسان کا جسم محض بے جان ایٹموں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ وہ ایٹم اور زندگی دونوں ہے۔ مرنے کے بعد ایٹموں کا مجموعہ تو ہمارے سامنے موجود رہتا ہے مگر زندگی اس سے رخصت ہوکر دوسری دنیا میں چلی جاتی ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ زندگی مٹنے والی چیز نہیں ہے۔ بلکہ باقی رہنے والی چیز ہے۔ اب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ زندگی بعد موت کا نظریہ کس قدر عقلی اور فطری نظریہ ہے۔ یہ حقیقت پکار رہی ہے کہ زندگی صرف وہی نہیں ہوسکتی جو موت سے پہلے نظر آتی ہے بلکہ مرنے کے بعد بھی ہمیں زندہ رہنا چاہیے۔ ہماری عقل تسلیم کرتی ہے کہ یہ دنیا اور اس کی عمر فانی ہے مگر انسان ایک ایسا وجود ہے جو اس کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ جب ہم مرتے ہیں تو درحقیقت مرتے نہیں بلکہ زندہ رہنے کے لیے دوسری دنیا میں چلے جاتے ہیں۔ موجودہ زندگی ہماری مسلسل عمر کا محض ایک مختصر وقفہ ہے۔

دوسری دنیا

اب اس سوال پر غور کیجئے کہ دوسری زندگی کیسی ہوگی۔ خدا کے رسول کہتے ہیں کہ وہاں جنّت اور دوزخ ہے۔ ہر شخص جو مرتا ہے وہ ان دو میں سے کسی ایک کے اندر داخل کیا جاتا ہے۔ جو شخص آج کی دنیا میں خدا کا فرماں بردار ہوگا اور نیک عمل کرے گا اس کو جنّت کی آرام گاہ میں جگہ ملے گی اور جو بدکردار اور خدا کا نافرمان ہوگا اس کو جہنّم کی تکلیفوں میں ڈالا جائے گا۔

اس کو سمجھنے کے لیے اس حقیقت پر غور کیجئے کہ انسان جو کام بھی کرتا ہے اس کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ایک واقعہ ہے جیسے کہ بہت سے واقعات ہوتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ وہ کسی خاص ارادے کے تحت کیا گیا ہے۔ پہلی حیثیت کو ہم واقعاتی کہہ سکتے ہیں اور دوسری کو اخلاقی۔ ایک مثال سے اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔

اگر کسی درخت پر کوئی پتھر اٹکا ہوا ہو، آپ اس کے نیچے سے گزریں اور یکایک پتّھر آپ کے اوپر گر پڑے اور آپ کا سر ٹوٹ جائے تو آپ درخت سے لڑائی نہیں کریں گے نہ اس پر خفا ہوں گے بلکہ خاموشی سے اپنا سر پکڑے ہوئے گھر چلے جائیں گے۔ اس کے برعکس اگر کوئی آدمی جان بوجھ کر آپ کے اوپر ایک پتھر کھینچ مارے جس سے آپ کا چہرہ زخمی ہو جائے تو آپ اس پر برس پڑتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کا سر توڑ ڈالیں جس طرح اس نے آپ کا سر توڑا ہے۔

درخت اور انسان میں یہ فرق کیوں ہے۔ کیوں آپ درخت سے بدلہ نہیں لیتے اور انسان سے بدلہ لینا چاہتے ہیں، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ درخت اس احساس وشعور سے خالی ہے جو انسان کو حاصل ہے۔ درخت کا عمل صرف واقعاتی نوعیت رکھتا ہے۔ جب کہ انسان کا عمل واقعاتی اور اخلاقی دونوں ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ انسان کے عمل کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کی وجہ سے کوئی

واقعہ دنیا میں ظاہر ہوا۔ دوسرے یہ کہ وہ عمل جائز تھا یا ناجائز۔ صحیح جذبے سے کیا گیا تھا یا غلط جذبے سے۔ اس کو ہونا چاہیے تھا یا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ جہاں تک عمل کی پہلی حیثیت کا تعلق ہے اس کا پورا انجام اسی دنیا میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ مگر اس کی دوسری حیثیت کا انجام اس دنیا میں ظاہر نہیں ہوتا۔ اور کبھی ظاہر ہوتا ہے تو نہایت ناقص شکل میں۔

جس شخص نے آپ کو پتھر مارا اس کے عمل کا یہ انجام تو فوراً ظاہر ہو گیا کہ آپ کا سر ٹوٹ گیا مگر اس کے عمل کا دوسرا پہلو کہ اس نے اپنی قوتوں کا غلط استعمال کیا اس کا انجام ظاہر ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس نے چاہا تھا کہ سر توڑے اور سر ٹوٹ گیا۔ اس نے چاہا تھا کہ ایک غلط کام کرے مگر اس کے اس دوسرے ارادہ کا کوئی نتیجہ ہمارے سامنے نہیں آیا۔ نتیجہ نام ہے انسانی ارادے کے خارجی ظہور کا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی ارادے کا ایک نتیجہ۔ واقعاتی نتیجہ۔ ہمیشہ ظاہر ہو جاتا ہے پھر انسانی ارادے کا دوسرا نتیجہ — اخلاقی نتیجہ۔ بھی ضرور ظاہر ہونا چاہیے۔

آخرت انسانی عمل کے اسی دوسرے پہلو کا مکمل انجام ظاہر ہونے کی جگہ ہے۔ جس طرح آدمی کے عمل کا ایک پہلو کچھ واقعات کو ظہور میں لاتا ہے۔ اسی طرح اس کے عمل کا دوسرا پہلو کچھ دوسرے واقعات کو پیدا کرتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلی قسم کے واقعات کو ہم اسی دنیا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں اور دوسری قسم کے واقعات کو ہم مرنے کے بعد دیکھیں گے۔

ہر آدمی جو دنیا میں زندگی گزار رہا ہے وہ اپنے عمل سے اپنے لیے کوئی نہ کوئی نتیجہ پیدا کرنے میں مصروف ہے۔ وہ خواہ بیکار بیٹھا ہو یا کسی کام میں مشغول ہو۔ اس کی ہر حالت اس کے موافق یا مخالف ایک ردّعمل پیدا کرتی ہے۔ اس کے عادات و اخلاق سے لوگ اس کے بارے میں رائے قائم کرتے ہیں۔ وہ اپنی قوتوں کو جس طرح استعمال کرتا ہے اسی کے لحاظ سے اس

کے کام بنتے یا بگڑتے ہیں۔ وہ اپنی کوششوں کو جس سمت میں لگاتا ہے اس سمت کی چیزوں پر اس کا حق قائم ہوتا ہے۔

غرض ہر شخص اپنے گرد و پیش اپنی ایک دنیا کی تخلیق کر رہا ہے جو عین اس کے عمل کے مطابق ہے۔ یہ آدمی کے عمل کا ایک پہلو ہے جو موجودہ دنیا سے متعلق ہے۔ اسی طرح اس کے کام کی دوسری حیثیت — صحیح یا غلط ہونے کی حیثیت — بھی اپنا ایک انجام پیدا کرتی ہے جو دوسری دنیا میں ذخیرہ ہو رہا ہے۔ ہمارے عمل کا اخلاقی پہلو مستقل طور پر اپنے انجام کی تخلیق کر رہا ہے اور اسی کا نام مذہب کی اصطلاح میں جنّت اور دوزخ ہے۔ ہم میں سے ہر شخص ہر آن اپنے لیے جنّت یا دوزخ کی تعمیر کر رہا ہے۔ چونکہ اس دنیا میں آدمی کو امتحان کی غرض سے ٹھہرایا گیا ہے۔ اس لیے یہ جنّت دوزخ اس کی نگاہوں سے اوجھل رکھی گئی ہے۔ جب امتحان کی مدّت ختم ہوگی اور قیامت آئے گی تو ہر شخص اپنی تعمیر کی ہوئی دنیا میں پہونچا دیا جائے گا۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر ہمارے عمل کا کوئی اخلاقی انجام ہے تو وہ ہم کو نظر کیوں نہیں آتا۔ مثلاً مکان بنانا ایک عمل ہے جس کا ایک انجام یہ ہے کہ مکان بن کر کھڑا ہو جائے۔ یہ انجام ظاہر ہوتا ہے اور اس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں مگر اس عمل کا یہ پہلو کہ وہ جائز طریقے پر بنایا گیا ہے یا ناجائز طریقے پر، یہ بھی اگر کوئی انجام پیدا کرتا ہے تو وہ کہاں ہے۔ کیا ایسا بھی کوئی انجام ہو سکتا ہے جس کو دیکھا اور چھوا نہ جا سکتا ہو۔

اس کا جواب خود عمل کی ان دونوں حیثیتوں میں موجود ہے۔ کسی عمل کی جو واقعاتی حیثیت ہے اس کو ہر شخص دیکھتا ہے حتیٰ کہ کیمرے کی بے جان آنکھ بھی اس کو صاف طور پر دیکھ لیتی ہے۔ مگر کسی عمل کی اخلاقی حیثیت نظر آنے والی چیز نہیں ہے۔ وہ صرف محسوس ہوتی ہے دیکھی نہیں

جاتی۔ عمل کی دونوں حیثیتوں کا یہ فرق خود اشارہ کر رہا ہے کہ دونوں قسم کا انجام کس طرح ظاہر ہونا چاہیے۔ یہ اس بات کا صریح اشارہ ہے کہ عمل کی پہلی حیثیت کا انجام اسی دنیا میں نظر آنا چاہیے جس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور عمل کی دوسری حیثیت کا انجام اُس دنیا میں نظر آئے گا جو ابھی ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے۔ گویا جو کچھ ہے، یہی دراصل ہونا بھی چاہیے تھا۔

مگر یہ صرف عقلی امکان ہی کی بات نہیں ہے۔ کائنات کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ بالفعل یہاں دونوں قسم کے انجام پائے جاتے ہیں۔ ایسے بھی جنھیں ہم واقع ہونے کے بعد فوراً دیکھ لیں۔ اور ایسے بھی جو اگرچہ ہماری آنکھوں کو نظر نہیں آتے مگر وہ ایک حقیقت کے طور پر موجود ہوتے ہیں۔ کائنات میں ایسے غیر مرئی نتائج کا موجود ہونا صریح طور پر ظاہر کرتا ہے کہ اسی قسم کے دوسرے غیر مرئی نتائج بھی موجود ہو سکتے ہیں۔ کائنات کی تخلیق اپنے اندر ایسے نتائج کے ہونے کا اقرار کرتی ہے۔

مثال کے طور پر آواز کو لیجئے۔ آپ جانتے ہیں کہ آواز نام ہے ایسی لہروں کا جن کو آنکھ کے ذریعہ دیکھا نہیں جا سکتا۔ جب ہم بولنے کے لیے زبان کو حرکت دیتے ہیں تو اس کی حرکت سے ہوا میں کچھ لہریں پیدا ہوتی ہیں۔ انہیں لہروں کو ہم آواز کہتے ہیں۔ آواز ایک طرح کا غیر مرئی نقش ہے جو ہماری زبان کے ہلنے سے ہوا میں پیدا ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی شخص بولتا ہے تو اس کی آواز لہروں کی شکل میں نقش ہو جاتی ہے اور مستقل طور پر باقی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اب سے ہزاروں برس پہلے کسی انسان نے جو آواز اپنے منہ سے نکالی تھی۔ جو گفتگو یا تقریر کی تھی سب کی سب ہوا کے اندر لہروں کی شکل میں موجود ہے۔ اگرچہ آج ہم ان آوازوں کو نہیں دیکھتے اور نہ اسے سنتے ہیں۔ لیکن اگر ہمارے پاس ان کو گرفت کرنے والے آلات ہوں تو کسی بھی وقت ان کو بعینہٖ اپنی

سابق شکل میں دُھرایا جا سکتا ہے۔

اس مثال کے ذریعہ ہم دوسری دنیا کے مسئلے کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ جس طرح ہمارے چاروں طرف ہوا کا ایک غلاف ہے۔ اور ہماری ہر آواز منہ سے نکلتے ہی اس پر نقش ہو جاتی ہے۔ حالاں کہ نہ ہم ہوا کو دیکھتے ہیں اور نہ اپنی آواز کے نقوش کو۔ ٹھیک اسی طرح وہ دوسری دنیا بھی ہم کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے اور ہماری نیتوں اور ارادوں کو مسلسل ریکارڈ کرتی جا رہی ہے۔ اس کے پردے پر ہمارے اعمال کے نقوش ثبت ہو رہے ہیں جو مرنے کے بعد ظاہر ہو جائیں گے۔

گراموفون میں چابی بھری ہوئی ہو اور ریکارڈ اس کے اوپر گھوم رہا ہو تو سوئی رکھتے ہی ریکارڈ کی خاموش تختی یکایک اس طرح بول پڑتی ہے۔ جیسے وہ اسی کی منتظر تھی کہ کوئی اس کے اوپر سوئی رکھے اور وہ اپنے اندر کی آواز کو نکالنا شروع کر دے۔ اسی طرح ہمارے تمام اعمال کا ریکارڈ تیار ہو رہا ہے اور جب کائنات کا مالک حکم دے گا تو سارا ریکارڈ اس طرح ہمارے سامنے آجائے گا۔ کہ اس کو دیکھ کر آدمی بے اختیار کہے گا:

مَالِ هٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّا اَحْصَاهَا

یہ کیسی کتاب ہے۔ میرا چھوٹا بڑا کوئی عمل ایسا نہیں ہے جو اس نے محفوظ نہ کر لیا ہو

آخری بات

اوپر میں نے جو کچھ بیان کیا ہے۔ اب آخر میں پھر ایک بار اس کو اپنے ذہن میں دُہرا لیجئے۔ آپ کی زندگی ایک نہایت طویل اور مسلسل زندگی ہے۔ موت اس زندگی کی آخری حد نہیں ہے بلکہ وہ اس کے دوسرے دَور کی ابتدا ہے۔ موت ہماری زندگی کے دو مرحلوں کے درمیان حدِ فاصل قائم کرتی ہے۔ اس کو مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ کسان ایک فصل

بوتا ہے ، اس پر کوشش کرتا ہے ، اپنا سرمایہ اس میں لگاتا ہے ۔ یہاں تک کہ فصل تیار ہو کر سوکھ جاتی ہے ۔ اس وقت وہ اسے کاٹ لیتا ہے تاکہ اس سے غلہ حاصل کر کے اپنی سال بھر کی خوراک کا انتظام کرے ۔ فصل کا کٹنا فصل کے ایک دور کا ختم ہونا اور اس کے دوسرے دور کا آغاز ہونا ہے ۔ اس سے پہلے بونا اور فصل کو تیار کرنا تھا ۔ اس کے بعد اس کا پھل حاصل کرنا اور اس سے اپنی ضرورت پوری کرنا ہے ۔ فصل کٹنے سے پہلے صرف کوشش اور خرچ تھا اور فصل کٹنے کے بعد صرف اپنی محنت کا نتیجہ پانا اور اس سے فائدہ اٹھانا ہے ۔

ٹھیک یہی حال ہماری زندگی کا بھی ہے ۔ ہم اس دنیا میں اپنی آخرت کی فصل تیار کر رہے ہیں ۔ ہم میں سے ہر شخص آخرت میں اپنا ایک کھیت رکھتا ہے جس میں وہ یا تو کاشت کر رہا ہے یا اس کو خالی چھوڑے ہوئے ہے ۔ اس نے یا تو خراب بیج استعمال کئے ہیں یا اچھے بیج ڈالے ہیں ۔ اس نے بیج ڈال کر یا تو اسے چھوڑ دیا ہے یا وہ بیج ڈالنے کے بعد مسلسل اس کی نگرانی کر رہا ہے ۔ اس نے یا تو کانٹوں کی فصل بوئی ہے یا پھل اور پھول اگائے ہیں ۔ وہ یا تو اپنی ساری قوت اس کھیتی کو بہتر بنانے میں لگائے ہوئے ہے یا دوسرے غیر متعلق مشاغل اور دلچسپیوں میں بھی وہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے ۔ اس فصل کی تیاری کی مدت اس وقت تک ہے جب تک ہم کو موت نہیں آجاتی ۔ موت آخرت کی فصل کاٹنے کا دن ہے ۔ جب اس دنیا میں ہماری آنکھ بند ہوگی تو دوسری دنیا میں ہماری آنکھ کھلے گی ۔ وہاں ہماری عمر بھر کی تیار کی ہوئی کھیتی ہمارے سامنے ہوگی ۔

یاد رکھیے کاٹنے کے دن وہی کاٹتا ہے جس نے کاٹنے سے پہلے کھیتی کی ہو اور وہی چیز کاٹتا ہے جو اس نے اپنے کھیت میں بوئی تھی ۔ اسی طرح آخرت میں ہر شخص کو وہی فصل ملے گی جو اس نے

موت سے پہلے تیار کی ہے۔ ہر کسان جانتا ہے کہ اس کے گھر میں ٹھیک اتنا ہی غلّہ آئے گا جتنی اس نے محنت کی ہے اور وہی چیز آئے گی جو اس نے بوئی تھی۔ اسی طرح آخرت میں بھی آدمی کو اسی کے بقدر ملے گا جتنی اس نے جدوجہد کی ہے اور وہی کچھ ملے گا جس کے لیے اس نے کوشش کی ہو۔ موت کوشش کی مدّت ختم ہونے کا آخری اعلان ہے اور آخرت اپنی کوششوں کا انجام پانے کی آخری جگہ۔ موت کے بعد نہ دوبارہ کوشش کرنے کا موقع ہے اور نہ آخرت کبھی ختم ہونے والی ہے۔ کتنا سنگین ہے یہ واقعہ۔ کاش انسان موت سے پہلے اس حقیقت کو سمجھ لے کیوں کہ موت کے بعد سمجھنا کچھ بھی کام نہ آئے گا۔ موت کے بعد ہوشیار ہونے کے معنیٰ صرف یہ ہیں کہ آدمی اس بات پر افسوس کرے کہ اس نے ماضی میں کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ ایک ایسی غلطی جس کی اب کوئی تلافی نہیں ہوسکتی۔

انسان اپنے انجام سے غافل ہے حالاں کہ زمانہ اس کو نہایت تیزی سے اس وقت کی طرف لیے جارہا ہے جب فصل کٹنے کا وقت آجائے گا۔ وہ دنیا کے حقیر فائدوں کو حاصل کرنے میں مصروف ہے اور سمجھتا ہے کہ میں کام کر رہا ہوں۔ حالاں کہ دراصل وہ اپنے قیمتی اوقات کو ضائع کر رہا ہے۔ اس کے سامنے ایک عظیم موقع ہے جس کو استعمال کرکے وہ اپنے لیے ایک ناقابل قیاس حد تک شاندار مستقبل بنا سکتا ہے۔ مگر وہ کنکریوں سے کھیل رہا ہے۔ اس کا رب اس کو اپنی جنت کی طرف بلا رہا ہے جو لامتناہی عزّت اور آرام کی جگہ ہے۔ مگر وہ چند دن کی جھوٹی لذتوں میں کھویا ہوا ہے وہ سمجھتا ہے کہ میں حاصل کر رہا ہوں حالاں کہ وہ صرف ضائع کر رہا ہے۔ دنیا میں مکان بنا کر وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی زندگی کی تعمیر کر رہا ہوں حالاں کہ وہ صرف ریت کی دیواریں اٹھا رہا ہے جو اسی لیے بنتی ہیں کہ بننے کے بعد منہدم ہوجائیں۔

انسان اپنے آپ کو پہچان۔ تو کیا کر رہا ہے اور تجھے کیا کرنا چاہیے! (۱۹۶۰)

کرتے ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص آخرت میں

خدا اور انسان

فہرست

آغازِ کلام ۳
خدا اور انسان ۴
یہ گونگے شاہکاروں کا عجائب خانہ نہیں ۵
خدا کی دنیا ۶
معبود کی طلب ۷
انسان کی تلاش ۸
سب کچھ عجیب ہے ۹
دریافت کی لذت ۱۰
خدا کی موجودگی کا تجربہ ۱۱
کائنات کا دسترخوان ۱۲
سچائی کو پانے والا ۱۳
شکر کی نعمت ۱۴
ظاہر فریبی ۱۵
رہنما کی ضرورت ۱۶
اندھیرا ختم ہوگا ۱۷
دنیا اور آخرت ۱۸
انسان کا المیہ ۱۹
تضاد ختم ہوگا ۲۰
آپریشن ۲۱
دو قسم کی روحیں ۲۲
یہ تضاد کیوں ۲۳
تولے جانے سے پہلے تول لو ۲۴
دھوکے بازی ۲۵
موت کو یاد کرو ۲۶
کچھ کام نہ آئے گا ۲۷
شناختی کارڈ کے بغیر ۲۸
جنت والے ۲۹
پلاسٹک کے پھول اور پھل ۳۰
اپنا احتساب ۳۱
دونوں ایک سطح پر ۳۲
صرف کرنا کافی نہیں ۳۳
مقبول بندے ۳۴
صبر کا بدلہ ۳۵
ضمیر کے خلاف ۳۶
خدا کی یاد ۳۷
جب پردہ اٹھے گا ۳۸
ہر طرف فریب ۳۹
جانور سے بدتر ۴۰
امتحان کا مقام ۴۱
عمل کے بغیر ۴۲
الفاظ کم ہو جاتے ہیں ۴۳
دنیا کی خاطر عمل کرنے والے ۴۴
ثواب ۴۵
خدا کو پانے والے ۴۶
نمائشی حق پرستی ۴۷
یہ انسان ۴۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسان نے ہمیشہ خدا کو سمجھنے میں بھی غلطی کی ہے اور اپنے آپ کو سمجھنے میں بھی۔ اس نے خدا کو اپنے جیسا سمجھ لیا اور اپنے آپ کو خدا جیسا۔ یہی ہر دور کے انسان کی غلطی رہی ہے۔ ساری انسانی تاریخ اسی غلطی اور اس کے نتائج کی داستان ہے۔

خدا کو اپنے جیسا سمجھنا یہ ہے کہ خدا کو انسانی سطح پر اتار لایا جائے۔ الحاد اور شرک کی تمام قسمیں اسی غلطی کی پیداوار ہیں۔ الحاد بھی خدا کو انسان پر قیاس کرنے کا دوسرا نام ہے اور شرک بھی۔

انسان ہمیشہ باپ اور ماں کے ذریعہ پیدا ہوتا ہے، وہ کسی جننے والے کے ذریعہ جنا جاتا ہے۔ اس بنا پر گمان کر لیا گیا کہ خدا اگر ہے تو اس کو جننے والا بھی کوئی ہونا چاہئے۔ کسی کو خدا سے پہلے ہونا چاہئے جو خدا کو وجود بخشے۔ اب چونکہ انسان کو خدائے لم یزل کا پیدا کرنے والا کوئی نظر نہ آیا اس لئے اس نے خدا کے وجود کا انکار کر دیا۔ انسان اپنی تخلیق کی صورت میں اپنے خالق کو دیکھ رہا تھا۔ مگر وہ اپنے ایک غلط مفروضہ کی وجہ سے اس کو ماننے پر تیار نہ ہوا۔

جن لوگوں نے خدا کو مانا انھوں نے یہی غلطی دوسرے انداز سے کی۔ انھوں نے دیکھا کہ انسان جب کوئی کام انجام دیتا ہے تو بہت سے لوگوں کی مدد سے انجام دیتا ہے۔ اس بنا پر انھوں نے خدا کے بھی شریک اور مددگار فرض کر لئے۔ انسان کے یہاں بڑے لوگوں کی سفارشیں چلتی ہیں۔ چنانچہ مان لیا گیا کہ خدا کے بھی کچھ مخصوص اور قریبی لوگ ہیں جو خدا کے دربار میں اثر رکھتے ہیں اور خدا ان کی سفارشیں قبول کرتا ہے۔ انسان جذبات سے مغلوب ہوتا ہے۔ وہ اکثر حق کے تقاضوں کو چھوڑ کر جذباتی میلان کے تحت فیصلے کرتا ہے۔ اس پر قیاس کرتے ہوئے یہ عقیدہ بنا لیا گیا کہ خدا محض گروہی تعلق کی بنیاد پر کچھ لوگوں سے ایسا معاملہ کرتا ہے جو معاملہ وہ دوسرے گروہ سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ نہیں کرتا۔ اس قسم کا ہر عقیدہ خدا کی خدائی کی نفی ہے۔ مگر انسان اپنی نادانی سے اکثر اپنے ذہن میں ایسے متضاد خیالات کو جمع کر لیتا ہے جن کا بیک وقت درست ہونا ممکن نہیں۔

اپنے آپ کو خدا جیسا سمجھنا یہ ہے کہ آدمی یہ گمان کرلے کہ وہ اپنی تقدیر کا مالک آپ ہے۔ وہ آزاد ہے کہ جو چاہے کرے اور جو چاہے نہ کرے۔ وہ اپنی زندگی کا اصول آپ وضع کرے اور اپنے حلال و حرام کو خود اپنی عقل سے متعین کرے۔ اس قسم کی ہر کوشش گویا اپنے آپ کو خدا کے مقام پر بٹھانا ہے، جو چیز صرف خدا کا حق ہے اس کا حق دار اپنے آپ کو سمجھنا ہے۔ مگر ایسا ہر گمان اس کائنات میں سراسر باطل ہے۔ کیونکہ انسان صرف ایک عاجز مخلوق ہے، وہ کسی بھی اعتبار سے خالق کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔

وحید الدین ۱۴ مارچ ۱۹۸۲

خدا اور انسان

کائنات خدا کا آئینہ ہے۔ یہاں خدا اپنی مخلوقات کے روپ میں نمایاں ہے۔ آدمی کی حساسیت اگر زندہ ہو تو اپنے گرد و پیش وہ خدا کو پائے گا۔ اپنے چاروں طرف وہ خدا کا مشاہدہ کرے گا۔ خدا کی کائنات اس کے لئے خدا کا زندہ ثبوت بن جائے گی۔

دنیا میں زندگی کی سرگرمیاں اس بات کا کھلا ہوا اعلان ہیں کہ اس دنیا کا خالق ایک زندہ ہستی ہے نہ کہ کوئی ایسی ہستی جو زندگی اور حیات سے محروم ہو۔ جب سورج نکلتا ہے اور چھپی ہوئی چیزیں اس کی روشنی میں دکھائی دینے لگتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خدا نے اپنی آنکھیں کھولی ہوں، جیسے خدا ایک دیکھنے والی ہستی ہو اور اپنی آنکھوں سے سارے عالم کو دیکھ رہا ہو۔ دریاؤں میں جب پانی کا سیلاب رواں ہوتا ہے تو وہ پُرشور اعلان کرتا ہے کہ اس دنیا کا خالق ایک ایسا خالق ہے جو چلتا ہے اور اقدام کر کے آگے بڑھتا ہے۔ جنگل کا شیر جب اپنا پنجہ نکال کر کسی جانور کو اپنی پکڑ میں لیتا ہے تو گویا وہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ اس کو پیدا کرنے والا خدا ایک ایسا خدا ہے جو پکڑنے کی طاقت رکھتا ہے اور چیزوں کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ خلا کی بے پایاں وسعتیں اس حقیقت کا ابدی اظہار ہیں کہ اس کائنات کا خالق ایک لامحدود ہستی ہے، وہ اپنی ذات میں بھی اتھاہ ہے اور اپنی صفات میں بھی۔

خدا کا یہ کائناتی مشاہدہ ایک طرف آدمی کے اندر خدا کا یقین پیدا کرتا ہے دوسری طرف اس کو بہت بڑے سوال سے دوچار کر دیتا ہے۔ اس دنیا کا اگر خدا ہے تو وہ اپنی دنیا میں ظاہر کیوں نہیں ہوتا۔ دنیا میں بے پناہ برائیاں ہیں۔ یہاں ایک انسان دوسرے انسان پر ظلم کرتا ہے۔ ایک شخص موقع پاکر دوسرے شخص کو ذبح کر دیتا ہے۔ یہ سب خدا کی دنیا میں ہر روز ہو رہا ہے مگر خدا ظالموں کا ہاتھ نہیں پکڑتا، وہ مظلوموں کی جانب کھڑا نہیں ہوتا۔

اس سوال کو صرف اس وقت سمجھا جا سکتا ہے جب کہ مخلوقات کے بارہ میں خالق کی اسکیم کو سمجھ لیا جائے۔ موجودہ دنیا خدا کا مستقل بندوبست نہیں، وہ صرف امتحانی بندوبست ہے۔ یہ گویا ایک کھیت ہے جس میں مختلف پودوں کو اگنے کا موقع دے کر یہ دیکھا جا رہا ہے کہ کون اچھا درخت ہے اور کون جھاڑ جھنکاڑ۔ اس کے بعد اچھے درختوں کو ہر قسم کے بہترین مواقع دے کر تمام برے درختوں کو اکھاڑ دیا جائے گا اور پھر خدا کی دنیا خدا کے معیاری انتظام کے تحت حسن اور لذت کی ابدی بہشت بن جائے گی۔

یہ گونگے شاہکاروں کا عجائب خانہ نہیں

تمام سفروں میں ٹرین کا سفر سب سے زیادہ تجربات سے بھرا ہوتا ہے۔ انسانی قافلوں کو لئے ہوئے تیز رفتار ایکسپرس دوڑی چلی جارہی ہے۔ گاڑی کے دونوں طرف قدرت کے مناظر مسلسل ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ اس طرح ٹرین گویا زندگی کے بڑے سفر کی ایک علامت بن گئی ہے جو نشانیوں سے بھری ہوئی ایک دنیا میں انسان طے کر رہا ہے۔ مگر جس طرح ٹرین کے مسافر اطراف کے مناظر سے بے خبر ہو کر اپنی ذاتی دلچسپیوں میں گم رہتے ہیں۔ اسی طرح انسان موجودہ دنیا میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ خدا کی بکھری ہوئی نشانیوں پر غور کرے۔

سورج اپنے روشن چہرہ کے ساتھ طلوع ہوتا ہے اور انسان کے اوپر اس طرح چمکتا ہے جیسے وہ کوئی پیغام سنانا چاہتا ہو۔ مگر وہ کچھ کہنے سے پہلے غروب ہو جاتا ہے۔ درخت اپنی ہری بھری شاخیں نکالتے ہیں، دریا اپنی موجوں کے ساتھ رواں ہوتا ہے۔ یہ سب بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ مگر انسان ان کے پاس سے گزر جاتا ہے۔ بغیر اس کے کہ ان کا کوئی بول اس کے کان میں پڑا ہو۔ آسمان کی بلندیاں، زمین کی رعنائیاں سب ایک عظیم "اجتماع" کے شرکا معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان میں سے ہر ایک خاموش کھڑا ہوا ہے۔ وہ انسان سے ہم کلام نہیں ہوتا۔

یہ عظیم کائنات کیا گونگے شاہکاروں کا عجائب خانہ ہے۔ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے پاس خدا کا ایک پیغام ہے اور اس کو وہ ابدی زبان میں نشر کر رہا ہے۔ مگر انسان دوسری آوازوں میں اتنا کھویا ہوا ہے کہ اس کو کائنات کا خاموش کلام سنائی نہیں دیتا۔ ایک سفر میں ہم ایک درمیانی اسٹیشن پر نماز پڑھنے کے لئے اترے۔ اسٹیشن کے آدمیوں سے پوچھا کہ "پچھم کس طرف ہے"۔ مگر کسی کے پاس اس سادہ سے سوال کا جواب نہ تھا۔ میں نے سوچا "سورج ایک روشن ترین حقیقت کی حیثیت سے روزانہ ان کے اوپر نکلتا ہے اور ڈوبتا ہے۔ مگر لوگ اپنے آپ میں اتنا گم ہیں کہ ان کو مشرق و مغرب کا پتہ نہیں۔ پھر وہ لطیف پیغام جو سورج اور اس کے کائناتی ساتھی اپنی خاموش زبان میں نشر کر رہے ہیں ان سے کیسے کوئی با خبر ہو سکتا ہے۔

ہماری ٹرین ایک اسٹیشن پر رکی۔ میں باہر آکر پلیٹ فارم پر کھڑا ہو گیا۔ سورج ابھی ابھی غروب ہوا تھا۔ ہرے بھرے درخت، ان کے پیچھے سرخی ملی ہوئی روشنی اور اس کے اوپر پھیلے ہوئے بادل، عجیب آفاقی حسن کا منظر پیدا کر رہے تھے۔ "ان میں یہ حسن ان کی بلندی نے پیدا کیا ہے"، میں نے سوچا۔ "مگر انسان اس بلندی تک جانے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ اس سطح پر نہیں جیتا جس سطح پر درخت جی رہے ہیں۔ وہ وہاں بسیرا نہیں لیتا جہاں روشنی اور بادل بسیرا لئے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس وہ سطحی مفادات میں جیتا ہے۔ وہ جھوٹی دوستی اور جھوٹی دشمنی میں سانس لیتا ہے۔ کائنات کا ہم سفر بننے کے بجائے اپنے آپ کو وہ اپنی ذات کے خول میں بند کر لیتا ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں جنتی فضائیں اس کا انتظار کر رہی ہیں۔ وہاں وہ اپنے آپ کو دوزخ کے ماحول میں ڈال دیتا ہے۔ انسانی دنیا کے بگاڑ کی ساری وجہ یہی ہے۔ اگر وہ بلند سطح پر جینے لگے تو اس کی زندگی میں بھی وہی حسن آجائے جو قدرت کے حسین مناظر میں دکھائی دیتا ہے۔ (۱۶ مارچ ۱۹۷۹)

خدا کی دنیا

جب آپ اپنے کمرہ میں ہوں تو آپ اس کی چھت کو ناپ کر معلوم کر سکتے ہیں کہ اس کی لمبائی کتنی ہے اور چوڑائی کتنی۔ مگر جب آپ کھلے میدان میں آسمان کے نیچے ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کی چھت کی لمبائی اور چوڑائی کو ناپنے کے لئے آپ کے تمام پیمانے ناکافی ہیں۔ یہی حال خدا کی پوری کائنات کا ہے۔ ایک بیج جس طرح بڑھ کر درخت کی ایک دنیا بناتا ہے اس کو کون بیان کر سکتا ہے۔ سورج کی روشنی، ہواؤں کا نظام، چڑیوں کے نغمے، پانی کے بہتے ہوئے چشمے اور اسی طرح کی بے شمار چیزیں جن کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں ان کو لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

سچائی اس سے زیادہ لطیف ہے کہ اس کو انسانی لفظوں میں بیان کیا جا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں زبان گنگ ہو جاتی ہے وہاں سے حقائق شروع ہوتے ہیں۔ جہاں الفاظ ساتھ نہیں دیتے وہاں سے معانی کا آغاز ہوتا ہے۔ خدا چپ کی زبان میں بول رہا ہے اور ہم اس کو شور کی زبان میں سننا چاہتے ہیں۔ ایسی حالت میں کیسے ممکن ہے کہ ہم خدا کی آوازوں کو سن سکیں۔ اس دنیا کی سب سے قیمتی باتیں وہ ہیں جو چپ کے بول میں نشر ہو رہی ہیں مگر جو لوگ صرف شور و غل کی بولیاں سننا جانتے ہوں وہ ان قیمتی باتوں سے اسی طرح ناآشنا رہتے ہیں جس طرح ایک بہرا شخص کسی عمدہ موسیقی سے۔

خدا کی دنیا بے حد حسین ہے۔ اس کے حسن کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ آدمی جب اس دنیا کو دیکھتا ہے تو بے اختیار اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ خدا کی اس ابدی دنیا کا باشندہ بن جائے —— وہ ہواؤں میں شامل ہو جائے وہ درختوں کی سرسبزیوں میں جا بسے۔ وہ آسمان کی بلندیوں میں کھو جائے۔ مگر انسان کی محدودیتیں اس کی اس خواہش کی راہ میں حائل ہیں۔ وہ اپنی محبوب دنیا کو دیکھتا ہے مگر اس میں شامل نہیں ہو پاتا۔ شاید جنت اسی کا نام ہے کہ آدمی کو اس کی محدودیتوں سے آزاد کر دیا جائے تاکہ وہ خدا کی حسین دنیا میں ابدی طور پر داخل ہو جائے۔

انسان نے جو تمدنی دنیا بنائی ہے وہ خدا کی دنیا سے کس قدر مختلف ہے۔ انسان کی بنائی ہوئی سواریاں شور اور دھواں پیدا کرتی ہیں مگر خدا کی دنیا میں روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سکنڈ کی رفتار سے چلتی ہے اور نہ کہیں شور ہوتا ہے۔ اور نہ دھواں۔ انسان انسانوں کے درمیان اس طرح رہتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے طرح طرح کی تکلیفیں پہنچتی رہتی ہیں، مگر خدا کی دنیا میں ہوا اس طرح گزرتی ہے کہ وہ کسی سے نہیں ٹکراتی۔ انسان اپنی غلاظت کو کاربن اور پسینہ اور بول و براز کی صورت میں خارج کرتا ہے مگر خدا نے اپنی دنیا میں جو درخت اگائے ہیں وہ اس کے برعکس اپنی کثافت کو آکسیجن کی صورت میں خارج کرتے ہیں اور پھول اپنی کثافت کو خوش بو کی صورت میں۔ انسان کے بنائے ہوئے تمام شہروں میں کوڑے کو ٹھکانے لگانا ایک ناقابل حل مسئلہ بنا ہوا ہے۔ مگر خدا کی بنائی ہوئی وسیع تر دنیا میں ہر روز بڑے پیمانہ پر "کوڑا" نکلتا ہے مگر کسی کو پتہ نہیں چلتا۔ کیوں کہ اس کو Recycle کر کے دوبارہ کائنات کے مفید اجزاء میں تبدیل کر دیا جاتا ہے ——

جو شخص حقیقت کی جھلک دیکھ لے وہ اس کے بیان سے اپنے کو عاجز محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس پر چپ طاری ہو جاتی ہے نہ یہ کہ وہ لفظوں کا سیلاب بہانے لگے۔

معبود کی طلب

روس کے خلائی مسافر اندرن نکولائیف اگست ۱۹۶۲ میں جب ایک خلائی پرواز سے واپس ہوئے تو ۲۱ اگست کو ماسکو کی ایک پریس کانفرنس میں انھوں نے کہا :

جب میں زمین پر اترا تو میرا جی چاہتا تھا کہ میں زمین کو چوم لوں

انسان جیسی ایک مخلوق کے لئے زمین پر جو بے حساب موافق سامان جمع ہیں وہ معلوم کائنات میں کہیں بھی نہیں۔ روسی خلاباز جب زمین سے دور خلا میں گیا تو اس نے پایا کہ وسیع خلا میں انسان کے لئے صرف حیرانی اور سرگشتگی ہے۔ وہاں انسان کے سکون اور حاجت برآری کا کوئی سامان نہیں۔ اس تجربہ کے بعد جب وہ زمین پر اترا تو اس کو زمین کی قیمت کا احساس ہوا، ٹھیک ویسے ہی جیسے شدید پیاس کے بعد آدمی کو پانی کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ زمین اپنے تمام موافق امکانات کے ساتھ اس کو اتنی محبوب معلوم ہوئی کہ اس کا جی چاہا کہ اس سے لپٹ جائے اور اپنے جذبات محبت کو اس کے لئے نثار کر دے۔

یہی وہ چیز ہے جس کو شریعت میں الٰہ بنانا کہا گیا ہے۔ آدمی خالق کو نہیں دیکھتا، اس لئے وہ مخلوق کو اپنا الٰہ بنا لیتا ہے۔ مومن وہ ہے جو ظاہر سے گزر کر باطن تک پہنچ جائے، جو اس حقیقت کو جان لے کہ یہ جو کچھ نظر آرہا ہے یہ کسی کا دیا ہوا ہے۔ زمین میں جو کچھ ہے وہ سب کسی برتر ہستی کا پیدا کیا ہوا ہے۔ وہ مخلوق کو دیکھ کر اس کے خالق کو پالے اور خالق کو اپنا سب کچھ بنالے۔ وہ اپنے تمام بہترین جذبات کو خدا کے لئے نثار کر دے۔

روسی خلاباز پر جو کیفیت زمین کو پاکر گزری وہی کیفیت مزید اضافہ کے ساتھ آدمی پر خدا کو پاکر گزرنا چاہئے۔ مومن وہ ہے جو سورج کو دیکھے تو اس کی روشنی میں خدا کے نور کو پالے۔ وہ آسمان کی وسعتوں میں خدا کی لامحدودیت کا مشاہدہ کرنے لگے۔ وہ پھول کی خوشبو میں خدا کی مہک کو پائے اور پانی کی روانی میں خدا کی بخشش کو دیکھے۔ مومن اور غیر مومن کا فرق یہ ہے کہ غیر مومن کی نگاہ مخلوقات میں اٹک کر رہ جاتی ہے اور مومن مخلوقات سے گزر کر خالق تک پہنچ جاتا ہے۔ غیر مومن مخلوقات کے حسن کو خود مخلوقات کا حسن سمجھ کر انھیں میں محو ہو جاتا ہے۔ مومن مخلوقات کے حسن میں خالق کا حسن دیکھتا ہے اور اپنے آپ کو خالق کے آگے ڈال دیتا ہے۔ غیر مومن کا سجدہ چیزوں کے لئے ہوتا ہے اور مومن کا سجدہ چیزوں کے خالق کے لئے۔

انسان کی تلاش

انسان کے اندر ایک عجیب خصوصیت ہے جو کسی دوسری مخلوق میں نہیں۔ وہ ہے لامتناہی تلاش کا جذبہ۔ ہر آدمی اپنے پیدائشی جذبہ کے تحت ایک ایسی نامعلوم چیز کی تلاش میں رہتا ہے جس کو اس نے پایا نہیں۔ کوئی بھی کامیابی اس کو اس طلب کے بارے میں مطمئن نہیں کرتی، کوئی بھی ناکامی اس کے اندر سے اس جذبہ کو فنا نہیں کر پاتی۔ فلاسفہ اس کو آئیڈیل کی طلب کہتے ہیں۔

یہ آئیڈیل کی طلب ہی تمام انسانی سرگرمیوں کی حقیقی اور آخری قوت محرکہ ہے۔ اگر یہ طلب نہ ہو تو دنیا کی تمام سرگرمیاں اچانک ٹھپ ہو کر رہ جائیں۔ انسانی ذہن کی یہی وہ زبردست طلب ہے جس کو فرائڈ نے غلط طور پر جنسی خواہش سے تعبیر کیا۔ ایڈلر نے اس کو غلط طور پر حصول طاقت کی خواہش قرار دیا۔ میک ڈوگل نے غلط طور پر کہا کہ یہ انسان کی تمام حیوانی جبلتوں کے مخلوطہ کا ایک پُراسرار نتیجہ ہے۔ مارکس نے اس کو غلط طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ انسانی زندگی کی معاشی خواہش ہے اور یہی اس کی تمام سرگرمیوں کو کنٹرول کرتی ہے۔ مگر ان توجیہات کو غلط قرار دینے کے لئے یہی واقعہ کافی ہے کہ یہ چیزیں جن لوگوں کو پوری طرح ملیں وہ بھی مطمئن نہ ہو سکے۔ ان کی اندرونی ہستی بھی اسی طرح بے چین رہی جس طرح ان چیزوں سے محروم رہنے والے بے چین نظر آتے ہیں۔

انسان ہزاروں برس سے اپنے اس آئیڈیل کو دنیا کی چیزوں میں تلاش کر رہا ہے۔ مگر کوئی بھی شخص اس اطمینان سے دوچار نہیں ہوا کہ اس نے اپنی تلاش کا مکمل جواب پالیا ہے۔ اس معاملہ میں بادشاہ یا امیر بھی اتنا ہی غیر مطمئن رہتا ہے جتنا کوئی بے زور اور مفلس آدمی۔ یہ لمبا تجربہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ "نظر آنے والی" دنیا میں آدمی کی تلاش کا جواب موجود نہیں۔ اس کا جواب اس "نظر نہ آنے والی" دنیا میں ہے جس کو آدمی محسوس تو کرتا ہے مگر دیکھ نہیں پاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ طلب خدا کی طلب ہے۔ آدمی جس آئیڈیل کو پانے کے لئے بے قرار رہتا ہے وہ خود اس کا خالق ہے۔ ہر آدمی جس چیز کی تلاش میں ہے وہ دراصل وہ خدا ہے جو اس کی روح میں سمایا ہوا ہے۔ ہر آدمی اپنی فطرت کے تحت مسلسل خدا کی جستجو میں رہتا ہے وہ اپنے اس اندرونی جذبہ کے تحت دنیا کی مختلف چیزوں کی طرف دوڑتا ہے اور سمجھتا ہے کہ شاید یہ چیز اس کی تلاش کا جواب ہو۔ مگر جب وہ اس کو پالیتا ہے اور قریب سے اس کا تجزیہ کرتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز وہ نہیں جس کی تلاش میں وہ سرگرداں تھا۔

سب کچھ عجیب ہے

۱۹۵۷ میں روس نے پہلا اسپٹنک خلا میں بھیجا تھا۔ امریکہ نے ۱۲ اپریل ۱۹۸۱ کو پہلی خلائی بس (کولمبیا) دو آدمیوں کے ساتھ بھیجی۔ وہ اس طرح بنائی گئی ہے کہ تقریباً سو بار خلائی سفر کے لئے استعمال ہو سکتی ہے۔

کولمبیا کا وزن ۷۵ ٹن ہے۔ اس کے بنانے میں تقریباً دس ارب ڈالر خرچ ہوئے ہیں اور وہ نو سال میں بن کر تیار ہوئی ہے۔ کولمبیا اپنے دو مسافروں کو لے کر خلا میں روانہ ہوئی۔ اس کی رفتار ۲۶ ہزار میل فی گھنٹہ تھی۔ وہ ۵۴ گھنٹہ خلا میں رہی۔ اس نے زمین کے گرد ۳۶ چکر لگا کر ۱۰ لاکھ میل طے کئے اور پھر ۱۴ اپریل کو واپس آگئی۔ واپسی کے وقت مخصوص راڈ اور راکٹوں کے ذریعہ اس کی رفتار کو گھٹا کر ۳۴۵ کیلو میٹر فی گھنٹہ کیا گیا۔ جب وہ ہوائی کرہ میں داخل ہوئی تو ہوا کی رگڑ سے گرم ہو کر سرخ اینٹ کی مانند ہو گئی۔ اس وقت اس کا بیرونی درجہ حرارت ۱۵۰۰ درجہ سنٹی گریڈ تھا۔ مگر کولمبیا کے بیرونی سمتوں میں ہر طرف گرمی روکنے والے ٹائل ۳۱ ہزار کی تعداد میں لگائے گئے تھے اس کی وجہ سے اس کے اندر کے دونوں مسافر محفوظ رہے۔

کولمبیا کو امریکہ کی ریاست کیلی فورنیا کے صحرا میں ایک ہوائی میدان میں اتارا گیا۔ وہ صرف ۱۰ سکنڈ کے فرق سے اپنے ٹھیک وقت پر اتر گئی۔ تقریباً دو لاکھ آدمی اس کے اترنے کا منظر دیکھنے کے لئے وہاں جمع تھے۔ اس کے علاوہ مختلف ملکوں کے کروڑوں آدمیوں نے اس واقعہ کو ٹیلی وژن پر دیکھا۔ کیلی فورنیا کے صحرا میں ۲۰ ٹرک اور کئی ہوائی جہاز اور دوسرے سامان موجود تھے تاکہ اترنے کے بعد وہ کولمبیا کی ہر ضرورت کو پورا کر سکیں۔ کولمبیا راکٹ کی طرح عمودی شکل میں اوپر گئی۔ وہ ایک تابع سیارہ کی طرح زمین کے گرد گھومی اور پھر گلائڈر (ہوائی جہاز) کی طرح زمین پر اتر آئی۔

کولمبیا کے دو مسافروں میں سے ایک مسٹر ینگ (John Young) تھے۔ ان کی عمر اس وقت ۵۰ سال ہے۔ ۵۴ گھنٹہ بے وزنی کی حالت میں رہنے کے بعد جب وہ اس حیران کن خلائی سفر سے واپس کیلی فورنیا پہنچے تو بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا ——— کیسا عجیب ہے اس طرح سے کیلی فورنیا آنا:

What a way to come to California

مسٹر ینگ خلائی سفر طے کر کے کولمبیا کے ذریعہ کیلی فورنیا میں اترے تو یہ بات ان کو بہت عجیب معلوم ہوئی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز عجیب ہے۔ کوئی سفر خواہ پیدل ہو یا سواری کے ذریعہ ہو، اس میں اتنے بے شمار کائناتی اسباب شامل ہوتے ہیں کہ آدمی ان کے بارے میں سوچے تو معمولی سفر بھی اس کو ایسا حیران کن معلوم ہو کہ وہ پکار اٹھے: میرا اپنے پیروں سے چل کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنا بھی اتنا ہی عجیب ہے جتنا کولمبیا کے ذریعہ خلائی سفر طے کر کے کیلی فورنیا کے صحرا میں اترنا۔ عام آدمی صرف کسی انوکھے واقعہ کے عجوبہ کو دیکھ پاتا ہے، عقلمند وہ ہے جو معمولی واقعات میں بھی اسی عجوبہ کو دیکھ لے۔

دریافت کی لذت

سورج ہماری زمین سے بارہ لاکھ گنا بڑا اور اس سے ساڑھے نو کروڑ میل دور ہے۔ پھر بھی سورج کی روشنی اور حرارت بے پناہ مقدار میں ہم تک پہنچ رہی ہے۔ یہ سورج کائنات کا نسبتاً ایک چھوٹا ستارہ ہے جو قریب ہونے کی وجہ سے ہم کو بڑا دکھائی دیتا ہے۔ اکثر ستارے سورج سے بہت زیادہ بڑے ہیں اور اس سے بہت زیادہ روشن بھی۔ روشنی اور حرارت کی یہ عظیم دنیائیں جن کو ستارہ کہا جاتا ہے بے شمار تعداد میں خلا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ کھرب ہا کھرب سال سے دہکنے کے باوجود ان کا حرارتی بھنڈار ختم نہیں ہوتا۔

ستاروں میں یہ بے پناہ قوت (Energy) کیسے پیدا ہوتی ہے۔ ہنس بیٹے (Hans Bethe) نے فلکیاتی طبیعیات کے میدان میں لمبی تحقیق کے بعد بتایا کہ اس کا راز کاربن سائیکل (Carbon Cycle) ہے۔ اسی تحقیق پر ۱۹۶۷ میں موصوف کو طبیعیات کا نوبل انعام دیا گیا۔

ڈاکٹر بیٹے (پیدائش ۱۹۰۶) نے جس دن کاربن سائیکل کی یہ سائنسی دریافت کی، وہ ان کے لئے جوش و مسرت کا ایک ناقابلِ بیان لمحہ تھا۔ ان کی بیوی روز بیٹے (Rose Bethe) کہتی ہیں کہ رات کا وقت تھا۔ ہم نیو میکسیکو کے صحرا میں تھے۔ صحرائی ماحول میں آسمان کے ستارے عجیب شان کے ساتھ چمک رہے تھے۔ روز بیٹے نے اوپر نگاہ کی اور حیران ہو کر کہا "آکاش کے ستارے کتنا زیادہ چمک رہے ہیں" ڈاکٹر بیٹے نے جواب دیا: کیا تم کو خبر ہے کہ اس وقت تم اس واحد انسان کے عین قریب کھڑی ہو جو یہ جانتا ہے کہ یہ ستارے آخر چمکتے کیوں ہیں۔

Do you realize, just now you are standing next to the only human who knows why they shine at all.

ہنس بیٹے کی دریافت اصل حقیقت کا بے حد جزئی پہلو تھا۔ اس نے ستاروں میں کاربن سائیکل کا عمل دریافت کیا۔ مگر سوال یہ ہے کہ خود کاربن سائیکل کا عمل ستاروں میں کیوں ہے۔ اس عظیم تر راز کو مومن خدا کی صورت میں دریافت کرتا ہے۔ ایمان باللہ ایک دریافت (Discovery) ہے جو تمام دریافتوں سے زیادہ بڑی ہے مگر کیسی عجیب بات ہے کہ سائنس داں کو معمولی دریافت ہوتی ہے تو وہ وفور جذبات سے بے قابو ہو جاتا ہے۔ مگر ایمان والے سب سے بڑی چیز — خدا کو دریافت کرتے ہیں اور ان کے اندر کوئی جذباتی ابال پیدا نہیں ہوتا۔ شاید خدا پر ایمان کے دعوے داروں نے ابھی تک خدا کو دریافت نہیں کیا۔

خدا کی موجودگی کا تجربہ

اپالو ۱۵ میں امریکہ کے جو تین خلاباز چاند پر گئے تھے، ان میں سے ایک کرنل جیمز اروِن (James Irwin) تھے۔ انھوں نے ایک انٹرویو میں کہا کہ اگست ۱۹۷۲ کا وہ لمحہ میرے لئے بڑا عجیب تھا جب میں نے چاند کی سطح پر قدم رکھا۔ میں نے وہاں خدا کی موجودگی (God's Presence) کو محسوس کیا۔ انھوں نے کہا کہ میری روح پر اس وقت وجدانی کیفیت طاری تھی اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے خدا بہت قریب ہو۔ خدا کی عظمت مجھے اپنی آنکھوں سے نظر آرہی تھی۔ چاند کا سفر میرے لئے صرف ایک سائنسی سفر نہیں تھا بلکہ اس سے مجھے روحانی زندگی نصیب ہوئی (ٹریبون ۲۷ اکتوبر ۱۹۷۲)

کرنل جیمز اروِن کا یہ تجربہ کوئی انوکھا تجربہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا نے جو کچھ پیدا کیا ہے وہ اتنا حیرتناک ہے کہ اس کو دیکھ کر آدمی خالق کی صناعیوں میں ڈوب جائے۔ تخلیق کے کمال میں ہر آن خالق کا چہرہ جھلک رہا ہے۔ مگر ہمارے گرد وپیش جو دنیا ہے اس کو ہم بچپن سے دیکھتے دیکھتے عادی ہو جاتے ہیں۔ اس سے ہم اتنا مانوس ہو جاتے ہیں کہ اس کے انوکھے پن کا ہم کو احساس نہیں ہوتا۔ ہوا اور پانی اور درخت اور چڑیا غرض جو کچھ بھی ہماری دنیا میں ہے سب کا سب حد درجہ عجیب ہے، ہر چیز اپنے خالق کا آئینہ ہے۔ مگر عادی ہونے کی وجہ سے ہم اس کے عجوبہ پن کو محسوس نہیں کر پاتے۔ مگر ایک شخص جب اچانک چاند کے اوپر اترا اور پہلی بار وہاں کے تخلیقی منظر کو دیکھا تو وہ اس کے خالق کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے تخلیق کے کارنامہ میں اس کے خالق کو موجود پایا۔ ہماری موجودہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں یہاں بھی "خدا کی موجودگی" کا تجربہ اسی طرح ہو سکتا ہے جس طرح چاند پر پہنچ کر کرنل اروِن کو ہوا۔ مگر لوگ موجودہ دنیا کو اس استعجابی نگاہ سے نہیں دیکھ پاتے جس طرح چاند کا ایک نیا مسافر چاند کو دیکھتا ہے۔ اگر ہم اپنی دنیا کو اس نظر سے دیکھنے لگیں تو ہر وقت ہم کو اپنے پاس "خدا کی موجودگی" کا تجربہ ہو۔ ہم اس طرح رہنے لگیں جیسے کہ ہم خدا کے پڑوس میں رہ رہے ہیں اور ہر وقت وہ ہماری نظروں کے سامنے ہے۔

اگر ہم ایک اعلیٰ درجہ کی مشین کو پہلی بار دیکھیں تو فی الفور ہم اس کے ماہر انجینئر کی موجودگی کو وہاں محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہم دنیا کو اور اس کی چیزوں کو گہرائی کے ساتھ دیکھ سکیں تو اسی وقت ہم وہاں خدا کی موجودگی کو پالیں گے۔ خالق ہم کو اس طرح نظر آئے گا کہ ہم خالق اور تخلیق کو ایک دوسرے سے جدا نہ کر سکیں۔

موجودہ دنیا میں انسان کی سب سے بڑی یافت یہ ہے کہ وہ خدا کو دیکھنے لگے، وہ اپنے پاس خدا کی موجودگی کو محسوس کرے۔ اگر آدمی کا احساس زندہ ہو تو سورج کی سنہری کرنوں میں اس کو خدا کا نور چمکتا ہوا دکھائی دے گا ہرے بھرے درختوں کے حسین منظر میں وہ خدا کا ردیف جھلکتا ہوا پائے گا۔ ہواؤں کے لطیف جھونکے میں اس کو لمسِ ربانی کا تجربہ ہوگا۔ اپنی ہتھیلی اور اپنی پیشانی کو زمین پر رکھتے ہوئے اس کو ایسا محسوس ہوگا گویا اس نے اپنا وجود اپنے رب کے قدموں میں ڈال دیا ہے۔ خدا ہر جگہ موجود ہے بشرطیکہ دیکھنے والی نگاہ آدمی کو حاصل ہو جائے۔

کائنات کا دستر خوان

قرآن میں ہے کہ اللہ آسمان وزمین کا نور ہے (نور) اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا تمام کی تمام خدائی صفات کا مظہر ہے۔ حساس قلب کو یہاں کی ہر چیز میں خدا کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ رزق خداوندی کا دستر خوان ہے۔

خدا پر ایمان اگر کسی آدمی کو وہ حساسیت دیدے جو خدا پر سچے ایمان سے پیدا ہوتی ہے تو کائنات میں فی الواقع اس کو ہر طرف خدا کا نور دکھائی دے گا۔ ہوا کے لطیف جھونکے جب اس کے جسم کو چھوئیں گے تو اس کو ایسا محسوس ہوگا کہ لمس خداوندی کا کوئی حصہ اسے مل رہا ہے۔ دریاؤں کی روانی میں اس کو رحمتِ حق کا جوش ابلتا ہوا نظر آئے گا۔ چڑیوں کے چہچہے جب اس کے کان میں رس گھولیں گے تو اس کے دل کے تاروں پر زمزمۂ خداوندی کے نغمے جاگ اٹھیں گے۔ پھولوں کی مہک جب اس کے مشام جان کو معطر کرے گی تو وہ اس کے لئے خدائی خوشبو میں نہانے کے ہم معنی بن جائے گی۔

ساری کائنات مومن کے لئے رزق روحانی کا دستر خوان ہے، ویسے ہی جیسے جنت اس کے لئے رزق مادی کا دستر خوان ہوگی۔ موجودہ دنیا کی تمام چیزوں کو اس طرح بنایا گیا ہے کہ ان کو دیکھ کر انسان عبرت حاصل کرے، ان کے ذریعہ وہ ان ربانی کیفیات کو پالے جو ان کے اندر ان لوگوں کے لئے رکھ دی گئی ہیں جو اللہ سے ڈرنے والے ہوں۔

ڈھاک ایک معمولی درخت ہے۔ مگر اس کے اوپر بے حد حسین پھول اُگتے ہیں۔ موسم خزاں کے پت جھڑ کے بعد اس کا درخت بظاہر ایک سوکھی لکڑی کی مانند، اس سے بھی زیادہ ایک سوکھی زمین پر کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک خاموش انقلاب آتا ہے۔ حیرت انگیز طور پر نہایت خوش رنگ پھول اس کی شاخوں میں کھل اٹھتے ہیں۔ سوکھی لکڑی کا ایک ڈھانچہ لطیف اور رنگین پھولوں سے ڈھک جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ایک محروم اور بے قیمت وجود کے لئے خدا نے خصوصی طور پر اپنی خوب صورت چھتری بھیج دی ہے۔

ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ کوئی بندۂ خدا اس کو دیکھ کر کہے —— "خدایا! میں بھی ایک ڈھاک ہوں، تو چاہے تو میرے اوپر حسین پھول کھلا دے۔ میں ایک ٹھنٹھ ہوں، تو چاہے تو مجھ کو سرسبز و شاداب کر دے۔ میں ایک بے معنی وجود ہوں، تو چاہے تو میری زندگی کو معنویت سے بھر دے۔ میں جہنم کے کنارے کھڑا ہوں تو چاہے تو مجھ کو جنت میں داخل کر دے۔

سچائی کو پانے والا

معانی کی دنیا خدا کے جلووں کی دنیا ہے۔ کون ہے جو خدا کے جلووں کو انسانی زبان میں بیان کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں الفاظ ختم ہو جاتے ہیں وہاں سے معانی کا آغاز ہوتا ہے۔ جب ہم کسی معنی کو بیان کرتے ہیں تو ہم اس کو بیان نہیں کرتے بلکہ اس کو کچھ گھٹا دیتے ہیں، اس کے اوپر ایک قسم کا لفظی پردہ ڈال دیتے ہیں۔

کسی بامعنی حقیقت کو کوئی آدمی صرف اس کے الفاظ سے سمجھ نہیں سکتا۔ ایک اندھا شخص کسی کے بتانے سے یہ نہیں جان سکتا کہ پھول کیا ہے خواہ اس نے پھول کے تعارف کے لئے انسانی زبان کے تمام الفاظ جمع کر دئے ہوں۔ اسی طرح ایک شخص جس نے معنوی حقیقتوں کو دیکھنے کی صلاحیت اپنے اندر نہ جگائی ہو وہ معنوی حقیقتوں سے باخبر نہیں ہو سکتا، خواہ ڈکشنری کے تمام الفاظ اس کے سامنے دہرا دئے جائیں، خواہ قاموس المعانی کی تمام جلدوں کو اسے پڑھا دیا جائے۔

ہدایت ہر آدمی کی فطرت کی آواز ہے مگر ہدایت اسی کو ملتی ہے جو اپنے اندر اس کی سچی طلب رکھتا ہو۔ جو اپنے اندر سچائی کی کھٹک لئے ہوئے ہو، سچائی جس کی ضرورت بن گئی ہو۔ جو سچائی کو پانے کے لئے اتنا بے قرار ہو کہ وہ اسی کی یاد لے کر سوتا ہو اور اسی کی یاد لے کر جاگتا ہو۔ جو آدمی اس طرح سچائی کا طالب بن جائے وہی سچائی کو پاتا ہے۔

ایسا شخص گویا ہدایت کا نصف راستہ طے کر چکا ہے۔ وہ اپنے اندر چھپے ہوئے عہد الست کی خدائی آوازوں کو سن رہا ہے۔ وہ اپنے اندر اس فطری صلاحیت کو بیدار کر چکا ہے جو معانی کی زبان کو سمجھتی ہے۔ ایسا شخص غیر حقیقی دنیا سے بے رغبتی کی وجہ سے حقیقی دنیا کے اتنا قریب آجاتا ہے کہ وہ فرشتوں کی سرگوشیوں کو سننے لگتا ہے۔

پیغمبر اس تلاش حق کی راہ میں آدمی کا مددگار ہے۔ پیغمبر کے ذریعہ حقیقت کا علم ملنے سے پہلے یہ تمام تجربات آدمی کے اندر مبہم اور مجہول انداز میں ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جب پیغمبر کی آواز اس کے اندر داخل ہوتی ہے تو وہ اس کی کتاب فطرت کی تفسیر بن جاتی ہے۔ وہ اپنے اندر چھپے ہوئے غیر ملفوظ اشارات کو ملفوظ زبان میں پالیتا ہے —— قرآن اور قرآن کو پڑھنے والا دونوں ایک دوسرے کا مثنیٰ بن جاتے ہیں۔ قرآن وہ بن جاتا ہے اور وہ قرآن۔

شکر کی اہمیت

چارلس رشٹر (Charless Richter) ایک امریکی سائنس داں ہیں۔ وہ زلزلہ کے ماہرین میں سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے ایک مخصوص پیمانہ دریافت کیا ہے جو آج دنیا بھر میں زلزلہ کی پیدا کردہ طاقت کو ناپنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کو رشٹر پیمانہ (Richter Scale) کہتے ہیں۔

چارلس رشٹر نے کیلی فورنیا کی انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی میں نصف صدی تک زلزلہ کا مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا: ان سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ زلزلہ کے خطرہ سے بچنے کے لئے آدمی کو کہاں بھاگنا چاہئے۔ کیلی فورنیا میں اس کا جواب بالکل سادہ ہے، وہ یہ کہ کہیں نہیں۔ امریکہ کی ۴۸ ریاستوں میں زلزلہ کا سب سے کم خطرہ فلوریڈا اور ساحلی ٹکساس میں ہے۔ مگر پھر میں سوال کروں گا کہ طوفان کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر علاقہ کے اپنے کچھ خطرات ہیں۔ اس لئے واحد بدل یہ ہے کہ آدمی کسی دوسرے مقام پر چلا جائے اور کسی دوسرے خطرہ کو گوارا کرے (ہندستان ٹائمس ۷، اکتوبر ۸۰)

آدمی کا یہ مزاج ہے کہ جو کچھ اس کو ملا ہوا ہے اس پر وہ مطمئن نہیں ہوتا اور جو کچھ نہیں ملا ہے اس کے پیچھے دوڑتا ہے۔ اسی مزاج کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر آدمی غیر مطمئن زندگی گزارتا ہے۔ کوئی بظاہر خوش نصیب آدمی جس کو لوگ قابل رشک سمجھتے ہیں وہ بھی اندر سے اتنا ہی غیر مطمئن ہوتا ہے جتنا وہ لوگ جو اس کو رشک کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ ہر شخص کو کوئی نہ کوئی نعمت ملی ہوئی ہے۔ مگر جس کے اندر شکر کی نفسیات نہیں ہوتی وہ غیر حاصل شدہ نعمت کی طرف متوجہ رہتا ہے اور جو نعمت ہر وقت اسے حاصل ہے اس کو حقیر سمجھتا ہے۔ ایسے آدمی کے اندر اپنے خدا کے لئے شکر کا جذبہ نہیں ابھرتا۔ وہ عین اسی چیز سے محروم رہ جاتا ہے جس کو اسے سب سے زیادہ اپنے سینہ کے اندر پرورش کرنا چاہئے۔

موجودہ دنیا کو خدا نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں مکمل راحت کسی کے لئے نہیں۔ ایک جغرافیہ کا آدمی وہاں کے مسائل سے گھبرا کر دوسرے جغرافیہ میں چلا جائے تو اس کو دوسرے جغرافیہ میں پہنچ کر معلوم ہوگا کہ یہاں بھی مسائل ہیں۔ اسی طرح اگر کم آمدنی والے کے مسائل ہیں تو زیادہ آمدنی والے کے بھی مسائل ہیں۔ اگر بے زور آدمی کے مسائل ہیں تو ان کے بھی مسائل ہیں جن کو زور و قوت حاصل ہے۔ امتحان کی اس دنیا میں کسی آدمی کو مسائل سے فرصت نہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ جن مسائل کے درمیان ہے ان کو گوارا کرتے ہوتے اپنا سفر جاری رکھے۔ اس کی توجہات کا مرکز خدا کی رضا حاصل کرنا ہو نہ کہ مسائل سے پاک زندگی کا مالک بننا، کیونکہ وہ تو آخرت سے پہلے ممکن ہی نہیں۔

ظاہر فریبی

ایر مارشل عبداللطیف ہوائی جہاز چلانے کا چالیس سالہ تجربہ رکھتے ہیں۔ ۲۵ اگست ۱۹۸۱ کو انھوں نے روسی ساخت کا آواز سے تیز چلنے والا لڑاکا جہاز مگ ۲۵ آزمائشی طور پر اڑایا۔ آدھ گھنٹہ تک پرواز کرنے کے بعد انھوں نے جہاز کو نیچے اتارا۔ ایر مارشل جب ہوائی جہاز سے باہر آئے تو انھوں نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا:

The flight made even the Himalayas look small

ہماری پرواز کے سامنے ہمالیہ پہاڑ بھی چھوٹا دکھائی دیتا تھا (ٹائمس آف انڈیا ۲۶ اگست ۱۹۸۱)

آواز سے تیز رفتار جہاز ہمالیہ کے اوپر اڑانیں بھر رہا ہو تو اس وقت جہاز کے اوپر بیٹھے ہوئے آدمی کو ہمالیہ واقعی حقیر دکھائی دیتا ہے، اور اپنی عظمت کا ایک عجیب احساس پیدا کرتا ہے مگر یہ غلط فہمی اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب کہ جہاز ہمالیہ کی کسی چوٹی سے ٹکرا جائے۔ چٹان کے معمولی ٹکراؤ سے بھی فی الفور جہاز میں آگ لگ جاتی ہے اور اچانک جہاز اور اس کا مسافر دونوں اس طرح راکھ کا ڈھیر بن جاتے ہیں جیسے کہ ان کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔

موجودہ دنیا میں کسی کو کوئی بڑائی ملتی ہے تو وہ بہت جلد غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ دنیا کی ہر بڑائی ایسی ہی ہے جیسے تیز رفتار ہوائی جہاز کے اوپر سے کسی آدمی کا پہاڑ کو دیکھنا۔ ایسے مسافر کو بظاہر اپنی سواری عظیم معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ ایک خیالی فریب کے سوا اور کچھ نہیں۔ حالات کا معمولی فرق بھی اس کو یہ بتانے کے لئے کافی ہو جاتا ہے کہ اس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔

دنیا میں کسی چیز کو پانے کے لئے جن بے شمار اسباب کی موافقت ضروری ہے ان کی فراہمی کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہ صرف خدا ہے جو تمام موافق اسباب کو یکجا کر کے کسی واقعہ کو ظہور میں لاتا ہے۔ تاہم اس سارے معاملہ پر ظاہری اسباب کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ آدمی سے یہ مطلوب ہے کہ وہ حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے خدا کی خدائی اور اس کے مقابلہ میں اپنی بندگی کا اعتراف کرلے۔ وہ بظاہر اپنی کوششوں سے پائے مگر اس کو خدا کی طرف سے آیا ہوا سمجھے۔ وہ بظاہر بڑا بنا ہوا ہو مگر اپنے کو چھوٹا یقین کرے۔ وہ بظاہر بلندی پر اڑ رہا ہو مگر اپنے کو پستی میں اترا ہوا محسوس کرے۔

آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ ظاہری فریب سے گزر کر اصل حقیقت کو پالے، یہاں کی ہر بڑائی کو چھوٹی بڑائی سمجھے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس فریب کا پردہ پھاڑنے میں کامیاب ہوتے ہوں۔

رہنما کی ضرورت

ہم کو بھوک لگتی ہے۔ ہم اپنی بھوک مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ثابت ہوتا ہے کہ یہاں کھانا موجود تھا جو ہماری بھوک کو مٹائے۔ ہم کو پیاس لگتی ہے۔ ہم اپنی پیاس کو بجھانے کے لئے عمل کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں پانی موجود تھا جو ہماری پیاس کو بجھائے۔ ایسا ہی معاملہ سچائی کا ہے۔ آدمی ہمیشہ سے سچائی کی تلاش میں ہے۔ یہ تلاش ہی اس بات کو ثابت کر رہی ہے کہ یہاں کوئی سچائی ہے جسے آدمی کو جاننا چاہئے۔ سچائی کھانے اور پینے سے زیادہ بڑی ہے۔ پھر جب ہماری چھوٹی طلب کا جواب اس دنیا میں موجود ہے تو ہماری بڑی طلب کا جواب یہاں کیوں نہ موجود ہوگا۔

سچائی کا سوال اپنی حقیقت کو جاننے کا سوال ہے۔ آدمی اچانک ایک روز پیدا ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ اس نے خود کو پیدا نہیں کیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک دنیا میں پاتا ہے جو اس سے الگ خود اپنے آپ قائم ہے۔ وہ پچاس سال یا سو سال اس دنیا میں رہ کر مر جاتا ہے۔ اس کو نہیں معلوم کہ وہ مر کر کہاں جاتا ہے۔ زندگی اور موت کی اسی حقیقت کو جاننے کا سوال سچائی کا سوال ہے۔

مگر ایک شخص جس طرح کھانا اور پانی کو جان لیتا ہے اسی طرح وہ سچائی کو نہیں جان سکتا۔ سچائی یقینی طور پر لامحدود اور ابدی ہے۔ سچائی اگر لامحدود اور ابدی نہ ہو تو وہ سچائی نہیں۔ مگر آدمی کی عقل اور اس کی عمر دونوں محدود ہیں۔ محدود عقل لامحدود سچائی تک نہیں پہنچ سکتی، محدود عمر کا آدمی ابدی سچائی کو دریافت نہیں کر سکتا۔

آدمی کی یہی نارسائی یہ ثابت کرتی ہے کہ سچائی کو جاننے کے لئے اسے پیغمبر کی ضرورت ہے۔ "پیغمبری" کیا ہے۔ پیغمبری کا مطلب یہ ہے کہ وہ سچائی جہاں تک آدمی اپنے آپ نہیں پہنچ سکتا تھا وہ خود آدمی تک پہنچ جائے۔ جس سچائی کو ہم اپنی کوششوں سے نہیں جان سکے، وہ خود ظاہر ہو کر اپنے بارے میں ہمیں بتا دے۔

حقیقت سے لوگوں کو پیشگی طور پر باخبر کرنے کے لئے اس کو خدا نے پیغمبر کے ذریعہ کھولا۔ موجودہ امتحان کی مدت ختم ہونے کے بعد اس کو براہ راست ہر آدمی پر کھول دیا جائے گا۔ پیغمبر نے بتایا کہ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ جس خدا کی اطاعت ساری کائنات جبر کے تحت کر رہی ہے اسی خدا کی اطاعت انسان ارادہ کے تحت کرنے لگے۔ وہ اپنے اختیار سے خود کو خدا کے آگے بے اختیار بنا لے۔ خدا کی دی ہوئی آزادی کے باوجود جو لوگ خدا کے محکوم بن جائیں ان کے لئے جنت ہے اور جو لوگ آزادی پا کر سرکش بن جائیں ان کے لئے جہنم۔

اندھیرا ختم ہو گا

خدا کی دنیا میں انسان بظاہر ایک تضاد ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں سورج ہر روز ٹھیک اپنے وقت پر طلوع ہوتا ہے وہاں انسان کا حال یہ ہے کہ آج ایک بات کہتا ہے اور کل وہ اس سے پھر جاتا ہے۔ جس دنیا میں سخت پتھروں کے اندر سے بھی پانی نکل پڑتا ہے وہاں ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ بدترین بے دردی کا ثبوت دیتا ہے۔ جس دنیا میں اس کا چاند تمام مخلوقات کے اوپر بلا امتیاز چمکتا ہے وہاں انسان ایک کے ساتھ کچھ سلوک کرتا ہے اور دوسرے کے ساتھ کچھ۔ جس دنیا کا ضمیر اپنے آپ کو پھولوں کی لطافت کی صورت میں ظاہر کرتا ہے وہاں انسان کانٹوں سے بھی زیادہ برے کردار کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جس دنیا میں ہواؤں کے جھونکے ہر طرف بے غرض خادم کی طرح پھر رہے ہیں وہاں انسان اس طرح رہتا ہے جیسے ذاتی غرض پوری کرنے کے سوا اس کا اور کوئی مقصد ہی نہیں۔ جس دنیا میں ایک درخت دوسرے درخت کو دکھ نہیں دیتا وہاں ایک انسان دوسرے انسان کو ستاتا ہے، ایک انسان دوسرے انسان کو برباد کر کے خوشی کے قہقہے لگاتا ہے۔

یہ سب کچھ اس دنیا میں ہر روز ہو رہا ہے مگر خدا یہاں مداخلت نہیں کرتا، وہ اس تضاد کو ختم نہیں کرتا۔ مخلوقات کے آفاقی آئینہ میں خدا کتنا حسین معلوم ہوتا ہے مگر انسانی زندگی کے الم ناک گوشہ میں اس کا چہرہ کتنا مختلف ہے۔ خدا کے سامنے زندگی کے واقعات آتے ہیں مگر اس کے اندر کوئی تڑپ پیدا نہیں ہوتی۔ خدا انسانوں کو ذبح ہوتے ہوئے دیکھتا ہے مگر اسے اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔ وہ کائنات کے سب سے زیادہ حساس باسیوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کا مشاہدہ کرتا ہے مگر اس کے خلاف اس کے اندر کوئی بے چینی نہیں ابھرتی۔ کیا خدا پتھر کی مورتی ہے، کیا وہ ایک انتہائی کامیاب اسٹیچو ہے جو سب کچھ دیکھتا ہے مگر اس کے بارہ میں اپنے ردعمل کا اظہار نہیں کرتا۔

اس سوال نے ہر زمانہ کے سوچنے والوں کو سب سے زیادہ پریشان کیا ہے۔ مگر یہ سوال صرف اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ مخلوقات کے بارے میں ہم خالق کی حکمت کو ملحوظ نہیں رکھتے۔ خالق کی اسکیم میں دنیا دارالامتحان ہے مگر ہم اس کو دارالجزا کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ جو کچھ کل کے دن پیش آنے والا ہے اس کو ہم چاہتے ہیں کہ آج ہی کے دن ہماری آنکھوں کے سامنے آجائے۔

جس طرح ہر روز رات کے اندھیرے کے بعد سورج کی روشنی پھیلتی ہے اسی طرح لازماً یہ بھی ہونے والا ہے کہ زندگی کا اندھیرا ختم ہو۔ ظالم اور مظلوم ایک دوسرے سے الگ کئے جائیں۔ سرکش انسانوں کی گردنیں توڑی جائیں اور سچے انسانوں کو ان کی سچائی کا انعام دیا جائے۔ یہ سب کچھ اپنی کامل ترین صورت میں ہو گا، مگر وہ موت کے بعد ہو گا نہ کہ موت سے پہلے۔

دنیا اور آخرت

انسان کی سب سے بڑی طلب کیا ہے۔ یہ کہ اس کو خوشیوں سے بھری ہوئی ایک زندگی حاصل ہو، یہی ہر زمانہ میں آدمی کا سب سے بڑا خواب رہا ہے۔ ہر آدمی اسی تمنا کو لے کر جیتا ہے۔ مگر ہر آدمی اس تمنا کی تکمیل کے بغیر مر جاتا ہے۔ سارے فلسفے اور نظریات، تمام انسانی کوششیں اسی ایک چیز کے گرد گھوم رہی ہیں۔ مگر آج تک انسان نہ فکری طور پر اس کو دریافت کر سکا اور نہ عملی طور پر اس منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہو سکا۔

اس ناکامی کی وجہ صرف ایک ہے۔ تمام لوگ اپنے خواب کی تعبیر اسی موجودہ دنیا میں پانا چاہتے ہیں۔ مگر ہزاروں برس کے تجربہ نے صرف ایک چیز ثابت کی ہے۔ یہ کہ موجودہ دنیا اس آرزو کی تکمیل کے لئے ناکافی ہے۔ موجودہ دنیا کی محدودیت، موجودہ دنیا میں انسانی آزادی کا غلط استعمال انتہائی فیصلہ کن طور پر اس میں مانع ہے کہ موجودہ دنیا انسانی خوابوں کی تعبیر بن سکے۔

ہم زندگی کو کامیاب بنانے کی طرف ابھی سفر کر رہے ہوتے ہیں کہ ہم کو موت آجاتی ہے۔ ہم مشینی ترقیاں وجود میں لاتے ہیں مگر صنعتی مسائل پیدا ہو کر ساری ترقی کو بے معنی بنا دیتے ہیں۔ ہم بے پناہ قربانیاں کر کے ایک سیاسی نظام کو وجود میں لاتے ہیں مگر اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے والوں کا بگاڑ اس کو عملاً بے نتیجہ بنا دیتا ہے۔ ہم اپنی پسند کے مطابق ایک زندگی بنانے کی کوشش کرتے ہیں مگر دوسرے انسانوں کا بغض، حسد، گھمنڈ، ظلم اور انتقام ظاہر ہو کر ہم کو الجھا لیتا ہے اور ہم اپنے آشیانہ کو خود اپنی آنکھوں سے بکھرتا ہوا دیکھ کر اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

یہ مسلسل تجربات ثابت کرتے ہیں کہ ہمارے خوابوں کی دنیا موجودہ زمینی حالات میں نہیں بن سکتی۔ اس کے لئے دوسری دنیا اور دوسرے حالات درکار ہیں۔ آدمی کی تمنائیں بجائے خود ایک حقیقی انسانی طلب ہیں۔ مگر اس طلب کی تکمیل کی جگہ موت کے بعد آنے والی اگلی دنیا ہے نہ کہ موت سے پہلے کی موجودہ دنیا۔

یہی واحد چیز ہے جو ہماری دنیا کی زندگی کو بامعنی بناتی ہے۔ اس کے بعد موجودہ دنیا جدوجہد کی دنیا بن جاتی ہے اور اگلی دنیا جدوجہد کا انجام پانے کی دنیا۔ اس کے بعد آدمی اپنی وہ منزل پا لیتا ہے جس کی طرف وہ مطمئن ہو کر بڑھ سکے۔ موجودہ دنیا کو منزل سمجھنے کی صورت میں آدمی بالآخر مایوسی اور انتشار ذہنی کے سوا اور کہیں نہیں پہنچتا۔ جب کہ آخرت کی دنیا کو منزل سمجھنے کا عقیدہ اس کے سامنے ابدی سکون کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں کھونے کے سوا اور کچھ نہ ہو وہاں وہی نظریہ صحیح ہو سکتا ہے جو کھونے میں پانے کا راز بتا رہا ہو۔

انسان کا المیہ

یہ جولائی کی ایک حسین صبح تھی۔ سورج ابھی نکلا نہیں تھا مگر آسمان کی وسعتوں میں اس کی پھیلتی ہوئی روشنی بتا رہی تھی کہ وہ جلد ہی نکلنے والا ہے۔ افق پر بادل کے ٹکڑوں کے پیچھے سے پھوٹتے والی سورج کی ابتدائی شعاعیں عجیب رنگ برنگ منظر پیش کر رہی تھیں۔ درختوں کی سرسبزی، چڑیوں کے چہچہے اور صبح کی ہوا کے لطیف جھونکے ماحول کی رعنائی میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔ میری زبان سے بے اختیار نکلا: خدا کی دنیا انتہائی حد تک بامعنی ہے، مگر وہ اس وقت انتہائی حد تک بے معنی ہو جاتی ہے جب کہ اس کے ساتھ آخرت کو شامل نہ کیا جائے۔

دنیا بے حد لذیذ ہے مگر اس کی لذتیں چند لمحے سے زیادہ باقی نہیں رہتیں۔ دنیا بے پناہ حد تک حسین ہے مگر اس کو دیکھنے والی آنکھ بہت جلد بے نور ہو جاتی ہے۔ دنیا میں عزت اور خوشی حاصل کرنا انسان کو کتنا زیادہ مرغوب ہے مگر دنیا کی عزت اور خوشی آدمی ابھی پوری طرح حاصل نہیں کر پاتا کہ اس پر زوال کا قانون جاری ہو جاتا ہے۔ دنیا میں وہ سب کچھ ہے جس کو انسان چاہتا ہے مگر اس سب کچھ کو حاصل کرنا انسان کے لئے ممکن نہیں، حتیٰ کہ اس خوش قسمت انسان کے لئے بھی نہیں جو بظاہر سب کچھ حاصل کر چکا ہو۔

انسان ایک کامل وجود ہے۔ مگر اس کا المیہ یہ ہے کہ اسی کے ساتھ وہ طرح طرح کی محدودیت کا شکار ہے اور بہت سے ناموافق حالات اس کو گھیرے ہوئے ہیں، انسان کی زندگی کامل زندگی ہونے کے باوجود اس وقت تک بے معنی ہے جب تک اس کو ایک ایسی دنیا نہ ملے جو ہر قسم کی محدودیت اور ناموافق حالات سے پاک ہو۔

خدا نے یہ کامل اور ابدی دنیا جنت کی صورت میں بنائی ہے۔ مگر یہ دنیا کسی کو اپنے آپ نہیں مل سکتی۔ اس آنے والی مکمل دنیا کی قیمت موجودہ نامکمل دنیا ہے۔ جو شخص اپنی موجودہ دنیا کو آنے والی دنیا کے لئے قربان کر سکے وہی آنے والی جنتی دنیا کو پائے گا۔ جو شخص اس قربانی کے لئے تیار نہ ہو وہ بھی اگرچہ موت کے بعد ابدی دنیا میں داخل ہوگا۔ مگر اس کے لئے یہ ابدی دنیا حسرتوں اور مایوسیوں کی دنیا ہوگی نہ کہ خوشیوں اور لذتوں کی دنیا۔

تضاد ختم ہوگا

میں آبادی سے دور ایک پہاڑ کے سامنے کھڑا تھا۔ سرسبز درخت میرے سامنے پھیلے ہوئے تھے۔ چڑیوں کی بولیاں کانوں میں آرہی تھیں۔ مختلف قسم کے جانور چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ یہ دیکھ کر میرے اوپر عجیب تاثر ہوا۔ کیسا عظیم اور کیسا کامل ہوگا وہ خدا جس نے اتنی بڑی دنیا بنائی اور پھر اس کو مجبور کردیا کہ وہ اس کے بتائے ہوئے نقشہ کی انتہائی پابند رہتے ہوئے حرکت کرے۔

کتنی حسین اور کتنی معصوم ہے یہ دنیا۔ یہاں چڑیاں وہی آوازیں نکالتی ہیں جو ان کے خالق نے انھیں سکھایا ہے۔ یہاں بلّی اور بکری بالکل اسی طرح اپنا اپنا رزق کھاتے ہیں جو پیدائشی طور پر ان کے لئے مقرر کردیا گیا ہے۔ یہاں درخت عین اسی منصوبہ کے مطابق اُگتے اور بڑھتے ہیں جو ازل سے ان کے مالک نے ان کے لئے متعین کردیا ہے۔ یہاں دریا ٹھیک اسی قانون کے مطابق رواں ہوتا ہے جو اس کے لئے ابدی طور پر مقدر ہے۔ خدا کی کائنات انتہائی کامل مجموعہ ہے اور یہاں کی ہر چیز ادنیٰ انحراف کے بغیر عین اسی طرح عمل کرتی ہے جس کا حکم اس کے خدا نے اسے دے رکھا ہے۔

مگر انسان کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ اپنے منھ سے ایسی آوازیں نکالتا ہے جس کی اجازت اس کے خدا نے اسے نہیں دی۔ وہ ایسی چیزوں کو اپنا رزق بناتا ہے جس سے اس کے مالک نے اس کو روک رکھا ہے۔ وہ اپنے سفر حیات کے لئے ایسے راستے اختیار کرتا ہے جہاں کاتب ازل نے ہمیشگی طور پر اس کے لئے لکھ دیا ہے کہ "یہاں سے گزرنا منع ہے"۔ انسان خدا کی کائنات کا بہت چھوٹا حصہ ہے۔ مگر وہ عظیم کائنات کے مجموعی نظام سے بغاوت کرتا ہے، وہ خدا کی اصلاح یافتہ دنیا میں فساد برپا کرتا ہے۔

یہ خدا کی بے تضاد دنیا میں تضاد کو دخل دینا ہے۔ یہ ایک ہم آہنگ مجموعہ میں بے آہنگی کا جوڑ لگانا ہے۔ یہ ایک حسین تصویر میں بدصورتی کا دھبہ ڈالنا ہے۔ یہ ایک کامل دنیا میں ناقص چیز کا اضافہ کرنا ہے۔ یہ فرشتوں کی سرگرمیوں کے ماحول میں شیطان کو سرگرم ہونے کا موقع دینا ہے۔

خدا کی قدرت اور اس کے حسن ذوق کا ثبوت جو عظیم تر کائنات میں ہر لمحہ نظر آتا ہے وہ اس گمان کی تردید کرتا ہے کہ یہ صورت حال اسی طرح باقی رہے۔ خدا کی قدرت یقیناً اس ظلم کی اجازت نہیں دے سکتی۔ خدا کا حسن ذوق ہرگز اس کو برداشت نہیں کرسکتا۔ ضرور ہے کہ وہ دن آئے جب کائنات کا یہ تضاد ختم ہو، خدا کی مرضی انسانی دنیا میں بھی اسی طرح پوری ہونے لگے جس طرح وہ بقیہ دنیا میں پوری ہو رہی ہے۔

آپریشن

فونکس (امریکہ) کے اسپتال میں ایک شخص نے داخلہ لیا۔ اس کے پیٹ میں نہایت سخت تکلیف تھی۔ ڈاکٹروں نے اس کو آپریشن کا کیس قرار دیا۔ چنانچہ اس کے پیٹ کا آپریشن کیا گیا۔ ڈاکٹروں نے حیرت انگیز طور پر پایا کہ اس کے پیٹ میں ایک ہیرا اٹکا ہوا ہے۔ یہی ہیرا اس کے ناقابل برداشت درد کا سبب تھا۔ ہیرا اس کے پیٹ سے نکال کر الگ کیا گیا۔ اس ہیرے کے ساتھ اب بھی قیمت کا پرچہ لگا ہوا تھا۔ اس پرچہ پر لکھا ہوا تھا —————— ۶۵۰۰ ڈالر۔

فوراً پولیس طلب کی گئی۔ پوچھ گچھ کے دوران مریض نے بتایا کہ اس کو انعام میں یہ ہیرا ملا تھا اور غلطی سے وہ اس کے پیٹ میں چلا گیا۔ تاہم بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اصل حقیقت کچھ اور ہے۔ یہ شخص ایک بار ہیرے کی ایک دکان میں داخل ہوا اور وہاں ایک ہیرا چرالیا۔ مگر جب وہ نکلنے کی کوشش کر رہا تھا تو دکان دار کو شبہ ہوا۔ اس نے آدمی کا پیچھا کیا۔ جب آدمی نے دیکھا کہ وہ پکڑا جانے والا ہے تو اس نے ہیرے کو جلدی سے منھ میں ڈالا اور نگل لیا۔ پولیس اس کی تلاش میں تھی مگر وہ ابھی تک پولیس کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ اس کے بعد فوراً اس کو گرفتار کر لیا گیا (ہندستان ٹائمس ۵ نومبر ۱۹۸۱ء)

ناجائز طور پر حاصل کیا ہوا ہیرا آدمی کے پیٹ میں ہضم نہ ہو سکا۔ وہ مجبور ہو گیا کہ چھپائے ہوئے ہیرے کو نکال کر باہر لائے اور خود اپنے جرم کا زندہ ثبوت بن جائے۔ یہی معاملہ شدید تر صورت میں لوگوں کے ساتھ آخرت میں ہوگا۔

دنیا میں آدمی ایک شخص کا حق دباتا ہے، وہ کسی کو وہ کلمۂ اعتراف دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا جو ازروئے واقعہ اسے دینا چاہئے۔ یہ سب کر کے بھی آدمی موجودہ دنیا میں کامیاب رہتا ہے۔ زور اور ہوشیاری کے ذریعہ وہ اپنے جرم کو چھپا لیتا ہے۔ مگر یہ صرف اس وقت تک ہے جب تک آدمی موت سے دوچار نہیں ہوتا۔ موت ہر آدمی کے لئے گویا قدرت کا آپریشن ہے جو اس کے اندر کو باہر کر دیتا ہے اور اس کے چھپے کو کھلا بنا دیتا ہے۔ جس طرح ہیرا آدمی کے پیٹ میں ہضم نہیں ہوتا۔ اسی طرح ظلم اور بے انصافی کو بھی خدا کی یہ کائنات کبھی قبول نہیں کرتی۔

آدمی پر وہ وقت آنے والا ہے جب کہ خدائی آپریشن اس کی حقیقت کو کھول دے اور اس کے لئے اپنے جرائم کے اقرار کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔

دو قسم کی روحیں

قرآن کی سورہ نمبر ۹۱ میں ارشاد ہوا ہے: قد افلح من زکّٰھا و قد خاب من دسّٰھا (وہ شخص کامیاب رہا جس نے اپنے آپ کو پاک کیا اور وہ شخص برباد ہوگیا جس نے اپنے آپ کو گندا کیا) موجودہ زندگی آخرت سے پہلے کا ایک امتحانی موقع ہے۔ جو شخص یہاں سے نیک اور ستھری روح لے کر آخرت کی دنیا میں پہنچے گا وہ وہاں جنت کی پرمسرت فضاؤں میں بسایا جائے گا اور جو شخص یہاں سے برائیوں میں لپٹی ہوئی روح لے کر آخرت کی دنیا میں جائے گا اس کو وہاں جہنم کے پُر عذاب ماحول میں دھکیل دیا جائے گا۔

موجودہ دنیا گویا خدا کی نرسری ہے۔ نرسری میں مختلف قسم کے پودے اگائے جاتے ہیں۔ زمین میں روئیدگی کی قوت بہت زیادہ ہے۔ چنانچہ یہاں طرح طرح کے پودے اگ آتے ہیں۔ مالی ان سب کی جانچ کرتا ہے۔ جو پودے غیر مطلوب پودے ہیں ان کو وہ کاٹ کر پھینک دیتا ہے۔ اور جو پودے اس کے مطلوب پودے ہیں ان کو اہتمام سے نکال کر لے جایا جاتا ہے تاکہ کسی باغ میں ان کو پھلنے پھولنے کے لئے نصب کر دیا جائے۔

موجودہ دنیا میں آدمی کے لئے بیک وقت دونوں مواقع کھلے ہوئے ہیں۔ وہ چاہے تو اپنی روح کو پاک کرے اور چاہے تو گندا کرتا رہے۔ کوئی وہ شخص ہے جو اللہ کی بڑائی کو مان کر اس کے آگے اپنے آپ کو جھکا دیتا ہے۔ اس کے سامنے جب کوئی حق آتا ہے تو وہ بے جھجک اس کا اعتراف کر لیتا ہے۔ لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے وہ ہمیشہ خیرخواہی اور انصاف کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ دوستی ہو یا دشمنی ہر حال میں وہ خدا کی مرضی پر چلتا ہے نہ کہ اپنے نفس کی مرضی پر۔ یہ وہ شخص ہے جس نے اپنی روح کو پاک کیا۔ اس کو اس کا خدا جنت کی پُر بہار دنیا میں بسائے گا۔

دوسرا آدمی وہ ہے جو خود اپنی بڑائی میں گم رہتا ہے۔ اس کے سامنے حق آتا ہے تو وہ اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ معاملات میں وہ سرکشی اور بے انصافی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ وہ اپنی مرضی پر چلتا ہے نہ کہ خدا کی مرضی پر۔ یہی وہ آدمی ہے جس نے اپنی روح کو گندا کیا۔ کائنات کا مالک اس کو اپنے پڑوس کے لئے قبول نہیں کرے گا۔ وہ اس کو جہنم میں دھکیل دے گا تاکہ وہ ابدی طور پر اپنے جرم کی سزا بھگتتا رہے۔

یہ تضاد کیوں

آسمان کے نیچے ہونے والے تمام واقعات میں سب سے زیادہ عجیب واقعہ یہ ہے کہ یہاں داداگیری کی صلاحیت کا استعمال ہے مگر سنجیدگی کی صلاحیت کا کوئی استعمال نہیں۔ یہاں شاطر آدمی اپنی پوری قیمت پالیتا ہے مگر شریف آدمی کو یہاں کوئی قیمت نہیں ملتی۔ ہر ایک کو خوش کرنے والی زبان بولنے والے کو یہاں خوب مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ مگر جو شخص غیر مصلحت پرستانہ انداز میں بولے اور حق کو حق اور باطل کو باطل کہے اس کو یہاں کوئی عزت اور مقبولیت حاصل نہیں ہوتی۔

یہ سب ایک ایسی دنیا میں ہورہا ہے جو اپنی ذات میں بالکل بے عیب ہے۔ جہاں درخت کمال کا ایک انتہائی خوش منظر نمونہ بنے ہوئے کھڑے ہیں۔ جہاں چڑیاں اس کے سوا کوئی اور بولی نہیں جانتیں کہ وہ حسن اور سلامتی کے نغمے گائیں۔ جہاں سورج اور چاند صرف روشنی بکھیرتے ہیں، ان کو تاریکی بکھیرنا اور اندھیرا پھیلانا نہیں آتا جہاں ستارے صرف اپنے اپنے مدار میں گھومتے ہیں، کوئی ستارہ دوسرے کے مدار میں داخل ہو کر وہاں اپنا جھنڈا گاڑنے کے لیے نہیں دوڑتا۔

انسان اور بقیہ کائنات میں یہ تضاد دیکھ کر کچھ لوگوں نے کہا کہ یہاں دو خدا ہیں، ایک نور کا اور دوسرا ظلمت کا۔ کسی نے کہا کہ یہاں کوئی خدا ہی نہیں۔ اگر کوئی خدا ہوتا تو دنیا میں یہ الل ٹپ نظام کیوں کر جاری رہتا۔

مگر صحیح یہ ہے کہ موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ مثالی دنیا اس کے بعد آنے والی ہے اور انسان کے سوا بقیہ کائنات اسی کا ایک ابتدائی تعارف ہے۔ امتحان کا یہ لازمی تقاضا تھا کہ انسان کو عمل کی پوری آزادی ہو۔ اسی آزادی کا یہ نتیجہ ہے کہ کوئی شخص سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے اور کچھ لوگ ٹیڑھے راستہ پر چلتے ہیں۔ مگر قیامت کے بعد جب مثالی دنیا قائم ہوگی تو وہاں وہی لوگ جگہ پائیں گے جنھوں نے موجودہ دنیا میں اس بات کا ثبوت دیا ہوگا کہ وہ مثالی انداز میں سوچنے اور مثالی کردار کے ساتھ زندگی گزارنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بقیہ تمام لوگ چھانٹ کر اسی طرح دور پھینک دیے جائیں گے جیسے کوڑا کرکٹ سمیٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔

تولے جانے سے پہلے تول لو

موجودہ دنیا میں چیزوں کے دو روپ ہیں۔ ایک ظاہر اور دوسرا باطن۔ یہاں ہر آدمی کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے باطنی وجود میں برائی لئے ہوئے ہو مگر زبان سے خوبصورت الفاظ بول کر اپنے کو اچھی صورت میں ظاہر کرے۔ قیامت اس لئے آئے گی کہ ظاہر و باطن کے اس فرق کو مٹا دے۔ قیامت کا زلزلہ تمام ظاہری پردوں کو پھاڑ دے گا تاکہ ہر انسان کے اوپر سے اس کا خول اتر جائے اور وہ اپنی اصلی اور حقیقی صورت میں سامنے آجائے۔

وہ دن بھی کیسا عجیب ہوگا جب حقیقتوں سے پردہ اٹھایا جائے گا۔ کتنے لوگ جو آج انصاف کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں اس دن وہ مجرموں کے کٹہرے میں نظر آئیں گے۔ کتنے لوگ جو آج اہم ترین شخصیت سمجھے جاتے ہیں اس دن وہ کیڑوں مکوڑوں سے بھی زیادہ حقیر دکھائی دیں گے۔ کتنے لوگ جن کے پاس آج ہر بات کا شاندار جواب موجود ہوتا ہے اس دن وہ ایسے بے جواب ہو جائیں گے جیسے کہ ان کے منہ میں الفاظ ہی نہیں۔

آج ایک شخص کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے پڑوسی کو ستائے اس کے باوجود اس کو دینداری کے اسٹیج پر بیٹھنے کے لئے نمایاں جگہ ملی ہوئی ہو۔ ایک شخص اپنی شان و شوکت دکھانے کے لئے سرگرم ہو پھر بھی وہ مجاہد اسلام کے نام سے شہرت پائے۔ ایک شخص اپنے اہل معاملہ سے بے انصافی کا طریقہ اختیار کرے اس کے باوجود امن و انصاف کے اجلاس میں اس کو صدارت کرنے کے لئے بلایا جائے۔ ایک شخص کی خلوتیں اللہ کی یاد سے خالی ہوں مگر اجتماعی مقامات پر وہ اللہ کے نام کا جھنڈا اٹھانے والا سمجھا جاتا ہو۔ ایک شخص کے اندر مظلوم کی حمایت کا کوئی جذبہ نہ ہو اس کے باوجود اخبارات کے صفحہ پر اس کو مظلوموں کے حامی کی حیثیت سے نمایاں کیا جا رہا ہو۔

ہر آدمی کی حقیقت خدا کے علم میں ہے مگر دنیا میں خدا لوگوں کی حقیقت چھپائے ہوئے ہے۔ آخرت میں وہ ہر ایک کی حقیقت کھول دے گا۔ وہ وقت آنے والا ہے جب کہ خدا کی ترازو کھڑی ہو اور ہر آدمی کو تول کر دکھا دیا جائے کہ کون کیا تھا اور کون کیا نہیں تھا۔ اس وقت کا آنا مقدر ہے۔ کوئی شخص نہ اس کو ٹال سکتا اور نہ کوئی شخص اپنے آپ کو اس سے بچا سکتا۔ کامیاب صرف وہ ہے جو آج ہی اپنے کو خدا کی ترازو میں کھڑا کرلے۔ کیونکہ جو شخص کل خدا کی ترازو میں کھڑا کیا جائے اس کے لئے بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

دھوکے بازی

برطانیہ کا ایک آرٹسٹ ہے جس کا نام اسٹیفن پریسٹ لی (Stephen Priestley) ہے۔ چیسٹر (انگلینڈ) میں ایک نیلام میں اس کی چار تصویریں رکھی گئیں۔ اس کی تصویروں کی قیمت صرف ایک پونڈ لگی۔ چنانچہ اسٹیفن پریسٹ لی (پیدائش ۱۹۵۴) کو ایک پونڈ کا چک دے دیا گیا۔

برطانوی آرٹسٹ ایک پونڈ کا چک پاکر بہت خفا ہوا۔ اس کے نزدیک اس کی ان چار تصویروں کی قیمت اس سے بہت زیادہ تھی جتنی قیمت خریدار کی طرف سے اس کو ملی۔ اس نے اپنے چک پر ایک پونڈ کی رقم کو ۱۰۰۱ پونڈ بنا دیا۔ وقتی طور پر اس نے بنک سے ۱۰۰۱ پونڈ کی رقم حاصل کرلی۔ مگر بہت جلد بنک والوں کو معلوم ہوگیا کہ اس نے بنک کے سامنے جو چک پیش کیا اس کی رقم جعلی تھی۔ اسٹیفن پریسٹ لی کو پولس کے حوالے کر دیا گیا۔ اب وہ جیل میں دھوکے بازی کے جرم میں سزا بھگت رہا ہے (ہندستان ٹائمس ۲ اکتوبر ۱۹۸۱)

اس واقعہ کا تعلق دنیا کے معاملہ سے ہے۔ مگر اسی میں آخرت کے معاملہ کی تصویر بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ بہت سے لوگ ہیں جن کے پاس صرف ایک پونڈ کا "عمل" ہے مگر وہ اس کو ایک ہزار ایک پونڈ دکھا کر کیش کرانا چاہتے ہیں —— کوئی دین کا ایک جزئی کام کر رہا ہے اور اسی کو وہ کل کام بتاتا ہے، کوئی ذاتی شہرت کے لئے سرگرم ہے اور اس کو خدمت دین کا عنوان دئے ہوئے ہے۔ کوئی قومی عصبیت کے تحت متحرک ہے اور اس کو اسلامی تحریک قرار دینا چاہتا ہے۔ کوئی اپنے سیاسی ذوق کی تسکین کر رہا ہے اور کہتا یہ ہے کہ وہ اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے اٹھا ہے۔ کوئی دولت وعزت کی خاطر کسی کے پیچھے دوڑتا ہے اور اس کو اسلامی اخوت کے پُرفخر لفظ سے یاد کرتا ہے۔ کوئی بحثوں اور مناظروں میں مصروف ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ احیاء اسلام کا مجاہد ہے۔ کوئی معمولی اصلاح کا کام کر رہا ہے اور اس کو دعوت و تبلیغ کا شاندار نام دئے ہوئے ہے۔

ان میں سے ہر شخص موجودہ دنیا میں بھرپور طور پر اپنی قیمت وصول کر رہا ہے۔ وہ اپنے معمولی عمل کو بہت بڑا عمل ثابت کرکے خوش ہے۔ مگر موت ان ساری خوش فہمیوں کو باطل کر دے گی۔ موت کے بعد آنے والی عدالت میں ایسے تمام لوگ دھوکے بازی کے مجرم قرار پائیں گے، خواہ آج کی دنیا میں وہ اپنے ایک پونڈ کے چک سے ایک ہزار ایک پونڈ کی رقم کیش کرانے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔

موت کو یاد کرو

کچھوا پانچ سو سال تک زندہ رہتا ہے۔ درخت ایک ہزار سال تک زمین پر کھڑا رہتا ہے۔ پہاڑ اور دریا کروروں سال تک اپنی شان کو باقی رکھتے ہیں۔ مگر انسان کی عمر پچاس سال یا سو سال سے زیادہ نہیں۔ انسان جو بظاہر تمام مخلوقات میں سب سے زیادہ اشرف اور افضل ہے وہ سب سے کم زندگی پاتا ہے۔

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ یہ مختصر زندگی بھی ناکامیوں کی ایک مسلسل داستان کے سوا اور کچھ نہیں۔ آدمی کی زندگی غم اور دکھ سے اتنا زیادہ بھری ہوئی ہے کہ خوشی کے لمحات غفلت کی چند جھلکیوں سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے۔ بیماری، حادثہ، بڑھاپا، امیدوں کی مسلسل پامالی کا نام زندگی ہے اور بالآخر اس قسم کے دردناک ایام گزارتے ہوئے ایک دن موت کے آگے شکست کھا جانا۔

ایک غریب کو یہ حسرت ہوتی ہے کہ اس کے پاس بڑا مکان نہیں۔ اس کے پاس ضروریات زندگی کے لئے کافی پیسہ نہیں۔ مگر دوسری طرف ان لوگوں کا حال بھی بہت زیادہ مختلف نہیں جن کو ایک غریب آدمی رشک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ دولت مند آدمی کے لئے پیسہ ہونا اس سے زیادہ بڑے مسائل پیدا کرتا ہے جو غریب کو پیسہ نہ ہونے کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ ایک مشہور آدمی جس کے گرد انسانوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہو اندر سے اس قدر بے چین ہوتا ہے کہ رات کو گولی کھائے بغیر اسے نیند نہیں آتی۔ غرض اس دنیا میں ہر آدمی دکھی ہے، کوئی ایک صورت میں اور کوئی دوسری صورت میں۔

بالفرض کوئی شخص ناموافق حالات سے بچ جائے اور اس خوش قسمتی کو حاصل کرے جس کو سکھ اور چین کہتے ہیں تب بھی کتنے دن تک۔ اگر کوئی شخص اتفاقی اسباب کے تحت خوشیوں کا خزانہ اپنے گرد جمع کرے تو وہ بھی بس صبح سے شام تک کے لئے ہوگا۔ اس کے بعد اچانک موت کا بے رحم فرشتہ آئے گا اور اس کو اس طرح پکڑ لے گا کہ نہ اس کی دولت اس کو بچا سکے گی اور نہ اس کی فوج۔ ہوائی جہاز کے مسافر پر بھی موت اسی طرح قابو پا لیتی ہے جس طرح ایک پیدل چلنے والے آدمی پر۔ وہ عالی شان محلوں میں بھی اسی طرح فاتحانہ داخل ہو جاتی ہے جس طرح ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں۔ موت آدمی کی سب سے بڑی مجبوری ہے۔

موت آدمی کو یاد دلاتی ہے کہ وہ آج سے اوپر اٹھ کر سوچے۔ وہ کامیابی کو زندگی کے اُس پار تلاش کرے۔ کامیاب وہ ہے جو موت سے یہ سبق لے لے۔ جو شخص یہ سبق لینے سے محروم رہے اس کی خوشیوں کے چراغ بہت جلد بجھ جائیں گے۔ وہ اپنے کو ایک ایسے بھیانک اندھیرے میں پائے گا جہاں وہ ابدالآباد تک ٹھوکریں کھاتا رہے اور کبھی اس سے نکل نہ سکے۔

کچھ کام نہ آئے گا

ایک صاحب سے بات ہو رہی تھی۔ ۲۰ سال پہلے وہ معمولی میکنک تھے۔ اب وہ تقریباً دو درجن مشینوں کے مالک ہیں۔ ان کے کئی کارخانے چل رہے ہیں۔ میں نے ایک ملاقات میں کہا: آپ نے ماشاء اللہ اپنے کاروبار میں کافی ترقی کی ہے۔ انھوں نے خوشی اور اعتماد کے لہجہ میں جواب دیا: اتنی کمائی کرلی ہے کہ بچے کچھ نہ کریں تب بھی وہ سو سال تک آرام سے کھاتے رہیں گے۔

یہ ایک انتہائی مثال ہے۔ تاہم موجودہ زمانہ میں ہر آدمی کا یہی حال ہو رہا ہے۔ ہر آدمی اپنے اپنے دائرہ میں یہی یقین لئے ہوئے ہے کہ اس نے اپنے معاملات کو درست کرلیا ہے۔ اسے اب کسی خطرہ کی ضرورت نہیں۔ کم از کم "سو سال" تک تو بالکل نہیں۔

کوئی اپنے بڑوں کو خوش کر کے مطمئن ہے۔ کسی کو یہ فخر ہے کہ اس نے اپنے قانونی کاغذات کو پکا کرلیا ہے۔ کسی کو اپنے قابل اعتماد ذریعۂ معاش اور اپنے بینک بیلینس پر ناز ہے۔ کوئی اپنے بازوؤں کی قوت اور اپنی دادا گیری پر بھروسہ کئے ہوئے ہے۔ کسی کے پاس کچھ نہیں تو جس کے پاس ہے وہ اس سے خوشامد اور مصالحت کا تعلق قائم کر کے سمجھتا ہے کہ اس نے بھی ایک چھتری حاصل کرلی ہے، اب اس کا کچھ بگڑنے والا نہیں۔

مگر بھونچال جب آتا ہے تو اس قسم کے تمام بھروسوں کو باطل ثابت کر دیتا ہے۔ بھونچال کے لئے پکے محل اور کچی جھونپڑیوں میں کوئی فرق نہیں۔ طاقت ور اور کمزور دونوں اس کے نزدیک یکساں ہیں۔ وہ بے سہارا لوگوں کو بھی اسی طرح تہس نہس کر دیتا ہے جس طرح ان لوگوں کو جو مضبوط سہارا پکڑے ہوئے ہیں۔ بھونچال یہ یاد دلاتا ہے کہ اس دنیا میں آدمی کس قدر بے بس ہے۔

یہ بھونچال خدا کی ایک پیشگی نشانی ہے جو بتاتی ہے کہ ہر ایک کے لئے بالآخر کیا ہونے والا ہے۔ بھونچال ایک قسم کی چھوٹی قیامت ہے جو بڑی قیامت کا پتہ دیتی ہے۔ جب ہولناک گڑگڑاہٹ لوگوں کے اوسان خطا کر دیتی ہے۔ جب مکانات تاش کے پتوں کی طرح گرنے لگتے ہیں۔ جب زمین کا نچلا حصہ اوپر آجاتا ہے اور جو اوپر تھا وہ نیچے دفن ہو جاتا ہے۔ اس وقت انسان جان لیتا ہے کہ وہ قدرت کی طاقتوں کے آگے بالکل عاجز ہے۔ اس کے لئے صرف یہ مقدر ہے کہ بے بسی کے ساتھ اپنی بربادی کا تماشہ دیکھے اور اس کے مقابلہ میں کچھ نہ کر سکے۔

قیامت کا بھونچال موجودہ بھونچال سے اربوں اور کھربوں گنا زیادہ سخت ہوگا۔ اس وقت سارے سہارے ٹوٹ جائیں گے۔ ہر آدمی اپنی ہوشیاری بھول جائے گا۔ عظمت کے تمام منارے اس طرح گر چکے ہوں گے کہ ان کا کہیں وجود نہ ہوگا۔ اس دن وہی سہارے والا ہوگا جس نے موجودہ چیزوں کو بے سہارا سمجھا تھا۔ اس دن وہی کامیاب ہوگا جس نے اس وقت خدا کو اپنایا تھا جب سارے لوگ خدا کو بھول کر دوسری دوسری چھتریوں کی پناہ لئے ہوئے تھے۔

شناختی کارڈ کے بغیر

دیہات کا ایک لڑکا شہر آیا۔ سڑک پر چلتے ہوئے وہ ایک اسکول کی عمارت کے سامنے سے گزرا۔ یہ اسکول کے جشن کا دن تھا۔ سیکڑوں لڑکے ایک کھڑکی کے سامنے لائن لگائے ہوئے تھے۔ دیہاتی لڑکے نے قریب جاکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کھڑکی پر مٹھائی تقسیم ہو رہی ہے۔ اور ہر ایک اس کو لے کر باہر آرہا ہے۔ دیہاتی لڑکا بھی لائن میں شامل ہوکر کھڑا ہوگیا۔ وہ لائن کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ جب میری باری آئے گی تو مٹھائی کا پیکیٹ اسی طرح میرے ہاتھ میں بھی ہوگا جس طرح وہ دوسروں کے ہاتھ میں دکھائی دے رہا ہے۔

لائن ایک کے بعد ایک آگے بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ دیہاتی لڑکا کھڑکی کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے خوش خوش اپنا ہاتھ کھڑکی کی طرف بڑھایا۔ اتنے میں کھڑکی کے پیچھے سے آواز آئی "تمھارا شناختی کارڈ"۔ لڑکے کے پاس کوئی کارڈ نہ تھا۔ وہ کارڈ پیش نہ کرسکا۔ چنانچہ وہ کھڑکی سے ہٹا دیا گیا۔ اب لڑکے کو معلوم ہوا کہ یہ مٹھائی ان لوگوں کو تقسیم ہو رہی تھی جو سال بھر اسکول کے طالب علم تھے نہ کہ کسی ایسے شخص کے لئے جو اچانک کہیں سے آکر کھڑکی پر کھڑا ہوگیا ہو۔

ایسا ہی کچھ معاملہ آخرت میں پیش آنے والا ہے۔ آخرت کا دن خدائی فیصلہ کا دن ہے۔ اس دن سارے لوگ خدا کے یہاں جمع کئے جائیں گے۔ وہاں لوگوں کو انعامات تقسیم ہو رہے ہوں گے۔ مگر پانے والے صرف وہ ہوں گے جنھوں نے اس دن کے آنے سے پہلے پانے کا استحقاق پیدا کیا ہو، جو اپنا "شناختی کارڈ" لے کر وہاں حاضر ہوئے ہوں۔

وہ وقت آنے والا ہے جب کسی آنکھ کے لئے سب سے زیادہ پُرکیف منظر یہ ہوگا کہ وہ اپنے رب کو دیکھے۔ کسی ہاتھ کے لئے سب سے زیادہ لذیذ تجربہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے رب کو چھوئے۔ کسی سر کے لئے سب سے زیادہ عزت اور فخر کی بات یہ ہوگی کہ وہ اس کو رب العالمین کے آگے جھکادے۔ مگر یہ سب کچھ صرف ان لوگوں کے لئے ہوگا جنھوں نے اس دن کے آنے سے پہلے اپنے کو خدا کی نظر عنایت کا مستحق ثابت کیا ہو۔ بقیہ لوگوں کے لئے ان کی غفلت ان کے اور ان کے خدا کے درمیان حائل ہوجائے گی۔ وہ خدا کی دنیا میں پہنچ کر بھی خدا کو نہ دیکھیں گے۔ وہ پانے والے دن بھی اپنے لئے کچھ پانے سے محروم رہیں گے۔

جنت والے

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اہل ایمان کو جس جنت میں داخل کیا جائے گا اس کی معرفت انھیں اسی دنیا میں کرائی جا چکی ہوگی (ویدخلھم الجنۃ عرفھا لھم، محمد) دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے کہ جنت کا رزق اس رزق کے مشابہ ہوگا جس کی توفیق انھیں دنیا کی زندگی میں ملی تھی (واتوا بہ متشابھا، بقرہ) حدیث میں کہا گیا ہے کہ جنت دوزخ دراصل انسان ہی کے اعمال ہیں جو آدمی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں (انما ھی اعمالکم ترد الیکم)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں داخلہ کا آغاز اِسی دنیا سے ہو جاتا ہے۔ جنتی انسان اپنی جنت کو اسی دنیا میں پالیتا ہے۔ گویا کہ جنت کا ایک مثنیٰ اسی دنیا میں ہے اور آخرت کی جنت میں وہی شخص جائے گا جس نے دنیا میں جنت کے اس مثنیٰ کو پالیا ہو۔ جنت کا یہ دنیوی مثنیٰ گویا نقد انعام ہے جو اصل انعام سے پہلے اس کی ایک ابتدائی علامت کے طور پر دے دیا جاتا ہے۔

یہ جنتی کون ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے دنیا میں ان کیفیات کا تجربہ کیا ہو جو آخرت میں اس کو جنت کا مستحق بنانے والی ہیں جس کے رونگٹے کھڑے ہو کر اس کو خدائی محاسبہ کا احساس دلا چکے ہوں۔ جس کے قلب پر ٹکڑے کر دینے والی تجلیات کے نزول نے اس کو قربت خداوندی سے آشنا کیا ہو۔ جس نے بغض و انتقام کے جذبات کو اپنے اندر کچل کر عفو خداوندی کا مشاہدہ کیا ہو۔ جس نے اپنے ندامت کے آنسوؤں میں وہ منظر دیکھا ہو جب کہ ایک مہربان آقا اپنے خادم کے اعتراف قصور پر اس سے درگزر فرماتا ہے۔ جس پر یہ لمحہ گزرا ہو کہ ایک شخص پر قابو پانے کے باوجود وہ اس کو اس لئے چھوڑ دے کہ اس کا خدا بھی اس دن اسے چھوڑ دے جب کہ وہ اس سے زیادہ عجز کی حالت میں ہوگا۔ جو ایک امر حق کے آگے اس طرح گر پڑے جیسے لوگ آخرت میں خدا کو دیکھ کر ڈھ پڑیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ مومن جنت کا ایک پھول ہے۔ وہ موجودہ دنیا میں آنے والی دنیا کا ایک ابتدائی شگوفہ ہے۔ مومن پر وہ سارے تجربات اسی دنیا میں گزر جاتے ہیں جو دوسروں پر موت کے بعد گزرنے والے ہیں۔ آدمی کی زندگی میں مختلف قسم کے جو حالات پیش آتے ہیں انھیں میں ہر آدمی کی جنت اور جہنم چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ ان حالات میں شیطانی ردعمل پیش کر کے کوئی شخص جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے اور ملکوتی ردعمل پیش کر کے کوئی شخص جنت کا۔

پلاسٹک کے پھل اور پھول

آجکل پلاسٹک کے پھول اور پھل بنتے ہیں۔ دیکھنے میں بالکل پھول اور پھل کی طرح معلوم ہونگے لیکن سونگھئے تو اس میں پھول کی خوشبو نہیں اور منھ میں ڈالئے تو اس میں پھل کا مزہ نہیں۔ اسی طرح موجودہ زمانہ میں دین داری کی عجیب وغریب قسم وجود میں آئی ہے۔ بظاہر اس میں دھوم کی حد تک دین دکھائی دے گا۔ لیکن قریب سے تجربہ کیجئے تو وہی چیز موجود نہ ہوگی جو دین کا اصل خلاصہ ہے: اللہ کا ڈر اور انسان کا درد ——— پلاسٹک کے دور میں شاید دین داری بھی پلاسٹک کی دین داری بن کر رہ گئی ہے۔

لوگ دین دار ہیں مگر کوئی شخص اپنی غلطی ماننے کے لئے تیار نہیں۔ کوئی شخص اللہ کی خاطر اپنی اکڑ ختم کرنا نہیں جانتا۔ ذاتی فائدہ کی خاطر بے شمار لوگ اپنے اختلاف اور شکایت کو بھول کر دوسروں سے جڑے ہوئے ہیں مگر خدا کی زمین پر کوئی نہیں جو خدا کے لئے اپنے اختلاف وشکایات کو بھول کر دوسرے سے جُڑ جائے۔

دین اصلاً اس کا نام ہے کہ آدمی اس حقیقت کو پاجائے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ اسی نے تمام چیزوں کو بنایا ہے۔ وہ موت کے بعد تمام انسانوں کو جمع کر کے ان سے حساب لے گا اور پھر ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق یا تو ابدی جنت میں داخل کرے گا یا ابدی جہنم میں۔ یہ حقیقت اتنی سنگین ہے کہ اگر وہ فی الواقع کسی کے دل و دماغ میں اتر جائے تو اس کی زندگی کچھ سے کچھ ہوجاتی ہے۔ وہ ان تمام چیزوں کے بارے میں انتہائی حساس ہوجاتا ہے جو آدمی کو جہنم کی آگ میں پہنچانے والی ہیں اور ان تمام چیزوں کا انتہائی مشتاق ہوجاتا ہے جو آدمی کو جنت کے باغوں کا مستحق بنانے والی ہیں۔ وہ ہر چیز سے زیادہ اللہ سے ڈرنے لگتا ہے اور ہر چیز سے زیادہ اللہ سے محبت کرنے لگتا ہے۔ وہ اپنی انفرادی ہستی کو خدا کی عظیم تر ہستی میں کھو دیتا ہے۔

خدا اور آخرت کے بارے میں اس کی بڑھی ہوئی حساسیت اس کو بندوں کے بارے میں بھی انتہائی محتاط اور ذمہ دار بنا دیتی ہے۔ ایک انسان سے بدخواہی کرتے ہوئے اسے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ اپنے آپ کو جہنم کے گڑھے میں گرا رہا ہے۔ بندوں کے ساتھ سرکشی کا سلوک کرتے ہوئے وہ اس طرح ڈرنے لگتا ہے جیسے کہ ہر آدمی اپنے ساتھ جہنم کے فرشتوں کی فوج لئے ہوئے ہے۔ اپنے صاحب معاملہ افراد سے بے انصافی کرنا اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس نے اپنے آپ کو جہنم کے گہرے غار میں دھکیل دیا ہے۔ اب کوئی انسان اس کی نظر میں محض ایک انسان نہیں ہوتا بلکہ ہر انسان ایک ایسا وجود ہوتا ہے جس کے ساتھ خدا اپنے تمام فرشتوں کے ساتھ کھڑا ہوا ہو۔

اپنا احتساب

کھیت میں جب فصل بوئی جاتی ہے تو فصل کے ساتھ طرح طرح کے گھاس پھوس بھی اگتے ہیں۔ گیہوں کے ہر پودے کے ساتھ ایک خودرو گھاس بھی نکلتی ہے اور سرسوں کے ہر درخت کے ساتھ ایک نکما پودا بھی بڑھنا شروع ہوتا ہے۔ یہ اپنے آپ نکلنے والے گھاس پھوس فصل کو بہت نقصان پہنچاتے ہیں، وہ کھیت کے پانی اور کھاد میں حصہ دار بن جاتے ہیں۔ وہ اصلی فصل کو بھرپور طور پر بڑھنے نہیں دیتے۔

کسان اگر ان خودرو پودوں کو بڑھنے کے لئے چھوڑ دے تو وہ ساری فصل کو خراب کر دیں۔ کھیت میں دانہ ڈال کر کسان نے جو امیدیں قائم کی ہیں وہ کبھی پوری نہ ہوں۔ اس لئے کسان یہ کرتا ہے کہ وہ کھیت میں نلائی (Weeding) کا عمل کرتا ہے۔ وہ ایک ایک خودرو پودے کو نکالتا ہے تاکہ کھیت کو ان سے صاف کر دے اور فصل کو بڑھنے کا پورا موقع ملے۔ ہر کسان جانتا ہے کہ کھیت میں دانہ ڈالنا ہی کافی نہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ فصل کے ساتھ اگنے والی دوسری گھاسوں کو چن چن کر نکال دیا جائے، ورنہ کھیت سے مطلوبہ فصل حاصل نہیں ہو سکتی۔

یہ نلائی کا عمل جو کھیت میں کیا جاتا ہے یہی انسانی زندگی میں بھی مطلوب ہے اور اس کا شرعی نام محاسبہ ہے۔ انسان کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اس کو جب کوئی خوبی کی چیز حاصل ہوتی ہے تو اسی کے ساتھ ایک "نکمی گھاس" بھی اس کے اندر سے اگنا شروع ہوتی ہے۔ اس نکمی گھاس کو جاننا اور اس کو اپنے اندر سے نکال پھینکنا انتہائی ضروری ہے۔ ورنہ آدمی کا انجام وہی ہوگا جو بغیر نلائی کئے ہوئے کھیت کا۔

کسی کو اسباب و وسائل ہاتھ آجائیں تو اس کے اندر بے جا خود اعتمادی کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اقتدار مل جائے تو گھمنڈ پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح دولت کے ساتھ بخل، علم کے ساتھ فخر، مقبولیت کے ساتھ ریا اور سماجی عزت کے ساتھ نمائش کی نفسیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ تمام چیزیں گویا خودرو گھاس ہیں جو کسی آدمی کی خوبیوں کو کھا جانے والی ہیں۔ ہر آدمی کو چاہئے کہ وہ اس اعتبار سے اپنا نگراں بن جائے اور جب بھی اپنے اندر کوئی "نکمی گھاس" اگتے ہوئے دیکھے تو اس کو اکھاڑ کر پھینک دے۔ جو شخص اپنے اوپر محاسبہ کا عمل نہ کرے گا وہ یقینی طور پر اس دنیا میں برباد ہو جائے گا۔ وہ ایسا کھیت ہوگا جس کی فصل تباہ ہو گئی، وہ ایسا باغ ہوگا جس کی ساری بہار خزاں میں تبدیل ہو گئی۔

دونوں ایک سطح پر

۳۱ مارچ ۱۹۸۱ کو تمام دنیا کے اخبارات کی پہلی سرخی یہ تھی " صدر امریکہ پر قاتلانہ حملہ" - ایک نوجوان نے خودکار گن سے صدر رونالڈ ریگن پر حملہ کیا اور دو سکنڈ میں چھ فائر کئے - ایک گولی صدر کے سینہ کو چھید کر ان کے پھیپھڑے میں لگی - اسپتال تک پہنچتے پہنچتے ان کے جسم کا آدھا خون بہہ چکا تھا - مگر فوری طبی مدد کارگر ثابت ہوئی اور رونالڈ ریگن کی جان بچ گئی -

رونالڈ ریگن اس سے پہلے ایک فلم ایکٹر تھے - فلم کی دنیا میں وہ کوئی ممتاز مقام حاصل نہ کر سکے - اس کے بعد انھوں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا اور بالآخر ۱۹۸۰ کے الکشن میں امریکہ کے صدر منتخب ہو گئے - گولی لگنے کے بعد صدر ریگن نے واشنگٹن کے اسپتال میں ڈاکٹروں اور نرسوں سے بات کرتے ہوئے کہا:

If I'd got this much attention in Hollywood, I would never have left

اگر میں ہالی وڈ (فلمی دنیا) میں اتنی زیادہ توجہ کا مرکز بنا ہوتا تو میں فلمی دنیا کو کبھی نہ چھوڑتا (ہندستان ٹائمس یکم اپریل ۱۹۸۱) دوسری طرف نوجوان حملہ آور جان ہنکلے (John Hinckley) کی روداد کے ذیل میں آیا ہے کہ اس کو نوجوان فلم ایکٹرس جاڈی فاسٹر (Jodie Foster) سے محبت ہو گئی تھی - وہ اس کو خطوط لکھتا رہا مگر مس فاسٹر نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی - بالآخر اس نے حملہ سے ایک دن پہلے مذکورہ ایکٹرس کو خط لکھا جس میں یہ فقرہ تھا Now you'll know who I am (H.T. 2-4-1981)

اب تم جان لوگی کہ میں کون ہوں - اس خط کے اگلے دن اس نے صدر امریکہ پر قاتلانہ حملہ کیا - اس کے بعد ایک گمنام نوجوان اچانک ساری دنیا کے اخباروں کی شاہ سرخی بنا ہوا تھا - ریڈیو اور ٹیلی وژن کی خبروں میں اس نے پہلا مقام حاصل کر لیا - صرف ایک بندوق کی لبلبی دبا کر اس نے وہ شہرت حاصل کر لی جو بے شمار لوگوں کو ساری عمر کام کرنے کے بعد بھی نہیں ملتی -

ایک آدمی بظاہر مجرم ہو اور دوسرا بظاہر بے قصور مگر دونوں شہرت کے طالب ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں کے جینے کی سطح ایک ہے - دنیا کا قانون لوگوں سے ان کے ظاہر کے اعتبار سے معاملہ کرتا ہے، آخرت وہ مقام ہے جہاں لوگوں سے ان کے باطن کے اعتبار سے معاملہ کیا جائے گا - ایک شخص نام و نمود کے لئے دین کا علم بردار بنے ، دوسرا شخص نام و نمود کے لئے لیڈری کرے تو دین دار کا انجام بھی وہی ہوگا جو خود پسند لیڈروں کا خدا کے یہاں ہونے والا ہے -

صرف "کرنا" کافی نہیں

بالٹی کے پیندے میں سوراخ ہو اور اوپر سے آپ اس میں پانی ڈالیں تو سارا پانی بہہ کر نکلتا رہے گا اور بالٹی کے اپنے حصہ میں کچھ نہیں آئے گا۔ ایسا ہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ آدمی کا وہی عمل حقیقۃً عمل ہے جو خود اس کو کچھ دے رہا ہو۔ اگر آدمی بظاہر سرگرمیاں دکھا رہا ہو اور اس کا اپنا وجود کچھ پانے سے محروم ہو تو اس کی سرگرمیوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ عمل وہی عمل ہے جس کے دوران آدمی کے ذہن میں شعور کی چنگاری پڑے۔ اس کے دل میں سوز و تڑپ کا کوئی لاوا ابلے۔ اس کی روح کے اندر کوئی کیفیاتی ہل چل پیدا ہو۔ اس کے اندرون میں کوئی ایسا حادثہ گزرے جو برتر حقیقتوں کی کوئی کھڑکی اس کے لئے کھول دے۔ یہی یافت کسی عمل کی کامیابی کا اصل معیار ہے۔ وہی عمل عمل ہے جو آدمی کو اس قسم کے تحفے دے رہا ہو۔ جس عمل سے آدمی کو یہ چیزیں نہ ملیں وہ ایسا ہی ہے جیسے سوراخ دار بالٹی میں پانی گرانا۔

دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہے کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ آپ کیا ہو رہے ہیں۔ اگر آپ کی "مصروفیات" بہت بڑھی ہوئی ہوں، اگر بتانے کے لئے آپ کے پاس بہت سے کارنامے ہوں مگر آپ کی اندرونی ہستی خالی ہو، آپ خود کچھ نہ ہو رہے ہوں تو آپ کی مصروفیات محض بے فائدہ سرگرمیاں (Idle Business) ہیں۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں — ہوائیں ہوں مگر ان سے آکسیجن نہ ملے۔ پانی ہو مگر اس سے سیرابی حاصل نہ ہو۔ غذا ہو مگر اس سے آدمی کو قوت نہ ملے۔ سورج ہو مگر وہ روشنی نہ دے رہا ہو تو ایسا ہونا ہونا نہیں ہے بلکہ نہ ہونے کی بدترین شکل ہے۔ اسی طرح جو عمل آدمی کی اپنی غذا نہ بن رہا ہو وہ عمل نہیں صرف بے عملی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ بے معنی کوئی چیز۔

پتھر کے اوپر آپ پانی ڈالیں تو وہ بظاہر پانی سے بھیگ جائے گا۔ اس کے چاروں طرف پانی پانی نظر آئے گا۔ مگر پتھر پانی کے مزہ اور تراوٹ کو نہیں جانتا، اس نے پانی کی اِس دوسری حیثیت کا تجربہ نہیں کیا۔ اس کے برعکس ایک زندہ آدمی جب پیاس کے وقت پانی پیتا ہے تو اس کی رگیں تر ہو جاتی ہیں، وہ پانی کی حقیقت کا ایک "اندرونی تجربہ" کرتا ہے۔ اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ کرنا کیا ہے اور ہونا کیا۔ کرنا یہ ہے کہ آدمی کچھ مقررہ اعمال کو بس رسمی طور پر دہرا لے۔ آدمی کی زبان کچھ الفاظ بولے مگر وہ الفاظ اس کے دل کی دھڑکن نہ بن رہے ہوں۔ آدمی اپنے ہاتھ پاؤں سے کچھ عمل کرے مگر اس کا عمل اس کی روح کو نہ چھوئے۔ اس کی حرکات و سکنات اس کے دل و دماغ میں ارتعاش نہ پیدا کریں۔ اس کے برعکس ہونا یہ ہے کہ آدمی کا عمل اس کے لئے روحانی تجربہ بن رہا ہو۔ اس کی اندرونی ہستی کو بار بار کیفی غذائیں مل رہی ہوں۔ اس کا جسمانی عمل اس کے غیر جسمانی وجود میں ہل چل پیدا کر رہا ہو۔ وہی کرنا کرنا ہے جس کے درمیان آدمی خود بھی کچھ ہو رہا ہو۔ جو کرنا ہونا نہ بنے، حقیقت کے اعتبار سے اس کی کوئی قیمت نہیں۔ وہ گویا ایک ایسا پتھر ہے جو بظاہر پانی سے بھیگ رہا ہے مگر پانی کا مزہ نہیں پاتا ہے۔

مقبول بندے

جسم میں اگر ایسا خون داخل کیا جائے جو آدمی کے بلڈ گروپ کا نہ ہو تو جسم اس کو قبول نہیں کرتا۔ اس کے اندر فوراً ضد جسم (Antibodies) پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور وہ خون باہر نکال دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جلے یا کٹے ہوئے حصہ جسم پر قلم بندی ہوتی ہے جس کی محفوظ صورت یہ ہے کہ خود اپنے جسم کی کھال لے کر مقام ماؤف پر لگا دی جائے جس کو آٹو گرفٹنگ کہتے ہیں۔ اب اگر کسی مقام پر کھال کی قلم بندی (Skin Grafting) کرنی ہے اور وہاں کسی غیر متعلق جسم کی کھال لے کر لگا دی گئی تو وہ چند دن ٹھیک رہے گی۔ مگر ایک ہفتہ کے اندر جسم اس کی اجنبیت کو پہچان لے گا۔ خون کا دوران اس مقام پر رک جائے گا اور بالآخر کھال کا مذکورہ ٹکڑا الگ ہو کر گر جائے گا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر ولیم بائڈ (William Boyd) نے اپنی پتھالوجی کی کتاب (۱۷۷) میں لکھا ہے کہ خودی غیر خودی کو قبول نہیں کرتی :

Self will not accept not-self

یہ چھوٹے سلف (انسان) کی خودداری کی ایک مثال ہے۔ اسی پر بڑے سلف (خدا) کی غیرت اور خودداری کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا تمام غیرت مندوں سے زیادہ غیرت مند اور تمام یکتا پسندوں سے زیادہ یکتا پسند ہے۔ خدا کسی حال میں بھی کسی قسم کی دوئی کو گوارہ نہیں کرتا۔ وہ ہر دوسرے قصور کو معاف کر دے گا مگر شرک کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔

وہ کون خوش قسمت لوگ ہیں جو آخرت میں خدا کے مقبول بندے ٹھہریں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے سلف کے خول کو توڑ کر خدا کے سلف میں گم ہونے پر راضی ہو گئے۔ جو اپنی یا کسی دوسرے کی یکتائی کو بھلا کر خدا کی یکتائی کے آگے جھک گئے۔ جنھوں نے ہر قسم کے شرک کو چھوڑ کر توحید خالص کو اختیار کر لیا۔ انسان کے لئے اگرچہ یہ مشکل ترین کام ہے کہ وہ اپنے سوا کسی دوسرے کا اقرار کرے۔ جب بھی کوئی شخص کسی دوسرے کو مانتا ہوا نظر آئے تو وہ یا تو خوف کی بنیاد پر ہوگا یا مصلحت کی بنیاد پر۔ تاہم یہی وہ عطیہ جو کوئی انسان کبھی کسی کو نہیں دیتا اسی کا مطالبہ انسان کے خالق نے انسان سے کیا ہے۔ اور اسی کا نام اسلام ہے۔ مسلم وہی ہے جو اپنی خودی کا اثاثہ اپنے خالق کو دینے پر راضی ہو جائے۔ جو اپنے آپ کو پوری طرح خدا کی سپردگی میں دے دے۔ جو ہر اعتبار سے خدا کا تابع فرمان بن جائے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ انسان کے لئے ناقابل برداشت کو برداشت کرنا ہے۔ مگر اسی کو خدا نے اپنی جنت کی قیمت بنا دیا ہے۔ جنت کی انوکھی نعمت اسی خوش نصیب کے حصہ میں آئے گی جو اس انوکھے عطیہ کی صورت میں اس کی قیمت پیش کر دے۔

صبر کا بدلہ

قرآن میں صبر کی بے حد تاکید کی گئی ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ اگر کوئی شخص تمھارے اوپر زیادتی کرے، اور تم صبر نہ کر سکو تو اس کے ساتھ تم اتنا ہی کر سکتے ہو جتنا اس نے تمھارے ساتھ کیا ہے۔ مگر یہ صرف رخصت کی بات ہے۔ ورنہ اعلیٰ درجہ تو یہ ہے کہ تم معاف کر دو اور انتقام کے بجائے اصلاح کا انداز اختیار کرو۔ اگر تم ایسا کرو گے تو تمھارا اجر اللہ کے ذمہ ہو جائے گا اور تم کو کوئی نقصان نہ ہو گا (فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللہ، الشوریٰ ۴۰)

دنیا کی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کو دوسرے شخص سے تکلیف پہنچتی ہے۔ کبھی ایک آدمی دوسرے کو ایک قول دیتا ہے مگر بعد کو وہ اسے پورا نہیں کرتا۔ کبھی کوئی شخص اپنے کو مضبوط پوزیشن میں پاکر کمزور فریق کے ساتھ ناانصافی کرتا ہے۔ کبھی کوئی شکایت پیش آنے کی بنا پر ایک شخص دوسرے شخص کو مٹانے اور برباد کرنے پر تل جاتا ہے۔ کبھی کوئی شخص موقع سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اپنے ساتھی کو اس کا ایک جائز حق دینے پر تیار نہیں ہوتا۔ کبھی کسی کی ترقی دیکھ کر آدمی کے اندر حسد پیدا ہوتا ہے اور وہ ناحق اپنے بھائی کی بربادی کے درپے ہو جاتا ہے۔

اب اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو شخص مظلوم ہے اس کے دل میں ظالم کے خلاف آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ وہ اس کی زیادتیوں کو بھولنے اور اس کو معاف کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے مواقع پر دل کے زخم کو بھلا دینا انتہائی مشکل کام ہے۔ لیکن اگر آدمی ایسا کرے کہ معاملہ کو اللہ کے اوپر ڈال دے، وہ اللہ کی خاطر اس کو برداشت کرے تو اس کا یہ عمل کبھی رائگاں نہیں جائے گا۔ جو چیز وہ انسانوں سے نہ پا سکا اس کو وہ خدا سے پاکر رہے گا۔

ایک شخص جب کسی کو ایک قول دیتا ہے تو گویا وہ اس کو ایک بنک چیک دے رہا ہے جو عمل کے وقت کیش کیا جا سکے۔ مگر جب عمل کے وقت وہ اپنے قول سے پھر جاتا ہے تو گویا اس نے کاغذی چیک تو لکھ دیا مگر جب کھاتہ سے اس کی رقم لینے کا وقت آیا تو اس نے ادائگی سے انکار کر دیا۔ ایسا تجربہ کسی انسان کے لئے تلخ ترین تجربہ ہے۔ لیکن اگر وہ صبر کرے تو خدا کا وعدہ ہے کہ وہ اپنی طرف سے اس کا بدلہ دے گا۔ جو چیک انسانی بنک میں کیش نہ ہو سکا وہ خدائی بنک میں کیش ہو گا، خواہ دنیا میں ہو یا آخرت میں۔

ضمیر کے خلاف

مشہور انگریز مورخ آرنلڈ ٹائن بی (۱۸۸۹ - ۱۹۷۵) نے اپنی آخر عمر میں ایک بار کہا کہ فلسطین پر یہودیوں کا بطور تاریخی وطن اپنا حق جتانا ایسا ہی ہے جیسے ریڈ انڈین قبائل کنڈا کی واپسی کا مطالبہ کریں۔ یہودیوں نے نازیوں کے ظلم پر بے شمار کتابیں لکھی ہیں مگر خود یہودی فلسطینی عربوں کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کر رہے ہیں وہ بالکل اسی قسم کا ہے جو نازیوں نے یہودیوں کے ساتھ کیا تھا۔

ٹائن بی نے اپنا یہ بیان کنڈا میں دیا تھا۔ اس وقت کنڈا میں حکومت اسرائیل کے سفیر مسٹر ہرزگ تھے۔ مسٹر ہرزگ نے برطانی مورخ کو دعوت دی کہ اس مسئلہ پر وہ اس سے مباحثہ کریں۔ آرنلڈ ٹائن بی نے اس کو قبول کر لیا۔ اس کے بعد مانٹریل کی میک گل یونیورسٹی میں ایک تقریب ہوئی جس میں دونوں جمع ہوئے۔ مسٹر ہرزگ نے کہا: جرمن نازیوں نے ساٹھ لاکھ یہودیوں کو مار ڈالا تھا۔ اس کے مقابلہ میں فلسطین میں جو عرب بے گھر ہوئے ہیں ان کی تعداد بہت معمولی ہے۔ ان دونوں کو ایک جیسا کس طرح کہا جا سکتا ہے۔

آرنلڈ ٹائن بی نے جواب دیا کہ میں نے جب نازیوں اور اسرائیلیوں کے مظالم کو ایک جیسا کہا تھا تو اس سے مراد تعداد نہیں بلکہ جرم کی نوعیت تھی۔ کسی شخص کے لئے سو فی صد سے زیادہ برا ہونا ممکن نہیں۔ قاتل کہلانے کے لئے ایک شخص کو قتل کر دینا کافی ہے۔ میں حیران ہوں کہ آپ لوگ میرے الفاظ پر کیوں اس قدر بوکھلا اٹھے ہیں۔ میں نے وہی بات کہی ہے جو تم میں سے ہر ایک کا ضمیر کہہ رہا ہے۔

جب بھی آدمی کسی سچائی کی تردید کرتا ہے تو سب سے پہلے وہ خود اپنی تردید کر رہا ہوتا ہے۔ سچائی ہمیشہ آدمی کے اپنے دل کی آواز ہوتی ہے مگر آدمی ضد، تعصب اور اپنی جھوٹی بڑائی کو قائم رکھنے کی خاطر اس کو نہیں مانتا، وہ اپنے انکار کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے ایسے الفاظ بولتا ہے جن کے بارے میں خود اس کا دل گواہی دے رہا ہوتا ہے کہ ان میں کوئی وزن نہیں۔

آدمی کی سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ وہ اپنے ضمیر کا ساتھ نہ دے سکے۔ ضد اور تعصب اور مصلحت سے مغلوب ہو کر وہ ایسے رخ پر چلنے لگے جس کے متعلق اس کا اندرونی ضمیر آواز دے رہا ہو کہ وہ صحیح رخ نہیں ہے۔ یہ اپنی تردید آپ کرنا ہے یہ اپنے آپ کو خود اپنے ہاتھوں قتل کرنا ہے۔ یہ اپنے مجرم ہونے پر خود گواہ بننا ہے۔

کیسی عجیب ہے یہ محرومی۔ مگر جب آدمی کی بے حسی بڑھ جاتی ہے تو وہ اپنی محرومی کی ان کارروائیوں کو اپنی فتح سمجھتا ہے۔ وہ اپنے کو ہلاک کر رہا ہوتا ہے مگر سمجھتا ہے کہ میں اپنے آپ کو زندگی دے رہا ہوں۔

خدا کی یاد

اخبار ہندستان ٹائمس کے ایڈیٹر نے ایک فیلڈ اسٹڈی (۱۵ مئی ۱۹۸۲) کے ذریعہ ہندستانی لوگوں کا مزاج معلوم کیا۔ وہ اپنے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندستانیوں کا حال یہ ہے کہ جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو خدا ان کے یہاں سب سے اوپر ہوتا ہے۔ جب ہر چیز ٹھیک ہو تو پیسہ سب سے اوپر آجاتا ہے اور خدا کو دوسرے درجہ میں پہنچا دیتا ہے:

When a catastrophe strikes, God is tops. When all is tranquil, money manages to push God down to the second place.

یہ بات نہ صرف ہندستانیوں کے لئے صحیح ہے بلکہ وہ عام انسانوں کے لئے بھی بڑی حد تک درست ہے۔ انسان کا حال یہ ہے کہ تکلیف اور بے بسی کے لمحات میں وہ سب سے زیادہ خدا کو یاد کرتا ہے۔ اس وقت اس کی ساری توجہ خدا کی طرف لگ جاتی ہے۔ مگر جب حالات اچھے ہوں اور کوئی پریشانی سامنے نہ ہو تو وہ اپنے مادی مفادات کو اپنی تمام توجہ کا مرکز بنالیتا ہے۔

مگر اس قسم کی خدا پرستی خدا پرستی نہیں۔ وہ صرف آدمی کے اس جرم کو بتاتی ہے کہ وہ اپنے رب کو بھولا ہوا تھا۔ وہ وقت جب کہ اسے خدا کو یاد کرنا چاہئے تھا اس وقت اس نے خدا کو یاد نہیں کیا۔ یہاں تک کہ خدا نے اس کی حقیقت اس پر کھول دی۔ اس کی آنکھ سے غفلت کا پردہ ہٹ گیا۔ جب ایسا ہوا تو وہ گھبرا کر خدا کو پکارنے لگا۔

انسان ایک آزاد اور با اختیار مخلوق ہے۔ اس سے آزادانہ خدا پرستی مطلوب ہے نہ کہ مجبورانہ۔ انسان کا یاد کرنا وہ یاد کرنا ہے جب کہ اس نے راحت کے لمحات میں خدا کو یاد کیا ہو۔ راحت کے وقت خدا کو بھلائے رکھنا اور جب مصیبت آئے تو خدا کی طرف دوڑنا ایک ایسا عمل ہے جس کی خدا کے یہاں کوئی قیمت نہیں۔

پھر یہ واقعہ بتاتا ہے کہ جو لوگ دولت کو سب سے بڑا درجہ دئے ہوئے ہیں وہ جھوٹے معبود کو اپنا معبود بنائے ہوئے ہیں۔ جو چیز مصیبت کے وقت آدمی کا سہارا نہ بنے، جس کو آدمی خود نازک لمحات میں بھول جائے وہ کسی کا معبود کس طرح ہو سکتی ہے۔

جب پردہ اٹھے گا

امریکی صدر رونالڈ ریگن ۳۰ مارچ ۱۹۸۱ کو پر اعتماد چہرہ کے ساتھ اپنے صدارتی محل (وھائٹ ہاؤس) سے نکلے۔ کاروں کا قافلہ ان کو لے کر واشنگٹن کے ہلٹن ہوٹل کی طرف روانہ ہوا۔ پروگرام کے مطابق انھوں نے ہوٹل کے شان دار ہال میں ایک تقریر کی۔ تحسین و آفریں کی فضا میں ان کی تقریر ختم ہوئی۔ وہ آدمیوں کے ہجوم میں ہنستے ہوئے چہرہ کے ساتھ باہر آئے۔ وہ اپنی گولی پروف لیموشین (کار) سے صرف چند قدم کے فاصلہ پر تھے کہ اچانک باہر کھڑے ہوئے مجمع کی طرف سے گولیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ایک نوجوان جان ہنکلے نے دو سکنڈ کے اندر چھ فائر کئے۔ ایک گولی مسٹر ریگن کے سینہ پر لگی۔ وہ خون میں لت پت ہو گئے اور فوراً اسپتال پہنچائے گئے۔ اچانک گولی لگنے کے بعد صدر امریکہ کا جو حال ہوا وہ اے پی کا رپورٹر ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

Mr Reagan appeared stunned. The smile faded from his lips

مسٹر ریگن جیسے سن ہو گئے۔ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں سے غائب ہو گئی (ٹائمس آف انڈیا ۳۱ مارچ ۱۹۸۱) یہ واقعہ اس صورت حال کی ایک تصویر ہے جو موت کے "حملہ" کے وقت اچانک آدمی پر طاری ہوگی۔

آدمی موجودہ دنیا میں اپنے کو آزاد سمجھ رہا ہے۔ وہ نڈر ہو کر جو چاہے بولتا ہے اور جو چاہے کرتا ہے۔ اگر کسی کو کچھ مال ہاتھ آگیا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ میرا مستقبل محفوظ ہے۔ کسی کو کوئی اقتدار حاصل ہے تو وہ اپنے اقتدار کو اس طرح استعمال کرتا ہے جیسے اس کا اقتدار کبھی چھننے والا نہیں۔ ہر آدمی پُر اعتماد چہرہ لئے ہوئے ہے۔ ہر آدمی ہنستے ہوئے اپنی "لیموشین" کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کے بعد اچانک پردہ اٹھتا ہے۔ موت کا فرشتہ اس کو موجودہ دنیا سے نکال کر اگلی دنیا میں پہنچا دیتا ہے۔

یہ ہر آدمی کی زندگی کا ایک انتہائی بھیانک لمحہ ہے۔ جب یہ لمحہ آتا ہے تو آدمی اپنے اندازہ کے بالکل خلاف صورت حال کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو جاتا ہے۔ اچانک اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ محض دھوکا تھا جس کو اس نے سب سے بڑی حقیقت سمجھ لیا تھا —— میں نے اپنے کو آزاد سمجھا تھا مگر میں تو بالکل بے اختیار نکلا۔ میں اپنے کو مال و جائداد والا پا رہا تھا مگر میں تو بالکل خالی ہاتھ تھا۔ میرا خیال تھا کہ میرے پاس طاقت ہے۔ مگر میں تو خدا کی اس دنیا میں مکھی اور مچھر سے بھی زیادہ بے زور تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ میرے ساتھ بہت سے لوگ ہیں مگر یہاں تو میرا کوئی ایک بھی نہیں۔

آہ وہ انسان جو اسی بات کو نہیں جانتا جس کو اسے سب سے زیادہ جاننا چاہئے۔

ہر طرف فریب

آج کی دنیا فریب کی دنیا ہے۔ آج کے انسان کو ایسے نعرے مل گئے ہیں جن سے وہ اپنی شخصی لوٹ کی سیاست کو قومی خدمت کی سیاست ظاہر کر سکے۔ ہر آدمی ایسے الفاظ کا ماہر بنا ہوا ہے جو اس کے ظلم و فساد کو عین حق و انصاف کا روپ دے سکیں۔ ہر آدمی کو ایسے قانونی نکتے ہاتھ آ گئے ہیں جو اس کے جرم کو بے گناہی کا سرٹیفکٹ عطا کر دیں۔

یہ دنیا پرستوں کا حال ہے۔ مگر خدا پرستوں کا معاملہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں۔ یہاں بھی لوگوں نے ایسے فضائل و مسائل کا خزانہ جمع کر رکھا ہے جو ان کی بے دینی کو دینی کمال کے خانہ میں ڈال دیں۔ جو ان کی بے عملی کو عمل کا شاندار کریڈٹ دے دیں۔

لوگوں نے ایسا خدا دریافت کر رکھا ہے جس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لوگوں کو ایسا رسول ہاتھ آگیا ہے جو صرف اس لئے آیا تھا کہ ان کی ساری بد اعمالیوں کے باوجود خدا کے یہاں ان کا یقینی سفارشی بن جائے۔ لوگوں کو ایسی آخرت مل گئی ہے جہاں جنت صرف اپنے لئے ہے اور جہنم صرف دوسروں کے لئے۔ لوگوں کو ایسی نمازیں حاصل ہو گئی ہیں جن کے ساتھ کبر اور حسد جمع ہو سکتا ہے۔ لوگوں کو ایسے روزے معلوم ہو گئے ہیں جو جھوٹ اور ظلم سے فاسد نہیں ہوتے۔ لوگوں کو ایسا دین ہاتھ آگیا ہے جو صرف بحث و مباحثہ کرنے کے لئے ہے نہ کہ عمل کرنے کے لئے۔ لوگوں کو اسلامی دعوت کے ایسے نسخے معلوم ہو گئے ہیں جو ان کی شخصی قیادت اور قومی سیاست کو اسلام کا لباس اوڑھا دیں۔

مگر جھوٹا سونا اسی وقت تک سونا ہے جب تک وہ کسوٹی پر کسا نہ گیا ہو۔ اسی طرح فریب کا یہ کاروبار بھی صرف اس وقت تک ہے جب تک کہ خدا ظاہر ہو کر اپنے انصاف کی ترازو کھڑا نہ کر دے۔ آج امتحان کی آزادی ہے۔ آج آدمی کو موقع ہے کہ جو چاہے کرے۔ مگر جب امتحان کی مدت ختم ہوگی تو آدمی اپنے آپ کو بالکل بے بس پائے گا۔ وہ بولنا چاہے گا مگر اس کے پاس الفاظ نہ ہوں گے کہ وہ بولے۔ وہ چلنا چاہے گا مگر اس کے پاس پاؤں نہ ہوں گے کہ ان کے ذریعہ وہ بھاگ کر کہیں جا سکے۔

یہ سچائی کا دن ہوگا۔ اس دن ہر آدمی کے اوپر سے فریب کا وہ لباس اتر چکا ہوگا جس کو آج وہ پہنے ہوئے ہے۔ ہر آدمی اپنی اس اصل صورت میں نمایاں ہو جائے گا جو فی الواقع اس کی ہے مگر امتحان کی آزادی سے فائدہ اٹھا کر آج وہ اس کو چھپائے ہوئے ہے۔ آدمی کی یہ اصل صورت خدا کے سامنے آج بھی عریاں ہے۔ مگر آخرت کی دنیا میں وہ تمام لوگوں کے سامنے نمایاں ہو جائے گی۔

جانور سے بدتر

شیخ سعدی نے کہا تھا "میں خدا سے ڈرتا ہوں۔ اور خدا کے بعد اس شخص سے ڈرتا ہوں جو خدا سے نہیں ڈرتا"۔ اسی بات کو شیکسپیئر نے ایک اور انداز سے اس طرح کہا ہے —— "انسان ہی ایک ایسا جانور ہے جس سے میں بزدل کی طرح ڈرتا ہوں"۔

اس دنیا میں ہر چیز قابل پیشین گوئی کردار رکھتی ہے۔ آگ کے بارے میں آپ پیشگی طور پر یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر آپ نے اس کے اندر ہاتھ ڈالا تبھی وہ آپ کو جلائے گی۔ اگر آپ اپنے ہاتھ کو اس سے دور رکھیں تو وہ ایسا نہیں کرے گی کہ وہ کود کر آپ کے ہاتھ پر آگرے۔ یہی معاملہ تمام چیزوں کا ہے حتّٰی کہ موذی جانوروں کے بارے میں بھی ہم کو پیشگی طور پر معلوم ہے کہ وہ یک طرفہ طور پر کسی کے اوپر حملہ نہیں کرتے۔ ان کا حملہ ہمیشہ دفاعی ہوتا ہے نہ کہ جارحانہ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز ایک لگے بندھے قاعدہ کے تحت کام کر رہی ہے اور اس قاعدہ کی رعایت کر کے آپ اس کے نقصان سے بچ سکتے ہیں۔ مگر انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جس کے عمل کا کوئی اصول اور قاعدہ نہیں۔ وہ مکمل طور پر آزاد ہے اور جس وقت جو چاہے کر سکتا ہے۔

اس دنیا میں انسان ہی ایک ایسا وجود ہے جو یک طرفہ طور پر دوسرے کے خلاف کارروائی کرتا ہے جو کسی واقعی سبب کے بغیر دوسرے کے اوپر حملہ کرتا ہے۔ انسان کے حرص اور انتقام کی کوئی حد نہیں۔ آپ خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں مصروف ہوں اور محض ذاتی محنت کی بنیاد پر ترقی کریں تب بھی آپ محفوظ نہیں۔ کیونکہ دوسروں کے اندر حسد کا جذبہ پیدا ہوگا اور وہ آپ کو گرانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ انسان لامحدود طور پر اپنی خواہشیں پوری کرنا چاہتا ہے اور بے حساب حد تک دوسرے کو برباد کر کے اس کی بربادی کا تماشا دیکھنا چاہتا ہے۔

کوئی بدترین موذی جانور بھی اس کو نہیں جانتا کہ وہ کسی کو ذلیل کرنے کا منصوبہ بنائے۔ وہ کسی کو نیچا دکھا کر اپنے غرور کے لئے تسکین کا سامان فراہم کرے۔ کسی کو خواہ مخواہ مصیبتوں میں پھنسا کر اس کی پریشانی کا تماشا دیکھے۔ یہ صرف انسان ہے جو ایسا کرتا ہے۔ خدا نے انسان کو احسن تقویم کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ مگر انسان اپنی نادانی سے اپنے آپ کو اسفل سافلین کی پستی میں گرا لیتا ہے۔

امتحان کا مقام

کالج میں امتحان ہو رہا تھا۔ ایک طالب علم امتحان ہال میں داخل ہوا۔ مگر اس نے امتحان کی کاپی پر کچھ نہیں لکھا۔ وہ بس بیٹھا ہوا سگریٹ پیتا رہا اور تین گھنٹہ گزار کر باہر چلا آیا۔ اس کے بعد وہ لائبریری پہنچا اور وہاں کتابوں کے درمیان بیٹھ کر پرچہ حل کرنا شروع کر دیا۔ امتحان ہال میں اس نے اپنی کاپی سادہ چھوڑ دی تھی مگر لائبریری میں اس نے اپنی کاپی بھر ڈالی۔

آپ کہیں گے کہ یہ فرضی کہانی ہے۔ کوئی طالب علم اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا کہ امتحان ہال میں پرچہ حل نہ کرے اور لائبریری میں بیٹھ کر کاپی بھرنے لگے۔ اور اگر یہ واقعہ سچا ہو تو یقیناً وہ کوئی ایسا طالب علم ہوگا جس کا دماغ صحیح نہ ہو۔

یہ درست ہے کہ اس قسم کی حرکت کوئی پاگل طالب علم ہی کر سکتا ہے۔ مگر دنیا کے امتحان کے معاملہ میں جو بات لوگوں کو اتنی عجیب معلوم ہوتی ہے، آخرت کے معاملہ میں ہر شخص اسی طریقہ پر عمل کر رہا ہے۔ کالج کے ذمہ دار طلبہ کا امتحان جہاں لینا چاہتے ہیں وہ امتحان ہال ہے نہ کہ لائبریری۔ اسی طرح خدا کے بھی امتحان لینے کے مقامات ہیں۔ مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ خدا نے امتحان کے جو مقامات مقرر کئے ہیں وہاں لوگ امتحان میں پورا اترنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس کے بجائے وہ دوسرے دوسرے مقامات پر خدا پرستی اور دین داری کا کمال دکھا رہے ہیں۔

خدا آدمی کے ایمان کا ثبوت دل کی انابت میں دیکھنا چاہتا ہے اور لوگ اپنے ایمان کا ثبوت کلمۂ ایمان کے مخارج میں دے رہے ہیں۔ خدا آدمی کی عبادت کو خشوع کے معیار پر جانچ رہا ہے اور لوگ مسائل کی پابندی میں اپنی عبادت گزاری کا ثبوت فراہم کر رہے ہیں۔ خدا لوگوں کے دین کو کردار اور معاملات کی سطح پر جانچ رہا ہے اور لوگ اشراق اور چاشت کے فضائل میں اپنی دین داری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ خدا چاہتا ہے کہ آدمی اپنے آپ پر خدا کی حکومت قائم کرنے والا بنے اور لوگ کسی خارجی شخص کے خلاف اکھیڑ پچھاڑ کر کے حکومت خداوندی کے قیام کا کریڈٹ لینے میں مصروف ہیں۔ خدا کسی آدمی کو جہاں مظلوموں کی حمایت کرنے والا دیکھنا چاہتا ہے وہ مظلوم فرد ہے مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ظلم و فساد کے اجتماعی واقعات پر تقریریں اور بیانات پیش کر کے اپنے کو مظلوموں کا حامی ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

ہر آدمی جانتا ہے کہ کسی طالب علم کی وہ کاپی بالکل بے کار ہے جو امتحان ہال کے بجائے لائبریری میں بیٹھ کر بھری گئی ہو۔ کاش لوگ جانتے کہ ٹھیک اسی طرح وہ عمل بے حیثیت ہے جو خدا کے مطلوبہ مقام کے علاوہ کہیں اور پیش کیا گیا ہو۔

عمل کے بغیر

آج کاغذ کی اتنی افراط ہے کہ جہاں بھی دیکھیں کاغذ کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا ملے گا۔ مگر کاغذ کے ان ٹکڑوں کی کوئی قیمت نہیں۔ نوٹ بھی کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے۔ مگر اس کی قیمت ہے۔ اس کی قیمت اتنی یقینی ہے کہ کوئی بھی آدمی اس پر شبہ نہیں کرتا۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ عام کاغذی ٹکڑے کی کسی نے ضمانت نہیں لی ہے جبکہ نوٹ کے پیچھے سرکاری بینک کی ضمانت ہے۔ ہر نوٹ پر سرکاری بینک کی یہ ضمانت ثبت ہوتی ہے کہ وہ اس کے پیش کرنے والے کو وہ رقم پوری پوری ادا کر دے گا جو اس پر چھپی ہوئی ہے۔ یہی ضمانت ہے جس نے نوٹ کے کاغذ کو لوگوں کے لئے قیمتی بنا دیا ہے۔

یہی معاملہ الفاظ کا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج جتنے الفاظ بولے جا رہے ہیں تاریخ کے کسی دور میں اتنے الفاظ نہیں بولے گئے۔ مگر ان الفاظ کی کوئی قیمت نہیں، کیونکہ ان کے پیچھے عمل ارادہ کی ضمانت شامل نہیں ہے۔ آپ سے ایک شخص وعدہ کرتا ہے کہ وہ آپ کا فلاں کام کر دے گا۔ مگر جب آپ مقررہ وقت پر اس کی حمایت مانگتے ہیں تو وہ بہانہ کر دیتا ہے۔ آپ مذکورہ شخص کے پاس جو چیز لے کر گئے وہ اس کے بولے ہوئے الفاظ تھے۔ جب اس نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تو گویا اس نے اپنے الفاظ کی قیمت ادا نہیں کی۔ اس نے الفاظ کا کاغذ تو دے دیا مگر جو عمل اس کاغذ کی قیمت تھا اس کو دینے کے لئے تیار نہ ہوا۔ اس کے بولے ہوئے الفاظ ردی کاغذ کے ٹکڑے تھے نہ کہ بینک کا جاری کیا ہوا نوٹ۔

آج کی دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ الفاظ کی سطح پر ہر آدمی بڑے بڑے الفاظ بول رہا ہے مگر اپنے الفاظ کی عملی قیمت دینے کے لئے کوئی شخص تیار نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کے بولے ہوئے الفاظ اسی طرح ردی کے پرزے بن کر رہ گئے ہیں جیسے پرزے گلی کوچوں میں ہر وقت پڑے رہتے ہیں اور ہر آدمی ان کو بے قیمت سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے۔

ایک شخص مظلوموں کی حمایت میں بیانات اور تجویزوں کے انبار لگا رہا ہے مگر جب اس کے قریب کا ایک شخص اس کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ میری مظلومیت پر میری مدد کرو تو وہ اس کو برف کی طرح بالکل سرد پاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آدمی جو لفظ بول رہا تھا اس کے پیچھے اس کا حقیقی ارادہ شامل نہ تھا۔ وہ محض زبانی الفاظ تھے نہ کہ کوئی حقیقی فیصلہ۔ ایک شخص لوگوں کے سامنے شرافت اور تواضع کی تصویر بنا رہتا ہے مگر جب اس کی انا پر چوٹ لگتی ہے تو اچانک وہ حسد اور گھمنڈ کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کی شرافت محض ظاہری تھی، وہ اس کی روح میں اتری ہوئی نہ تھی۔

الفاظ کم ہو جاتے ہیں

مسٹر لزلی براؤن شمالی انگلستان کے ایک ٹرک ڈرائیور ہیں۔ وہ اولاد سے محروم تھے۔ ان کی بیوی کے جسمانی نظام میں بعض حیاتیاتی فرق کی وجہ سے دونوں کا مادۂ حیات رحم مادر میں یکجا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے کہ عین وقت پر سائنس نے ان کی مدد کی۔ لندن کے ڈاکٹر پیٹرک اسٹیپٹو جو برسہا برس سے اس میدان میں تجربہ کر رہے تھے انھوں نے اپنی لیبورٹری میں لزلی براؤن کا مادۂ تولید (اسپرم) نکالا اور مسز براؤن کے جسم سے ایک بیضہ لیا۔ دونوں کو انھوں نے ایک خصوصی قسم کے ٹسٹ ٹیوب میں رکھا۔ قدرتی قانون کے تحت وہ دونوں مل کر زرخیز ہو گئے۔ چار روز کے بعد ڈاکٹر نے اس کو مصنوعی طور پر رحم مادر میں پہنچا دیا۔ اب رحم مادر میں اس "بچہ" کی پرورش ہونے لگی۔ تجربہ کامیاب رہا۔ اگست ۱۹۷۸ میں تاریخ کا پہلا "ٹسٹ ٹیوب بے بی" وجود میں آگیا۔ اس پورے عمل کی تصویر لی جاتی رہی، اور پیدائش کے بعد اس کو مکمل طور پر ٹیلی وژن پر دکھایا گیا۔

ٹیوب بے بی (لوئی براؤن) کے باپ سے اس پورے واقعہ پر تبصرہ کرنے کے لئے کہا گیا تو اس نے کہا "بیوٹی فل"، یعنی بے حد حسین۔ اس ایک لفظ کے سوا وہ کچھ اور نہ کہہ سکا۔

غم کی گھٹنا خوشی سے زیادہ بڑی گھٹنا ہوتی ہے۔ انڈین نیوی کے ایک افسر کی اہلیہ مسز او ما چوپڑہ کو ۲۶ اگست ۱۹۷۸ کو جب معلوم ہوا کہ ان کے دونوں بچے گیتا (۱۷) اور سنجے (۱۵) کو نئی دہلی میں وحشیانہ طور پر کسی نے قتل کر دیا ہے تو اس کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ سات گھنٹے تک وہ ایک لفظ نہ بول سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تاثر جتنا شدید ہو الفاظ اتنا ہی کم ہو جاتے ہیں۔ بے حد خوشی ہو تب بھی آدمی زیادہ بول نہیں پاتا اور بے حد غم ہو تب بھی زیادہ بولنا آدمی کے لئے ممکن نہیں رہتا۔ جو لوگ دین و ملت کے "غم" میں ہر روز الفاظ کے دریا بہاتے رہتے ہیں وہ صرف اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ دین و ملت کے غم میں وہ سب سے پیچھے ہیں۔ جو شخص درد و غم میں مبتلا ہو اس کو تو چپ لگ جاتی ہے نہ یہ کہ وہ لفظی اکھاڑوں میں لسانی پہلوانی کے کرتب دکھانے لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگوں نے خدا کو نہ اس کے منعم کے روپ میں پایا ہے اور نہ منتقم کے روپ میں۔ اگر وہ دونوں میں سے کسی روپ میں بھی خدا کو پا لیتے تو یہ صورت باقی نہ رہتی کہ ہر آدمی ایسے الفاظ کا بھنڈار بنا ہوا ہے جو کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتے۔

دنیا کی خاطر عمل کرنے والے

لوگ خوش اخلاق ہیں۔ وہ ہدیے دیتے ہیں اور دعوتیں کرتے ہیں۔ وہ دوسروں کے کام آنے کے لئے دوڑتے ہیں۔ وہ دوسرے کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ بناتے ہیں۔ وہ غمی کے موقع پر اظہار درد کے لئے پہنچتے ہیں اور خوشی کے موقع پر مبارک باد دینے کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔ وہ اختلاف کے باوجود اختلاف کو بھول جاتے ہیں اور شکایت کے باوجود شکایت کو پی جاتے ہیں۔

لوگ خوش ہیں کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ وہ ویسے ہی ہیں جیسا کہ انھیں ہونا چاہئے۔

مگر لوگوں کی یہ خوش معاملگی کس کے ساتھ ہے۔ صرف ان لوگوں کے ساتھ جن سے ان کا کوئی فائدہ وابستہ ہے۔ جن سے انھیں امید ہے کہ وہ وقت پر ان کے کام آسکتے ہیں۔ جن سے وہ ڈرتے ہیں۔ جن کے زور قوت کا رعب ان کے اوپر چھایا ہوا ہے۔ جن سے کٹ کر وہ سمجھتے ہیں کہ سارے لوگوں سے کٹ جائیں گے، جن سے جڑ کر وہ سمجھتے ہیں کہ سارے لوگوں سے جڑے رہیں گے۔

لوگوں کی یہ خوش اخلاقی تمام تر مفاد پرستانہ خوش اخلاقی ہے۔ اس کا راز اس وقت معلوم ہو جاتا ہے جب کہ معاملہ ایسے شخص سے پڑے جس کے ساتھ خوش اخلاقی برتنے کے لئے مذکورہ محرکات میں سے کوئی محرک موجود نہ ہو۔ ایسے موقع پر اچانک وہی آدمی بالکل بد اخلاق بن جاتا ہے جو اس سے پہلے نہایت خوش اخلاق دکھائی دے رہا تھا۔

اب اس کو یہ شوق نہیں ہوتا کہ وہ سلام میں پہل کرے۔ اب وہ اپنی دعوتوں میں اس کو بلانا بھول جاتا ہے۔ اب وہ اس کی مشکلوں میں کام آنے کے لئے نہیں دوڑتا۔ اب وہ معمولی شکایت پر بگڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اب اس کو یہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ اس کے جذبات کی رعایت کرے۔ دنیوی فائدہ کے لئے اخلاق دکھانے والا آدمی اس وقت بے اخلاق ہو جاتا ہے جب کہ اس میں کوئی دنیوی فائدہ نظر نہ آتا ہو۔

لوگوں کو جاننا چاہئے کہ اس قسم کی خوش اخلاقی اور انسانیت کی خدا کے نزدیک کوئی قیمت نہیں۔ وہ کسی آدمی کو جہنم کی آگ سے بچانے والی نہیں خواہ وہ کتنی ہی زیادہ بڑی مقدار میں آدمی کے اندر پائی جارہی ہو۔ خدا کے ہاں جو کچھ بدلہ ہے صرف اس عمل کا ہے جو خالص خدا کی رضا اور آخرت کی نجات کے لئے کیا گیا ہو۔ اور جو عمل دنیا میں اپنا معاملہ درست رکھنے کے لئے کیا جائے اس کا خدا کے یہاں کوئی بدلہ نہیں۔ ایسے عمل کا پشتارہ لے کر خدا کے یہاں پہنچنے والوں سے خدا کہہ دے گا —— تم نے جو کچھ کیا وہ اپنی دنیا کے لئے کیا۔ تم دنیا میں اس کا بدلہ پاچکے۔ اب آخرت میں تمھارے لئے اس کے بدلے میں کچھ نہیں۔

ثواب

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے پیسہ دیا ہے وہ عام طور پر ایسا کرتے ہیں کہ اپنے ملازموں اور ماتحت کارکنوں کو تو صرف واجبی تنخواہ یا اجرت دیتے ہیں۔ دوسری طرف کانفرنس یا ریلیف فنڈ یا مشہور اداروں کو بڑی بڑی رقمیں دے کر خوش ہوتے ہیں۔ اگر ان سے پوچھئے کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں تو وہ کہیں گے کہ ملازم یا کارکن کو جو رقم دی جاتی ہے وہ تو ان کے کام کی اجرت ہوتی ہے۔ اس پر ہم کو ثواب نہیں ملے گا۔ انھوں نے ہماری خدمت کی اور ہم نے ان کو معاوضہ دے دیا۔ اس پر ثواب کیسا۔ یہ تو دونوں طرف سے معاملہ برابر ہوگیا۔ اس کے برعکس اداروں اور ملی کاموں میں جو رقم دی جاتی ہے ان کے متعلق یقینی ہے کہ ان پر ثواب ملے گا۔

مگر اس کی تہ میں اصل بات کچھ اور ہے اور یہ جواب محض اصل بات پر پردہ ڈالنے کی ایک کوشش ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہر آدمی کے دل میں یہ چھپی ہوئی خواہش موجود ہے کہ وہ جو کچھ دے اس کا معاوضہ اس کو اسی دنیا میں ملے۔ غریب آدمی یہ معاوضہ پیسہ کی صورت میں چاہتا ہے۔ مگر جن لوگوں کے پاس کافی پیسہ آجاتا ہے ان کو جس معاوضہ کی تمنا ہوتی ہے وہ سماجی حیثیت (سوشل اسٹیٹس) ہے۔ یہی وہ چھپی ہوئی خواہش ہے جو اس قسم کے لوگوں کے انفاق کا رخ بڑی بڑی قابل ذکر مدوں کی طرف کر دیتی ہے۔

ظاہر ہے کہ غریب ملازم یا کارکن یہ معاوضہ دینے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اس کے پاس نہ اخبار ہوتا ہے نہ اسٹیج۔ اس کے پاس نہ اونچی بلڈنگوں والے ادارے ہیں اور نہ استقبال کرنے والا حلقہ۔ مگر ایک شخص جب کسی مشہور ادارہ یا کسی "عظیم الشان" ملی مہم میں رقم دیتا ہے تو اس کو امید رہتی ہے کہ اس کو شاندار معاوضہ ملے گا ــــــ جلسوں کی صدارت، عوامی مواقع پر نمایاں نشست، اداروں میں پرزور استقبال، سماجی حیثیت میں اضافہ، اخباروں میں نام چھپنا اور بڑے بڑے لوگوں کی صف میں جگہ ملنا، وغیرہ

ثواب کا تعلق نیت سے ہے نہ کہ قابل تذکرہ مدوں سے۔ ثواب حقیقۃً اس عمل میں ہے جو صرف اللہ کی رضا کے لئے کیا گیا ہو۔ ثواب یہ ہے کہ اللہ کی خاطر ایسی مدوں میں دیا جائے جو لوگوں کو دکھائی نہیں دیتیں۔ ان مواقع پر خرچ کیا جائے جہاں ہر قسم کے دوسرے محرکات حذف ہو جاتے ہیں۔ جس انفاق کا فائدہ اسی دنیا میں وصول کر لیا گیا ہو اس کا فائدہ کسی کو آخرت میں ملے گا تو کیوں ملے گا۔

لوگ دکھائی دینے والے مقامات پر انفاق کر رہے ہیں حالاں کہ خدا ان کے انفاق کو قبول کرنے کے لئے اس مقام پر کھڑا ہوا ہے جو ظاہر پرست انسانوں کو دکھائی نہیں دیتا۔

خدا کو پانے والے

خدا کی زمین پر شاید ایسے لوگ موجود نہیں جنھوں نے خدا کو ان عظمتوں کے ساتھ پایا ہو جس کے اثرات اس ہیجان خیز کیفیت میں ڈھل جاتے ہیں جس کو خدا کی یاد کہا گیا ہے۔ جھوٹی عبادت کی دھوم ہر طرف نظر آتی ہے۔ مگر سچی عبادت اتنی نایاب ہے کہ امکان ہی کے درجہ میں کہا جاسکتا ہے کہ وہ کہیں موجود ہوگی۔

آج ساری دنیا میں دین اور اسلام کا غلغلہ بلند ہے۔ مگر وہ انسان شاید خدا کی زمین پر کہیں پایا نہیں جاتا جس نے خدا کو اس طرح دیکھا ہو کہ اس کی ہیبت سے اس کا دل دہل اٹھے اور اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ جو قرآن کو پڑھے تو اس کی روح پکار اٹھے کہ خدایا یہ تیرا کتنا بڑا احسان ہے کہ تو نے میری ہدایت کا ایسا انتظام کیا، ورنہ میں جہالت کے اندھیروں میں بھٹکتا رہتا۔ وہ رسول کی سنت کو دیکھے تو اس کا وجود اس دریافت سے سرشار ہو جائے کہ یہ خدا کا کیسا غیر معمولی انتظام تھا کہ اس نے پیغمبر کی زندگی میں ہدایت کا بے داغ نمونہ قائم کیا اور پھر تاریخ میں اس کو روشنی کے ابدی مینار کی طرح محفوظ کر دیا۔ جب وہ سجدہ کرتے ہوئے اپنا سر زمین پر رکھے تو اس کو یہ احساس ہونے لگے کہ اس کے رب نے اس کو اپنی رحمت کے آغوش میں لے لیا ہے، جب وہ کوئی غذا اپنی حلق کے نیچے اتارے تو اس کی پوری ہستی میں اس احسان مندی کی لہر دوڑ جائے کہ کیسا عجیب ہے وہ خدا جس نے میرے جسم کی پرورش کے لئے ایسی مکمل غذا کا اہتمام کیا۔ جب وہ پانی پئے تو اس کی آنکھوں سے ایک اور جھرنا بہہ پڑے اور وہ بے اختیار ہو کر کہے کہ خدایا اگر تو مجھے سیراب نہ کرے تو میں سیراب ہونے والا نہیں، اگر تو مجھے پانی نہ دے تو کہیں سے مجھ کو پانی ملنے والا نہیں۔

آہ، لوگ اپنے کو خدا سے کتنا قریب سمجھتے ہیں مگر وہ خدا سے کتنا زیادہ دور ہیں۔ وہ خدا کا نام لیتے ہیں مگر ان کے منھ میں خدائی مٹھاس کی شکر نہیں گھلتی۔ وہ خدا کو پانے کا دعوی کرتے ہیں مگر خدا کے چمنستان کی کوئی خوشبو ان کے مشام کو معطر نہیں کرتی۔ وہ خدا کے نام پر دھوم مچاتے ہیں مگر خدا کے نورانی سمندر میں نہانے کا کوئی نشان ان کے جسم پر ظاہر نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خدا کی جنتیں ان کے لئے مخصوص ہو چکی ہیں مگر جنت کے باغ کا کوئی جھونکا ان کے وجود کو نہیں چھوتا۔

کیسا عجیب ہوگا وہ خدا جس کی یاد دل و دماغ کی دنیا میں کوئی اہتزاز (Thrill) پیدا نہ کرے۔ کیسی عجیب ہوگی وہ جنت جس میں داخلہ کا ٹکٹ آدمی اپنی جیبوں میں لئے پھرتا ہو مگر جنت کا باسی ہونے کی کوئی جھلک اس کے رفتار و گفتار سے نمایاں نہ ہو۔ کیسے عجیب ہوں گے وہ آخرت والے جن کے لئے آخرت کی ابدی وراثت لکھی جا چکی ہو مگر ان کی ساری دلچسپیاں بدستور اسی عارضی دنیا میں اٹکی ہوئی ہوں۔

نمائشی حق پرستی

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پتھر کے اوپر کچھ مٹی جم جاتی ہے۔ اس مٹی کے اوپر سبزہ اگ آتا ہے۔ بظاہر دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کوئی کھیت ہو۔ لیکن اگر زور کی بارش ہو جائے تو مٹی سمیت سارا سبزہ بہہ جاتا ہے اور اس کے بعد صرف پتھر کی صاف چٹان باقی رہ جاتی ہے جو ہر قسم کی ہریالی اور نباتات سے بالکل خالی ہوتی ہے۔

یہی معاملہ اکثر انسانوں کا ہے۔ وہ دیکھنے میں بظاہر بالکل ٹھیک معلوم ہوتے ہیں۔ ظاہری طور طریق میں بہت "شاداب" نظر آتے ہیں۔ مگر حالات کا ایک جھٹکا ان کی ساری شادابی اور ہریالی کو ختم کر دیتا ہے اس کے بعد ان کی شخصیت ایک سوکھے پتھر کی مانند ہو کر رہ جاتی ہے۔

ایک شخص جو بات چیت میں شرافت اور معقولیت کی تصویر بنا ہوا تھا وہ عملی تجربہ کے وقت اچانک ایک نامعقول انسان بن جاتا ہے۔ ایک شخص جو انصاف اور انسانیت کے موضوع پر تقریر کر رہا تھا وہ عمل کے موقع پر بے انصافی کا طریقہ اختیار کر لیتا ہے۔ ایک شخص جو مسجد کے رکوع اور سجدہ میں تواضع کا مظاہرہ کر رہا تھا وہ مسجد کے باہر انسانوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں گھمنڈ اور خود پسندی کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ ایک شخص جو دوسروں کو عالی ظرفی اور حقوق رسی کی تلقین کر رہا تھا جب اس کا اپنا وقت آتا ہے تو وہ بغض، حسد اور ظلم کے راستہ پر چلنے لگتا ہے

یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کی آزمائش ہو رہی ہے۔ یہ آزمائش معمول کے حالات میں نہیں ہوتی بلکہ غیر معمولی حالات میں ہوتی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ آدمی عین اس وقت ناکام ہو جاتا ہے جب کہ اس کو سب سے زیادہ کامیابی کا ثبوت دینا چاہیے۔

لوگ باتوں میں حق پرستی کا ثبوت دے رہے ہیں حالانکہ حق پرستی وہ ہے جس کا ثبوت عمل سے دیا جائے۔ لوگ دوستی کے وقت خوش اخلاق بنے رہتے ہیں حالانکہ خوش اخلاق وہ ہے جو بگاڑ کے وقت خوش اخلاق ثابت ہو۔ لوگ خدا کے سامنے تواضع کی رسم ادا کر کے مطمئن ہیں حالانکہ کسی کا متواضع ہونا یہ ہے کہ وہ بندوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں تواضع پر قائم رہے۔

چٹان کی مٹی پر کی جانے والی کھیتی نمائشی کھیتی ہے۔ ایسی کھیتی کسی کسان کے کچھ کام آنے والی نہیں۔ سیلاب کا ایک ہی ریلا اس کو جھوٹی کھیتی ثابت کر دیتا ہے۔ اسی طرح نمائشی حق پرستی بھی جھوٹی حق پرستی ہے جس کو قیامت کا سیلاب اس طرح باطل ثابت کر دے گا کہ وہاں اس کے لئے کچھ نہ ہوگا جو اس کا سہارا بنے۔

یہ انسان!

حضرت مسیح کے وعظوں میں سے ایک وعظ میں داعی اور مدعو کی تمثیل ہے۔ یہاں ہم اس تمثیل کا عربی اور اردو ترجمہ نقل کرتے ہیں:

وبمن اُشبّہ ھٰذا الجیل۔ یُشبہ اولاداً جالسین فی الاسواق ینادون الی اصحابھم ویقولون: زمّرنا لکم فما رقصتم وندبنا لکم فما بکیتم (متی ۱۱: ۱۶)

پس اِس زمانہ کے لوگوں کو میں کس سے تشبیہ دوں وہ ان لڑکوں کی مانند ہیں جو بازاروں میں بیٹھے ہوئے اپنے ساتھیوں کو پکار کر کہتے ہیں۔ ہم نے تمہارے لئے بانسری بجائی اور تم نہ ناچے۔ ہم نے ماتم کیا اور تم نہیں روئے

خدا کا داعی خدا کے سمندر میں نہاتا ہے۔ اس طرح اس کے لئے ممکن ہوتا ہے کہ وہ خدا کی دنیا میں خدا کے گیت گائے۔ وہ فطرت کے ساز پر خدا کے ابدی نغمے چھیڑے۔ ان نغمات میں ایک طرف خدا کے حسن وکمال کی تجلیاں ہوتی ہیں جن کا تقاضا ہوتا ہے کہ ان کو سن کر آدمی رقص کر اٹھے۔ دوسری طرف ان نغمات میں خدا کی پکڑ کی تنبیہات ہوتی ہیں جو ایک حساس انسان کو تڑپا کر اسے رلا دیں۔ داعی خدا کے جمال وجلال کا مظہر ہوتا ہے۔ مگر انسان اتنا غافل ہے کہ وہ ان چیزوں سے کوئی اثر نہیں لیتا۔ داعی کے کلام کی صورت میں خدا بالکل اس کے قریب آجاتا ہے۔ مگر اس وقت بھی وہ خدا کو نہیں پاتا۔ اس میں نہ حمد خداوندی کی کیفیات جاگتیں اور نہ خوف خدا سے اس کی آنکھیں تر ہوتیں۔ وہ نازک ترین پیغامات کو بھی پتھر کی طرح سنتا ہے نہ کہ اس انسان کی طرح جس کو خدا نے وہ عقل دی ہے جو باتوں کی گہرائی کو پالے اور وہ دل دیا ہے جو درد سے تڑپ اٹھے۔

خدا کی طرف سے ایک پکارنے والے کا وجود میں آنا کسی مشین پر بجنے والے ریکارڈ کا وجود میں آنا نہیں ہے۔ یہ روح انسانی میں ایک ایسے انقلاب کا برپا ہوتا ہے جس کی شدت آتش فشاں پہاڑوں سے بھی زیادہ سخت ہوتی ہے۔ داعی کا بولنا اپنے جگر کے ٹکڑوں کو باہر لانا ہوتا ہے۔ اس کا لکھنا اپنے خون کو سیاہی بنانے کے بعد وجود میں آتا ہے۔ اس کے نغمے محض نغمے نہیں ہوتے بلکہ روح انسانی میں ایک خدائی بھونچال کی آواز ہوتے ہیں۔ مگر اس دنیا کا شاید یہ سب سے زیادہ عجیب واقعہ ہے کہ ایسے ربانی کلمات بھی انسان کو متاثر نہیں کرتے۔ داعی اپنے پورے وجود کے ساتھ اس کے سامنے "نذیر عریاں" بن جاتا ہے، اس کے باوجود وہ اندھا بہرا بنا رہتا ہے۔ انسان کے سامنے جنت کی کھڑکیاں کھولی جاتی ہیں پھر بھی وہ وجد میں نہیں آتا۔ اس کو بھڑکتے ہوئے جہنم کا نقشہ دکھایا جاتا ہے پھر بھی اس پر گریہ طاری نہیں ہوتا۔ اس کے سامنے خدا خود آکر کھڑا ہو جاتا ہے پھر بھی وہ سجدہ میں نہیں گرتا۔ انسان سے زیادہ نازک مخلوق خدا نے کوئی نہیں بنائی مگر انسان سے زیادہ بے حسی کا ثبوت بھی کوئی نہیں دیتا۔

مذہب اور سائنس

فہرست

طریق استدلال کا مسئلہ ———— ۵
استدلال کے تین طریقے
برٹرینڈرسل کے خیالات ———— ۱۵
تشکیک ناقابل عمل
براہ راست استدلال ممکن نہیں
کائنات کی مشینی تعبیر ———— ۲۴
اصول تعلیل کا خاتمہ
علم کا قافلہ غیر مشینی حقیقت کی طرف
کچھ نئی حقیقتیں ———— ۳۰
زندگی بعد موت پر نئے شواہد
مذہب اور سائنس ———— ۳۴
کائنات کی توجیہہ خدا کو مانے بغیر ممکن نہیں
نظریۂ ارتقاء
سائنس صرف ڈھانچہ کی معلومات دیتی ہے
سائنس میں نئے دور کا آغاز
انسان جس کو سائنس دریافت نہ کرسکی ———— ۴۷
ڈاکٹر الکسس کیرل کا تجزیہ
مادی علوم زندگی کے سوالات کا جواب دینے کے لئے ناکافی ہیں
دور جدید کا مذہب ———— ۵۴
:نسانی ساخت کا مذہب بنانے کی کوشش بے معنی
جولین ہکسلے کے خیالات کا تجزیہ
مادی علوم پر انسانی علوم کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔
مذہب کی ملحدانہ تشریح ———— ۶۴
الہام اور شاعری میں نوعیت کا فرق
مذہب محض روحانی تجربہ نہیں
کتابیات ———— ۷۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مذہب کی تعلیمات مجرد تعلیمات نہیں ہیں بلکہ وہ کائنات کی ابدی صداقتیں ہیں۔ ہماری نجات کی واحد صورت یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو ان صداقتوں سے ہم آہنگ کریں، ٹھیک ویسے ہی جیسے ہم سورج کی روشنی سے اپنے کو ہم آہنگ کرتے ہیں۔ ان صداقتوں کے معاملہ میں نہ ہم انکار کا رویہ اختیار کرسکتے اور نہ ان کے معاملہ میں غیر جانب دار ہو سکتے۔ اپنے کو ان سے ہم آہنگ بنانے کے سوا کوئی بھی دوسرا رویہ ہم کو صرف ایک انجام تک پہنچانے والا ہے۔ اور وہ ہے ابدی تباہی۔

مذہب کی تعلیمات کو ان کی قطعی اور یقینی صورت میں جاننے کا ذریعہ وحی ہے۔ خدا کے پیغمبروں نے ان تعلیمات کو براہ راست خالق کائنات سے لے کر انسانوں تک پہنچایا۔ پیغمبروں کی دعوت پر جب ان کے مخاطبین نے شک و شبہ کا اظہار کیا تو انھوں نے کہا: کیا تم اس خدا کے بارے میں شک کرتے ہو جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا (قالت رسلھم افی اللہ شک فاطر السمٰوٰتِ وَالارض، ابراہیم ۱۰) اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبروں نے اپنے پیغام کی صداقت پر جو دلیل پیش کی وہ فطرت کی دلیل تھی۔ زمین و آسمان کی صورت میں جو مظاہر ہمارے سامنے پھیلے ہوئے ہیں، وہ مشاہداتی طور پر اس تعلیم کے حق میں گواہی دے رہے ہیں جو پیغمبروں نے فطری طور پر پیش کی۔ یہ دلیل آج بھی پوری طرح مذہب کی تائید میں موجود ہے۔

پیغمبروں کا زمانہ سائنسی دور سے پہلے کا زمانہ ہے۔ اس زمانہ میں آدمی زمین و آسمان کے مظاہر کے بارے میں بہت کم باتیں جانتا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں جب کہ زمین و آسمان کے بارے میں انسان کی معلومات میں کروروں گنا اضافہ ہو گیا ہے، اب بھی اس استدلال کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جدید تحقیقات نے پیغمبروں کی تعلیم کی صداقت کو اور زیادہ مضبوطی کے ساتھ ثابت کیا ہے۔

جدید علم نے کائنات کی جو تصویر بنائی ہے وہ ایک حد درجہ محکم اور منظم کائنات ہے۔ اس سے اولاً یہ قیاس کیا گیا کہ یہ ایک قسم کا مشینی نظام ہے جو اسباب و علل کے زور پر اپنے آپ چل رہا ہے لیکن گہرے مطالعہ نے اس مفروضہ کو بے بنیاد ثابت کر دیا۔ معلوم ہوا کہ کائنات کا نظام محکم ہونے کے ساتھ مکمل طور پر غیر مشینی ہے۔ وہ ہر آن ایک محرک اور منتظم کا طالب ہے۔ اسی طرح معلومات کے اضافہ سے یہ فرض کر لیا گیا کہ انسان کا اپنا علم ہی ساری حقیقتوں کو جاننے کے لئے کافی ہو جائے گا، وحی و الہام کا سہارا لینے کی ضرورت نہ ہوگی۔ مگر تحقیق نے اس کو بھی بے بنیاد ثابت کر دیا۔ معلوم ہوا کہ کائنات کے کلی علم تک پہنچنے کے لئے انسان کی صلاحیتیں فیصلہ کن طور پر ناکافی ہیں۔ ہمارے لئے خارجی علم کا سہارا لینے کے سوا دوسری کوئی صورت نہیں۔ اس طرح جدید علم ہر لحاظ سے مذہب کی بنیاد کو مضبوط کرتا جا رہا ہے، اس نے کسی بھی اعتبار سے اس کو کمزور نہیں کیا ہے۔

جدید مطالعہ سے یہ بات بھی ثابت ہوئی ہے کہ مذہب کا جذبہ انسان کا فطری جذبہ ہے۔ کسی طرح اس کو انسان سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ جدید دور میں آخری کوشش یہ کی گئی کہ وحی سے آزاد ہو کر انسانی ساخت کا ایک "مذہب" بنایا جائے اور اس کو انسان کی مذہبی تلاش کے جواب کے طور پر پیش کیا جائے۔ مگر اب تک کی کوششوں نے صرف یہ بتایا ہے کہ جس کائنات میں انسان کلی علم تک پہنچنے سے عاجز ہے، اس کائنات میں بسنے والی مخلوق کے لئے وہ ایسا دین بھی وضع نہیں کر سکتا جو حقائق کائنات سے کلی مطابقت رکھنے والا ہو۔

وحید الدین ۱۹ مارچ ۱۹۷۱

طریق استدلال کا مسئلہ

ٹی ۔ آر ۔ مائلز (T.R. Miles) نے کہا ہے :

" ماضی کے علمائے مذاہب کی مثال ایسے شخص کی سی ہے جس نے ایک بیکار چک (Dud Cheqe) لکھ دیا ہو جس کے لئے بنک میں واقعی رقم موجود نہ ہو۔ یہ لوگ ایسے الفاظ استعمال کرتے رہے جن کے پیچھے معنویت کا سرمایہ نہیں تھا۔ " ناقابل تغیر حقیقت اعلیٰ " قواعد زبان کی رو سے ایک صحیح جملہ ہے مگر وہ ایک بے کار چک ہے جس کے پیچھے کوئی حقیقی سرمایہ موجود نہیں "

Religion and the Scientific Outlook, P. 20

اس بیان کا مطلب یہ ہے کہ مذہب کے جو دعوے ہیں ان کی بنیاد کسی دلیل پر قائم نہیں ہے۔ مذہب خالص اعتقادی چیز ہے۔ جبکہ کسی چیز کا حقیقت ہونا اس وقت متحقق ہوتا ہے جبکہ وہ اعتقاد کی اندرونی دنیا سے باہر ثابت کی جاسکے۔ مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ " کہکشاں نورانی بادل نہیں بلکہ الگ الگ ستاروں کا مجموعہ ہے " ابتدائی طور پر یہ بیان صرف ایک عقیدہ ہے۔ مگر جب مدعی اسے دوربین کے شیشہ میں دکھا دے تو یہ عقیدہ ایک ایسی حقیقت بن جاتا ہے جو ہر ایک کے لئے قابل مشاہدہ ہو۔ مذہب کی صداقتوں کو اس طور پر خارج میں (Demonstrate) نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے مذہب صرف ایک دعویٰ یا عقیدہ ہے۔ اس سے زیادہ اس کو کوئی حیثیت حاصل نہیں۔

آیئے اس سوال کا تجزیہ کریں۔ یہ معیارِ استدلال جس کا اوپر ذکر ہوا، سادہ طور پر ایک واحد چیز نظر آتا ہے۔ مگر عمل میں آنے کے بعد اس کے کئی درجے بن جاتے ہیں۔

۱۔ اس کا ابتدائی درجہ یہ ہے کہ جو چیز زیر بحث ہے خود وہ چیز براہ راست ہمارے اپنے تجربے اور مشاہدے میں آجائے۔ مثال کے طور پر ایک شخص دعویٰ کرتا ہے کہ " پانی میں کیڑے ہوتے ہیں " بظاہر یہ عجیب سا دعویٰ ہے۔ مگر جب ہم اس دعوے کو جانچنے کے لئے پانی کے قطرے کو خوردبین کے شیشے کے نیچے رکھتے ہیں تو واقعی ہمیں نظر آتا ہے کہ پانی کے اندر بے شمار چھوٹے چھوٹے کیڑے بلبلا رہے ہیں۔

۲۔ دوسرا درجہ وہ ہے جب کہ دعویٰ پورا کا پورا تو نظر نہ آئے۔ مگر اس کے کچھ اجزاء (Patches) دکھائی دے رہے ہوں۔ مثال کے طور پر یہ دعویٰ کہ " زمین گول ہے " اپنی پوری شکل میں کسی بھی طرح انسانی مشاہدہ میں نہیں

آسکتا۔ مگر اس کی گولائی کے بعض حصوں کو ہم بلاشبہ دیکھ سکتے ہیں۔ مثلاً ایک خلائی جہاز جب اوپر اٹھ کر دوربینی کیمرے سے زمین کی تصویر لیتا ہے تو وہ اس میں اسی طرح گول نظر آتی ہے جیسے چاند۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ اس کی گولائی کا صرف جزو ہوتا ہے، نہ کہ کل۔

۳۔ مگر اس طرح کے مشاہدات سے جو حقائق ہمارے ادراک میں آتے ہیں وہ اس دنیا کے بہت معمولی حقائق ہیں۔ ان مشاہدات سے کوئی بھی معنی خیز حقیقت (Significant Fact) حاصل نہیں ہوتی۔ حالانکہ دنیا کے بارے میں ہمارا تجربہ بتاتا ہے کہ وہ بے شمار معنی خیز حقائق سے بھری ہوئی ہے۔

یہاں جدید ذہن اپنے معیار استدلال میں ایک اور اضافہ کرتا ہے اور وہ یہ کہ — وہ استدلال بھی ایک صحیح معیار استدلال ہے جس میں اگرچہ اصل حقیقت کو براہ راست دکھایا نہ گیا ہو۔ مگر اس کے کچھ ایسے پہلو ہمارے تجربے میں آتے ہوں جن سے قیاس کیا جا سکے کہ ایسی کوئی حقیقت یہاں پائی جارہی ہے۔ مثال کے طور پر الکٹران بذات خود ایک ناقابل مشاہدہ چیز ہے۔ وہ اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ نہ کوئی خوردبین اسے دکھا سکتی اور نہ کوئی ترازو اسے تول سکتا۔ مگر اس کے باوجود سائنس کی دنیا میں الکٹران کو ایک حقیقت سمجھا جاتا ہے — کیوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ الکٹران بذات خود تو نظر نہیں آتا، مگر اس کے کچھ ایسے اثرات (Effects) قابل اعادہ تجربات کی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں جن کی توجیہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ ہم الکٹران جیسے ایک نظام کا وجود فرض کریں۔ الکٹران بذات خود ایک مفروضہ ہے مگر اس مفروضہ کی بنیاد چونکہ بالواسطہ تجربہ پر ہے۔ اس لئے سائنس اسے تسلیم کرتی ہے۔

معیار استدلال میں اس تیسرے اضافہ ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ معنی خیز حقائق ہمارے دسترس میں آسکے جن کا دوسرا نام جدید طبیعیات یا نیوکلیر سائنس ہے۔

(۴) مگر مطالعہ نے بتایا کہ یہ تیسرا معیار بھی آخری نہیں ہے۔ اس سے جو حقائق ہمیں دستیاب ہوتے ہیں، وہ تمام تر وہی ہیں جن کو ایک عالم نے تکنیکی حقائق (Technical Truths) کہا ہے جب کہ کائنات کی وسعت تکنیکی حقائق سے بہت آگے جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زیادہ معنی خیز حقائق وہاں سے شروع ہوتے ہیں جہاں تکنیکی حقائق کا خاتمہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر جسم انسانی کا حیاتیاتی اور عضویاتی مطالعہ ہمارے سامنے بہت سے حقائق کھولتا ہے اور بلاشبہ ان کے اندر معنویت بھی ہے۔ مگر اس سے زیادہ معنی خیز حقیقت وہ ہے جو انسان کے آغاز و انجام سے متعلق ہے مگر یہاں حیاتیات اور عضویات کا رواجی مطالعہ ہمارا ساتھ نہیں دیتا۔ اسی لئے ایک مغربی عالم نے کہا ہے:

The knowable is unimportant, and the important is unknowable.

جو چیز قابل دریافت ہے وہ غیر اہم ہے اور جو چیز اہم ہے وہ قابل دریافت نہیں۔

اب جدید ذہن معیار استدلال کی فہرست میں ایک اور معیار کا اضافہ کرتا ہے۔ اور وہ یہ کہ مشاہدات اور تجربات خواہ خالص ٹکنکل سائنس کے معنی میں، اصل دعوے سے براہ راست مربوط نہ ہوں، مگر وہ اصل دعوے کے حق میں جائز قرینہ پیدا کرتے ہوں، نیز ان کی توجیہہ کے لئے دوسرا کوئی بہتر تصور موجود نہ ہو، تو ایسے استدلال کو بھی جائز اور صحیح استدلال سمجھا جائے گا۔

یہ آخری معیار استدلال بھی جدید ذہن کے لئے ایک معقول معیار (Valid Criterion) ہے اور جو چیز اس معیار پر قرار واقعی طور پر پوری اترے، اس کو بھی ایک ثابت شدہ چیز سمجھا جائے گا۔ اس کی وضاحت کے لئے میں یہاں دو مثالیں دینا چاہتا ہوں۔ ایک منفی اور دوسری مثبت۔

منفی مثال کے ذیل میں جدید ذہن کے خلافِ مذہب نظریات کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ مذہب کے سلسلے میں جدید ذہن کا کہنا صرف یہ نہیں ہے کہ وہ ہمارے لئے قابل فہم نہیں ہے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر خود مذہب کی واقعیت کے بارے میں اس نے ایک بیان (Statement) دے دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ مذہب ایک سراسر غلط اور بے بنیاد چیز ہے۔

انکار مذہب کا یہ دعویٰ کس معیار استدلال کے تحت کیا گیا ہے۔ وہ تمام تر اسی معیار کے تحت ہے جس کو ہم نے اوپر نمبر ۴ کے ذیل میں بیان کیا ہے۔ گویا جدید ذہن مذہب کے خلاف دلیل قائم کرنے کے لئے اس چوتھے معیار کو ایک جائز اور معقول معیار تسلیم کرتا ہے۔

مذہب کے خلاف دور جدید کا مقدمہ بیک وقت دو متضاد پہلوؤں کا حامل ہے۔ ایک طرف جدید ذہن کا کہنا ہے کہ مذہب چونکہ ایسے عقائد کے مجموعے کا نام ہے جس کا مظاہرہ (Demonstration) ممکن نہیں ہے، اس لئے وہ شخصی عقیدہ کی چیز ہے۔ دوسروں سے اس کے ماننے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ دوسری طرف فلسفیوں اور سائنس دانوں کی ایک فوج یہ بھی کہہ رہی ہے کہ جدید دریافتوں نے مذہبی عقائد کو باطل ثابت کر دیا ہے۔

یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ کیونکہ مذہب اگر ایک ایسے دائرہ کی چیز ہے جس کو دوسرے شخص کے سامنے علمی طور پر ثابت نہیں کیا جاسکتا، تو جس طرح اس کا ثابت کرنا ناممکن ہوگا، اسی طرح اس کو رد کرنا بھی ناممکن ہونا چاہئے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو دور جدید کے موقف کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ہم مذہب کو علمی طور پر مدلل کرنا چاہیں تو وہ کہیں گے کہ تم فضول کوشش کر رہے ہو کیونکہ مذہب ثابت کرنے کی چیز ہی نہیں۔ لیکن جب وہ خود مذہب کے خلاف دلیل قائم کرنا چاہیں تو مذہب ایک ایسے دائرہ کی چیز بن جاتا ہے جہاں علمی دلائل قائم کئے جاسکتے ہوں۔

اس تضاد کی وجہ حقیقۃً یہ نہیں ہے کہ مذہب واقعی ایسے دائرہ سے تعلق رکھتا ہے جہاں دلائل قائم نہ کئے جاسکتے ہوں۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ مخالفین مذہب یہ نہیں چاہتے کہ جس اصول استدلال کے تحت انھوں نے مذہب کا

رد کرنا چاہی ہے ، اس اصول استدلال کو اہل مذاہب اس کے اثبات کے لئے استعمال کریں۔ کیونکہ اگر ایسا ہوا تو انھیں مذہب کی معقولیت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے کسی عدالت میں سرکاری وکیل تو اپنا فرض انجام دے رہا ہو مگر ملزم کو اپنا وکیل رکھنے کی اجازت نہ ہو۔ سرکاری وکیل کا ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ حکومت اس اصول کو تسلیم کرتی ہے کہ مقدمہ کی وضاحت کے لئے وکیل ہونا چاہئے۔ مگر اس اصول کو جب ملزم استعمال کرنا چاہے تو حکومت اس کی مخالف ہو جاتی ہے کیونکہ اسے اندیشہ ہوتا ہے کہ اس کا فائدہ کہیں ملزم کو نہ پہنچ جائے۔

اگر اصول یہ ہے کہ حقیقت صرف مشاہدہ اور تجربہ سے حاصل شدہ چیز کا نام ہے تو مذہب کے مخالفین کا موقف اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب کہ انھوں نے مشاہدہ اور تجربہ کے ذریعہ براہ راست طور پر یہ معلوم کر لیا ہو کہ فی الواقع مذہب کوئی چیز نہیں ہے۔ مثلاً ان کا مشاہدہ اس حد تک مکمل ہو چکا ہو کہ وہ کہہ سکیں کہ عالم کے اندر اور عالم کے باہر جو کچھ ہے وہ سب ہم آخری حد تک دیکھ چکے ہیں اور اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہاں نہ خدا ہے، نہ فرشتے، نہ جنت نہ دوزخ، بالکل اسی طرح جیسے ۱۰ فٹ چوڑے اور ۱۰ فٹ لمبے ایک خالی کمرے کے اندر ایک بینا شخص جو تو وہ اس میں نظر دوڑا کر یہ کہنے کی پوزیشن میں ہوتا ہے کہ اس کے اندر کوئی ہاتھی یا شیر موجود نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ مخالفین مذہب اس موقف میں نہیں ہیں۔ پھر استدلال کا وہ کون سا طریقہ ہے جس سے انھوں نے مذہب کے خلاف مواد حاصل کیا ہے۔ یہ مذہب کا براہ راست مشاہدہ نہیں بلکہ بعض مشاہدات کی توجیہ ہے (مثلاً عالم افلاک میں باہمی کشش کو دریافت کرنے کے بعد یہ کہنا کہ کوئی خدا نہیں ہے جو کائنات کو سنبھالے ہوئے ہو۔ کیونکہ قانون کشش اس کی توجیہ کے لئے موجود ہے) ظاہر ہے کہ یہاں جس مشاہدہ کی بنیاد پر دلیل قائم کی گئی ہے، وہ خود خدا کا عدم وجود نہیں ہے۔ یعنی کسی دوربین نے آخری طور پر ہمیں یہ خبر نہیں دے دی ہے کہ یہ کائنات خدا سے خالی ہے بلکہ ایک خارجی مشاہدہ کی بنیاد پر یہ استنباط کیا گیا ہے کہ خدا کو نہیں ہونا چاہئے۔ گویا مشاہدہ یا تجربہ خود عدم وجود کا نہیں ہوا ہے بلکہ ایک اور واقعہ کا ہوا ہے جس سے عدم وجود کو قیاس کر لیا گیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ یہ اصولِ استدلال جس کو موجودہ زمانے میں مذہب کے رد کے لئے صحیح سمجھا گیا ہے وہی مذہب کی صداقت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ غلطی اصول استدلال میں نہیں بلکہ اصول استدلال کے انطباق میں ہے۔ اگر اس کو صحیح طور پر منطبق کیا جائے تو نتیجہ بالکل برعکس برآمد ہوگا۔

اس سے ظاہر ہوا کہ استدلال کے چوتھے معیار کو بھی جدید ذہن، ایک جائز اور معقول معیار (Valid Criterion) تسلیم کرتا ہے۔

اوپر ہم نے چوتھے معیار استدلال کی منفی مثال دی تھی۔ مثبت مثال کے ذیل میں عضویاتی ارتقا (Organic Evolution) کو پیش کیا جا سکتا ہے جس کو جدید دنیا میں اس طرح تسلیم کر لیا گیا ہے کہ آج علم کی تمام شاخوں

چی اس کے اثرات پھیل چکے ہیں۔ نظریہ ارتقاء کی صداقت کا ثبوت پہلے اور دوسرے اور تیسرے معیار کے مطابق حاصل نہیں ہوتا۔ اس کی صداقت کا واحد ثبوت صرف اس معیار استدلال میں ملتا ہے جس کو اوپر نمبر ۳ کے تحت بیان کیا گیا ہے
عضویاتی ارتقاء جدید دنیا کے لئے ایک سائنٹفک حقیقت ہے۔ "سائنس آف لائف" کے مصنفین نے لکھا ہے
۔۔۔ عضویاتی ارتقاء کے حقیقت ہونے سے اب کسی کو انکار نہیں ہے۔ سوا ان لوگوں کے جو جاہل ہوں یا متعصب ہوں یا اوہام پرستی میں مبتلا ہوں۔" ماڈرن پاکٹ لائبریری (نیویارک) نے (Man and the Universe) کے نام سے کتابوں کا ایک سلسلہ شائع کیا ہے۔ اس سلسلے کی پانچویں کتاب میں ڈارون کی کتاب "اصل الانواع" کو تاریخ ساز تصنیف قرار دیتے ہوئے کہا گیا ہے:۔

"انسان اپنا شجرۂ نسب معلوم کرنے کے لئے طویل ترین مدت سے جو کوشش کر رہا ہے، اس سلسلہ میں کسی نظریے کو اتنی زبردست مذہبی مخالفت کا سامنا کرنا نہیں پڑا جتنا چارلس ڈارون کے انتخاب طبعی کو۔ اور نہ کسی دوسرے نظریے کو اتنی زیادہ سائنسی تصدیق (Scientific Affirmation) حاصل ہوئی ہے جتنی اس نظریے کو حاصل ہوئی ہے"

Philosophers of Science, P. 244

امریکا کا مشہور ارتقاء پسند عالم سمپسن (G.G. Simpson) لکھتا ہے:

"ڈارون تاریخ کے بلند ترین لوگوں میں سے ایک تھا جس نے انسانی علم کی ترقی میں بہت نمایاں کام انجام دیا ہے۔ یہ مقام اس نے اس لئے حاصل کیا کہ اس نے نظریہ ارتقاء کو آخری اور کلی طور پر ایک حقیقت ثابت کر دیا نہ کہ محض ایک قیاس یا متبادل مفروضہ جو سائنسی تحقیق کے لئے قائم کر لیا گیا ہو۔"

Meaning of Evolution (N.Y. 1951) P. 127

اے۔ ای۔ مینڈر لکھتا ہے:

"یہ نظریہ کہ انسان اور دوسری ذی حیات اشیاء کے موجودہ صورت تک پہنچنے میں ارتقاء کا عمل ہوا ہے، یہ اب اتنے دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس کو تقریباً حقیقت (Approximate Certainty) کہا جا سکتا ہے"

Clearer Thinking, P. 113

لل (R.S. Lull) لکھتا ہے:

"ڈارون کے بعد سے نظریۂ ارتقاء دن بدن زیادہ قبولیت حاصل کرتا رہا ہے، یہاں تک کہ اب سوچنے اور جاننے والے لوگوں میں اس بارے میں کوئی شبہ نہیں رہ گیا ہے کہ یہ واحد منطقی طریقہ ہے جس کے تحت عمل تخلیق کی توجیہہ ہو سکتی ہے اور اس کو سمجھا جا سکتا ہے۔"

Organic Evolution, P. 15

وہ مزید لکھتا ہے:

"تمام سائنس داں اور دوسرے جاننے والوں میں سے بیشتر لوگ نظریۂ ارتقا کی صداقت (Truth) پر مطمئن ہو چکے ہیں۔ خواہ وہ جمادات سے متعلق ہو یا حیوانات سے متعلق۔ یعنی یہ کہ زمین جب اس قابل ہوئی کہ اس پر زندہ چیزیں رہ سکیں، اس وقت لمبی مدت کے عمل کے نتیجہ میں زندگی کی کچھ سادہ اقسام پیدا ہوئیں۔ اور اس کے بعد طویل مدت کے مسلسل عمل سے نباتات اور حیوانات کی وہ تمام حیرت انگیز قسمیں وجود میں آئیں جن کو ہم آج اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔" (صفحہ ۸۳)

اس نظریئے کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ لل کی سات سو صفحہ کی کتاب میں زندگی کے تخلیقی تصور (Special Creation) پر صرف ایک صفحہ اور چند سطریں ہیں اور بقیہ تمام عضویاتی ارتقاء کے بارے میں ہیں۔ اسی طرح انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (۱۹۵۸) میں تخلیق (Creationism) کے نظریئے کو چوتھائی صفحے سے بھی کم دیئے گئے ہیں۔ اس کے مقابلے میں عضویاتی ارتقاء کے عنوان کے تحت جو مقالہ شامل کیا گیا ہے وہ باریک ٹائپ کے پورے چودہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس مقالے میں بھی حیوانات میں ارتقاء کو بطور ایک حقیقت (Fact) تسلیم کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ڈارون کے بعد اس نظریئے کو سائنس دانوں اور تعلیم یافتہ طبقہ کا قبول عام (General Acceptance) حاصل ہو چکا ہے۔

نظریۂ ارتقاء کے حق میں وہ کون سے دلائل فراہم ہوئے ہیں جن کی وجہ سے دور جدید کے اہل علم نے اس کی صداقت تسلیم کر لی ہے۔ یہاں میں اس کے چند بنیادی پہلوؤں کا ذکر کروں گا تاکہ اندازہ ہو سکے کہ ان دلائل کی نوعیت کیا ہے

۱۔ حیوانات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان میں ادنیٰ اور اعلیٰ اقسام پائی جاتی ہیں۔ واحد الخلیہ جانوروں (Single Cellular Animal) سے لے کر اربوں خلیات رکھنے والے جانور اور اسی طرح صلاحیتوں کے اعتبار سے حیوانات میں ادنیٰ اور اعلیٰ درجات کا فرق۔

علہ Iqbal Review April 1960

۲۔ اس ابتدائی مشاہدہ کو جب اس کہانی کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے جو زمین کی تہوں میں نقش ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس فرق میں باعتبار زمانہ ایک ارتقائی ترتیب ہے۔ کروڑوں برس پہلے زمین پر زندگی جو شکلیں آباد تھیں، ان کے پنجر قدرتی عمل کے تحت پتھرائی ہوئی حالت میں اب بھی زمین کے نیچے دبے ہوئے ہیں جن کو فاسل (Fossil) کہا جاتا ہے۔ یہ فاسل بتاتے ہیں کہ زمین کے زیادہ قدیم دور میں، حیوانات کی جو قسمیں یہاں آباد تھیں، وہ سادہ قسمیں تھیں اور اس کے بعد دھیرے دھیرے زیادہ پیچیدہ اور ترقی یافتہ قسمیں آباد ہوتی رہیں — اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کی موجودہ قسمیں سب کی سب یک وقت وجود میں نہیں آئیں بلکہ پہلے سادہ قسمیں وجود میں آئیں اور اس کے بعد دھیرے دھیرے ترقی یافتہ قسمیں

۳۔ اس کے بعد ایک اور حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے، وہ یہ کہ مختلف حیوانات کے درمیان نوعی اختلاف کے باوجود ان کے جسمانی نظام میں بہت سی مشابہتیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً چمگادڑ چھپکلی چوہے سے ملتی جلتی ہے اور گھوڑے کا ڈھانچہ انسان کے مشابہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ اس بات کا قرینہ ہے کہ سارے ذی حیات ایک ہی خاندان کی پیداوار ہیں اور سب کے اجداد بالآخر ایک ہی تھے۔

۴۔ ایک نوع سے دوسری نوع کیسے نکلی۔ یہ اس وقت معلوم ہوجاتا ہے جب ہم ایک اور واقعہ کو دیکھتے ہیں۔ وہ یہ کہ ایک جانور کے بطن سے جو بچے پیدا ہوتے ہیں وہ سب کے سب یکساں نہیں ہوتے بلکہ ان کے مختلف بچوں میں کچھ فرق ہوتا ہے۔ یہی فرق اگلی نسلوں میں مزید ترقی کرتا ہے اور انتخاب طبیعی کے عمل کے تحت آگے بڑھتا رہتا ہے۔ یہ فرق لاکھوں سال کے بعد اتنا زیادہ ہوجاتا ہے کہ ایک چھوٹی گردن والی بکری، لمبی گردن والے زرافہ کی شکل اختیار کرلیتی ہے اس نظریہ کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ "اینمیل بیالوجی" کے مصنفین (ہالڈین اور ہکسلے) نے ارتقار کو تبدیلیوں کے انتخاب (Selection of Mutation) کا نام دیا ہے۔

نظریہ ارتقار کے حامیوں کے یہ دلائل جس معیار استدلال پر پورے اترتے ہیں، وہ کون سا معیار ہے، وہ وہی معیار ہے جس کو ہم نے اوپر نمبر ۴ کے تحت بیان کیا ہے۔ یعنی دعویٰ یا اس کے اثرات کا براہ راست تجربہ نہ ہوتا۔ البتہ ایسے مشاہدات کا حاصل ہونا جن سے اس کی صداقت کا منطقی قرینہ معلوم ہوتا ہو۔

نظریۂ ارتقا کے حامی ابھی تک ان میں سے کسی ایک چیز کا بھی مشاہدہ یا تجربہ نہیں کرا سکے ہیں جن کے اوپر ان کے نظریہ کی بنیاد قائم ہے۔ مثلاً وہ کسی لیبارٹری میں یہ نہیں دکھا سکتے کہ بے جان مادہ سے زندگی کیسے پیدا ہوجاتی ہے اس سلسلے میں ان کے دعوے کی بنیاد صرف یہ ہے کہ طبیعیاتی ریکارڈ بتاتا ہے کہ پہلے بے جان مادہ تھا، پھر کائنات میں زندگی رینگنے لگی۔ اس سے وہ قیاس کرلیتے ہیں کہ زندگی بے جان مادہ سے اسی طرح نکل آئی جیسے ماں کے پیٹ سے بچہ نکلتا ہے۔ اسی طرح ایک نوع کا دوسری نوع میں تبدیل ہونا بذات خود کوئی تجربہ اور مشاہدہ کی چیز نہیں۔ ایسا نہیں ہے

کہ کسی چڑیا خانہ میں ایسے تجربات کئے جا سکیں جہاں بکری زرافہ بنتی ہوئی نظر آئے۔ بلکہ بعض خارجی مشاہدات، مثلاً مختلف انواع میں مشابہت اور ایک نسل کے کئی بچوں میں باہم فرق، سے یہ قیاس کر لیا گیا ہے کہ نوعیں الگ الگ وجود میں نہیں آئیں بلکہ ہر نوع دوسری نوع سے برآمد ہوتی چلی گئی ہے۔ اسی طرح جبلت کا ذہانت کی شکل میں ترقی کرنے کا معاملہ ہے جس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ انسان بھی حیوان ہی کی ایک اگلی نسل ہے۔ اس سلسلے میں بھی ابھی تک ایسا کوئی مشاہدہ سامنے نہیں لایا جا سکا جہاں فی الواقع جبلت ذہانت میں تبدیل ہوتی نظر آ رہی ہو۔ یہ بھی محض ایک قیاس ہے جس کی بنیاد صرف اس واقعہ پر ہے کہ ارضیاتی تحقیق میں جبلت والے جانوروں کے آثار نچلے طبقات میں ملتے ہیں اور ذہانت والے جانوروں کے آثار اوپر کے طبقات میں۔

اس قسم کے تمام دلائل کی نوعیت یہ ہے کہ دعوے اور دلیل کے درمیان جو ربط ہے وہ صرف قیاسی ربط ہے نہ کہ تجرباتی یا مشاہداتی ربط۔ مگر اس قسم کے دلائل کی بنیاد پر ارتقا کے تصور کو موجودہ زمانہ میں، ایک سائنٹفک حقیقت قرار دے دیا گیا ہے۔ گویا جدید ذہن کے نزدیک علمی حقائق کا دائرہ صرف انھیں واقعات تک محدود نہیں ہے جو براہ راست تجربے سے معلوم ہوں۔ بلکہ تجربات اور مشاہدات کی بنیاد پر جو منطقی قرینہ حاصل ہوتا ہے وہ بھی اتنا ہی سائنٹفک حقیقت ہو سکتا ہے جتنی وہ حقیقت جس کا یا جس کے اثرات کا براہ راست تجربہ کیا جا سکتا ہو۔

یہاں مجھے نظریۂ ارتقا کی صداقت یا عدم صداقت سے بحث نہیں ہے، کیونکہ یہاں جو سوال ہے وہ اصلاً معیار استدلال سے متعلق ہے نہ کہ نظریۂ ارتقا سے متعلق۔ اور یہ ایک معلوم بات ہے کہ خواہ کوئی بھی معیار استدلال ہو، اس سے ثابت کی ہوئی چیز صحیح بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی۔ سائنس میں آئے دن نظریات بدلتے رہتے ہیں، حالانکہ وہ عموماً ان معیاروں کے مطابق ثابت کئے جاتے ہیں جو خالص تجرباتی نوعیت سے متعلق ہیں۔ کسی معیار استدلال کو جائز اور معقول تسلیم کرنے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس کے حوالے سے جو بات بھی پیش کر دی جائے وہ لازماً صحیح ہو۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ نتیجہ غلط ہو۔ مگر معیار تسلیم شدہ ہے تو اصل معیار کی معقولیت اس کے بعد بھی باقی رہے گی۔

سر آرتھر کیتھ کے الفاظ میں ارتقا، مذہب عقلیت کا ایک بنیادی عقیدہ (Basic Dogma of Rationalism) ہے۔ ایک سائنسی انسائیکلوپیڈیا میں ڈارونزم کو ایک ایسا نظریہ کہا گیا ہے جس کی بنیاد توجیہ بلا مشاہدہ (Explanations without Demonstrations) پر قائم ہے[۱۵] پھر ایک ایسی چیز جس کا لیبارٹری میں تجربہ نہ کیا جا سکتا ہو جو صرف "عقیدہ" ہو۔ اس کو کس بنا پر علمی حقیقت سمجھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ اے۔ ای مینڈر کے الفاظ میں یہ ہے:

---

۱۵ Revolt-Against Reason, P. III-12,

۱۔ یہ نظریہ تمام معلوم حقیقتوں سے ہم آہنگ (Consistent) ہے
۲۔ اس نظریے میں ان بہت سے واقعات کی توجیہ مل جاتی ہے جو اس کے بغیر سمجھے نہیں جا سکتے۔
۳۔ دوسرا کوئی نظریہ ابھی تک ایسا سامنے نہیں آیا جو واقعات سے اس درجہ مطابقت رکھتا ہو۔
(صفحہ ۱۱۲)

یہ استدلال جو نظریہ ارتقاء کو حقیقت قرار دینے کے لئے معیار استدلال کے اعتبار سے کافی سمجھا جاتا ہے، یہی استدلال بدرجہا زیادہ شدت کے ساتھ مذہب کے حق میں موجود ہے۔ ایسی حالت میں جدید ذہن کے پاس کوئی وجہ جواز نہیں ہے کہ وہ کیوں ارتقاء کو سائنسی حقیقت قرار دیتا ہے اور مذہب کو سائنسی ذہن کے لئے ناقابلِ قبول ٹھیراتا ہے۔ ۶۷

مندرجہ بالا چوتھے معیار استدلال کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ جب دعوے اور تجربے میں براہ راست کوئی ربط نہیں ہے بلکہ صرف ہمارا استنباط (Inference) دونوں کو مربوط کرتا ہے تو کیسے یقین کر لیا جائے کہ ہمارا استنباط لازماً صحیح ہے۔ میں کہوں گا کہ بلاشبہ ہمارے استنباط میں غلطی ہو سکتی ہے۔ مگر صرف یہ امکان اصل معیار کی معقولیت کو متاثر نہیں کر سکتا۔ اگر محض اس بنا پر اس معیار کی معقولیت پر شبہ کیا جائے تو ٹھیک اسی دلیل کی بنیاد پر دوسرے معیاروں کو بھی مشتبہ قرار دینا پڑے گا جس پر ہماری جدید سائنس کی ساری بنیاد قائم ہے۔

سائنس میں جتنے بھی نظریات تسلیم شدہ ہیں، بلا استثنار ہر ایک کا حال یہ ہے کہ خود اصل نظریات کبھی مشاہدے یا تجربے میں نہیں آتے۔ بلکہ بعض خارجی تجربات یا مشاہدات کی بنا پر کچھ نظریات قائم کر لئے گئے ہیں۔ یہاں بھی تجربہ اور نظریہ کو جو چیز باہم مربوط کرتی ہے وہ اصلاً استنباط ہے نہ کہ خود تجربہ و مشاہدہ سائنس داں کے اس قول کا مطلب کہ Electricity means flow of electron، یہ نہیں ہوتا کہ اس نے بجلی کے کسی تار میں خوردبین سے الیکٹران کو دوڑتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔ یہ درحقیقت اس مشہود واقعہ کی ایک توجیہ ہوتی ہے کہ جب ہم بٹن دباتے ہیں تو کیوں بلب جل جاتا ہے، پنکھا گھومنے لگتا ہے۔ کارخانے متحرک ہو جاتے ہیں۔ گویا جس چیز کا تجربہ کیا گیا ہے وہ محض ایک خارجی مظہر ہے نہ کہ خود وہ واقعہ جو اس خارجی مظہر سے مستنبط (Infer) کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے سائنس کے تمام نظریات اسی طرح محض قیاسی مفروضے ہیں جن کا الزام چوتھے معیار کے تحت قائم کردہ نظریات کو دیا جاتا ہے۔

تیسرے اور چوتھے معیار میں جو واحد فرق بتایا جا سکتا ہے وہ صرف یہ کہ تیسرے معیار میں تجربہ یا مشاہدہ براہ راست طور پر خود اصل دعوے سے متعلق ہوتا ہے۔ جب کہ چوتھے معیار میں وہ براہ راست طور پر اصل دعوے سے متعلق نہیں ہوتا۔ مگر اس فرق کی اہمیت اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب ہم اس واقعہ کو سامنے رکھیں کہ تجربہ خواہ کتنا ہی متعلق اور براہ راست ہو

مگر بہر حال وہ اصل حقیقت کا صرف ایک خارجی مظہر ہوتا ہے۔ وہ بذات خود اصل حقیقت نہیں ہوتا، جیسے ٹیلی فون نمبر بلاشبہ صاحب ٹیلی فون سے متعلق ہے مگر وہ خود صاحب ٹیلی فون نہیں ہے۔ گویا یہاں بھی سائنس داں کے مشاہدے یا تجربے کو جو چیز اصل حقیقت سے جوڑتی ہے وہ صرف ایک ایسی چیز ہے جو اس کے ذہن میں ہے۔ یعنی استنباط نہ کہ خود مشاہدہ یا تجربہ۔ اسی لئے ایک سائنس داں نے اس کو "ذہنی خاکہ" قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

Theories are mental pictures that explain known laws.

گویا بٹن دبانے سے بجلی کے بلب کا جلنا اگرچہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ بٹن اور بلب میں کوئی خاص رشتہ ہے۔ مگر اس مظاہرہ کے باوجود اصل رشتہ بہرحال غیر مرئی ہے۔ اور پھر بھی یہ ہمارا استنباط ہی ہے جو بٹن اور بلب کو ایک دوسرے سے مربوط کرتا ہے۔ اس لئے بٹن اور بلب کی مشہود نوعیت کو تسلیم کرتے ہوئے یہ امر پھر بھی مشتبہ رہے گا کہ دونوں کو مربوط کرنے والا سائنسی نظریہ بذات خود حقیقی ہے یا غیر حقیقی۔ اب جس طرح یہ اشتباہ اور غلطی کا یہ امکان کسی سائنس داں کو نظریات قائم کرنے اور اس کو صحیح سمجھنے سے نہیں روکتا، اسی طرح کسی فلسفی یا کسی مذہبی شخص کو بھی مندرجہ بالا سبب کی بنا پر اس سے نہیں روکا جا سکتا کہ وہ نظریات قائم کرے اور ان کو صحیح سمجھے۔

برٹرینڈ رسل کے خیالات

یہ ۱۹۶۰ کی بات ہے۔ میں نے طے کیا کہ میں برٹرینڈ رسل (۱۸۷۲-۱۹۷۰) کو پڑھ ڈالوں۔ خوش قسمتی سے قریب ہی ایک لائبریری میں مجھے رسل کی کتابوں کا پورا سٹ مل گیا۔ مگر جب میں ان کتابوں کو لے کر گھر پہنچا تو میری بیوی ان کو دیکھ کر بہت متوحش ہوئی "اب آپ ضرور گمراہ ہو جائیں گے"، اس نے کہا۔ یہ واقعہ ہے کہ رسل اس دور کا غلیظ ترین ملحد ہے۔ اس لحاظ سے اس کی تصنیفات کو پڑھنا عام ذوق کے مطابق خطرہ سے خالی نہیں تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میں رسل کی دنیا میں داخل ہو کر اس طرح اس سے نکلا کہ میرا ایمان پہلے سے زیادہ پختہ ہو چکا تھا۔

موجودہ زمانہ کے فلسفیوں میں رسل کا مطالعہ سب سے زیادہ وسیع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں اگر کوئی استثنا ممکن ہے تو وہ صرف وائٹ ہڈ کا۔ برٹرینڈ رسل کی زندگی تقریباً ایک صدی پر پھیلی ہوئی ہے۔ اپنے بیان کے مطابق وہ ساری عمر دو چیزوں کی تحقیق میں مصروف رہا ——— "ہم کتنی چیزوں کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں، اور یہ کہ ہمارے علم کا کتنا حصہ یقینی ہے اور کتنا حصہ مشتبہ ہے" (۱۔ صفحہ ۱۱)

اس مقصد کے لئے رسل نے خاص طور پر چار سائنسوں کا مطالعہ کیا ——— فزکس، فزیالوجی، سائیکالوجی، اور میتھمیٹکل لاجک۔ (۱۔ صفحہ ۱۶)

اس مطالعہ کے بعد سب سے پہلے وہ تشکیک کے نقطۂ نظر کو رد کر دیتا ہے۔ اس کے الفاظ میں تشکیک نفسیاتی طور پر ناممکن ہے:

Scepticism is Psychologically Impossible (2, P. 9)

مگر یہاں انسان دو طرفہ مشکل میں مبتلا ہے۔ ایک طرف یہ کہ "ہم نہیں جانتے" کہہ کر ہم اس دنیا میں نہیں رہ سکتے۔ دوسری طرف جب ہم جاننا چاہتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس راہ میں بہت کم کامیابی کے امکانات ہیں:

"فلسفہ قدیم ترین زمانہ سے بڑے بڑے دعوے کرتا رہا ہے مگر اس کا حاصل دوسرے علوم کے مقابلہ میں بہت کم ہے" (۲۔ صفحہ ۱۳)

چنانچہ رسل خود عمر بھر کی کوشش کے باوجود کوئی منظم فلسفہ نہ بنا سکا۔ پروفیسر الان وڈ (Alan Wood) کے الفاظ میں برٹرینڈ رسل ایک ایسا فلسفی ہے جس کا اپنا کوئی فلسفہ نہیں:

Bertrand Russell is a philosopher without a philosophy.

منطق اور ریاضی کو حقیقت کی دریافت کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر رسل کے نزدیک:

Logic and mathematics . . . are the alphabet of the book of nature, not the book itself. (1, P. 277)

یعنی منطق اور ریاضی کتاب فطرت کی الف، ب ہیں، خود کتاب نہیں ہیں۔

رسل کے نزدیک علم کی دو قسمیں ہیں۔ چیزوں کا علم (Knowledge of Things) اور صداقتوں کا علم (Knowledge of Truths) (۴۔ صفحہ ۴۶) چیزوں کا علم دوسرے الفاظ میں حسی واقعات (Sensible Facts) کا علم ہے۔ مگر حسی واقعات ہی سب کچھ نہیں ہیں بلکہ ان کے پیچھے کچھ اور صداقتیں بھی چھپی ہوئی ہیں جو بذات خود ہمارے حواس میں نہیں آتیں۔ ان صداقتوں کو معلوم کرنے کا ذریعہ وہ استنباط (Inference) ہے جو حسی واقعات کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ رسل کے نزدیک استنباط صحیح (Valid) ہو سکتا ہے۔ البتہ اس کو سائنسی استنباط (Scientific Inference) ہونا چاہئے۔ (۱، صفحہ ۲۰۷)

وہ تمام چیزیں (Things) جن سے ہم استنباط کے بغیر براہ راست واقف ہوتے ہیں ان کو رسل نے اعداد و شمار (Data) کا نام دیا ہے۔ یہ اعداد و شمار ہمارے تجرباتی حواس (Observed Sensations) پر مشتمل ہوتے ہیں۔ بصری (Visual) سمعی (Auditory) لمسی Tactile وغیرہ۔ رسل کہتا ہے کہ کائنات کے بارے میں ہمارا جو سائنسی تصور ہے، وہ تجرباتی حواس کے ذریعہ معلوم شدہ چیز نہیں ہے۔ بلکہ وہ تمام تر ایک استنباطی دنیا (Infered World) ہے۔ حتیٰ کہ وہ کہتا ہے:

People's thoughts are in their heads. (1, P. 25)

یعنی لوگوں کے تصورات صرف ان کے دماغوں میں ہیں۔ اس سے باہر ان کا کہیں وجود نہیں ہے۔

رسل اپنے تمام مطالعہ کے بعد جس نتیجہ پر پہنچا ہے، وہ یہ کہ تجربہ (Experience) پر ضرورت سے زیادہ زور دیا گیا ہے اور اس لئے تجربیت (Empiricism) کو بحیثیت فلسفہ کچھ اہم محدودیتوں (Important Limitations) کا پابند ہونا چاہئے۔ (۱۹۱) "میں نے پایا کہ تقریباً تمام فلسفیوں نے یہ سمجھنے میں غلطی کی ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو صرف تجربے سے مستنبط کی جا سکتی ہے اور وہ کیا چیز ہے جو تجربہ سے مستنبط نہیں ہوتی" (۱۹۴) وہ لکھتا ہے:

"بدقسمتی سے نظری طبیعیات اب اس شان داراعتماد سے نہیں بولتی جس سے وہ سترھویں

صدی میں کلام کر رہی تھی۔ نیوٹن کا کام چار بنیادی تصورات پر مشتمل تھا۔۔۔ مکاں، زماں
مادّہ اور طاقت۔ یہ چاروں کے چاروں جدید طبیعیات میں طاقِ نسیاں کی نذر ہو گئے ہیں۔
مکاں اور زماں نیوٹن کے نزدیک ٹھوس اور مستقل چیزیں تھیں۔ اب وہ مکاں ۔ زماں
(Space-Time) سے بدل گئی ہیں جو کہ (Substantial) نہیں،
بلکہ روابط کا ایک نظام ہے۔ مادّہ نے واقعات کے ایک سلسلے کی شکل اختیار کر لی ہے۔
طاقت (Force) اب انرجی (Energy) بن چکی ہے۔ اور انرجی خود
بھی ایک ایسی چیز ہے جس کو بقیہ مادہ سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ سبب (Cause)
جو کہ اس چیز کی فلسفیانہ شکل تھی جس کو علمائے طبیعیات فورس (Force) کہتے ہیں
وہ اب فرسودہ ہو چکا ہے۔ میں تسلیم نہیں کروں گا کہ یہ مر چکا ہے۔ مگر اس میں پہلے کی طرح
اب قوت باقی نہیں رہی ہے" (۱۷)

رسل اپنے بیان کے مطابق عمر بھر کی تحقیقات کے بعد آخری طور پر جس نتیجہ پر پہنچا ہے وہ یہ کہ ناقابلِ مظاہرہ
استنباط (Non-Demonstratable Inference) بھی معقول (Valid) ہے۔
اس کے بغیر سائنس کا پورا نظام اور روزمرہ کی انسانی زندگی دونوں مفلوج ہو جائیں گے۔ (۲۰۳)۔ اس کے نزدیک
سائنس حقیقی دنیا (Real World) اور اعتقادی دنیا (Beleived World) دونوں
پر مشتمل ہے۔ اور سائنس میں جتنی زیادہ ترقی ہوتی ہے، اس میں اعتقادیات کا جزو بڑھتا جاتا ہے۔ سائنس میں کچھ چیزیں
تو مشہود حقائق (Observed Facts) ہیں اور اس سے اوپر کی تمام چیزیں سائنسی مجردات
(Scientific Abstractions) ہیں جو مشاہدہ کی بنیاد پر مستنبط کئے گئے ہیں۔ کلی تشکیک
(Universal Scepticism) کا انکار نہیں۔ مگر کلی تشکیک کو اختیار کرنا بھی مشکل ہے۔ (۲۰۱)
وہ لکھتا ہے:

"میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ حسی حقائق (Facts of Sense) کو، اور اس کے
ساتھ عمومی طور پر، سائنس کی سچائی کو ایک ایسی چیز کی حیثیت سے قبول کروں جو فلسفی کے لئے
ابتدائی مواد کا کام دے سکے۔ اگرچہ ان کا سچ ہونا قطعی یقینی (Quite Certain)
نہیں ہے۔ یہ کسی اور چیز کے مقابلہ میں صرف ایک اونچا امکانی درجہ
(Higher Degree of Possibility) ہے، جو فلسفیانہ قیاس
کے لئے حاصل کی جا سکتی ہے۔" (۲۰۷)

اب ہم رسل کا ایک اور اقتباس نقل کریں گے جس سے رسل کے خیالات کی وہ تصویر مکمل ہو جاتی ہے جو ہم یہاں بنانا چاہتے ہیں :

"اس کو ہمیشہ سمجھا نہیں گیا ہے کہ نظری طبیعیات جو معلومات دیتی ہے، وہ کس قدر زیادہ مجرد (Exceedingly Abstract) ہیں۔ وہ چند خاص بنیادی مساوات (Equations) مقرر کرتی ہے جو اس کو اس قابل بناتی ہیں کہ وہ واقعات کے منطق ڈھانچہ کو بیان کر سکے جب کہ واقعات کی باطنی حالت (Intrinsic Character) بالکل نامعلوم (Completely Unknown) ہو۔ نظری طبیعیات میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو ہمیں اس قابل بنائے کہ ہم واقعات کی باطنی حالت کے بارے میں بول سکیں۔ طبیعیات جو کچھ ہمیں دیتی ہے وہ تمام تر صرف کچھ مخصوص مساواتیں (Equations) ہیں جو ان کی تبدیلیوں کی مجرد خاصیتیں (Abstract Properties) بتاتی ہیں۔ مگر یہ کہ وہ کیا چیز ہے جو تبدیل ہوتی ہے اور کہاں سے تبدیل ہوتی ہے، اس کے بارہ میں طبیعیات خاموش ہے۔" (۱۸)

رسل اپنی کتاب "میرا فلسفیانہ ارتقاء" کے باب: (Non-Demonstratable Inference) کو حسب ذیل الفاظ پر ختم کرتا ہے:

. . . there is no such claim to certainty as has too often and too uselessly, been made by rash philosophers. (1, P. 207)

یعنی اس قسم کا دعویٰ کرنے کی گنجائش نہیں ہے کہ ہم کو صداقت کا یقینی ذریعہ معلوم ہو گیا ہے جیسا کہ اکثر بے فائدہ طور پر جلد باز فلسفی کرتے رہے ہیں۔

اس مطالعہ کے مطابق رسل کے لئے صرف دو راستے باقی رہ جاتے ہیں۔ یا تو وہ تشکیک کی پناہ گاہ میں چلا جائے، یا پھر مذہب کی صداقت کا اعتراف کرلے۔ کیونکہ جب صورت حال یہ ہے کہ ہم حقیقت کا صرف ظاہری ڈھانچہ دیکھ سکتے ہیں، اس کی اندرونی صداقت سے براہ راست طور پر واقف ہونا ہمارے لئے ممکن نہیں ہے تو دو ہی صورتیں آدمی کے لئے باقی رہ جاتی ہیں۔ یا تو وہ اصرار کرے کہ وہ اسی وقت کسی بات کو مانے گا جب وہ آخری اور براہ راست طور پر اس کے ذاتی علم میں آجائے۔ اب چونکہ اب تک کی تحقیقات کے مطابق اس قسم کا علم ناممکن ہے، اس لئے اسے یہ کہہ کر بیٹھ جانا چاہئے کہ "میں کچھ نہیں جانتا"۔ مگر رسل اس پوزیشن کو قبول نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے کہ ظاہری ڈھانچہ کی

بنیاد پر اندرونی حقیقت کے بارہ میں جو استنباط کیا جائے وہ بھی جائز علم کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ کہ گروہ مذہب کی عین سرحد کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ کیونکہ مذہب کا کہنا بھی یہی ہے کہ انسان اپنے محدود حواس سے حقیقت کا آخری ادراک نہیں کرسکتا۔ البتہ ظاہر کائنات میں وہ جن چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے، ان سے یہ قیاس کرسکتا ہے کہ وہ کون سی حقیقت ہے جو اس کے پیچھے مستور ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ رسل جیسا ذہین شخص تشکیک کا بھی انکار کرتا ہے اور مذہب کا بھی اور اسے یاد نہیں رہتا کہ اس طرح وہ خود اپنے مسلّمات کے مطابق ایک کھلے ہوئے تضاد کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

رسل واضح طور پر تسلیم کرتا ہے کہ ایسے عقیدے (Belief) بھی صحیح (Valid) ہوسکتے ہیں جن کا تجربہ (Experience) نہ کیا گیا ہو۔ رسل خود بھی ایسے "عقائد" کو مانتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کے بیان کے مطابق، زمین کا قدیم ماضی۔ کائنات کے بعید ترین علاقے جن کا فلکیات میں مطالعہ کیا جاتا ہے ۱۰۱ وغیرہ۔ یہاں میں اس کے چند فقرے اس کے اپنے الفاظ میں نقل کروں گا:

I commit myself to the view that there are valid processes of inference from events to other events . . . . . more particularly, from events of which I am aware without inference to events of which I have no such awareness. (2, P. 10)

یعنی میں اس نقطۂ نظر کے حامی ہونے کا اعتراف کرتا ہوں کہ استنباط کے ایسے معقول طریقے ہیں جن میں بعض واقعات سے کچھ دوسرے واقعات پر استنباط کیا جاتا ہے۔ زیادہ متعین طور پر، ایسے واقعات سے جن سے میں کسی استنباط کے بغیر باخبر ہوں، ایسے واقعات پر جن کے بارہ میں میں اس قسم کی واقفیت نہیں رکھتا۔

رسل نے اسی بات کو دوسری جگہ ان الفاظ میں کہا ہے:

I do think that there are forms of probable inference which must be accepted although they cannot be proved by experience. 1, P. 132)

میں خیال کرتا ہوں کہ ایسے قریب بہ صحت استنباط کے طریقے ہیں جن کو تسلیم کیا جانا چاہئے، اگرچہ وہ تجربہ سے ثابت نہیں کئے جاسکتے۔

اس صریح اعتراف کے مطابق، کم از کم رسل کے نزدیک، مذہب ایک ایسی چیز کی حیثیت نہیں رکھتا جس کو دلیل سے ثابت نہ کیا جاسکتا ہو۔ کیونکہ یہاں وہ جس معیارِ استدلال کے جواز (Validity) کو تسلیم کر رہا ہے، یہ عین وہی معیارِ استدلال ہے جس کے مطابق مذہب کی صداقتوں کو ثابت کیا جاتا ہے۔

مزید حیرت انگیز بات یہ ہے کہ رسل نے بالواسطہ طور پر یہاں تک تسلیم کیا ہے کہ مذہب کے حق میں اس نوعیت کے

استنباطی دلائل بھی موجود ہیں جن کو وہ سائنٹفک استنباط کہتا ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ نہایت سرسری وجوہ کا نام لے کر ان دلائل کو رد کر دیتا ہے۔

یہاں میں برٹرینڈ رسل کا ایک اقتباس نقل کروں گا جو اس کی کتاب "میں عیسائی کیوں نہیں" سے لیا گیا ہے:

I think all the great religions of the world-Buddhism, Hinduism, Christianity, Islam and Communism-both untrue and harmful . . . . It is true that scholastics invented what professed to be logical arguments proving the existence of God, and that these arguments, or others of a similar tenure, have been accepted by many eminent philosophers, but the logic to which these traditional arguments appealed is of an antiquated Aristotelian sort which is now rejected by practically all logicians except such as are Catholics.

There is one of these arguments which is not purely logical. I mean the argument from design. This argument, however, was destroyed by Darwin; and, in any case, could only be made logically respectable at the cost of abandoning God's omnipotence.

Bertrand Russell,
Why I am Not A Christian,
George Allen & Unwin Ld. (1959) P. XI

"دنیا کے تمام بڑے مذاہب — بدھ ازم، ہندومت، عیسائیت، اسلام اور کمیونزم — سب کو میں غلط (Untrue) بھی سمجھتا ہوں اور مضر (Harmful) بھی۔

- - - - - - - - - - - - - - - - یہ صحیح ہے کہ متکلمین نے کچھ ایسی دلیلیں ایجاد کی ہیں جن کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ منطقی دلائل (Logical Arguments) ہیں اور ان سے خدا کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ اور یہ کہ یہ اور اسی قسم کے دوسرے دلائل کو بہت سے بڑے بڑے فلسفیوں نے قبول کیا ہے۔ مگر وہ منطق جس پر ان روایتی استدلالات کی بنیاد قائم ہے، وہ ارسطو کی قدیم منطق ہے جس کو عملاً اب تمام علمائے منطق رد کر چکے ہیں، سوائے مذہبی لوگوں کے"

اس کے بعد رسل لکھتا ہے:

"ان دلائل میں ایک دلیل ایسی ضرور ہے جو خالص منطقی (Purely Logical) نہیں ہے۔

میری مراد ہے نظم کائنات کی دلیل (Argument from Design) ۔ مگر ڈارون اس دلیل کو بالکل ختم کر چکا ہے۔

Why I Am Not a Christian, P. IX

اس اقتباس کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ نظم کائنات کی دلیل کو رسل نے منطقی طور پر ایک جائز دلیل (Valid Argument) تسلیم کیا ہے۔ مگر اصولی طور پر اس کی منطقی معقولیت تسلیم کرتے ہوئے رسل کا کہنا ہے کہ ڈارونزم نے اس کی استدلالی حیثیت کو برباد کر دیا ہے یا کم از کم اس کی اہمیت بہت گھٹا دی ہے۔

رسل کے اس بیان پر ہم کسی قدر وضاحت سے روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

رسل کے اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ مذہب کا دعویٰ ہے کہ کائنات میں ایک نظم (Design) پایا جاتا ہے اور یہ نظم اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے پیچھے کوئی شعور ہو جس نے اس کو "نظم" کی صورت دی ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کائنات بے ترتیب انبار کی شکل میں نظر آتی۔

رسل کے نزدیک یہ استدلال اصولی طور پر صحیح ہے۔ مگر پھر وہ کہتا ہے کہ "ڈارون نے حیاتیاتی مظاہر کے مطالعہ سے ثابت کیا ہے کہ زندگی کی مختلف اقسام جو منظم اور بامعنی شکل میں زمین پر نظر آتی ہیں وہ دراصل کروڑوں برس میں مادی حالات کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہیں۔ مثلاً زرافہ کو کسی نے پیدا نہیں کیا بلکہ بکری جیسے جانور نے طویل فطری عمل کے بعد خود بخود لمبی گردن والے زرافہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔

یہاں مجھے ڈارونزم پر کوئی تفصیلی گفتگو نہیں کرنی ہے۔ البتہ یہاں یہ کہوں گا کہ رسل نے ایک استدلال کی اصولی معقولیت تسلیم کرتے ہوئے جس بنیاد پر اس کو رد کیا ہے۔ وہ نہایت کمزور ہے۔

پہلی بات یہ کہ ڈارونزم ابھی تک ایک غیر ثابت شدہ نظریہ ہے۔ اگر اس سے کچھ ثابت ہوا ہے تو صرف یہ کہ زندگی کی مختلف اقسام بیک وقت وجود میں نہیں آئیں بلکہ مختلف اقسام مختلف وقتوں میں پائی گئی ہیں۔ نیز یہ کہ ان میں ایک خاص طرح کی زمانی ترتیب ہے۔ یعنی زندگی کی سادہ اقسام پہلے اور پیچیدہ اقسام اس کے بعد۔ مگر یہ بات آج بھی قطعی طور پر غیر ثابت شدہ ہے کہ زیادہ پیچیدہ اور بامعنی اقسام دراصل پچھلے زمانہ کی سادہ اقسام حیات ہی کی ترقی یافتہ صورتیں ہیں جو مادی عمل کے نتیجے میں ان کے اندر سے خود بخود وجود میں آگئیں۔ پہلی بات تو بلاشبہ مشاہدہ سے اخذ کی گئی ہے۔ مگر یہ دوسری بات قطعی طور پر علمائے ارتقاء کا اپنا مفروضہ ہے جس کی بنیاد نہ حقیقۃً کسی مشاہدہ پر ہے اور نہ کسی بھی درجہ میں اس کو Demonstrate کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ رسل کے استدلال کا جواز اسی دوسرے پہلو کے ثبوت پر موقوف ہے۔

نظریہ ارتقاء کی یہ کمزوری خود ارتقاء پسند علماء تسلیم کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر سر آرتھر کیتھ نے کہا ہے:

Evolution is unproved and unprovable. We believe it only because the only alternative is special creatin, and that is unthinkable.

اسی لئے ارتقا کے مسئلہ کو دو اجزاء میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک نظریہ ارتقاء اور دوسرے سبب ارتقاء۔ کہا جاتا ہے کہ نظریہ ارتقاء تو یقینی ہے البتہ سبب ارتقا ابھی تک لامعلوم ہے۔ اس تقسیم کو ہم زیادہ بہتر طور پر نظریہ ارتقا اور دلیل ارتقا کے الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں۔ کیونکہ جب تک اسباب معلوم نہ ہوں، ایک نظریہ یقینی کیسے ہو جائے گا۔ گویا نظریۂ ارتقا ایک ایسا نظریہ ہے جس کی دلیل تو ابھی دریافت نہیں ہوئی مگر اس کے باوجود وہ ارتقا پسند علماء کے نزدیک ثابت شدہ نظریہ کے طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے ۔ ایسے کمزور نظریہ کے حوالے سے یہ کہنا کہ اس نے مذہب کے استدلال کو برباد کر دیا ہے کس قدر بے بنیاد بات ہے۔

دوسرے یہ کہ بالفرض انواع حیات ارتقا کے عمل ہی کے تحت وجود میں آئی ہوں، جب بھی اس سے رسل کا دعویٰ ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ رسل کے دعوے کو صحیح ماننے کے لئے اس مفروضہ کو ماننا بھی ضروری ہے کہ خدا کوئی ایسا ہی وجود ہو سکتا ہے جو یکایک پھونک مار کر پیدا کر دیا کرے۔ اس کا طریق تخلیق یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ لمبی مدت کے اندر کسی چیز کو وجود بخشے۔ حالانکہ نہ صرف یہ کہ اس مفروضہ کے لئے کوئی بنیاد وجود نہیں ہے۔ بلکہ اس سے خود خدا کی قدرت مطلقہ کی نفی بھی نہیں ہوتی

انسان ہمیشہ سے یہ مانتا رہا ہے کہ درخت اور انسان کو پیدا کرنے والا قادر مطلق خدا ہے۔ مگر یہ مشاہدہ اس کے عقیدہ کو متزلزل کرنے والا ثابت نہ ہو سکا کہ بچہ چالیس برس میں پورا انسان بنتا ہے اور درخت آدھی صدی اور ایک صدی میں مکمل ہوتا ہے۔ خدا کی قدرت کاملہ پر ایمان لانے کے لئے اس نے کبھی ضروری نہیں سمجھا کہ درخت اور انسان یکایک پورے درخت اور پورے انسان کی شکل میں ظاہر ہو جایا کریں۔ اسی طرح اگر آئندہ کوئی تحقیق یہ ثابت کرے کہ زندگی کے مظاہر اچانک دنیا میں موجود نہیں ہو گئے ہیں، بلکہ لمبے ارتقائی عمل سے گزرنے کے بعد وجود میں آئے ہیں تو اس میں مذہب پر نظر ثانی یا اس کی تردید کا سوال آخر کس لئے پیدا ہو جائے گا۔

آخری بات

میں سمجھتا ہوں کہ برٹرینڈ رسل کا مذکورہ بالا بیان ایک ملحد کی زبان سے مذہب کی اصولی صداقت کا اعتراف ہے وہ تسلیم کرتا ہے کہ کائنات میں ڈزائن ہے۔ اسے یہ بھی تسلیم ہے کہ ڈزائن سے ڈزائنر کا وجود ثابت کیا جا سکتا ہے۔ مگر جب وہ اس کو نہ ماننے کے لئے ڈارونزم کا حوالہ دیتا ہے تو گویا وہ نہایت کمزور بنیاد پر خود اپنے تسلیم شدہ مقدمہ کو رد کر رہا ہے کیونکہ ڈزائن کا وجود تو متفقہ طور پر ایک ثابت شدہ حقیقت ہے مگر ڈارونزم کوئی ثابت شدہ حقیقت نہیں۔ اس کا یہ پہلو یقینی طور

پاب بھی مفروضہ ہے کہ مادی عوامل سے انواعِ حیات میں بامعنی "ڈزائن" پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے ڈزائن کے واقعہ کی بنا پر ڈزائنر کے حق میں استدلال تو خود رسل کے اعتراف کے مطابق صحیح ہے۔ مگر ڈاروِنزم ابھی اس قابل نہیں ہو سکا کہ اس کی بنیاد پر کوئی رسل اس دلیل کو رد کر دے۔

کتابیات

BERTRAND RUSSELL

1. My Philosophical Devolopment (1959)
2. Human Knowledge (1956)
3. Our Knowledge of External World (1952)
4. The Problems of Philosophy (1957)
5. Why I am not a Christian

کائنات کی مشینی تعبیر

اٹھارویں اور انیسویں صدی کی سائنس نے جب یہ دریافت کیا کہ کائنات میں علت اور معلول (Cause and Effect) کا ایک نظام ہے تو اس زمانہ کے ملحد مفکرین نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کے نزدیک یہ دریافت خدا کا سائنسی بدل تھا۔ اگرچہ اس قانون کو دریافت کرنے والے سائنس دانوں کے لئے اس کے یہ معنی نہیں تھے۔ مثال کے طور پر نیوٹن نے کہا تھا کہ یہ خدا کا طریق کار ہے۔ خدا اسباب وعلل کے ذریعہ کائنات میں اپنی منشا کو ظاہر کرتا ہے۔ مگر وہ لوگ جو سائنسی دریافتوں کی روشنی میں فلسفہ کی تشکیل کر رہے تھے، انھوں نے اس کے اندر الحاد کا ثبوت پایا۔ اور اس کی بنیاد پر ایک پورا نظام فکر بنا ڈالا۔

اس طرح وہ نظریہ وجود میں آیا جس کو "کائنات کی مشینی تعبیر" کہا جاتا ہے۔ مسلمہ طور پر یہ مان لیا گیا کہ کائنات کے تمام واقعات کسی خارجی مداخلت کے بغیر محض مادی اسباب کے تحت واقع ہوتے ہیں اور اس طرح پوری کائنات علت و معلول کی ایک مسلسل زنجیر میں بندھی ہوئی ہے۔

یہ انیسویں صدی عیسوی کا مسلمہ تھا۔ ۱۸۷۴ میں چھپنے والی ایک انسائیکلوپیڈیا کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

> "طبیعی فلاسفہ کیمسٹری اور فزیالوجی کے ماہرین یقین رکھتے ہیں کہ ایک سبب سے ہمیشہ یکساں نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ اور ایک مثال میں اگر یہ تصور کامیاب ہو تو ان کو اطمینان ہے کہ ہمیشہ یہی کامیابی حاصل ہوگی۔ اس لئے طبیعی علوم میں اب قانون تعلیل (Law of Causation) کے بارہ میں کوئی اختلاف نہیں رہ گیا ہے۔ اس باب میں اختلاف صرف مابعد الطبیعیاتی حلقہ میں پایا جاتا ہے۔"

Chamber's Encyclopaedia (1874) V. II, P. 691

مگر ان مفکرین کی یہ خوشی زیادہ دیر تک باقی نہیں رہی۔ کیونکہ بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی سائنس کے علم میں ایسے بہت سے حقائق آئے جو کسی طرح مشینی تعبیر کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ مثال کے طور پر ریڈیم ایک تابکار (Radio-Active) عنصر ہے۔ اس کے الکٹران خود بخود فطری عمل کے تحت مسلسل ٹوٹتے رہتے ہیں۔ یہ معلوم کرنے کے لئے بے شمار تجربے کئے گئے کہ اس تابکاری کا سبب کیا ہے۔ مگر ہر تجربہ ناکام رہا۔ ہمیں

آج بھی نہیں معلوم کہ ریڈیم کے ایک ٹکڑے میں کوئی خاص الکٹران جب اپنے ایٹمی نظام سے ٹوٹ کر نکلتا ہے تو اس کا سبب کیا ہوتا ہے۔ اسی طرح مثال کے طور پر مقناطیس لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس کی توجیہہ میں سائنس نے بہت سے نظریات قائم کئے ہیں مگر ایک سائنس داں ان کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ سچی بات یہ ہے کہ ہمیں نہیں معلوم کہ مقناطیس کیوں لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے" شاید اس لئے کہ اس کے خالق نے اس کو یہی حکم دیا ہے"

یہ صرف ریڈیم اور مقناطیس کی بات نہیں ہے۔ گہرے تجزیہ نے بتایا ہے کہ ماضی میں جن باتوں کو کسی واقعہ کا سبب مان لیا گیا تھا، وہ بھی اصل واقعہ کا محض سطحی مطالعہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں کسی بھی واقعہ کے بارے میں نہیں معلوم کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم رات کو سوتے ہیں تو ہمیں نیند کیوں آتی ہے۔

طویل بحث مباحثہ کے بعد اب سائنس کی دنیا میں تسلیم کر لیا گیا ہے کہ قانون تعلیل (Law of Causation) ان معنوں میں کوئی مطلق حقیقت نہیں ہے جیسا کہ انیسویں صدی میں فرض کر لیا گیا تھا۔ علم کا مسافر دوبارہ لوٹ کر وہیں پہنچ گیا ہے جہاں وہ پہلے تھا ——— "اس دنیا کا نظام محض اتفاقی طور پر وجود میں آجانے والے کسی علت و معلول (Cause and Effect) کے قانون کے تحت نہیں چل رہا ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک شعوری ذہن ہے جو بالارادہ اس کو چلا رہا ہے"۔ سائنس کی یہ واپسی مذہب کی صداقت کا ایک ایسا واضح ثبوت ہے جس کے بعد کسی اور ثبوت کی ضرورت نہیں۔

پچھلے پچاس برسوں میں اس سلسلے میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ یہاں ہم اس مسئلہ کو مختصر طور پر واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔ اصول تعلیل کے بارے میں آگے جو باتیں درج ہیں وہ زیادہ تر سر جیمز جینز کی کتاب پراسرار کائنات (Mysterious Universe) سے ماخوذ ہے۔

کائنات کو دیکھتے ہی جو سب سے پہلا سوال ذہن میں آتا ہے وہ یہ کہ اس کا بنانے والا کون ہے اور وہ کون ہے جو اس عظیم کارخانے کو چلا رہا ہے۔ پچھلے زمانوں میں انسان یہ سمجھتا تھا کہ بہت سی غیر مرئی طاقتیں اس کائنات کی مالک ہیں ایک بڑے خدا کے تحت بہت سے چھوٹے چھوٹے خدا اس کا انتظام کر رہے ہیں۔ اب بھی بہت سے لوگ اس قسم کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ مگر علمی دنیا میں عام طور پر اب یہ نظریہ ترک کیا جا چکا ہے۔ یہ ایک مردہ نظریہ ہے نہ کہ زندہ نظریہ۔ موجودہ زمانہ کے وہ لوگ جو اپنے آپ کو ترقی یافتہ کہتے ہیں اور جن کا خیال ہے کہ وہ جدید دور کے انسان ہیں، وہ شرک کے بجائے الحاد کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کائنات کسی ذی شعور ہستی کی کارفرمائی نہیں ہے بلکہ ایک اتفاقی حادثہ کا نتیجہ ہے اور جب کوئی واقعہ وجود میں آجائے تو اس کے سبب سے کچھ دوسرے واقعات بھی وجود میں آئیں گے۔ اس طرح اسباب و واقعات کا ایک لمبا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے اور یہی سلسلۂ اسباب ہے جو کائنات کو چلا رہا ہے۔ اس توجیہہ کی بنیاد دو چیزوں پر ہے ایک "اتفاق" اور دوسرے "قانون علت" (Law of Causation)

یہ توجیہ بتاتی ہے کہ اب سے تقریباً دو لاکھ ارب سال (۲۰ نیل سال) پہلے کائنات کا وجود نہ تھا۔ اس وقت ستارے تھے اور نہ سیارے، مگر فضا میں مادہ موجود تھا۔ یہ مادہ اس وقت بھی ہوئی ٹھوس حالت میں نہ تھا، بلکہ اپنے ابتدائی ذرے یعنی برقیے اور پروٹونوں کی شکل میں پوری فضائے بسیط میں یکساں طور پر پھیلا ہوا تھا، گویا انتہائی چھوٹے چھوٹے ذرات کا ایک غبار تھا جس سے کائنات بھری ہوئی تھی۔ اس وقت مادہ بالکل توازن کی حالت میں تھا۔ اس میں کسی قسم کی حرکت نہ تھی۔ ریاضی کے نقطۂ نگاہ سے یہ توازن ایسا تھا کہ اگر اس میں کوئی ذرا سا بھی خلل ڈال دے تو پھر یہ قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ خلل بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ اگر اس ابتدائی خلل کو مان لیجئے تو ان لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے بعد کے تمام واقعات علم ریاضی کے ذریعہ ثابت ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہوا کہ مادّے کے اس بادل میں خفیف سا خلل واقع ہوا۔ جیسے کسی حوض کے پانی کو کوئی ہاتھ ڈال کر ہلا دے۔ کائنات کی پرسکون دنیا میں یہ اضطراب کس نے پیدا کیا، اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم لیکن خلل ہوا اور یہ خلل بڑھتا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مادہ سمٹ سمٹ کر مختلف جگہوں میں جمع ہونا شروع ہو گیا۔ یہی وہ جمع شدہ مادہ ہے جس کو ہم ستارے، سیارے اور سحابیے کہتے ہیں۔

کائنات کی یہ توجیہ سائنس کی طرف سے پیش کی گئی تھی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ اس قدر بودی اور کمزور توجیہ ہے کہ خود سائنس دانوں کو بھی اس پر کبھی شرح صدر حاصل نہ ہو سکا۔ یہ توجیہ اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہے کہ اسے نہیں معلوم کہ کائنات کو پہلی بار کس نے حرکت دی۔ مگر اس کے باوجود اس کا دعویٰ ہے کہ اس نے کائنات کے محرک اول کو معلوم کر لیا ہے اور اس محرک اول کا نام اس کے نزدیک اتفاق ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب کائنات میں صرف غیر متحرک مادہ تھا اس کے سوا کوئی چیز موجود نہ تھی تو یہ عجیب و غریب قسم کا اتفاق کہاں سے وجود میں آگیا جس نے ساری کائنات کو حرکت دیدی جس واقعہ کے اسباب نہ مادہ کے اندر موجود تھے اور نہ مادہ کے باہر، وہ واقعہ وجود میں آیا تو کیسے۔ اس توجیہ کا یہ نہایت دلچسپ تضاد ہے کہ وہ ہر واقعہ سے پہلے ایک واقعہ کا موجود ہونا ضروری قرار دیتی ہے جو بعد کو ظاہر ہونے والے واقعے کا سبب بن سکے۔ مگر اس توجیہ کی ابتدا ایک ایسے واقعہ سے ہوتی ہے جس سے پہلے اس کا سبب موجود نہیں — یہی وہ بے بنیاد مفروضہ ہے جس پر کائنات کی اتفاقی پیدائش کے نظریہ کی پوری عمارت کھڑی کر دی گئی ہے۔

پھر یہ کائنات اگر محض اتفاق سے وجود میں آئی ہے تو کیا واقعات لازمی طور پر وہی رخ اختیار کرنے پر مجبور تھے جو انھوں نے اختیار کیا۔ کیا اس کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا تھا۔ کیا ایسا ممکن نہیں تھا کہ ستارے آپس میں ٹکرا کر تباہ ہو جائیں مادہ میں حرکت پیدا ہونے کے بعد کیا یہ ضروری تھا کہ یہ محض حرکت نہ رہے بلکہ ایک ارتقائی حرکت بن جائے اور حیرت انگیز تسلسل کے ساتھ موجودہ کائنات کو وجود میں لانے کی طرف دوڑنا شروع کر دے۔ آخر وہ کون سی منطق تھی جس نے ستاروں کے وجود میں آتے ہی ان کو لامتناہی خلا میں نہایت باقاعدگی کے ساتھ پھرانا شروع کر دیا، پھر وہ کون سی منطق تھی جس نے کائنات کے ایک بعید ترین گوشہ میں نظام شمسی کو وجود دیا، پھر وہ کون سی منطق تھی جس سے ہمارے کرہ زمین پر وہ عجیب و

عجیب تبدیلیاں ہوئیں جن کی وجہ سے یہاں زندگی کا قیام ممکن ہو سکا اور جن تبدیلیوں کا سراغ آج تک کائنات کی بے شمار دنیاؤں میں سے کسی ایک دنیا میں بھی معلوم نہیں کیا جا سکا ہے، پھر وہ کون سی منطق تھی جو ایک خاص مرحلہ پر بے جان مادہ سے جان دار مخلوق پیدا کرنے کا سبب بن گئی۔ کیا اس بات کی کوئی معقول توجیہ کی جا سکتی ہے کہ زمین پر زندگی کس طرح اور کیوں وجود میں آئی اور کس قانون کے تحت مسلسل پیدا ہوتی چلی جا رہی ہے۔

پھر وہ کون سی منطق تھی جس نے کائنات کے ایک چھوٹے سے رقبہ میں حیرت انگیز طور پر وہ تمام چیزیں پیدا کر دیں، جو ہماری زندگی اور ہمارے تمدن کے لئے درکار تھیں، پھر وہ کون کی منطق ہے جو ان حالات کو ہمارے لئے باقی رکھے ہوئے ہے۔ کیا محض ایک اتفاق کا پیش آجانا اس بات کی کافی وجہ تھی کہ یہ سارے واقعات اس قدر حسن ترتیب کے ساتھ مسلسل پیش آتے چلے جائیں اور اربوں اور کھربوں سال تک ان کا سلسلہ جاری رہے اور پھر بھی ان میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔ کیا اس بات کی کوئی واقعی توجیہ کی جا سکتی ہے کہ محض اتفاق سے پیش آنے والے واقعہ میں لزوم کی صفت کہاں سے آگئی اور اتنے عجیب و غریب طریقہ پر مسلسل ارتقاء کرنے کا رجحان اس میں کہاں سے پیدا ہو گیا۔

یہ اس سوال کا جواب تھا کہ کائنات کیسے پیدا ہوئی۔ اس کے بعد یہ سوال اٹھا کہ اس کا چلانے والا کون ہے۔ وہ کون ہے جو اس عظیم کارخانے کو اس قدر منظم طریقہ پر حرکت دے رہا ہے۔ اس توجیہ میں جس کو کائنات کا خالق قرار دیا گیا ہے اسی کو کائنات کا حاکم نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یہ توجیہ مین اپنی ساخت کے اعتبار سے دوخدا چاہتی ہے، کیوں کہ حرکت اول کی توجیہ کے لئے تو اتفاق کا نام لیا جا سکتا ہے مگر اس کے بعد کی مسلسل حرکت کو کسی حال میں بھی اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی توجیہ کے لئے دوسرا خدا تلاش کرنا پڑے گا۔

اس مشکل کو حل کرنے کے لئے اصول تعلیل (Principle of Causation) پیش کیا گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ حرکت اول کے بعد کائنات میں علت اور معلول کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہو گیا ہے کہ ایک کے بعد ایک تمام واقعات پیش آتے چلے جا رہے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے بچے بہت سی اینٹیں کھڑی کر کے کنارے کی ایک اینٹ گرا دیتے ہیں تو اس کے بعد کی تمام اینٹیں خود بخود گرتی چلی جاتی ہیں۔ جو واقعہ ظہور میں آتا ہے اس کا سبب کائنات کے باہر کہیں موجود نہیں ہے۔ بلکہ ناقابل تسخیر قوانین کے تحت حالاتِ ماقبل کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ اور یہ سابقہ حالات بھی اپنے سے پہلے واقعات کا لازمی نتیجہ تھے۔ اس طرح کائنات میں علت اور معلول کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم ہو گیا ہے۔ حتیٰ کہ جس صورت میں تاریخ عالم کا آغاز ہوا، اس نے آیندہ سلسلۂ واقعات کا قطعی فیصلہ کر دیا ہے۔ جب ابتدائی صورت ایک دفعہ معین ہو گئی تو قدرت صرف ایک ہی طریق سے منزل مقصود تک پہنچ سکتی تھی۔ گویا کائنات جس روز پیدا ہوئی اس کی آیندہ تاریخ بھی اسی دن متعین ہو چکی ہے۔

اس اصول کو قدرت کا اساسی قانون مقرر کرنا سترھویں صدی کا ایک بہت بڑا واقعہ تھا۔ چنانچہ یہ تحریک شروع

ہوئی کہ تمام کائنات کو ایک مشین ثابت کیا جائے۔ انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں یہ تحریک اپنے پورے عروج پر آگئی۔ یہ زمانہ سائنس داں اور انجینئروں کا تھا جن کی دلی خواہش تھی کہ قدرت کے مشینی ماڈل بنائے جائیں۔ اسی زمانہ میں ہیلم ہولٹز (Helm Holtz) نے کہا تھا کہ "تمام قدرتی سائنسوں کا آخری مقصد اپنے آپ کو میکانکس میں منتقل کر لینا ہے۔" اگرچہ اس اصول کے مطابق کائنات کے تمام مظاہر کی تشریح کرنے میں ابھی سائنس دانوں کو کامیابی نہیں ہوئی تھی، مگر ان کا یقین تھا کہ کائنات کی تشریح میکانکی پیرائے میں ہو سکتی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ صرف تھوڑی سی کوشش کی ضرورت ہے اور بالآخر تمام عالم ایک مکمل چلتی ہوئی مشین ثابت ہو جائے گا۔

ان باتوں کا انسانی زندگی سے تعلق صاف ظاہر تھا۔ اصول تعلیل کی ہر توسیع اور قدرت کی ہر کامیاب میکانکی تشریح نے اختیارِ انسانی پر یقین کرنا محال بنا دیا، کیونکہ اگر یہ اصول تمام قدرت پر حاوی ہے تو زندگی اس سے کیوں مستثنیٰ ہو سکتی ہے۔ اس طرز فکر کے نتیجہ میں سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے میکانکی فلسفے وجود میں آئے۔ جب یہ دریافت ہوا کہ جاندار خلیہ (Living Cell) بھی بے جان مادہ کی طرح محض کیمیاوی جوہروں سے بنا ہے تو فوراً سوال پیدا ہوا کہ وہ خاص اجزا جن سے ہمارے جسم و دماغ بنے ہوئے ہیں کیونکر اصول تعلیل کے دائرہ سے باہر ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ گمان کیا گیا بلکہ بڑے جوش کے ساتھ دعویٰ کر دیا گیا کہ زندگی بھی ایک خاص مشین ہے۔ یہاں تک کہا گیا کہ نیوٹن باخ (Bach) اور مائیکل انجلو (Michelangelo) کے دماغ چھاپنے والی مشین سے صرف پیچیدگی میں مختلف تھے اور ان کا کام صرف یہ تھا کہ بیرونی محرکات کا مکمل جواب دیں۔

مگر سائنس اس سخت اور غیر معتدل قسم کے اصولِ علیت کی اب قائل نہیں ہے۔ نظریۂ اضافیت اصول تعلیل کو دھوکے (Illusion) کے لفظ سے یاد کرتا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر ہی میں سائنس پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ کائنات کے بہت سے مظاہر، بالخصوص روشنی اور قوت کشش، میکانکی تشریح کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیتے ہیں۔ یہ بحث ابھی جاری تھی کہ کیا ایسی مشین بنائی جا سکتی ہے جو نیوٹن کے افکار، باخ کے جذبات اور مائیکل انجلو کے خیالات کا اعادہ کر سکے۔ مگر سائنس دانوں کو بڑی تیزی سے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ شمع کی روشنی اور سیب کا گرنا کوئی مشین نہیں دہرا سکتی۔ قدیم سائنس نے بڑے وثوق کے ساتھ اعلان کیا تھا کہ قدرت صرف ایک ہی راستہ اختیار کر سکتی ہے جو اول روز سے علت اور معلول کی مسلسل کڑی کے مطابق ابد تک کے لئے معین ہو چکا ہے۔ مگر بالآخر سائنس کو خود یہ تسلیم کرنا پڑا کہ کائنات کا ماضی اس قدر اٹل طور پر اس کے مستقبل کا سبب نہیں ہے جیسا کہ پہلے خیال کیا جاتا تھا۔ موجودہ معلومات کی روشنی میں سائنس دانوں کی ایک بڑی اکثریت کا اب اس بات پر اتفاق ہے کہ علم کا دریا ہمیں ایک غیر میکانکی حقیقت (Non-Mechanical Reality) کی طرف لئے جا رہا ہے۔

کائنات کی پیدائش اور اس کی حرکت کے بارے میں یہ دونوں نظریئے جو سائنسی ترقیوں کے ساتھ وجود میں آئے

تھے اب تک یقین کی دولت سے محروم ہیں۔ جدید تحقیقات ان کی بنیاد کو مضبوط نہیں بناتی بلکہ اور کمزور کر دیتی ہے۔ اس طرح گویا سائنس خود ہی اس نظریہ کی تردید کر رہی ہے، اب انسان دوبارہ اسی منزل پر پہنچ گیا ہے جس کو چھوڑ کر اس نے اپنا نیا سفر شروع کیا تھا۔

کچھ نئی حقیقتیں

علامہ شبلی نعمانی اپنی کتاب " الغزالی " کے دوسرے حصّہ میں " معاد یا حالات بعد الموت " کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں ــــــ " مذہب کی روح ورواں جو کچھ کہو، معاد کا اعتقاد ہے۔ مذہب میں جو کچھ تاثیر ہے اور افعال انسانی پر مذہب کا جو اثر پڑتا ہے، وہ اسی اعتقاد کی بدولت ہے۔ لیکن جس قدر وہ مہتم بالشان ہے اسی قدر عسیر التصور ہے ایک بدوی شاعر الحاد کے لہجہ میں کہتا ہے :

أموتٌ ثم بعثٌ ثم نشرٌ	مرنا، پھر زندہ ہونا، پھر چلنا پھرنا !
حدیثُ خرافۃٍ یا امّ عمرو	میری بیگم ! یہ تو خرافات کی باتیں ہیں

اس مرحلے میں جو مشکلیں ہیں ان میں پہلا اور سب سے مشکل بقائے روح کا مسئلہ ہے۔ یعنی یہ ثابت کرنا کہ روح جسم سے جدا کوئی چیز ہے۔ مادّیین کا خیال ہے کہ روح کوئی جداگانہ چیز نہیں، بلکہ جس طرح دواؤں کی ترکیب دینے سے ایک مزاج خاص پیدا ہو جاتا ہے۔ یا تاروں کی خاص ترکیب سے خاص خاص راگ پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح عناصر کی خاص طور پر ترکیب پانے سے ایک مزاج خاص پیدا ہو جاتا ہے جو ادراک اور تصور کا سبب ہوتا ہے اور اسی کا نام روح ہے۔

روح کے ثابت کرنے کے بعد دوسرا مرحلہ اس کی بقا کا ثابت کرنا ہے، یعنی یہ کہ جسم کے فانی ہونے پر وہ باقی رہ سکتی ہے " (صفحہ ۲۷۰ - ۱۷۱)

اس کے بعد مضنون صغیر اور مضنون کبیر سے امام غزالی کے خیالات ان مباحث پر نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :۔

" امام صاحب نے روح کی جو حقیقت بیان کی اور اس پر جو دلائل پیش کئے یونانیوں سے ماخوذ ہیں۔ ارسطو نے اثولوجیا میں بعینہٖ یہی تقریر کی ہے اور بو علی سینا نے اس کو مختلف پیرایوں میں آب و رنگ دے کر ادا کیا ہے، لیکن یہ امر بظاہر تعجب انگیز ہے کہ جو سب سے مقدم امر تھا۔ یعنی روح کا اثبات، امام صاحب نے اسی کو چھوڑ دیا۔ روح کا جوہر ہونا، غیر جسمانی ہونا، یہ فرعی امور ہیں۔ پہلے یہ ثابت کرنا چاہیے کہ روح کوئی شے بھی ہے یا نہیں " (صفحہ ۱۷۴)

اس کے بعد اپنی طرف سے لکھتے ہیں ــــــ " اصل یہ ہے کہ روح کا وجود ایک وجدانی امر ہے، غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ادراک و تعقل محض مادّہ کا کام نہیں۔ مادہ ایک بے حس، بے جان اور لایعقل چیز ہے۔ دقیق خیالات

اور علوم و فنون مادّہ سے انجام نہیں پاسکتے۔ بلکہ کوئی اور جوہر لطیف ہے جس سے یہ کرشمے سرزد ہوتے ہیں اور اسی کا نام روح ہے "

اس کے بعد لکھتے ہیں: " لیکن یہ استدلال وجدانی ہے۔ (بو علی سینا نے روح کے اثبات پر اشارات میں لمبی چوڑی دلیل پیش کی ہے۔ لیکن وہ یونانیوں کے عام دلائل کی طرح صرف لفظوں کا کھیل ہے) اگر کوئی منکر انکار پر آمادہ ہو اور کہے کہ ـــــ " تم نے جو کچھ کہا عین دعوے کا اعادہ ہے، دلیل نہیں۔ ممکن ہے مادّہ ہی ایک خاص ترکیب پاکران نیرنگوں کا مظہر ہو۔ کلوں سے جو عجیب و غریب حرکتیں ظاہر ہوتی ہیں، ارغنوں سے جو دلکش اور موثر نغمے پیدا ہوتے ہیں، ان میں روح کا کون سا شائبہ ہے۔" تو ہم دلیل سے اس کی زبان بند نہیں کر سکتے۔ یہی سبب تھا کہ امام صاحب نے روح کے ثبوت پر کوئی منطقی دلیل نہیں پیش کی۔" (صفحہ ۱۷۵)

مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے اس بحث کو یہیں ختم کر دیا ہے اور ایک عالم کی سنہ ۱۹۰۱ء کی تصنیف میں شاید اتنا ہی کہا بھی جا سکتا تھا۔ مگر میں اس پر یہ اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ جدید تحقیقات نے واقعات و حقائق کے کچھ ایسے نئے گوشے کھولے ہیں جس کے بعد ایک حد تک یہ کہا جا سکتا ہے کہ روح کا جسم سے الگ ایک مستقل وجود ہونا یا جسم کے فنا ہونے کے بعد روح کا باقی رہنا محض وجدانی چیز نہیں رہا، بلکہ ایک ایسی حقیقت بن چکا ہے جس کو تجرباتی دلیل سے ثابت کیا جا سکتا ہے جسم کے بارے میں سائنس نے دریافت کیا ہے کہ وہ بے شمار چھوٹے چھوٹے خلیوں (Cells) کا مرکب ہے جن کی تعداد ایک متوسط جسم میں ایک ہزار ارب کے قریب ہوتی ہے۔ یہ خلیے ہر آن ٹوٹ کر ختم ہوتے رہتے ہیں۔ غذا ہضم ہو کر ہمارے جسم کے لئے وہ خلیے مہیا کرتی ہے جو ٹوٹ پھوٹ کی وجہ سے ہر روز درکار ہوتے ہیں۔ گویا جسم نام ہے ایک ایسی عمارت کا جو کھربوں اینٹوں سے مل کر بنا ہو اور ہر آن اپنی اینٹوں کو بدلتا رہتا ہو۔ اب اگر روح جسم ہی کا ایک مظہر ہے تو جس طرح مشین کا ایک پرزہ ٹوٹنے سے پوری مشین متاثر ہو جاتی ہے اور باجے کا ایک تار خراب ہونے سے اس کی آواز پر اثر پڑ جاتا ہے اسی طرح جسم کے مرکبات بدلنے یا ضائع ہونے سے روح میں بھی تبدیلیاں ہونی چاہئیں۔ مگر ایسا نہیں ہوتا اس سے معلوم ہوا کہ روح جسم سے الگ ایک چیز ہے جو بذات خود اپنا وجود رکھتی ہے۔ چنانچہ ایک سائنس داں نے انسانی ہستی کو اس کے جسم کے مقابلے میں ایک ایسی مستقل بالذات چیز قرار دیا ہے جو مسلسل تغیرات کے اندر غیر متغیر حالت میں اپنا وجود باقی رکھتی ہے۔ اس کے الفاظ میں:

Personality is changelessness in change

اس خیال کی مزید تصدیق نفسیات کے اس انکشاف سے ہوتی ہے جس کو تحت شعور یا لاشعور کہا جاتا ہے اور جو انسانی ذہن کا نسبتاً زیادہ بڑا حصہ ہے۔ لاشعور کے بارے میں اب یہ تقریباً مسلمہ طور پر مان لیا گیا ہے کہ جو خیالات اس کے اندر جگہ پاتے ہیں وہ تاحیات بالکل یکساں حالت میں باقی رہتے ہیں۔ فرائڈ اپنے اکتیسویں لکچر میں کہتا ہے:۔

"منطق کے قوانین بلکہ اضداد کے اصول بھی لاشعور کے عمل پر حادی نہیں ہوتے مخالف خواہشات ایک دوسرے کو زائل کئے بغیر اس میں پہلو بہ پہلو ہمیشہ موجود رہتی ہیں ..... لاشعور میں کوئی ایسی چیز نہیں جو نفی سے مشابہت رکھتی ہو اور ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ لاشعور کی دنیا میں فلسفیوں کا یہ دعویٰ غلط ہو جاتا ہے کہ ہمارے تمام دماغی افعال وقت اور فاصلہ کے درمیان واقع ہوتے ہیں۔ لاشعور کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جو وقت کے تصور سے مطابقت رکھتی ہو۔ لاشعور میں وقت کے گزرنے کا کوئی نشان نہیں اور یہ ایک حیرت انگیز حقیقت ہے جس کے معنی سمجھنے کی طرف ابھی تک فلسفیوں نے پوری توجہ نہیں کی کہ وقت کے گزرنے سے ذہنی عمل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ایسے خیالات (Conative Impulses) جو کبھی لاشعور سے باہر نہیں آئے، بلکہ وہ ذہنی تاثرات بھی جنھیں روک کر لاشعور میں دبا دیا گیا ہو، فی الواقع غیر فانی ہوتے ہیں اور دسیوں سال تک اس طرح سے محفوظ رہتے ہیں گویا ابھی کل وجود میں آئے ہیں"

New Introductory Lectures on Psychoanalysis (London 1949) P. 99

لاشعور کے عمل کا وقت کی گرفت سے آزاد ہونا، ظاہر کرتا ہے کہ لاشعور جسم سے الگ اپنا کوئی وجود رکھتا ہے کیونکہ جسم کے بارے میں یہ مسلّم ہے کہ وہ وقت اور فاصلہ کے قوانین کا پابند ہے اور انھیں حدود کے اندر اس کے تمام مظاہر واقع ہوتے ہیں۔ اب اگر روح جسم ہی کا ایک ظہور خاص ہوتی تو جسم کی طرح اس کو بھی لازماً وقت اور فاصلہ کے قوانین کا پابند ہونا چاہئے تھا اور جب کہ تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ایسا نہیں ہے تو اس کا لازمی مفہوم یہ ہے کہ روح اپنی نوعیت میں جسم سے مختلف ایک چیز ہے جو اس سے الگ اپنا مستقل وجود رکھتی ہے۔ جسم سے روح کا تعلق مشین اور حرکت یا باجے اور راگ کا نہیں ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو جس طرح حرکت اور راگ پر بعینہٖ وہی قوانین مترتب ہوتے ہیں جو مشین اور باجے پر مترتب ہوتے ہیں۔ اسی طرح روح پر بھی یقیناً انھیں قوانین کا ترتب ہوتا جو جسم کے اوپر اثر انداز ہوتے ہیں۔

دوسری چیز جس کا میں یہاں حوالہ دینا چاہتا ہوں، وہ سائیکیکل تحقیقات (Psychical Research) کے نتائج ہیں جو خالص تجرباتی اور مشاہداتی سطح پر موت کے بعد زندگی کے وجود کو ثابت کرتے ہیں۔ اس میں ہمارے نقطۂ نظر سے مزید دلچسپی کی بات یہ ہے کہ یہ بقائے محض کو ثابت نہیں کرتے بلکہ عین اس شخصیت کی بقا کو ثابت کرتے ہیں جس سے ہم موت سے پہلے واقف تھے۔

انسان کی بہت سی ایسی خصوصیات ہیں جو بذات خود تو پہلے سے موجود تھیں، مگر ان پر سائنسی انداز سے غور و فکر نہیں ہوا تھا، مثلاً خواب دیکھنا انسان کی قدیم ترین خصوصیت ہے۔ مگر جدید دور میں خواب کے مطالعہ سے جو نفسیاتی حقائق معلوم

کئے گئے ہیں۔ ان سے قدیم دور کے لوگ ناآشنا تھے۔ اسی طرح اور بہت سے مظاہر ہیں جن کے متعلق موجودہ زمانے میں باقاعدہ اعداد و شمار جمع کئے گئے اور سائنسی انداز سے ان کا تجزیہ کیا گیا۔ اس طرح جدید مطالعہ کے ذریعے ان واقعات سے نہایت اہم نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ اسی میں سے ایک سائیکیکل ریسرچ ہے جو جدید نفسیات کی ایک شاخ ہے اور جس کا مقصد انسان کی مافوق العادت صلاحیتوں کا تجرباتی مطالعہ ہے۔ اس قسم کی تحقیقات کے لئے سب سے پہلا ادارہ ۱۸۸۲ء میں انگلینڈ میں قائم ہوا اور ۱۰۰۹ء میں اس نے سترہ ہزار اشخاص سے رابطہ قائم کرکے وسیع پیمانے پر اپنی تحقیقات شروع کردیں۔ یہ اب بھی مطالعہ نفسیات کا ادارہ (Society for Psychical Research) کے نام سے موجود ہے اور اسی نوعیت کے دوسرے ادارے دوسرے ملکوں میں کام کر رہے ہیں۔ ان اداروں نے مختلف مظاہروں اور تجربات کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی شخصیت کسی پُراسرار شکل میں باقی رہتی ہے۔

فلسفہ نفسیات کے بہت سے علماء جنھوں نے ان شواہد کا غیر جانب دارانہ مطالعہ کیا ہے وہ زندگی بعد موت کو بطور واقعہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔ براؤن یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر سی۔ جے۔ ڈوکاس (G.J. Ducasse) نے اپنی کتاب کے سترھویں باب میں زندگی بعد موت کے تصور کا فلسفیانہ اور نفسیاتی جائزہ لیا ہے۔ پروفیسر موصوف اگرچہ مذہب کے معنوں میں اُخروی زندگی کے تصور پر عقیدہ نہیں رکھتے، مگر ان کا خیال ہے کہ ایسے شواہد موجود ہیں کہ مذہب کے عقیدے سے الگ کرکے زندگی کے بقا کو ہمیں ماننا پڑتا ہے۔ اس باب کے آخری حصے میں وہ سائیکیکل ریسرچ کی تحقیقات کا جائزہ لینے کے بعد لکھتے ہیں:

"کچھ بہت ہی ذہین اور نہایت ذی علم افراد جنھوں نے سالہا سال تک نہایت تنقیدی نظر سے متعلقہ شہادتوں کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کم از کم کچھ شواہد ایسے ضرور ہیں جن میں صرف بقائے روح کا فرضیہ (Survival Hypothesis) ہی معقول اور ممکن نظر آتا ہے، ان کی کوئی دوسری توجیہہ نہیں کی جاسکتی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موت کے بعد زندگی کا عقیدہ جس کو بہت سے لوگ مذہبی طور پر مانتے ہیں نہ صرف یہ کہ صحیح ہو سکتا ہے بلکہ شاید وہ ایک ایسا عقیدہ ہے جس کو تجرباتی دلیل (Empirical Proof) سے ثابت کیا جاسکتا ہے اور اگر ایسا ہے تو قطع نظر اس من گھڑت کے جو زندگی بعد موت کی نوعیت کے متعلق اہل مذاہب نے فرض کرلی ہے، قطعی معلومات بالآخر اس کے بارے میں حاصل ہو سکیں گی، مگر ایسی صورت میں اس کی مذہبی نوعیت کو ماننا ضروری نہیں ہوگا۔"

(A Philosophical Scrutiny of Religion, PP. 407-10

مصنف نے زندگی بعد موت کو بطور حقیقت تسلیم کرتے ہوئے اس کی مذہبی نوعیت کا انکار کیا ہے۔ یہ صرف تسکین نفس کی ایک کوشش ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ موت کے بعد بھی اگر زندگی باقی رہتی ہے تو اس کی کوئی بھی تعبیر مذہبی نوعیت کے سوا نہیں ہو سکتی۔

مذہب اور سائنس

مذہب اور سائنس دونوں بہت وسیع الفاظ ہیں۔ مذہب، زندگی کا ایک تصور اور اس تصور پر بننے والے ایک ہمہ گیر طرز عمل کا نام ہے جو زندگی کے تمام پہلوؤں کے بارے میں اپنے کچھ مطالبات اور تقاضے رکھتا ہے اور سائنس، اس محسوس دنیا کے مطالعہ کا نام ہے جو ہمارے مشاہدے اور تجربے میں آتی ہے یا آسکتی ہو۔ اس اعتبار سے دونوں نہایت وسیع موضوعات ہیں اور ان کے دائرے بہت سے پہلوؤں سے ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں مجھے یہاں دونوں کی تفصیلات پر کوئی بحث نہیں کرنی ہے۔ اس مقالے کا موضوع صرف وہ فرضی یا حقیقی تصادم ہے جو سائنس اور مذہب کے درمیان علمی حیثیت سے واقع ہوا اور جس کے کچھ نتائج برآمد ہوئے۔ میں مختصر طور پر صرف اس دعوے سے بحث کرنا چاہتا ہوں جس میں دہرایا گیا ہے کہ سائنس کی دریافتوں نے مذہب کو بے بنیاد ثابت کر دیا ہے۔

سائنس اور مذہب کا روایتی ٹکراؤ خاص طور پر اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی پیداوار ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ جدید سائنس کا ظہور ہوا۔ سائنسی دریافتوں کے سامنے آنے کے بعد بہت سے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ اب خدا کو ماننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ خدا کو ماننے کی ایک بہت بڑی وجہ، دوسری وجہوں کے ساتھ، یہ تھی کہ اس کو مانے بغیر کائنات کی توجیہ نہیں بنتی۔ مخالفینِ مذہب نے کہا کہ اب اس مقصد کے لئے ہم کو خدائی مفروضے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں ہم آسانی کے ساتھ پوری کائنات کی اس طرح تشریح کر سکتے ہیں کہ کسی بھی مرحلے میں خدا کو ماننے کی کوئی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اس طرح خدا کا خیال ان کی نظر میں ایک بے ضرورت چیز بن گیا اور جو خیال بے ضرورت ہو جائے اس کا بے بنیاد ہونا لازمی ہے۔

یہ دعویٰ جب کیا گیا، اس وقت بھی اگرچہ وہ علمی حیثیت سے نہایت کمزور تھا۔ مگر اب تو خود سائنس نے براہِ راست یا بالواسطہ طور پر اس بات کا اعتراف کر لیا ہے کہ اس کے پاس اس قسم کا دعویٰ کرنے کے لئے اطمینان بخش دلائل موجود نہیں ہیں۔

سائنس کی وہ کیا دریافت تھی جس میں لوگوں کو نظر آیا کہ اب خدا کی ضرورت ختم ہو گئی ہے۔ وہ خاص طور پر یہ تھا کہ سائنس نے معلوم کیا کہ کائنات کچھ خاص قوانین کی تابع ہے۔ قدیم زمانے کا انسان سادہ طور پر

یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا کرنے والا خدا ہے۔ مگر جدید ذرائع اور جدید طرز تحقیق کی روشنی میں دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ ہر واقعہ کے پیچھے ایک ایسا سبب موجود ہے جس کو تجربہ کر کے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً نیوٹن کے مشاہدے میں نظر آیا کہ آسمان کے تمام ستارے اور سیارے کچھ نا قابل تغیر قوانین میں بندھے ہوئے ہیں اور انھیں کے تحت حرکت کرتے ہیں۔ ڈارون کی تحقیق نے اسے بتایا کہ انسان کسی خاص تخلیقی حکم کے تحت وجود میں نہیں آیا بلکہ ابتدائی زمانے کے کیڑے مکوڑے عام مادی قوانین کے تحت ترقی کرتے کرتے انسان بن گئے ہیں۔ اسی طرح مطالعہ اور تجربے کے بعد زمین سے لے کر آسمان تک سارے واقعات ایک معلوم نظام کے تحت ظاہر ہوتے ہوئے نظر آئے۔ جسکو قانون فطرت (Law of nature) کا نام دیا گیا۔ قانون فطرت کا یہ عمل اس درجہ موثر تھا کہ اس کے بارے میں پیشگی خبر دی جا سکتی تھی۔

اس دریافت کا مطلب یہ تھا کہ جس کائنات کو ہم سمجھتے تھے کہ وہاں خدا کی کارفرمائی ہے، وہ کچھ مادی اور طبیعیاتی قوانین کی کارفرمائیوں کے تابع تھی۔ جب ان قوانین کو استعمال کیا گیا اور اس کے کچھ نتائج بھی برآمد ہوئے تو انسان کا یقین اور زیادہ بڑھ گیا۔ جرمن فلسفی کانٹ نے کہا: "مجھے مادہ مہیا کرو اور میں تم کو بتا دوں گا کہ دنیا اس مادے سے کس طرح بنائی جاتی ہے۔" ہیکل (Haeckel) نے دعویٰ کیا کہ "پانی" کیمیادی اجزا اور وقت ملے تو وہ ایک انسان کی تخلیق کر سکتا ہے۔ نٹشے نے اعلان کر دیا کہ "اب خدا مر چکا ہے۔" اس طرح یہ یقین کر لیا گیا کہ اس کائنات کا خالق اور مالک کوئی زندہ اور صاحب ذہن و ارادہ ہستی نہیں ہے۔ بلکہ کائنات از اول تا آخر ایک مادی کائنات ہے۔ کائنات کی ساری حرکتیں اور اس کے تمام مظاہر خواہ وہ ذی روح اشیاء سے متعلق ہوں یا بے روح اشیاء کے بارے میں ہوں، اندھے مادی عمل کے سوا اور کچھ نہیں۔ سائنس نے جس دنیا کو دریافت کیا اس میں کہیں اس خدا کی کارفرمائی نظر نہیں آتی تھی جو تمام مذاہب کی بنیاد ہے۔ پھر خدا کو مانا جائے تو کس لئے مانا جائے۔

اگرچہ اس دریافت کے ابتدائی تمام ہیرو خدا کو ماننے والے لوگ تھے۔ مگر دوسرے لوگوں کے سامنے جب یہ تحقیق آئی تو انھوں نے پایا کہ اس دریافت نے سرے سے خدا کے وجود ہی کو بے معنی ثابت کر دیا ہے۔ کیونکہ واقعات کی توجیہ کے لئے جب خود مادی دنیا کے اندر اسباب و قوانین مل رہے ہوں تو پھر اس کے لئے مادی دنیا سے باہر ایک خدا کو فرض کرنے کی کیا ضرورت۔ انھوں نے کہا کہ جب تک دوربین ایجاد نہیں ہوئی تھی اور ریاضیات نے ترقی نہیں کی تھی اس وقت انسان نہیں جان سکتا تھا کہ سورج کیسے نکلتا ہے اور

کیسے ڈوبتا ہے۔ چنانچہ اپنی لاعلمی کی وجہ سے اس نے یہ فرض کر لیا کہ کوئی خدائی طاقت ہے جو ایسا کرتی ہے۔ مگر اب فلکیات کے مطالعہ سے ثابت ہو گیا ہے کہ جذب وکشش کا ایک عالمی نظام ہے جس کے تحت سورج، چاند اور تمام ستارے اور سیارے حرکت کر رہے ہیں۔ اس لئے اب خدا کو ماننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسی طرح وہ تمام چیزیں جن کے متعلق پہلے سمجھا جاتا تھا کہ ان کے پیچھے کوئی اَن دیکھی طاقت کام کر رہی ہے، وہ سب جدید مطالعہ کے بعد ہماری جانی پہچانی فطری طاقتوں کے عمل اور ردعمل کا نتیجہ نظر آیا۔ گویا واقعہ کے فطری اسباب معلوم ہونے کے بعد وہ ضرورت آپ سے آپ ختم ہو گئی جس کے لئے پچھلے لوگوں نے ایک خدا یا مافوق الفطری طاقت کا وجود فرض کر لیا تھا۔ "اگر قوس قزح گرتی ہوئی بارش پر سورج کی شعاعوں کے انعطاف (Refraction) سے پیدا ہوتی ہے تو یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ وہ آسمان کے اوپر خدا کا نشان ہے" ہکسلے اس قسم کے واقعات پیش کرتا ہوا کس قدر یقین کے ساتھ کہتا ہے:۔

If events are due to natural causes,
they are not due to supernatural causes

یعنی واقعات اگر فطری اسباب کے تحت صادر ہوتے ہیں تو وہ مافوق الفطری اسباب کے پیدا کئے ہوئے نہیں ہو سکتے۔ اور ظاہر ہے کہ جب واقعات کے پیچھے مافوق الفطری اسباب موجود نہ ہوں تو کسی مافوق الفطرت ہستی کے وجود پر کیسے یقین کیا جا سکتا ہے۔

مخالفین مذہب کے اس استدلال میں کیا کمزوری ہے، اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک شخص ریلوے انجن کو دیکھتا ہے کہ اس کے پہیے گھوم رہے ہیں اور وہ پٹری پر بھاگا چلا جا رہا ہے۔ اس کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پہیے کیسے گھوم رہے ہیں۔ تحقیق کرنے کے بعد اس کی رسائی انجن کے پُرزوں تک ہوتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ پرزوں کی حرکت سے پہیے گھوم رہے ہیں۔ کیا اس دریافت کے بعد وہ یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوگا کہ انجن اپنے پرزوں کے ساتھ بذات خود ٹرین کی حرکت کا سبب ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ انجن سے پہلے انجنیر اور ڈرائیور کو ماننا ضروری ہے۔ انجنیر اور ڈرائیور کے بغیر انجن کا نہ تو کوئی وجود ہے اور نہ اس میں کسی قسم کی حرکت کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ گویا انجن یا اس کا پرزہ آخری حقیقت نہیں۔ آخری حقیقت وہ ذہن ہے جو انجن کو وجود میں لایا ہے اور اپنے ارادہ سے اس کو چلا رہا ہے۔ ایک عیسائی عالم نے بہت صحیح کہا کہ فطرت کائنات کی توجیہ نہیں کرتی۔ وہ خود اپنے لئے ایک

توجیہ کی طالب ہے:۔ Nature does not explain, she is herself in need of an explanation

کیونکہ، اس کے الفاظ میں، فطرت کا قانون تو کائنات کا ایک واقعہ ہے، اس کو کائنات کی توجیہ نہیں کہا جاسکتا:

Nature is a fact, not an explanation

مرغی کا بچہ انڈے کے مضبوط خول کے اندر پرورش پاتا ہے اور اس کے ٹوٹنے سے باہر آجاتا ہے۔ یہ واقعہ کیونکر ہوتا ہے کہ خول ٹوٹے اور بچہ جو گوشت کے لوتھڑے سے زیادہ نہیں ہوتا، وہ باہر نکل آئے پہلے کا انسان اس کا جواب یہ دیتا تھا کہ "خدا ایسا کرتا ہے"۔ مگر اب خوردبینی مشاہدہ کے بعد معلوم ہوا کہ جب ۲۱ روز کی مدت پوری ہونے والی ہوتی ہے، اس وقت انڈے کے اندر ننھے بچے کی چونچ پر ایک چھوٹی سی سخت سینگ ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی مدد سے وہ اپنے خول کو توڑ کر باہر آجاتا ہے۔ سینگ اپنا کام پورا کرکے بچے کی پیدائش کے چند دن بعد خود بخود جھڑ جاتی ہے۔

مخالفین مذہب کے نظریے کے مطابق یہ مشاہدہ اس پرانے خیال کو غلط ثابت کر دیتا ہے کہ بچہ کو باہر نکالنے والا خدا ہے۔ کیونکہ خوردبین کی آنکھ ہم کو صاف طور پر دکھا رہی ہے کہ ایک ۲۱ روزہ قانون ہے جس کے تحت وہ صورتیں پیدا ہوتی ہیں جو بچہ کو خول کے باہر لاتی ہیں۔ مگر یہ مغالطہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ جدید مشاہدہ نے جو کچھ ہمیں بتایا ہے وہ صرف واقعہ کی چند مزید کڑیاں ہیں، اس نے واقعہ کا اصلی اور آخری سبب نہیں بتایا۔ اس مشاہدہ کے بعد صورت حال میں جو فرق ہوا ہے وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ پہلے جو سوال خول ٹوٹنے کے بارے میں تھا، وہ "سینگ" کے اوپر جاکر ٹھہر گیا۔ بچہ کا اپنی سینگ سے خول کو توڑنا واقعہ کی صرف ایک درمیانی کڑی ہے۔ اس لحاظ سے وہ اصل واقعہ ہی کا ایک جزو ہے، وہ واقعہ کی تشریح نہیں ہے۔ واقعہ کی تشریح تو اس وقت معلوم ہوگی جب ہم جان لیں کہ وہ آخری اسباب کیا ہیں جن کے نتیجے میں بچہ کی چونچ پر سینگ نمودار ہوئی۔ اس آخری سبب کو جاننے سے پہلے سینگ کا ظہور خود ایک سوال ہے، نہ کہ اسے اصل سوال کا جواب قرار دیا جائے۔ کیونکہ پہلے اگر یہ سوال تھا کہ "خول کیسے ٹوٹتا ہے"۔ تو اب یہ سوال ہو گیا کہ "سینگ کیسے بنتی ہے؟"۔ ظاہر ہے کہ دونوں حالتوں میں کوئی نوعی فرق نہیں۔ اس کو زیادہ سے زیادہ فطرت کا وسیع تر مشاہدہ کہہ سکتے ہیں۔ فطرت کی توجیہ کا نام نہیں دے سکتے۔

مخالفین مذہب جس انکشاف کو فطرت کی توجیہ کا نام دے کر اس کو خدا کا بدل ٹھہرا رہے ہیں، اس کو ہم نہایت آسانی سے فطرت کا طریق کار کہہ سکتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدا ان قوانین کے ذریعہ کائنات میں اپنا عمل کرتا ہے جس کے بعض اجزا کو سائنس نے دریافت کیا ہے، فرض کیجئے مذہبی لوگ یہ عقیدہ رکھتے

ہیں کہ سمندروں میں جوار بھاٹا لانے والا خدا ہے۔ اب جدید دور کا ایک سائنس داں اٹھتا ہے اور ہم کو بتاتا ہے کہ جوار بھاٹا در حقیقت چاند کی کشش (Gravity-pull of the moon) اور دنیا کے سمندروں اور خشکی کے ٹکڑوں کی جغرافی وضع و ہیئت (Geographical Configuration) کے سبب سے ہوتا ہے۔ سائنس داں کے اس مشاہدے کو ہمیں رد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بہت خوشی کے ساتھ ہم اسے قبول کر سکتے ہیں۔ مگر اس سے ہمارے عقیدے کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ صحیح ہے کہ طوفان قوت کشش اور زمین کی جغرافی بناوٹ کے ذریعہ عمل کرتا ہے۔ مگر قوت کشش اور جغرافی بناوٹ کیا ہیں۔ وہ بھی خدا ہی کی مخلوق ہیں۔ وہ خدا ہی ہے جو ان ذرائع سے اپنا فعل انجام دیتا ہے۔ خدا آج بھی طوفان کا حقیقی سبب ہے۔ جان ولسن کے الفاظ میں:۔

> This does'nt destroy my belief :
> it is still God, working through these things,
> who is responsible for the tides.
>
> John Wilson, Philosophy & Religion,
> (London, 1861) P. 36

اسی طرح حیاتیات کے میدان میں نظریۂ ارتقاء کے حوالے سے یہ بات بار بار دہرائی گئی ہے کہ حیاتیاتی عمل اب کسی ماورائے فطرت ذریعہ کی موجودگی کا تقاضا نہیں کرتا۔ دوسرے لفظوں میں زندگی کے مسئلے کو سمجھنے کے لئے کسی باشعور خدا کو ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ جدید مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ زندگی صرف چند مادی طاقتوں سے خود بخود حاصل ہونے والا ایک نتیجہ ہے جو خاص طور پر تین ہیں:۔

Reproduction, Variation, and Differential Survival.

یعنی توالد و تناسل کے ذریعہ مزید زندگیوں کا پیدا ہونا، پیدا شدہ نسل کے بعض افراد میں کچھ فرقوں کا ظہور اور پھر ان فروق کا پشت ہا پشت میں ترقی کر کے مکمل ہو جانا۔ اس طرح مخالفین مذہب کے نقطہ نظر کے مطابق ڈارون کے انتخاب طبیعی کے اصول کا حیاتیاتی مظاہر پر انطباق اس کو ممکن اور ضروری بنا دیتا ہے کہ زندگی کی نشوونما پر خدا کی کارفرمائی کے تصور کو بالکل ترک کر دیا جائے۔

اگرچہ ابھی تک بذات خود یہ بات غیر ثابت شدہ ہے کہ انواع حیات فی الواقع اسی طرح وجود میں آئی ہیں جیسا کہ ارتقاء پسند علماء بتاتے ہیں۔ تاہم اگر اس کو بلا بحث مان لیا جائے جب بھی اس سے مذہبی عقیدے کے تزلزل کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ انواع حیات اگر بالفرض ارتقائی عمل کے تحت وجود میں آئی ہوں جب بھی یکساں درجہ کی قوت کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ خدائی تخلیق کا طریقہ ہے، نہ کہ اندھے مادی عمل کا خود بخود نتیجہ۔ حقیقت یہ ہے کہ مشینی ارتقاء (Mechanical Evolution) کو نہایت

آسانی کے ساتھ تخلیقی ارتقاء (Creational Evolution) ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اور سائنس کے حوالے سے مذہب کی مخالفت کرنے والوں کے پاس اس کی تردید کی کوئی واقعی بنیاد نہیں ہوگی۔

مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس نے بیسویں صدی میں پہنچ کر اپنے سابق یقین کو کھو دیا ہے۔ آج جبکہ نیوٹن کی جگہ آئن سٹائن نے لے لی ہے اور پلانک اور ہیزن برگ نے لاپلاس کے نظریات کو منسوخ کر دیا ہے، اب مخالفین مذہب کے لئے، کم از کم علمی بنیاد پر، اس قسم کا دعویٰ کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ نظریہ اضافیت (Relativity) اور کوانٹم تھیوری نے خود سائنسدانوں کو اس نتیجہ تک پہنچایا ہے کہ وہ اس بات کا اعتراف کر لیں کہ یہ ناممکن ہے کہ سائنس میں مشاہد (Observer) کو مشاہدہ (Observed) سے الگ کیا جا سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی چیز کے صرف چند خارجی مظاہر کو دیکھ سکتے ہیں، اس کی اصل حقیقت کا مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ بیسویں صدی میں سائنس کے اندر جو انقلاب ہوا ہے اس نے خود سائنسی نقطۂ نظر سے مذہب کی اہمیت ثابت کر دی ہے۔

سائنس میں جو چیز جدید انقلاب کہی جاتی ہے، وہ اس واقعہ پر مشتمل ہے کہ نیوٹن کا نظریہ جو دو سو سال تک سائنس کی دنیا پر حکمراں رہا، وہ جدید مطالعہ کے بعد ناقص پایا گیا ہے۔ اگرچہ سابقہ فکر کی جگہ ابھی تک کوئی مکمل نظریہ نہیں آسکا ہے مگر یہ واضح ہے کہ نئے رجحان کے فلسفیانہ تقاضے اس سے بالکل مختلف ہیں جو پچھلے نظریے کے تھے۔ اب یہ دعویٰ نہیں رہا کہ سائنٹفک طریق مطالعہ ہی حقیقت کو معلوم کرنے کا واحد صحیح طریقہ ہے سائنس کے ممتاز علماء حیرت انگیز طور پر اقرار کر رہے ہیں کہ:۔

Science gives us but a partial knowledge of reality

سائنس ہم کو صداقت کا صرف جزوی علم دیتی ہے

سائنسی رجحان میں یہ تبدیلی اچانک پیدا ہوئی ہے۔ صرف سو برس گزرے جب ٹنڈل T ndall نے اپنے خطبۂ بلفاسٹ (Belfast Address) میں اعلان کیا تھا کہ سائنس تنہا انسان کے تمام اہم معاملات سے بحث (Deal) کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس قسم کے خیالات اس مفروضہ یقین کی بنیاد پر قائم کئے گئے تھے کہ حقیقت تمام کی تمام صرف مادہ اور حرکت (Matter and Motion) پر مشتمل ہے۔ مگر فطرت کو مادہ اور حرکت کی اصطلاحوں میں بیان کرنے کی ساری کوشش ناکام ثابت ہوئی اٹھارہویں صدی کے آخر میں یہ کوشش اپنے عروج پر تھی جب لاپلاس (Laplace) نے یہ کہنے کی جرأت کی کہ ایک عظیم ریاضی داں جو ابتدائی سحابیہ (Nebulae) میں ذرات کے انتشار کو جانتا ہو

وہ دنیا کے مستقبل کی پوری تاریخ کو پیشگی بتا سکتا ہے۔ اس وقت یہ یقین کر لیا گیا تھا کہ نیوٹن کا نظریہ سارے علوم کی کنجی ہے۔

نیوٹن کے نظریے کی غلطی پہلی بار اس وقت ظاہر ہوئی جب علماء نے روشنی کی مادی تشریح کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش انھیں ایتھر (Ether) کے عقیدے تک لے گئی جو بالکل مجہول اور ناقابل بیان عنصر تھا۔ کچھ نسلوں تک یہ عجیب وغریب عقیدہ چلتا رہا۔ روشنی کی مادی تعبیر کے حق میں ریاضیات کے خوب خوب معجزے دکھائے گئے۔ لیکن میکسویل (Maxwell) کے تجربات کی اشاعت کے بعد یہ مشکل ناقابل عبور نظر آنے لگی۔ کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ روشنی ایک برقی مقناطیسی مظہر (Electromagnetic Phenomenon) ہے۔ یہ خلا بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ دن آیا جب علمائے سائنس پر واضح ہوا کہ نیوٹن کے نظریات میں کوئی چیز "مقدس" نہیں ہے۔ بہت دنوں کے تذبذب اور بجلی کو مادی (Mechanical) ثابت کرنے کی آخری کوششوں کے بعد بالآخر بجلی کو ناقابل تحویل عناصر (Irreducible Elements) کی فہرست میں شامل کر دیا گیا۔

یہ بظاہر ایک سادہ سی بات ہے۔ مگر درحقیقت یہ بہت معنی خیز فیصلہ ہے۔ نیوٹن کے تصور میں ہم کو سب کچھ اچھی طرح معلوم تھا۔ اس کے مطابق ایک جسم کی کیفیت اس کی مقدار مادہ تھی، طاقت کا مسئلہ حرکت سے سمجھ میں آجاتا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح یقین کر لیا گیا تھا کہ ہم اس فطرت کو جانتے ہیں جس کے متعلق ہم کلام کر رہے ہیں مگر بجلی کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اس کی فطرت (Nature) ایسی ہے جس کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ اس کو معلوم اصطلاحوں میں تعبیر کرنے کی ساری کوششیں ناکام ہو گئیں۔ وہ سب کچھ جو ہم بجلی کے متعلق جانتے ہیں وہ صرف وہ طریقہ ہے جس سے وہ ہمارے پیمائشی آلات کو متاثر کرتی ہے۔ اب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ بات کس قدر اہم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسے وجود (entity) کو طبیعیات میں تسلیم کر لیا گیا جس کے متعلق ہم اس کے ریاضیاتی ڈھانچے کے سوا اور کچھ نہیں جانتے۔

اس کے بعد اس نہج پر اس قسم کے اور بھی وجود تسلیم کئے گئے اور یہ مان لیا گیا کہ یہ لامعلوم ہستیاں بھی سائنسی نظریات کے بنانے میں وہی حصہ ادا کرتی ہیں جو قدیم معلوم مادہ ادا کرتا تھا۔ یہ حقیقت قرار پا گیا کہ جہاں تک علم طبیعیات کا تعلق ہے، ہم کسی چیز کے اصلی وجود کو نہیں جان سکتے۔ بلکہ صرف اس کے ریاضیاتی ڈھانچے (Mathematical Structure) کو جاننے کی کوشش کر سکتے ہیں اب اعلیٰ ترین سطح پر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ہمارا یہ خیال کہ ہم اشیاء کو ان کی آخری صورت میں دیکھ سکتے ہیں محض فریب تھا۔

پروفیسر اڈنگٹن (Eddington) کے نزدیک ریاضیاتی ڈھانچہ کا علم ہی وہ واحد علم ہے جو طبیعیاتی سائنس ہمیں دے سکتی ہے:۔

"جمالیاتی، اخلاقی اور روحانی پہلوؤں سے قطع نظر، کمیت مادہ، جوہر، وسعت اور مدت وغیرہ جو خالص طبیعیات کے دائرے کی چیزیں سمجھی جاتی ہیں، ان کی کیفیت کو جاننا بھی ہمارے لئے ویسا ہی مشکل ہو گیا ہے جیسے غیر مادی چیزوں کی حقیقت کو جاننا۔ موجودہ طبیعیات اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ وہ ان چیزوں سے براہ راست واقف ہو سکے۔ ان کی حقیقت، ادراک سے باہر ہے ہم ذہنی خاکوں کی مدد سے اندازہ کرتے ہیں۔ مگر ذہن کا کوئی عکس ایک ایسی چیز کی بعینہٖ نقل نہیں ہو سکتا جو خود ذہن کے اندر موجود نہ ہو۔ اس طرح اپنے حقیقی طریق مطالعہ کے اعتبار سے طبیعیات ان خارج از ادراک خصوصیتوں کا مطالعہ نہیں کرتی بلکہ وہ صرف مطالعہ بر آلہ (Pointer Reading) ہے جو ہمارے علم میں آتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ مطالعہ عمل کائنات کی بعض خصوصیات کو منعکس کرتا ہے، مگر ہماری اصل معلومات آلاتی مطالعہ سے متعلق ہیں نہ کہ وہ خصوصیات کے بارے میں ہیں۔ آلاتی مطالعہ کو اشیاء کی حقیقی خصوصیات سے وہی نسبت ہے جو ٹیلی فون نمبر کو اس شخص سے جس کا وہ فون نمبر ہے"۔

یہ واقعہ کہ سائنس صرف ڈھانچہ کی معلومات تک محدود ہے، بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حقیقت ابھی پورے طور پر معلوم شدہ نہیں ہے۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمارے احساسات یا خدا سے اتصال کا عارفانہ تجربہ اپنا کوئی خارجی جواب (Objective counterpart) نہیں رکھتا یہ قطعی ممکن ہے کہ ایسا کوئی جواب خارج میں موجود ہو۔ ہمارے مذہبی اور جمالیاتی احساسات اب محض مظاہر فریب (Illusory Phenomenon) نہیں کہے جا سکتے جیسا کہ پہلے سمجھا جاتا تھا نئی سائنسی دنیا میں مذہبی عارف بھی ایک حقیقت کے طور پر رہ سکتا ہے۔

The Limitations of Science, pp. 138-42

سائنٹفک فلاسفہ نے اس قسم کی تشریحات شروع کر دی ہیں۔ مارٹن وائٹ e (Morton White) کے الفاظ میں: "بیسویں صدی میں فلسفیانہ ذہن رکھنے والے سائنسدانوں نے ایک نئی جنگ (Crusade) کا آغاز کر دیا ہے۔ جس میں وہائٹ ہیڈ، ایڈنگٹن اور جینز کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں: ان علماء کا فکر صریح طور پر کائنات کی مادی تعبیر کی نفی کرتا ہے، مگر ان کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے خود جدید طبیعیات اور ریاضیات کے نتائج کے حوالے سے اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے بارے میں وہی الفاظ صحیح ہیں جو مارٹن

وائٹ نے وائٹ ہیڈ کے متعلق لکھے ہیں:۔

He is heroic thinker who tries to beard the lions of Intellectualisw, Materialism and Positivism in their own bristling den. (P. 84)

'The Domain of Physical Science' essay in Science, Religion and Reality
The age of Analysis, P. 84

یعنی وہ ایک بلند ہمت مفکر ہے جس نے مادہ پرستی کے شیروں کو عین ان کے بھٹ میں للکارا ہے۔
انگریز ماہر ریاضیات اور فلسفی الفرڈ نارتھ وائٹ ہیڈ (۱۹۴۷ - ۱۸۶۱) کے نزدیک جدید معلومات یہ ثابت کرتی ہیں کہ

Nature is Alive (P. 84)

یعنی فطرت بے روح مادہ نہیں، بلکہ زندہ فطرت ہے۔
انگریز ماہر فلکیات سر آرتھر اڈنگٹن (۱۹۴۴ - ۱۸۸۲) نے موجودہ سائنس کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ:

The stuff of the world is mind-stuff. (146)

یعنی کائنات کا مادہ ایک شے ذہنی ہے۔
ریاضیاتی طبیعیات کا انگریز عالم سر جیمز جینز (۱۹۴۶ - ۱۸۷۷) جدید تحقیقات کی تعبیر ان الفاظ میں کرتا ہے:

The universe is a universe of thought (P. 134)

یعنی کائنات، مادی کائنات نہیں بلکہ تصوراتی کائنات ہے۔
یہ انتہائی مستند سائنسدانوں کے خیالات ہیں جن کا خلاصہ جے۔ ڈبلیو۔ این سولیون کے الفاظ میں یہ ہے کہ:

The ultimate nature of the universe is mental.
P. 145

کائنات کی آخری ماہیت ذہن ہے۔
آخری حقیقت ذہن ہے یا مادہ۔ یہ فلسفیانہ الفاظ میں در اصل یہ سوال ہے کہ کائنات محض مادہ کے ذاتی عمل کے طور پر خود بخود بن گئی ہے یا کوئی غیر مادی ہستی ہے جس نے بالارادہ اسے تخلیق کیا

ہے جیسے کسی مشین کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ اپنے آخری تجزیے میں محض لوہے اور پٹرول کا ایک اتفاقی مرکب ہے۔ گویا یہ کہنا ہے کہ مشین سے پہلے صرف لوہا اور پٹرول تھا اور اس نے خود ہی کسی اندھے عمل کے ذریعہ محض اتفاق سے مشین کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس کے برعکس اگر یہ کہا جائے کہ مشین اپنے آخری تجزیے میں انجنیر کا ذہن ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مشین سے پہلے ایک ذہن تھا جس نے مادہ سے الگ اس کے ڈزائن کو سوچا اور بالارادہ اسے تیار کیا۔

• ذہن" کے تعین میں اختلاف سے ذہن کو آخری حقیقت ماننے والوں میں مختلف گروہ ہو سکتے ہیں جیسے خدا کو ماننے والے خدا کو ماننے کے باوجود مختلف ٹولیوں کی شکل میں پائے جاتے ہیں۔ مگر علمی مطالعہ کا یہ نتیجہ کہ کائنات کی آخری حقیقت ذہن ہے، یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے مذہب کی تصدیق ہے اور الحاد کی تردید۔

یہ ایک عظیم تبدیلی ہے جو موجودہ صدی میں سائنس کے اندر ہوئی ہے۔ اس تبدیلی کا اہم ترین پہلو، جے۔ ڈبلیو۔ این۔ سولیون کے الفاظ میں، یہ نہیں ہے کہ تمدنی ترقی کے لئے زیادہ طاقت حاصل ہو گئی ہے بلکہ یہ تبدیلی وہ ہے جو اس کی مابعد الطبیعیاتی بنیادوں (Metaphysical Foundations) میں واقع ہوئی ہے۔

The Limitations of Science, pp. 138-50

برطانیہ کے مشہور ماہر فلکیات اور ریاضی داں سر جیمز جینز (Sir James Jeans) کی کتاب "پر اسرار کائنات" غالباً اس پہلو سے موجودہ زمانے کا سب سے زیادہ قیمتی مواد ہے۔ اس کتاب میں موصوف خالص سائنسی بحث کے ذریعہ اس نتیجے تک پہنچتے ہیں کہ:

"جدید طبیعیات کی روشنی میں کائنات مادی تشریح (Material Representation) کو قبول نہیں کرتی۔ اور اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ اب وہ محض ایک ذہنی تصور (Mental Concept) ہو کر رہ گئی ہے"

The Mysterious Universe (1948) P. 123

جینز کے الفاظ میں:

> If the universe is a universe of thought, then its creation must have been an act of thought. (P. 133-34)

یعنی جب کائنات ایک تصوراتی کائنات ہے تو اس کی تخلیق بھی ایک تصوراتی عمل سے ہونی چاہئے۔ وہ کہتا ہے کہ مادہ کو امواج برق سے تعبیر کرنے کا جدید نظریہ انسانی تخیل کے لئے بالکل ناقابل ادراک ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ لہریں محض امکان کی لہریں (Waves of Probabilities) ہوں جن کا کوئی وجود نہ ہو۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے وجوہ سے سرجیمز جینز اس نتیجہ تک پہنچا ہے کہ کائنات کی حقیقت مادہ نہیں، بلکہ تصور ہے۔ یہ تصور کہاں واقع ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ ایک عظیم ریاضیاتی مفکر (Mathematical Thinker) کے ذہن میں ہے۔ کیونکہ اس کا ڈھانچہ، جو ہمارے علم میں آتا ہے، وہ مکمل طور پر ریاضیاتی ڈھانچہ ہے۔ یہاں میں اس کا ایک اقتباس نقل کروں گا۔

"یہ کہنا صحیح ہوگا کہ علم کا دریا پچھلے چند سالوں میں ایک نئے رُخ پر مڑا ہے۔ تیس سال پہلے ہم نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ہم ایک ایسی حقیقت کے سامنے ہیں جو اپنی نوعیت میں مشینی (Mechanical) قسم کی ہے۔ ایسا نظر آتا تھا کہ کائنات ایٹموں کے ایک ایسے بے ترتیب انبار پر مشتمل ہے جو اتفاقی طور پر اکٹھا ہو گئے ہیں اور جن کا کام یہ ہے کہ بے مقصد اور اندھی طاقتوں کے عمل کے تحت، جو کوئی شعور نہیں رکھتیں، کچھ زمانے کے لئے ایک بے معنی رقص کریں جس کے ختم ہونے پر محض ایک مردہ کائنات باقی رہ جائے۔ اس خالص میکانکی دنیا میں، مذکورہ بالا اندھی طاقتوں کے عمل کے دوران میں، زندگی محض اتفاق سے وجود میں آگئی۔ کائنات کا ایک بہت ہی چھوٹا گوشہ یا امکان کے طور پر اس طرح کے کئی گوشے کچھ عرصے کے لئے اتفاقی طور پر ذی شعور ہو گئے ہیں اور یہ بھی ایک بے روح دنیا کو چھوڑ کر بالآخر ایک روز ختم ہو جائیں گے۔ آج ایسے قوی دلائل موجود ہیں جو طبیعی سائنس کو یہ ماننے پر مجبور کرتے ہیں کہ علم کا دریا ایک غیر مشینی حقیقت (Non-Mechanical Reality) کی طرف چلا جا رہا ہے۔ کائنات ایک بہت بڑی مشین کے بجائے ایک بہت بڑے خیال (Great Thought) سے زیادہ مشابہ معلوم ہوتی ہے۔ ذہن (Mind) اتفاقاً محض اجنبی کی حیثیت سے اس مادی دنیا میں وارد نہیں ہو گیا ہے۔ اب ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ رہے ہیں کہ ذہن کا عالم مادی کے خالق اور حکمراں کی حیثیت سے استقبال کریں۔ یہ ذہن بلاشبہ ہمارے شخصی ذہن کی طرح نہیں ہے۔ بلکہ ایک ایسا ذہن ہے جس نے مادی ایٹم سے انسانی دماغ کی تخلیق کی۔ اور یہ سب کچھ ایک اسکیم کی شکل میں پہلے سے اس کے ذہن میں موجود تھا۔ جدید علم ہم کو مجبور کرتا ہے کہ ہم دنیا کے بارے میں اپنے ان خیالات پر نظر ثانی کریں جو ہم نے جلدی میں قائم کر لئے تھے۔ ہم نے دریافت کر لیا ہے کہ کائنات ایک منصوبہ ساز یا حکمراں (Designing or Controlling Power)

کی شہادت دے رہی ہے جو ہمارے شخصی ذہن سے بہت کچھ مشابہ ہے۔ جذبات و احساسات کے اعتبار سے نہیں بلکہ اس طرز پر سوچنے کے اعتبار سے جس کو ہم ریاضیاتی ذہن (Mathematical Mind) کے الفاظ میں ادا کر سکتے ہیں۔"

The Mysterious Universe pp.136-38

سائنس کے اندر علمی حیثیت سے اس تبدیلی کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ عملی طور پر انکار خدا کے ذہن میں کوئی نمایاں فرق پیدا نہیں ہوا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس انکار خدا کے وکیل نئے نئے ڈھنگ سے اپنے دلائل کو ترتیب دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ کوئی علمی دریافت نہیں بلکہ محض تعصب ہے۔ تاریخ بے شمار مثالوں سے بھری ہوئی ہے کہ حقیقت کے ظاہر ہو جانے کے باوجود انسان نے محض اس لئے اس کو قبول نہیں کیا کہ تعصب اسکی اجازت نہیں دیتا تھا۔ یہی تعصب تھا جب چار سو برس پہلے اٹلی کے علماء نے ارسطو کے مقابلے میں گلیلیو کے نظریے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ لیننگ ٹاور سے گرنے والے گولے اس کے نظریے کو آنکھوں دیکھی حقیقت بنا چکے تھے۔ پھر یہی تعصب تھا کہ جب انیسویں صدی کے آخر میں برلن کے پروفیسر ماکس پلانک (Max Planek) نے روشنی کے متعلق بعض ایسی تشریحات پیش کیں جو کائنات کے نیوٹنی تصور کو غلط ثابت کر رہی تھیں تو وقت کے ماہرین نے اس کو تسلیم نہیں کیا اور عرصہ تک اس کا مذاق اڑاتے رہے۔ حالانکہ آج وہ کوانٹم تھیوری کی صورت میں علم طبیعیات کے اہم اصولوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

اگر کسی کا یہ خیال ہو کہ تعصب دوسرے لوگوں میں تو ہو سکتا ہے مگر سائنس دانوں میں نہیں ہوتا۔ تو اس کو میں ایک سائنس داں کا قول یاد دلاؤں گا۔ ڈاکٹر ہلز (A.V. Hills) نے کہا ہے:

I should be the last to claim that we, scientific men, are less liable to prejudice than other educated men.

Quoted by A. N. Gilkes. Faith for Modern Man, P. 109

یعنی میں آخری شخص ہوں گا جو اس بات کا دعویٰ کرے کہ ہم سائنسداں دوسرے تعلیم یافتہ لوگوں کے مقابلے میں کم تعصب رکھنے والے ہوتے ہیں۔

اب ایک ایسی دنیا میں جہاں تعصب کی کارفرمائی ہو، یہ امید کیسے کی جاسکتی ہے کہ کوئی تصور محض اس لئے قبول کر لیا جائے گا کہ وہ علمی طور پر ثابت ہو گیا ہے۔ تاریخ کا طویل تجربہ ہے کہ انسان کے رہنما اسکے جذبات رہے ہیں، نہ کہ اس کی عقل۔ اگرچہ علمی اور منطقی طور پر عقل ہی کو بلند مقام حاصل ہے مگر زیادہ تر ایسا ہی ہوا ہے کہ عقل خود جذبات کی آلۂ کار رہی ہے۔ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ وہ جذبات کو اپنے قابو میں کر سکی ہو۔ عقل نے

ہمیشہ جذبات کے حق میں دلائل تراشتے ہیں اور اس طرح اپنے جذباتی رویے کو عقلی رویہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتی رہی ہے، خواہ حقیقت واقعہ انسان کا ساتھ نہ دے مگر جذبات سے پٹا رہنا وہ اپنے لئے ضروری سمجھتا ہے ہم کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارا معاملہ کسی مشین سے نہیں ہے جو بٹن دبانے کے بعد لازماً اس کے مطابق اپنا رد عمل ظاہر کرتی ہے، بلکہ ہمارا مخاطب انسان ہے۔ اور انسان اسی وقت کسی بات کو مانتا ہے جبکہ وہ خود بھی ماننا چاہے۔ اگر وہ خود ماننا نہ چاہتا ہو تو کوئی دلیل محض دلیل ہونے کی حیثیت سے اسے قائل نہیں کر سکتی۔ دلیل کو برقی بٹن (Electric Switch) کا قائم مقام نہیں بنایا جا سکتا۔ اور بلاشبہ انسانی تاریخ کی یہ سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔

انسان

جس کو سائنس دریافت نہ کر سکی

جدید علماء طویل تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جس طرح ہم بے جان مادہ کے مطالعہ میں کامیاب ہوئے ہیں، اسی طرح ہم انسان کے متعلق حقائق کو دریافت نہیں کر سکتے۔ جامد مادے کے علوم اور حیاتیاتی علوم کے درمیان یہ فرق ہے کہ جامد مادہ ایک متعین قانون کا پابند ہے۔ جبکہ حیاتیاتی مظاہر گویا۔ ایک طلسماتی جنگل ہیں جہاں رنگ برنگ کے بے شمار درخت مسلسل طور پر اپنی جگہ اور اپنی شکل بدلتے رہتے ہیں"۔ مادی مظاہر کے برعکس حیاتیاتی مظاہر کو جبر و مقابلہ کی مساداتوں میں تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ مادی دنیا کا علم بھی اب تک صرف وصفی علم (Descriptive Science) کے مقام تک پہونچا ہے جو درحقیقت سائنس کی ایک ادنی شکل ہے، کیونکہ یہ علم چیزوں کی اصل نوعیت کو ہمارے اوپر بے نقاب نہیں کرتا۔ بلکہ یہ اس کے چند ظاہری اوصاف مثلاً وزن اور مکانی ابعاد (Spatial Dimensions) وغیرہ کو بیان کرتا ہے تاہم اس علم کی بدولت یہ ہوا ہے کہ ہم میں اتنی طاقت پیدا ہو گئی ہے کہ آئندہ ہونے والے واقعات کے متعلق پیش گوئی کر سکیں بلکہ اکثر حالات میں ان کے ٹھیک ٹھیک واقع ہونے کی تاریخ کا تعین کر سکیں۔ مادہ کی ترکیب اور اس کی خصوصیات جان لینے کے بعد ہم کو اپنی ذات کے علاوہ تقریباً ہر اس چیز پر قابو حاصل ہو گیا ہے جو زمین کی سطح پر موجود ہے۔ جاندار دں کے علم نے بالعموم اور انسان کے علم نے بالخصوص اتنی زیادہ ترقی نہیں کی ہے، یہ علم اب تک صرف وصفی حالت میں ہے جبکہ ذی حیات اشیا کی اصل حقیقت ان کا غیر وصفی ہونا ہے۔

یہاں میں الکسس کیرل کا ایک اقتباس نقل کروں گا:

" انسان ایک انتہائی پیچیدہ اور ناقابل تقسیم کل ہے۔ کوئی چیز بھی آسانی کے ساتھ اس کی نمائندگی نہیں کر سکتی۔ کوئی ایسا طریقہ نہیں ہے جس کے ذریعہ ہم بیک وقت اس کی پوری ذات کو اس کے اجزاء اور بیرونی دنیا کے ساتھ اس کے تعلقات کو بخوبی سمجھ سکیں۔ اپنی ذات کا تجزیہ کرنے کے لئے ہم کو مختلف فنی مہارتوں

سے مدد لینی پڑتی ہے۔ اور اس طرح مختلف علوم سے کام لینا ہوتا ہے فطری طور پر یہ تمام علوم اپنے کسی عام مقصد کے متعلق کسی ایک متحدہ تصور پر نہیں پہنچتے۔ وہ انسان سے صرف انھیں چیزوں کی تجرید کرتے ہیں جو ان کے خاص طریقوں سے حاصل ہو سکتی ہے اور ان مجردات کو ایک دوسرے سے ملا بھی دیا جائے تو وہ ایک ٹھوس حقیقت سے بھی کم قیمتی ہوتے ہیں۔ ان مجردات کے بعد بھی ایک ایسی ذات باقی رہتی ہے جو بہت ہی اہم ہوتی ہے اور اس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ علم تشریح، کیمیا، فعلیات، نفسیات، تعلیمات تاریخ، سماجیات، سیاسی اقتصادیات اپنے موضوع کو پورے طور پر ختم نہیں کرتے۔ وہ انسان جس سے خصوصی ماہرین آشنا ہیں، حقیقی انسان سے بہت دور ہوتا ہے۔ وہ ایک مفروضہ کے سوا اور کچھ نہیں جو مختلف مفروضات پر مشتمل ہے۔ اور جن کو ہر ایک علم کی فنی مہارتوں نے پیدا کیا ہے۔

انسان بیک وقت ایک لاش ہے جس کو تشریح کا عالم چیرتا پھاڑتا ہے، وہ ایک شعور ہے جب کا ماہرین نفسیات اور بڑے بڑے روحانی اساتذہ مشاہدہ کرتے ہیں۔ وہ ایک شخصیت ہے جس کے اندر دیکھنے سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ اس کی ذات کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے؛ وہ کیمیائی مادہ بھی ہے جس سے جسم کی نسیجیں اور خلئیں بنتی ہیں، وہ خلیوں، اور تغذیاتی رطوبتوں کا ایک حیرت انگیز گروہ ہے جنکے جسمانی قوانین کا مطالعہ ماہرین فعلیات کرتے ہیں، وہ نسیجوں اور شعور سے مرکب ہے جس کو حفظان صحت اور تعلیمات کے ماہرین، جبکہ وہ زمان کے اندر پھیل رہا ہو، امید افزا ترقی دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ایک گھریلو اقتصادیات کا حامل ہے جس کا کام پیدا کی ہوئی چیزوں کو استعمال کرتے رہنا ہے تاکہ مشینیں جن کا وہ غلام بن گیا ہے، برابر کام کرتی رہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ وہ ایک شاعر، سورما اور ولی بھی ہے، وہ نہ صرف ایک انتہائی پیچیدہ ہستی ہے جس کا تجزیہ سائنس کی فنی مہارتوں کے ذریعہ کیا جا رہا ہے بلکہ وہ انسانیت کے رجحانات قیاسات اور آرزوؤں کا مرکز ہے۔ بلاشبہ انسانیت نے اپنی حقیقت کو معلوم کرنے کی بڑی زبردست کوشش کی ہے۔ اگرچہ ہمارے پاس تمام زمانوں کے سائنسدانوں فلسفیوں، شاعروں اور بڑے بڑے صوفیوں کے مشاہدات کا ایک انبار موجود ہے مگر ہم اپنی ذات کے صرف چند پہلوؤں کو دریافت کر سکے ہیں۔ ہم انسان کو اس کی کلی حیثیت میں بخوبی سمجھ نہیں سکے ہیں۔ ہم اس کو الگ الگ حصوں سے مرکب جانتے ہیں اور یہ حصے بھی ہمارے اپنے طریقوں کے پیدا کردہ ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص ایک خیالی پیکر ہے جس کے اندر سے ایک نامعلوم حقیقت جھلک رہی ہے۔

حقیقت میں ہماری ناواقفیت بہت گہری ہے۔ وہ لوگ جو انسانی ہستیوں کا مطالعہ کرتے ہیں، اپنے آپ سے بہت سے ایسے سوالات کرتے ہیں جن کا کوئی جواب نہیں ہے۔ ہماری اندرونی دنیا کے وسیع علاقے اب

تک نامعلوم ہیں۔ خلیۓ کے پیچیدہ اور عارضی اعضا کے بنانے کے لئے کس طرح کیمیائی مادوں کے سالمے باہم مل جاتے ہیں، ترو تازہ بیضہ کی نواۃ (Nucleus) کے اندر کے نسلی مادے کس طرح اس فرد کی خصوصیات کا فیصلہ کرتے ہیں جو اس بیضہ سے پیدا ہوتا ہے، کس طرح خلیۓ خود اپنی کوششوں سے نسیجوں اور اعضا کے جیسے گروہوں میں منظم ہو جاتے ہیں چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کی طرح ان خلیوں کو پہلے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اپنے گروہ کو زندہ رکھنے میں انھیں کیا کام کرنا ہے۔ اور چھپی ہوئی بناوٹوں کے ذریعہ وہ ایک ایسے نظام جسمانی کے بنانے کے قابل ہوتے ہیں جو سادہ اور پیچیدہ دونوں ہوتا ہے ہماری مدت (Duration) خلیاتی وقت (Physiological Time) اور نفسیاتی وقت (Psychological Time) کی نوعیت کیا ہے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ ہم نسیجوں، اعضا، رطوبتوں اور شعور سے مرکب ہیں۔ لیکن شعور اور دماغ کے درمیانی تعلقات اب تک ایک راز بنے ہوئے ہیں۔ ہم کو اعصابی خلیوں کے فعلیات کا پورا پورا علم حاصل نہیں۔ ارادی قوت کس حد تک نظام جسمانی میں تبدیلیاں پیدا کرتی ہے، کس طرح دماغ اعضا کے حالات سے متاثر ہوتا ہے، طرز زندگی غذا کے کیمیائی مادوں، آب و ہوا اور فعلیاتی اور اخلاقی تربیتوں کے ذریعہ کس طرح جسمانی اور دماغی خصوصیات میں، جو بطور وراثت ہر ایک فرد کو ملتی ہیں، تبدیلیاں پیدا کی جاسکتی ہیں۔

ہم یہ بھی نہیں جان سکتے کہ ڈھانچہ، عضلات اور اعضا، اور دماغی اور روحانی سرگرمیوں کے درمیان کس قسم کے تعلقات ہیں۔ ہم ان اسباب سے ناواقف ہیں جن کی بنا پر اعصابی توازن اور تکان اور بیماریوں کی مدافعت پیدا ہوتی ہے، ہم نہیں جانتے کہ اخلاقی احساس، قوت فیصلہ اور جرأت کو کس طرح ترقی دی جا سکتی ہے، ذہنی، اخلاقی اور صوفیانہ سرگرمیوں کی اضافی اہمیت کیا ہے، جمالیاتی اور مذہبی احساس کی ضرورت کیا ہے، کس قسم کی قوت سے اشراقی تعلقات کا ظہور ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض فعلیاتی اور دماغی اسباب خوشی یا تکلیف کامیابی یا ناکامی کا نتیجہ ہوتے ہیں لیکن ہم یہ نہیں جانتے کہ وہ اسباب کیا ہیں۔ ہم کسی فرد کے اندر مصنوعی طور پر خوشی کا چسکہ نہیں پیدا کر سکتے۔ اب تک ہم اس کو نہیں جان سکے کہ متمدن آدمی کی امید افزا ترقی کے لئے کس قسم کا ماحول زیادہ مناسب ہے، کیا ہماری فعلیاتی اور روحانی ساخت سے کش کش، محنت اور تکلیف کو دور کرنا ممکن ہے، موجودہ تمدن میں ہم انسان کو زوال پذیر ہونے سے کس طرح روک سکتے ہیں۔ ان باتوں کے متعلق، جو ہماری انتہائی دلچسپی کا باعث ہیں، بہت سے دوسرے سوالات کئے جا سکتے ہیں، ان کا کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ انسان کے متعلق تمام علوم کی مہارت بھی ناکافی ہے۔ اور یہ کہ اپنی ذات کے متعلق ہمارا علم ابتک ابتدائی

حالت میں ہے۔"

Man the Unknown, pp. 16-19

یہ اقتباس یہ ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے کہ "انسان" کا علم ابھی تک انسان کو حاصل نہیں ہوا۔ انسانی وجود کے مادی حصہ کے بارے میں تو ہم بہت کچھ جانتے ہیں۔ مگر وہ انسان جو اس مادی وجود کو کنٹرول کرتا ہے اس سے ہم قطعًا لاعلم ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ زندگی اب تک ہمارے لئے ایک راز بنی ہوئی ہے اور جب تک یہ راز نہ کھلے زندگی کی صحیح تعمیر وتشکیل ممکن نہیں۔ الکسس کیرل کی کتاب اسی "انسان نامعلوم" کو دریافت کرنے کی ایک سائنٹفک کوشش ہے۔ اس طرح کی کوششیں موجودہ زمانے میں بہت بڑے پیمانے پر جاری ہیں۔ مگر اب تک کا نتیجہ صفر کے سوا اور کچھ نہیں۔

آج کا انسان ایٹم توڑ سکتا ہے۔ برفیلے علاقوں میں آبادیاں قائم کرسکتا ہے۔ وہ خلاء کے دوسرے سیاروں تک سفر کے منصوبے بنا رہا ہے۔ اس طرح کے ہزاروں واقعات ہیں جن کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح انسان نے مادی دنیا سے واقفیت حاصل کرلی ہے اور اس کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کررہا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے آپ کو بھی جان سکتا ہے اور اپنے معاملات کو درست کرسکتا ہے مگر خود ہماری معلوم دنیا کے اندر اس بات کے اشارے موجود ہیں کہ ہم جس طرح مادے کے اوصاف کو معلوم کرلیتے ہیں، اسی طرح ہم انسان کو سمجھ نہیں سکتے۔

جس وجود کو ہم "انسان" کہتے ہیں، وہ پروٹوپلازم کے بنے ہوئے کروروں خلیوں پر مشتمل ایک جسم ہے پروٹوپلازم کیا ہے؟ وہ غیر ذی روح اشیا کا ننھا سا مرکب ہے جس کے اندر روح پزیری کی غیرمعمولی صلاحیت ہوتی ہے۔ سادہ لفظوں میں وہ زندگی کی اکائی ہے مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ جس طرح ہم مادی دنیا کو سمجھنے کے لئے اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ہم پروٹوپلازم کا مطالعہ نہیں کرسکتے۔

وہ سب کچھ جس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں وہ کچھ چیزوں کا مرکب ہی ہوتا ہے اگر وسائل وذرائع حاصل ہوں تو ہم اس طرح کے تمام مرکبات کو وجود میں لاسکتے ہیں اور اسے ختم بھی کرسکتے ہیں۔ اسی بنیاد پر جرمن فلسفی کانٹ نے ۱۷۵۵ء میں کہا تھا۔ "مجھے مادہ مہیا کرو اور میں تم کو بتادوں گا کہ دنیا اس مادہ سے کس طرح بنائی جاتی ہے۔" ہیکل (Haeckel) نے دعویٰ کیا کہ "پانی، کیمیائی اجزا اور وقت لے تو وہ ایک انسان کی تخلیق کرسکتا ہے۔"

مثلًا پانی کے متعلق معلوم ہوچکا ہے کہ اس کا ایک سالمہ (Molecule) آکسیجن کے ایک ایٹم اور ہائیڈروجن کے دو ایٹم سے مرکب ہوتا ہے، یہ بالکل ہمارے بس میں ہے کہ ہم ان گیسوں کو اسی تناسب سے ملاکر پانی کی شکل دے دیں۔ یا پانی کے سالموں کو توڑ کر دوبارہ آکسیجن اور ہائیڈروجن میں تبدیل کردیں۔ مگر انسان

کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ سائنس نے وہ اجزا معلوم کر لئے ہیں جو پروٹوپلازم میں پائے جاتے ہیں اور ان کے مخصوص تناسب بھی دریافت ہو چکے ہیں۔ مگر انسان یہ نہیں کر سکتا کہ ان اجزا کو اسی مخصوص ترتیب سے ملا کر زندگی پیدا کر دے۔ پروٹوپلازم کے اجزائے ترکیبی کے درمیان جو تناسب ہے، ٹھیک اسی تناسب سے ان اجزا کو ملایا جاتا ہے۔ لیکن وہ پروٹوپلازم نہیں بنتا جو ذی روح ہو۔ حالانکہ دوسرے کیمیاوی مرکبات ان کے اجزائے ترکیبی کو اسی نسبت سے ملانے پر بن جاتے ہیں۔ گویا ہم جس طرح مادی اشیا میں تصرف کر کے مادی واقعات کو وجود میں لاتے ہیں، ٹھیک اسی طرح ہم انسان کے اوپر تصرف کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔

یہ انسان کے سلسلے میں ہماری پہلی عاجزی ہے جس کا اعتراف کرنے پر ہم مجبور ہیں۔ دوسری اس سے بڑی چیز یہ کہ انسان کے سلسلے میں ہمارا تمام طبیعیاتی مطالعہ انسانِ مردہ کا مطالعہ ہے، انسانِ زندہ کا مطالعہ کرنے کی صلاحیت ہم اپنے اندر نہیں رکھتے۔ سائنس نے وہ اجزا معلوم کر لئے ہیں جو پروٹوپلازم میں پائے جاتے ہیں اور ان کا مخصوص تناسب بھی معلوم ہو چکا ہے۔ لیکن یہ دریافت نہ ہو سکا کہ ان کے درمیان وہ کونسی مخصوص ترتیب ہے جس کے قائم رہنے سے پروٹوپلازم ذی روح بنا رہتا ہے اور جہاں یہ ترتیب بگڑی، ذی روح پروٹوپلازم غیر ذی روح ہو جاتا ہے۔ گویا اصل میں وہ مخصوص ترتیب ہی ہے جو پروٹوپلازم میں روح کی موجودگی کی ذمہ دار ہے مگر مشکل یہ ہے کہ اس مخصوص ترتیب کو باقی رکھتے ہوئے پروٹوپلازم کا کیمیاوی تجزیہ نہیں کیا جا سکتا۔ پروٹوپلازم کا تجزیہ کرنے کے لئے لازمی طور پر اس کی کیمیاوی ترتیب کو توڑنا پڑتا ہے اور جوں ہی ہم ایسا کرتے ہیں اس کے اندر سے زندگی رخصت ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب بھی پروٹوپلازم کا کیمیاوی تجزیہ کیا جاتا ہے تو یہ وہی وقت ہوتا ہے جبکہ پروٹوپلازم سے اس کی روح نکل چکی ہوتی ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کیمیاوی تجزیہ کیا جا رہا ہو اور پروٹوپلازم میں روح موجود ہو۔ اور ظاہر ہے کہ جب تک ایسا نہ ہو گا۔ یعنی روح کی موجودگی میں تجزیہ نہ کیا جائیگا زندگی کی حقیقت معلوم کرنے کے بارے میں سائنس ہمیشہ اندھیرے میں رہے گی۔

مگر ہماری مشکل یہیں ختم نہیں ہوتی۔ وہ اس سے بہت آگے جاتی ہے۔

فرض کیجئے ایک شخص اپنے ذمہ یہ کام لیتا ہے کہ وہ انسانیت کی حقیقت معلوم کرے گا۔ اور انسان کو بتائے گا کہ زندگی کا قانون کیا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ انسانی آبادیوں سے اپنے مطالعہ کا آغاز کرتا ہے۔ لمبے عرصہ تک مختلف سماجوں کی چھان بین کرنے کے بعد اسے محسوس ہوتا ہے کہ سماج تو انسانوں کے مجموعے کا نام ہے۔ اس لئے جب تک ہم فرد کو سمجھ نہ لیں، جماعت کو کس طرح سمجھ سکتے ہیں۔ اب وہ معاشرہ کو چھوڑ کر انسان کا مطالعہ شروع کرتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ سب سے پہلے نفسیات کی طرف رخ کرتا ہے، یہاں وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا کوئی ایک فکر نہیں بلکہ اس کی بہت سی شاخیں ہیں۔ اور سب کے نتائج تحقیق الگ الگ ہیں۔ نفسیات کی ایک شاخ کا دعویٰ ہے کہ انسان کے

تمام اعمال کا مرکز اس کا احساس ہے۔ کسی کا کہنا ہے کہ انسان خارجی دنیا سے شعوری یا غیر شعوری طور پر جو تاثر قبول کرتا ہے، اس کا ہر کام اسی کا ردعمل ہے، کوئی جنسی خواہشات کو اس کے تمام اعمال کا محرک بتاتا ہے، کسی کا مطالعہ یہ ہے کہ اپنے آئیڈیل کو پالینے کا نامعلوم جذبہ انسان کو متحرک کئے ہوئے ہے۔ کوئی مکتبِ فکر شعور کو اصل قرار دیتا ہے اور اسی کی روشنی میں انسان کی پوری ہستی کی تشریح کرتا ہے اور کوئی اس بات کا قائل ہے کہ عقل اور ذہن کوئی چیز نہیں۔ انسان کے مختلف اعضا کی عنان کسی ایک مرکزی قوت کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ انسان جس حصۂ جسم پر زیادہ توجہ دیتا ہے اس کی نشو ونما بہتر طریقہ سے ہو جاتی ہے اس کے نتیجے میں کوئی ابھار خاص بن جاتا ہے۔ کوئی اچھا مفکر نفسیات کا یہ اختلاف اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ بعض لوگ سرے سے اس واقعہ ہی کا انکار کرتے ہیں کہ اس نام کا کوئی علم (Science) فی الواقع موجود ہے۔

خیالات کے اس جنگل کو دیکھ کر وہ سوچتا ہے کہ انسانی وجود کے دوسرے حصے، حیاتیات کا مطالعہ کرے تاکہ دونوں کے نتائج کو ملا کر کوئی رائے قائم کی جا سکے۔ جب انسان کو وہ اس حیثیت سے دیکھتا ہے تو اسے نظر آتا ہے کہ انسان، نظام ہضم، نظام تنفس، نظام دوران خون وغیرہ کا ایک مجموعہ ہے۔ ان نظاموں کی بنیاد چند کیمیادی تبدیلیوں پر ہے جو کچھ کیمیاوی اشیا اور ان کے آپس کے عمل اور ردعمل سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جسم کا سارا نظام کیمیاوی تحلیل (Metabolism) کا ہی ایک پیکر ہے۔

اب وہ غور کرتا ہے تو اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ جب جسم انسانی کا وجود اور اس کا نشو ونما کیمیاوی رد و بدل کا مرہونِ منت ہے۔ تو پہلے کیمیاوی تبدیلیوں کے اصولوں کو ہی اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔ اس کے بغیر انسان کے بارے میں حقیقی اور قابل اطمینان معلومات نہ مل سکیں گی۔ اس لئے اب وہ کیمیا اور طبیعیات کا مطالعہ کرنے لگتا ہے اور اس میں ایک عمر کھپا دیتا ہے۔

کیمیا اور طبیعیات کا مطالعہ اسے سالمے کیول اور ایٹم کے مطالعہ تک لے جاتا ہے اور پھر وہ ایٹم کے اجزائے ترکیبی الکٹران اور پروٹان وغیرہ کا مطالعہ شروع کر دیتا ہے۔ جس کے بعد اسے معلوم ہوتا ہے کہ ساری کائنات برقی لہروں کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس طرح مطالعہ کرتے کرتے بالآخر وہ جدید سائنس کے آخری شعبے۔ نیوکلر سائنس۔ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس طرح معلومات کا عظیم دفتر جمع کرنے کے باوجود وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچتا۔ اور جو شخص انسان کی حقیقت معلوم کرنے اور اس کے لئے قانون وضع کرنے چلا تھا۔ وہ ایک ایسی دنیا میں گم ہو جاتا ہے۔ جو نظر آنے کے باوجود نظر نہیں آتی ڈاکٹر جوڈ (JOAD) کے الفاظ میں:۔

"جدید مادہ ایک ایسی بے حقیقت چیز ہے جو ہاتھ نہیں آسکتی۔ یہ فاصلہ اور وقت کے مرکب کا ایک ابھار، برقی

ردکا ایک جال۔ یا امکان کی ایک لہر ہے۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے فنا کے اندر کھو جاتی ہے۔ اکثر اوقات اسے مادہ کے بجائے دیکھنے والے کے شعور کا ایک پھیلاؤ سمجھا جاتا ہے "

زندگی کے راز کو مادی علوم میں تلاش کرنے کا یہ عبرت ناک انجام بتاتا ہے کہ زندگی کا راز انسان کیلئے ناقابل دریافت ہے۔ اب جس طرح ایک بیمار شخص کی یہ معذوری کہ وہ خود اپنا علاج نہیں کر سکتا، اس کو یہ ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ اس کو ایک ڈاکٹر کے پاس جانا چاہئے۔ اسی طرح نظام فطرت میں انسان کا ایک چیز کے لئے ضرورت مند ہونا اور پھر اس ضرورت کی تکمیل کے لئے کافی صلاحیت نہ رکھنا اس بات کا اشارہ ہے کہ اس کے لئے وہ اپنے اس خدا کا محتاج ہے جس نے اسے موجودہ شکل میں بنایا ہے۔ جس طرح خدا نے اسے آکسیجن کا محتاج بنایا اور پھر آکسیجن بے حساب مقدار میں سارے کرۂ ارض کے گرد پھیلادی۔ اسی طرح اس نے انسان کو زندگی کی حقیقت جاننے کا محتاج بنایا۔ اور پھر اپنے نبیوں کے ذریعہ زندگی کی حقیقت واضح فرمائی۔

دورِ جدید کا مذہب

تعارف

جولین ہکسلے کے نزدیک مکمل تشکیک (Complete Sceptcism)
ناقابل عمل ہے اور انسان کے لئے کچھ نہ کچھ عقیدہ رکھنا ضروری ہے۔ وہ لکھتا ہے:

Religion of some sort is probably necessary
Hindustan Times, Oct. 1961

یعنی کسی نہ کسی قسم کا مذہب انسان کے لئے ضروری ہے۔ مگر دور جدید کا مذہب، اس کے نزدیک، یقینی طور پر ایک بے خدا مذہب (Godless Religion) اور مذہب بغیر الہام (Religion without Revelation) ہوگا۔ بظاہر یہ ایک لغو سی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر درحقیقت اس کی پشت پر ایک مستقل فلسفہ ہے اور اس نے دور جدید کے اکثر ذہنوں کو متاثر کیا ہے۔

اس طرز پر جو لوگ سوچتے ہیں، ان کے خیالات اگرچہ باہم یکساں نہیں ہیں۔ نیز ان میں مخالف مذہب اور بظاہر غیر مخالفین دونوں قسم کے لوگ شامل ہیں۔ مگر جو بات سب میں مشترک ہے وہ یہ کہ یہ تمام لوگ رسالت کے ذریعہ رہنمائی حاصل کرنے کے قائل نہیں ہیں بلکہ وہ اس کو دوسرے علوم کی طرح محض انسانی دریافت کی ایک چیز سمجھتے ہیں لارڈ مارلے نے اسی معنی میں کہا تھا۔

The next great task of science is to creat a religion for mankind.
Science & Christian Belief,
By C.A. Coulson (1955) P. 8

یعنی سائنس کا دوسرا اہم کام یہ ہے کہ وہ انسانیت کے لئے ایک مذہب کی تخلیق کرے۔

اس گروہ میں سے کوئی شخص اگر مذہب کا نام لیتا ہے تو وہ بھی عام مذہبی مفہوم میں نہیں بلکہ اپنے مخصوص مفہوم میں۔ اس کے نزدیک یہ ایک خاص طرح کا ذہنی آرٹ (Intellectual Art) ہے نہ کہ

وحی و الہام کے ذریعہ معلوم شدہ کوئی واقعی حقیقت۔ اس مذہب کی اہم ترین خصوصیت، ایک مفکر کے الفاظ میں خدا کی جگہ انسان کو بٹھانا (Transfer of seat from God to man) ہے۔ اسی لئے اس جدید مذہب کو انسانیت (Humanism) کہا جاتا ہے۔

ڈاکٹر الکسس کیرل کی کتاب جو پہلی بار ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی وہ اسی سلسلے کی ایک کوشش ہے۔ اس کتاب کو اگرچہ اس طرز فکر کے مختلف لوگوں کا نمائندہ نہیں کہا جاسکتا۔ مگر غالباً اس موضوع پر یہ جامع ترین کتاب ہے جو ایک سائنس داں کے قلم سے خالص سائنسی انداز میں لکھی گئی ہے اور جس میں اس پہلو سے تا حال دریافت شدہ حقائق کا نہایت عمدہ جائزہ موجود ہے۔

"سائنس اور ٹکنالوجی کی غیر معمولی ترقی کے باوجود انسان مشکلوں میں گرفتار ہے" یہ ایک سوال ہے جو موجودہ دنیا کے سوچنے والے ذہنوں کو پریشان کئے ہوئے ہے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ مذہب کے انحطاط کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔ مگر دوسرے لوگ جو مذہب میں یقین نہیں رکھتے، وہ دوسرے انداز سے سوچتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جامد مادے کے علوم میں جس طرح ترقی ہوئی ہے اسی طرح حیاتیاتی علوم میں ترقی نہیں ہوسکی۔ اور اسی کا نتیجہ ہے جو ہم اپنی زندگی میں بھگت رہے ہیں۔ ان کا مشورہ ہے کہ حیاتیاتی علوم میں اب اس سے زیادہ شدت کے ساتھ تحقیق و تفتیش کا کام جاری ہونا چاہئے جیسے اب تک ہوتا رہا ہے۔

نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر الکسس کیرل (Alexis Carrel) کی کتاب انسان نامعلوم (Man the Unknown) اسی تاحال عدم دریافت انسان کو دریافت کرنے کی ایک کوشش ہے۔ "سائنس جس نے مادی دنیا کو بدل دیا ہے، انسان کو وہ طاقت دیتی ہے جس سے وہ اپنے آپ کو بھی بدل سکے" ان الفاظ کے ساتھ وہ اپنی کتاب کا باب انسانیت کی نئی تعمیر (The Remarking of Man) شروع کرتا ہے۔

"تاریخ میں پہلی بار سائنس کی مدد سے انسانیت اپنی قسمت کی آپ مالک بن گئی ہے۔ آج ہمیں یہ موقع حاصل ہے کہ ہم جس طرح مادہ پر عمل کر کے اس کو اپنی خدمت میں لا رہے ہیں، اسی طرح جسم اور روح پر عمل کر کے اس کو اپنی منشا کے مطابق ڈھال سکیں۔ ہم جانتے ہیں کہ کند ذہنی، بداخلاقی اور جرم کاری عموماً موروثی نہیں ہوتی ہم ان برائیوں کی اسیطرح اصلاح کر سکتے ہیں جس طرح ہم بیماریوں کو اچھا کرتے ہیں"

ڈاکٹر الکسس کیرل اس مسئلے میں مزید لکھتا ہے:

"صنعت و حرفت نے سائنس کی اسپرٹ کے مطابق کام نہیں کیا بلکہ مابعد الطبیعیات کے غلط تصورات کے مطابق انسان کی تعمیر کی ہے۔ ہم کو چاہئے کہ ان حد بندیوں کو توڑ دیں جو حقیقی اشیا کی خصوصیات اور ہماری ذات کے مختلف پہلوؤں کے درمیان قائم کر دی گئی تھی۔ یہ غلطی جو ہماری تمام مصیبتوں کی ذمے دار ہے، گلیلیو کے تولیدی

نظریئے (Genial Idea) اکی ایک غلط تعبیر کا نتیجہ ہے۔ گیلیو نے چیزوں کی ابتدائی صفات کو، جو ابعاد اور وزن پر مشتمل ہیں اور جن کی آسانی سے پیمائش کی جا سکتی ہے، ان ثانوی صفات سے الگ کر دیا جو شکل، رنگ اور بو وغیرہ سے تعلق رکھتی ہیں اور جن کی پیمائش نہیں کی جا سکتی۔ کمیت کو کیفیت سے جدا کر دیا گیا ہے۔ اس غلطی سے غیر معمولی نتائج پیدا ہوئے۔ انسان کے اندر وہ چیزیں، جن کی پیمائش نہیں کی جا سکتی، ان چیزوں سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں جن کی پیمائش کی جا سکتی ہے۔ مثلاً خیال اور فکر کا وجود اتنا ہی اہم ہے جتنا خون ناپ Blood Serum کے طبعی کیمیائی توازنوں کا وجود اہم ہے۔ کمی اور کیفی اشیا کے درمیان تفرقہ اور وسیع ہو گیا جبکہ ڈیکارٹ نے جسم اور روح کے درمیان فرق کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد سے دماغ کے مظاہر ناقابل تشریح بن گئے۔ مادی اشیا کو روحانی اشیا سے بالکل الگ کر دیا گیا جسمانی ساخت اور فعلیاتی طریقے (Psysiological Mechanism) خیال، لذت، حزن اور حسن سے بھی زیادہ بڑی حقیقت قرار پائے۔ اس غلطی کی وجہ سے تمدن ایک ایسی راہ پر پڑ گیا جہاں سائنس کو کامیابی حاصل ہوئی مگر انسان تنزل کے گڑھے میں گرتا چلا گیا۔

اب ٹھیک رخ پر پہنچنے کے لئے ہم کو چاہئے کہ نشاۃ ثانیہ کے دور کے خیالات کی طرف رجوع کریں۔ ہمیں ڈیکارٹ کی ثنویت (Dualism) کو ترک کر دینا چاہئے۔ دماغ کو پھر مادہ کے اندر جگہ دینی چاہئے۔ روح کو آئندہ جسم سے جدا نہیں ہونا چاہئے۔ جذبات کو بھی اتنی ہی اہمیت دینی چاہئے جتنی کہ حرکیات حرارت کے قانون کو دی جاتی ہے۔

ایک ایسا نظریہ جو تین سو سال سے زیادہ عرصہ تک متمدن لوگوں کے ذہنوں پر چھایا رہا، پورے طور پر اس سے آزاد ہونا بہت مشکل ہے لیکن اگر ایسا ہو جائے تو فوراً حیرت انگیز واقعات رونما ہوں گے۔ مادے کی فوقیت ختم ہو جائے گی۔ ریاضیات، طبیعیات اور کیمیا کی طرح اخلاقی، جمالیاتی اور مذہبی افعال کا مطالعہ بھی بالکل ضروری معلوم ہوگا، حفظان صحت کے ماہرین سے یہ سوال ہوگا کہ وہ کیوں صرف جسمانی بیماریوں کو روکنے کی طرف توجہ کرتے ہیں اور دماغی اور اعصابی امراض کا علاج کیوں تلاش نہیں کرتے۔ ماہرین امراض کو اعضا کے صدمات کے ساتھ اخلاط (Humours) کے صدمات کا بھی مطالعہ کرنا ہوگا اور یہ جاننا ہوگا کہ دماغ کا نسیجوں پر اور نسیجوں کا دماغ پر کیا اثر پڑتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ"

Man The Unknown, (1961) pp. 257-63

اس طرح ڈاکٹر کیرل کی تشخیص کے مطابق انسانی مشکلات کا سبب یہ ہے کہ مادی علوم کی تو وسیع پیمانے پر ترقی ہوئی مگر جس انسان نے یہ سب کیا خود اس کا علم۔ جاندار ہستیوں کا علم۔ بالکل ابتدائی حالت میں رہ گیا جب ورنہ جس طرح سیاہ اور بدبو دار تارکول بہترین خوشنما رنگوں کی صورت میں نظر آتا ہے اور لوہے کے بدوضع ڈلے خوبصورت مشینوں کی شکل میں متحرک ہیں، اسی طرح انسان اور انسانی سماج بھی سائنس کی مدد سے باغ وبہار بن گیا ہوتا۔ اس کے اپنے الفاظ میں:

We are the victims of the backwardness of the sciences of life over those of matter (P. 39)

یعنی ہم دراصل زندگی کے علوم کی اس پس افتادگی کا شکار ہیں جو مادی علوم کے مقابلے میں اسے حاصل ہے۔ وہ لکھتا ہے :

۔ اس مصیبت کا ایک ہی ممکن علاج اپنی ذات کے بارے میں زیادہ گہرا علم ہے۔ اس قسم کا علم ہمیں یہ سمجھنے کے قابل بنائے گا کہ کن طریقوں سے جدید زندگی ہمارے شعور اور ہمارے جسم کو متاثر کر رہی ہے۔ اس سے ہم سیکھیں گے کہ کس طرح ہم اپنے آپ کو اپنے گرد و پیش کے مطابق ڈھالیں اور اگر ماحول کو بدلنا ضروری ہو تو کس طرح ہم اسے بدلیں۔ ہماری داخلی فطرت ہماری استعداد اور اس کے اظہار کے طریقوں کے روشنی میں آنے کے بعد یہ علم ہماری فعلیاتی کمزوری اور اخلاقی اور ذہنی بیماریوں کی وجہ بتا سکے گا۔ ہم اپنی جسمانی اور روحانی سرگرمیوں کے اٹل قوانین کو جاننے، ناجائز (Prohibited) اور جائز (Lawfull) کے درمیان تمیز کرنے اور یہ محسوس کرنے کے لئے کہ ہم اپنے خیال کے مطابق اپنے آپ کو اور اپنے ماحول کو بنانے میں آزاد نہیں ہیں، ہم کوئی دوسرا ذریعہ نہیں رکھتے۔ جبکہ جدید تمدن نے زندگی کے فطری حالات کو برباد کر دیا ہے، دوسرے تمام علوم کے مقابلے میں انسانی علم (Science of Man) کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے ؟

Man The Unknown, P. 39

اس علم کو حاصل کرنے کی کیا صورت ہو۔

"ہر سال ہم سنتے رہتے ہیں کہ نسلیات، توالد و تناسل، اور اعداد و شمار، اخلاق و عادات، فعلیات، تشریح حیاتیاتی کیمیا، طبیعی کیمیا، نفسیات، طب، حفظان صحت، تعلیم، سماجیات، عمرانیات، اقتصادیات وغیرہ کے ماہرین نے اپنے اپنے فن میں قابل قدر ترقی کی ہے۔ لیکن عملاً ان کے نتائج حیرت انگیز طور پر بہت ہی غیراہم ہوتے ہیں۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ معلومات کا یہ وسیع ذخیرہ مختلف دماغوں اور مختلف کتابوں میں بکھرا ہوا ہے، کسی ایک شخص کو بھی ان پر عبور حاصل نہیں۔ ضرورت ہے کہ ان تمام علوم کو چند افراد کے دماغوں میں لے آیا جائے، اسی وقت ان منتشر علوم سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

مگر کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی ایک شخص ان تمام علوم کو حاصل کرے۔ کیا کوئی فرد تشریح، فعلیات، حیاتیاتی کیمیا نفسیات، مابعد الطبیعیات، علم الامراض اور طب پر عبور حاصل کر سکتا ہے اور اسی کے ساتھ دوسرے علوم سے گہرے طور پر واقف ہو سکتا ہے۔ "اس قسم کا کمال حاصل کرنا ناممکن نہیں ہے" مصنف لکھتا ہے۔ "ایک شخص تقریباً پچیس سال کے مسلسل مطالعہ کے بعد ان تمام علوم میں دستگاہ پیدا کر سکتا ہے۔ اس طرح کے ایک سو افراد پچاس

سال کی عمر پر پہنچ کر انسان کی فطرت کے مطابق انسانی زندگی اور تمدن کی موثر رہنمائی کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد انسان کی تعمیر کرنے کے لئے ایسے اداروں کی ضرورت ہے جہاں فطری قوانین کے مطابق جسم اور دماغ کی تربیت دی جاتی ہو، ان اداروں میں انسان کے مختلف پہلوؤں کے علوم کو ملا کر ایک کلی علم کی شکل دینی ہوگی۔ اور محققوں اور سائنٹفک کام کرنے والوں کی ایک متحدہ جماعت بنانی پڑے گی۔ ان اداروں کو ماہرین خصوصی کے سپرد نہیں کرنا چاہئے بلکہ ان کی رہنمائی ایسے افراد کے ذمے ہونی چاہئے جو تمام علوم پر عبور رکھتے ہوں خصوصی ماہرین کو صرف ایک عمومی ماہر کا مددگار ہونا چاہئے۔ ایک ماہر اقتصادیات، ایک ماہر نفسیات، ایک کیمیا داں اور ایک سماجی عالم الگ الگ یکساں طور پر انسان کی حقیقت سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اپنے دائرہ عمل سے آگے ان کی بصیرت پر کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔

اس وقت درجنوں بہترین ادارے قائم ہیں اور مختلف علوم پر قابل قدر کام کر رہے ہیں۔ مگر پیش نظر مقصد کے لئے ان کی تحقیقات کافی نہیں ہیں۔ ریاضیات، طبیعیات اور کیمیا کے علوم ضروری تو ہیں مگر ان کو زندہ نظام جسمانی کی تحقیقات کے لئے بنیادی علوم کی حیثیت سے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ ان سے ایسے تصورات کی تخلیق نہیں ہوسکتی جو انسانوں کے ساتھ خاص ہیں۔ آئندہ کے حیاتیاتی کارکنوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ان کا نصب العین محض مصنوعی اور تنہا نظاموں کا مطالعہ نہیں بلکہ ایک زندہ نظام جسمانی کا مطالعہ ہے اور یہ کہ فعلیات (Physiology) کا وہ علم جس کو بیلس (Bayliss) نے دریافت کیا ہے، اصل علم کا صرف ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔

ان مسائل کے مطالعہ کے لئے سائنسدانوں کو کئی نسلوں تک اپنی زندگی بھر کام کرتے رہنے کی ضرورت ہوگی۔ اس کے لئے ہمارے پاس ایک ایسا ادارہ ہونا چاہئے جہاں کم از کم ایک سو سال تک کسی رکاوٹ کے بغیر علم انسانی کا مطالعہ جاری رہے۔ موجودہ سوسائٹی میں تمام دماغی کام کرنے والوں کو ایک مرکز پر جمع ہو کر کام کرنا چاہئے تاکہ سب مل کر ایسا غیر فانی دماغ پیدا کریں جس کے اندر اپنے مستقبل کو سوچنے اور اس کو بنانے کی پوری طاقت موجود ہو۔ اس کے بعد ہی انسانی ترقی کے دائمی نظریات حاصل ہوسکتے ہیں۔ (صفحات ۲۷۴-۲۷۷)

اوپر جو کچھ لکھا گیا یہ ڈاکٹر کیرل کے الفاظ میں ان لوگوں کے خیالات کا خلاصہ ہے، جو خدائی مذہب کو چھوڑ کر اس کی جگہ ایک انسانی مذہب بنانا چاہتے ہیں۔ کیرل نے خود بھی اپنی اس ضخیم کتاب میں انسانی علم کا جائزہ لیا ہے اور اس کے معلوم اور نامعلوم گوشوں کی نشاندہی کی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی تین سو صفحے کی کتاب کو ان الفاظ پر ختم کرتا ہے:

"انسانیت کی تاریخ میں پہلی بار ایک بوسیدہ تمدن اپنے انحطاط کے اسباب معلوم کرنے کے قابل ہوا ہے۔ سائنس کی عظیم طاقت پہلی بار اس کے قبضہ میں آئی ہے۔ کیا ہم اس علم اور اس طاقت کو استعمال کریں

گے۔ ماضی کے عظیم تمدنوں کے لئے جو انجام مقدر رہا ہے، اس سے ہمارے بچنے کی واحد امید یہی ہے۔ ہماری قسمت، ہمارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اب ہم کو نئی شاہراہ پر آگے بڑھنا ہے" (صفحہ ۲۹۸)

جائزہ

اس فکر کا ہم جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر بنیادی خامیاں موجود ہیں۔

۱۔ پہلی بات یہ کہ مادی علوم اور انسانی علوم میں بنیادی فرق ہے اور یہی فرق بتاتا ہے کہ انسان کبھی بھی اپنی ذات کو اس طرح نہیں سمجھ سکے گا جس طرح وہ مادہ کے ظاہری اوصاف کو سمجھ لیتا ہے۔ صورت حال یہ نہیں ہے کہ انسانی علوم پر کام نہیں ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ انسانی علوم پر تحقیق اور غور و فکر کی تاریخ مادی علوم سے کہیں زیادہ پرانی ہے۔ مگر اس کے باوجود اس شعبہ میں ابھی تک کوئی کامیابی نہیں ہوئی اور مصنف کے الفاظ میں صورت حال یہ ہے کہ:

"ایک مادہ پرست اور ایک روحانیت پسند دونوں سوڈیم کلورائڈ (نمک) کے ایک ٹکڑے کی تشریح پر متفق ہو جاتے ہیں۔ لیکن انسانی ہستی کے بارے میں ان کی رائے ایک دوسرے سے نہیں ملتی" ص ۱۷

ابھی تک کسی بھی تحقیق نے یہ امکان پیدا نہیں کیا ہے کہ مستقبل میں یہ صورت حال باقی نہ رہے۔ پھر کس بنا پر امید کر لی جائے کہ مستقبل میں آدمی اپنی زندگی کے راز کو معلوم کر لے گا۔ مصنف نے ان لوگوں پر تنقید کی ہے جو مادی دنیا سے متعلق معلومات کو انسانی ہستی پر چسپاں کرنا چاہتے ہیں، وہ لکھتا ہے:

"حرکیات حرارت کا دوسرا قانون یعنی آزاد شدہ قوت کے پھیلاؤ کا اصول سالمات کی سطح پر کام آسکتا ہے۔ مگر اس کو نفسیات میں استعمال نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہاں کم کوشش اور زیادہ آرام کا اصول منطبق ہوتا ہے۔ شعری جذب و دفع کی قوت اور نفوذی دباؤ کے تصورات سے ان مسائل پر کوئی روشنی نہیں پڑتی جو شعور سے تعلق رکھتے ہیں۔ نفسیاتی مظاہر کو خلیوں کی فعلیات یا کوانٹم میکانکس کی اصطلاحات میں بیان کرنا محض الفاظ کے ساتھ کھیلنا ہے" (صفحہ ۳۴)

مگر جب وہ کہتا ہے کہ مادی علوم کی طرح انسانی علوم بھی ہمارے لئے قابل دریافت ہیں، تو وہ دراصل انیسویں صدی کے میکانکی، ماہرین فعلیات (Mechanistic Physiologists) کے نظریے کو دوسری شکل میں دہرا دیتا ہے۔ کیونکہ انسان کے بارے میں جو حقیقی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں وہ صرف وہی ہیں جو وصفی — (Descriptive) نوعیت کی ہیں، جو انسان کے مادی پہلو سے متعلق ہیں۔ اس لئے جو لوگ مذہب کو الگ کر کے انسان کو سمجھنا چاہتے ہیں ان کے تمام انسانی نظریے اسی مادی عنصر کو پورے انسان پر چسپاں کر کے بنائے جائیں گے

اس طرح عملاً ان میں اور انیسویں صدی کے مادین میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

۲۔ جیسا کہ صاحب کتاب نے اعتراف کیا ہے، مختلف علوم کے الگ الگ ماہرین کے اجتماع سے انسانی علم کی دریافت نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لئے ایک جامع شخص کا ہونا ضروری ہے:

"اس طرح کی جامعیت مختلف شعبوں کے ماہر بن خصوصی کی کانفرنس کر کے حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اس کو تو ایک جماعت کے بجائے ایک شخص ہی انجام دے سکتا ہے۔ کوئی عمدہ آرٹ کبھی آرٹسٹوں کی کمیٹی کے ذریعہ وجود میں نہیں آیا ہے۔ نہ مختلف محققوں نے اجتماعی کوشش سے کوئی زبردست انکشاف کیا ہے علوم کا اجتماع جو انسانی واقفیت کو ترقی دینے کے لئے درکار ہے، وہ ایک ہی دماغ میں ہونا چاہئے" ص۵۵

مگر اس قسم کے کسی جامع العلوم شخص کا پایا جانا ابتک کی صورت حال کے مطابق بالکل ناممکن ہے۔ کیونکہ انسان محدود عمر اور بڑھاپے کے لازمی قانون کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ ابھی تک کسی درجہ میں بھی کوئی ایسا طریقہ دریافت نہ ہو سکا جس سے بڑھاپے کو روکا جا سکے یا موت کو ٹالا جا سکے۔ اس طرح ایک شخص کو کام کرنے کی جو عمر ملتی ہے وہ کسی ایک شعبہ کی کامل مہارت کے لئے لگتا کافی ہے۔ کجا کہ اسی محدود عمر میں سارے علوم کی مہارت حاصل کی جا سکے۔

مصنف نے ۲۵ سال کے مطالعہ کو سارے علوم میں دستگاہ پیدا کرنے کے لئے کافی قرار دیا ہے، یہ ایک حیرت انگیز جسارت ہے۔ مارکس صرف اقتصادیات کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔ اور اس میں اس نے اپنی بہترین عمر کے ۳۵ سال لگا دیئے، مگر اس کے باوجود اسکا مطالعہ مکمل نہیں ہوا۔ اس طویل مطالعہ کے باوجود وہ اپنی مجوزہ کتاب (سرمایہ) کی صرف ایک جلد لکھ سکا۔ پھر کس بنیاد پر یقین کر لیا گیا ہے کہ سارے علوم کی مہارت کے لئے ۲۵ سال کا مطالعہ کافی ہو جائیگا۔

پھر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ انسان کی حقیقت اتنی پیچیدہ ہے اور وہ ایک مفکر کے الفاظ میں ایسا مجموعہ اضداد (Mixture of Opposites) ہے کہ اب تک کی معلومات کے مطابق ہم یہی قیاس کر سکتے ہیں کہ اس کے بارے میں کوئی غیر مشکوک اور ہم آہنگ رائے قائم کرنا کسی انسان کے لئے محال ہے۔ کمتر واقفیت کی صورت میں تو بیشک ایک شخص کے اندر وہ یقین پیدا ہو سکتا ہے جس کو مصنف نے دھندلا اعتماد (Illusive Confidence) کہا ہے۔ (صفحہ ۲۳۱) مگر معلومات میں اضافہ ہوتے ہی اتنے متضاد اور مختلف النوع سوالات سامنے آجاتے ہیں کہ ان کے درمیان توافق قائم کرنا اور سب کو ملا کر کسی ایک حتمی رائے پر پہنچنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف شعبوں کے خصوصی علما کی رائیں اکثر ایک ہی چیز کے بارے میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہیں مثلاً واٹسن (Watson) اور نظریہ کردار کے دوسرے قائلین (Behaviourists) کا یہ دعویٰ ہے کہ موروثی صفات کوئی چیز نہیں ہیں۔ انسان کو تعلیم اور ماحول کے ذریعہ کسی بھی شکل میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ اسکے برعکس نظریۂ توالد و تناسل کے قائلین (Geneticists) کا مطالعہ انھیں یہ بتاتا ہے کہ موروثیت ہی ایک

انسان کی قسمت کا فیصلہ کرتی ہے اور قوموں کی نجات تعلیم و تربیت میں نہیں بلکہ عمدہ انسانی نسل پیدا کرنے میں ہے
ایسی حالت میں یہ قیاس کرنا بہت غیر حقیقی مفروضہ ہوگا کہ کوئی یا چند انسان ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو علم انسانی کے بیشمار
شعبوں کا خصوصی مطالعہ کریں اور اس کے باوجود ان کے ذہن میں وہ اختلافات رونما نہ ہوں جو الگ الگ خصوصی
مطالعہ کرنے کی صورت میں، مختلف اشخاص کے درمیان پیدا ہوتے ہیں۔

۳۔ مصنف نے اس حقیقت کو نظرانداز کر دیا ہے کہ انسان ایک صاحب ارادہ مخلوق ہے اور یہ چیز اسکو تمام
مادی اشیا سے الگ کر دیتی ہے۔ کسی مادی چیز کے مطالعہ سے اگر ہمیں ایک بات معلوم ہو تو ہم اس کو صداقت سمجھ سکتے
ہیں۔ کیونکہ یہ یقین ہے کہ اسی نوعیت کے تمام مادے انھیں حالات میں ہوں تو وہ ٹھیک اسی واقعہ کو دہرائیں گے۔
مگر انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ انسان ذی ارادہ ہونے کی وجہ سے اس پوزیشن میں ہے کہ ہر آن اپنے آپ
کو بدل دے۔ مصنف کے الفاظ میں:

"جامد مادے کے علم اور زندگی کے علم میں ایک عجیب فرق ہے۔ ہیئت، میکانکس اور طبعیات کی بنیاد
ایسے تصورات پر ہے جن کو نہایت اختصار اور خوش اسلوبی کے ساتھ ریاضیاتی زبان .. ..
(Mathematical Language) میں بیان کیا جا سکتا ہے ... حیاتیاتی علوم کی
یہ صورت نہیں ہے۔ جو لوگ زندگی کے مظاہر کی تحقیق کرتے ہیں وہ گویا ایک ایسے طلسمی جنگل میں داخل
ہوتے ہیں جہاں رنگ برنگ کے بے شمار درخت مسلسل طور پر اپنی جگہ اور اپنی شکل بدلتے رہتے ہیں۔ اور
جہاں سے نکلنا بہت ہی دشوار ہوتا ہے، حقیقتوں کی کثرت کی وجہ سے ان کی عقل کچھ کام نہیں کرتی۔ ان کو
وہ کچھ بیان تو کر سکتے ہیں مگر جبر و مقابلہ کی مساواتوں میں ان کی تعبیر نہیں کر سکتے" (صفحہ ۱۵)

یہی وجہ ہے کہ انسانی علم کی کوئی ایسی تشریح حاصل کرنا جو سب پر منطبق ہو، ناممکن ہے۔ دراصل انسانیت کے
سارے مسائل کا ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ انسان کے ارادہ پر قابو پایا جائے۔ تاکہ وہ اپنے ارادہ سے وہی کرنے
لگے جو ہم چاہتے ہیں۔ پاور ہاؤس میں ایک بٹن دبانے سے شہر کے سارے قمقمے روشن ہو سکتے ہیں۔ مگر انسان کیلئے
کوئی ایسا قانون ناممکن ہے جو سب پر یکساں طور پر نافذ ہو جائے۔ انسان خود ہی اپنے آپ کو اپنے ارادہ سے بدل تا ہے
کوئی خارجی عمل اسے تبدیلی نہیں کر سکتا۔

۴۔ یہ نقطۂ نظر یہ فرض کرتا ہے کہ بد اخلاقی، بد دیانتی اور جرائم ایک قسم کی دماغی اور عصبی "بیماری" ہے اور
اس کا علاج شفا خانوں میں اسی طرح ہو سکتا ہے جیسے پھوڑے پھنسی، اور زکام و بخار کا علاج کیا جاتا ہے۔ مصنف
لکھتا ہے:

"دماغی سرگرمی کی طرح اخلاقی حس بھی بظاہر جسم کی ساخت اور اس کے افعال کی حالت پر منحصر ہے۔ یہ

حالات ہماری نسیجوں اور ہمارے دماغ کی طبعی ساخت کا نتیجہ ہوتے ہیں، نیز یہ ان عوامل کی وجہ سے بھی پیدا ہوتے ہیں جو نشوونما کے زمانے میں ہمارے اوپر اثر انداز ہوتے ہیں۔ شوپنہار نے اپنے مضمون "اخلاقیات کی بنیاد" میں، جس کو اس نے کوپن ہیگن کی رائل سوسائٹی آف سائنس میں پیش کیا تھا، یہ رائے ظاہر کی تھی کہ اخلاقی اصول ہماری فطرت کے اندر اپنی اساس رکھتے ہیں، دوسرے الفاظ میں انسانوں میں خود غرضی کمینگی اور رحم کے جذبات پیدائشی ہوتے ہیں" (صفحہ ۱۲۷)

یہ بنیاد بھی بالکل لغو ہے کیونکہ جرائم کی تحریک کے اگرچہ کچھ اور اسباب بھی ہوتے ہیں مگر یقینی طور پر وہ اسباب اضافی ہیں اور اصل سبب انسان کا اپنا فیصلہ ہے۔ فیصلہ پر کنٹرول حاصل کئے بغیر کسی طرح مجرمانہ ذہنیت ختم نہیں کی جاسکتی یہ قطعاً ناممکن ہے کہ اخلاقی مجرمین کا علاج اسی طرح ہسپتالوں میں ہونے لگے جس طرح جسمانی مریضوں کا علاج کیا جاتا ہے کیونکہ جرم ایک ارادی واقعہ ہے اور بیماری ایک مادی واقعہ۔ ہمارے سرجن مادہ کی چیر پھاڑ کر سکتے ہیں، وہ انسانی ارادہ کا آپریشن نہیں کر سکتے۔ اس لئے وہ انسانی ارادہ پر قابو بھی نہیں پا سکتے

۵۔ زندگی کے موضوعات کی پیچیدگی کی وجہ سے مصنف خود تسلیم کرتا ہے کہ اس کا علم ہمیشہ انسان کی دسترس سے باہر رہے گا۔ مگر اس کے باوجود کسی واقعی علمی بنیاد کے بغیر یہ امید موہوم قائم کر لیتا ہے کہ انسان اسے حاصل کر سکتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"طبیعیات، ہیئت، کیمیا اور میکانکس کے شاندار عروج کے مقابلے میں علم انسانی کی سست رفتار ہمارے آباد اجداد کی قلت فرصت، موضوعات کی پیچیدگی اور ہمارے دماغ کی خاص بناوٹ کا نتیجہ ہے یہ رکاوٹیں بنیادی ہیں۔ ان کے ختم ہونے کی کوئی امید نہیں۔

There is no hope of eliminating them

جان توڑ کوشش کے بعد ہی ان پر قابو حاصل کیا جاسکتا ہے، ہماری ذات کا علم، طبیعیات کی خوشنما سادگی، تجرید اور خوبصورتی حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ اسباب، جو اس کی ترقی میں حارج ہوتے رہے شاید دور نہیں کئے جا سکتے۔ ہم کو صاف طور پر ماننا چاہئے کہ انسان کا علم تمام علوم میں سب سے زیادہ مشکل ہے" (صفحہ ۲۳)

انسانی علم کی یہ نزاکت تمام منکرین تسلیم کرتے ہیں۔ جولین ہکسلے لکھتا ہے:

"یہ ناگزیر ہے کہ خدا کے تصور کا خاتمہ مذہب کے خاتمہ کا ہم معنی نہیں ہے۔ خدا کا خاتمہ محض محدود الہیاتی عمل کے مفہوم میں ہے۔ اگرچہ الہیاتی ذہن ختم ہو رہا ہے مگر وہ مذہبی احساسات جنھوں نے خدا کو وجود دیا تھا وہ اب بھی باقی ہیں۔ خدا کا خاتمہ مذہب کی ایک نئی تشکیل کے ہم معنی ہے۔ اس کا مطلب

یہ ہے کہ اب انسان خود اپنے کندھوں پر اس بوجھ کو اٹھائے گا جس کو اس نے پہلے خدا کے کندھوں پر ڈال دیا تھا۔ اس ذمے داری کا سب سے پہلا مطلب ایک پر اسرار کائنات اور اپنی ناواقفیت کا مقابلہ کرنا ہے۔ پچھلے زمانوں میں یہ بوجھ ایک فہم وادراک سے باہر خدائی کے اوپر ڈال دیا گیا تھا۔ اب ہم اس کو خود اپنی ناواقفیت (Ignorance) کے خانے میں ڈالتے ہیں اور اس امکان کا مقابلہ کرتے ہیں کہ آخری حقائق سے بے خبری ہماری فطرت کی محدودیتوں کی وجہ سے ہمیشہ برقرار رہے گی"

Man In The Modern World, P. 133

یہ تضاد بھی حیرت انگیز ہے کہ یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ انسانی علم انسان کے لئے ناقابل دریافت ہے، ہم یہ امید کرتے ہیں کہ ہم انسان کی زندگی کے مسائل کو حل کر لیں گے، ایسے مسائل جن کا حل اسی وقت ممکن ہے جبکہ انسانی علم پر عبور حاصل ہو جائے۔ کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ ایک ایسا موڑ جو خدا کی رہنمائی کی طرف اشارہ کرتا ہے، وہیں سے آدمی الٹی سمت میں مڑ جاتا ہے۔ ●

مذہب کی
ملحدانہ تشریح

دورِ جدید کے منکرین کسی ایسے ذریعۂ علم کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جو مخصوص شخص کو وہبی طور پر حاصل ہو اور عام تجربے میں اس کا آنا ممکن نہ ہو سکے۔ ان کے نزدیک جو بات عام لوگوں کے ادراک سے باہر ہو۔ اس کا عام لوگوں سے مطالبہ کرنا نہ صرف غیر منطقی بات ہے بلکہ یہی اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ وہ غیر حقیقی ہے۔ کیوں کہ وہ اگر حقیقی ہوتی تو دوسرے انسانوں کے لئے بھی اس کا حصول ممکن ہوتا۔ اب چوں کہ مذہب اور مذہبی معتقدین ساری تاریخ میں بطور واقعہ موجود رہے ہیں اور آگسٹ کامٹے (۱۷۹۸-۱۸۵۷ء) کی پیشین گوئی کے علی الرغم اب تک موجود ہیں۔ اس لئے مذہب کی صداقت تسلیم نہ کرتے ہوئے بھی وہ اس کی تشریح کرنے پر مجبور ہیں۔ اس کی تشریح کے لئے قدرتی طور پر ان کا ذہن ایسے مماثل واقعات کی طرف جاتا ہے جو عام انسانوں کے لئے قابل فہم ہوں اور "شاعری" کی شکل میں بہت جلد انہیں اس کا جواب مل جاتا ہے۔ وہ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ دوسرے ذہنی اعمال کی طرح مذہب بھی محض ایک ذہنی عمل (Mental Activity) ہے۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

ٹائن بی کے الفاظ میں حقیقت کے ادراک کے دو طریقے ہیں۔ ایک سائنسی طریقہ جس کا انحصار مشاہدہ اور تجربہ پر ہے۔ اور دوسرا شاعرانہ طریقہ جو اندر سے ابلتا ہے۔ پہلے طریقہ سے جو چیز دریافت ہو، وہ سائنسی حقیقت (Scientific Truth) ہے۔ اور دوسرے طریقہ سے جو چیز ملے وہ شاعرانہ حقیقت ——— (Poetic Truth) وہ کہتا ہے۔

On the poetic level of the subconscious psyche,,
the comprehensive vision is prophecy.
An Historian's Approach to Religion, P. 123

یعنی لاشعور کی شاعرانہ سطح پر قابل فہم مشاہدہ کا نام پیغبری ہے۔

علوم اجتماعی کی انسائیکلو پیڈیا کے مقالہ نگار کے الفاظ میں مذہب (Religion) کی مثال آرٹ سے دی جا سکتی ہے۔ جس طرح بعض لوگ دوسروں کے مقابلے میں آرٹ کا خصوصی ذوق رکھتے ہیں۔ اور اس میدان میں غیر معمولی مظاہرے کرتے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگوں میں اندرونی بصارت وسماعت (Inner

eyes and ears) سے دیکھنے اور سننے کی منفرد خصوصیات ہوتی ہیں۔ اور یہی وہ چیز ہے جس نے مذہب کے تجربات سے انسان کو آشنا کیا ہے۔

Encyclopaedia of the Social Sciences
(1957) Vol. 13, P. 230

ٹی آر مائلز (T R. Miles) لکھتا ہے:

"مذہب کی مابعد الطبیعی حقیقتیں اگر مذہب کے اپنے لفظی معنی میں لی جائیں تو وہ بے معنی ہیں۔ البتہ مجازی زبان (Language or Parable) کی حیثیت دی جائے تو وہ بامعنی ہو سکتی ہیں۔ جیسے کوئی شخص ایک نئی دریافت کرتا ہے تو ہم کہہ اٹھتے ہیں:

It was an absolute revelation

یہ تو بالکل الہام تھا۔ اس طرح شاعر پر الہام ہوتا ہے۔ اور اسی طرح پیغمبر پر الہام ہوتا ہے۔"

Religion & the Scientific Outlook, 195-26

مائلز کے نزدیک وحی کو اگر اس معنی میں لیا جائے کہ وہ خدا کے اپنے الفاظ ہیں۔ جو فرشتے کے ذریعہ کسی خاص انسان پر اترتے ہیں تو یہ ایک بے معنی بات ہوگی۔ البتہ اگر اس کو بصیرت کی روشنی (Flush of Insight) کہیں تو وہ سمجھ میں آتا ہے۔ کیوں کہ اس طرح ایک فن کار یا ایک مفکر کے اندر یکایک کسی خیال کا آجانا ایک معلوم بات ہے (صفحہ ۱۹۶) اسی طرح مرنے کے بعد دوبارہ زندگی پانا بالکل لفظی معنوں میں سمجھ میں آنے والی چیز نہیں ہے البتہ اگر وہ تمثیلی زبان تسلیم کر لی جائے تو ہم اسے سمجھ سکتے ہیں۔ کیوں کہ جسم کے متعلق ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ مرنے کے بعد منتشر ہو جاتا ہے۔ اور روح بھی اسی کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے دوبارہ زندگی کا تصور لفظی معنوں میں ناقابل فہم ہے۔ (صفحہ ۲۰۴)

الکسس کیرل الہام کو صوفیانہ معرفت (Mysticism) قرار دیتا ہے اس کے نزدیک خدا کی تلاش مکمل طور پر ایک ذاتی مہم (Personal Undertaking) ہے۔ جس طرح ایک شخص جسمانی ورزش کر کے پہلوان بنتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص ترک دنیا اور تپسیا کے ذریعہ روحانیت کے سایہ میں پہنچنے کی سعادت حاصل کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"اپنے شعور کی مشق کر کے آدمی ایک ایسی ناقابل مشاہدہ حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے جو ایک خلقی (Immanent) حقیقت بھی ہے اور مادی دنیا سے بالاتر بھی۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو ایسے بڑے جوکھم میں ڈالتا ہے۔ جس کی کوئی شخص جرأت کر سکتا ہے۔

وہ کسی کو بیرونظر آسکتا ہے اور کسی کو دیوانہ، مگر کوئی شخص یہ سوال نہیں کرسکتا کہ عارفانہ تجربہ صحیح ہے یا غلط۔ یہ کوئی خود ساختہ چیز ہے یا وہم ہے یا روح کا ہماری دنیا کے ابعاد (Dimension) سے پرے کوئی سفر ہے۔ جہاں وہ اعلیٰ حقیقت سے جاکر مل جاتی ہے۔ معرفت آدمی کی اعلیٰ ترین آرزوؤں کو تسکین دیتی ہے، اندرونی قوت، روحانی روشنی، خدائی محبت، بے حد سکون، مذہبی وجدان اتنا ہی حقیقی ہے جتنا جمالیاتی احساس:

Religious intuition is as real as esthetic inspiration

مافوق آدمیت حسن کے تصور کے ذریعہ عارف اور شاعر آخری صداقت (Ultimate Truth) تک پہنچتے ہیں۔

Man the Unknown, P. 134

تبصرہ

اوپر کی سطروں میں مذہب کی جو جدید تشریح نقل کی گئی ہے۔ اس کے بارے میں میں الکسس کیرل کے وہ الفاظ دہراؤں گا۔ جو اس نے خود اپنے بارے میں لکھے ہیں:

"مصنف کو تسلیم ہے کہ مذہب سے متعلق ذہنی اعمال کی تشریح جو اس نے کی ہے۔ وہ نہ سائنس والوں کو پسند آئے گی۔ اور نہ مذہبی لوگوں کو۔ سائنسداں اس قسم کی کوشش کو طفلانہ یا بے معنی کوشش سمجھیں گے اور مذہبی علماء اس کو غلط اور فضول قرار دیں گے۔"

(ایضاً صفحہ ۱۳۲)

مذہب کی مندرجہ بالا تشریح میں اگرچہ مذہب کے الفاظ موجود ہیں مگر حقیقتاً اس میں اور خالص الحاد میں کوئی فرق نہیں ہے۔

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ اس تشریح کے مطابق مذہب ایک غیر حقیقی چیز قرار پاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا اور آخرت اور الہام فی الواقع اپنا کوئی وجود نہیں رکھتے، بلکہ وہ ہماری قوت تخیل کے کرشمے ہیں۔ مگر مذہب نے جس شدت کے ساتھ ذہنوں میں جگہ بنائی ہے۔ اس کے لحاظ سے یہ بات بالکل ناقابل قیاس ہے کہ وہ محض ایک تخیلاتی چیز ہو۔ دور حاضر کا مشہور مورخ ٹائن بی لکھتا ہے:

اگر ہم مذاہب کے ایک سروے پر نکلیں، جو مختلف مقامات پر مختلف زمانوں میں بے شمار انسانی سماج اور گروہوں میں رائج رہے ہیں۔ جن کے متعلق ہم کچھ معلومات رکھتے ہیں، ہمارا پہلا تاثر حیران کن طور پر لامحدود قسم کا ہوگا۔ تاہم غور و فکر اور تجزیہ سے یہ ظاہری اقسام انسان کی پرستش یا تلاش تین چیزوں سے زیادہ نہیں ہوگی۔ یعنی فطرت، انسان خود اور حقیقت مطلق Absolute Reality جو کہ نہ فطرت ہے، نہ خود انسان ہے بلکہ وہ ان کے اندر ہوتے ہوئے ان سے باہر ہے۔"

An Historian's Approach to Religion, P. 16

گویا تاریخ بتاتی ہے کہ قدیم ترین زمانے سے لے کر اب تک انسان ایک حقیقت اعلیٰ کی تلاش میں سرگرداں رہا ہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ایک بالکل فرضی چیز اس طرح انسانی تاریخ پر چھا جائے کیا دوسری کسی ایسی چیز کی نشاندہی کی جا سکتی ہے جو غیر حقیقی ہونے کے باوجود اس طرح انسان کی نفسیات پر اثر انداز ہوتی ہو۔

۲۔ اس تشریح میں فطری طور پر مذہب کسی ایک چیز کا نام نہیں رہتا بلکہ وہ ہزار چیز بن جاتا ہے۔ کیوں کہ جب مذہب آدمی کا اپنا ذہنی عمل ہے۔ تو وہ ہر شخص کی اپنی استعداد، اپنے مزاج اور اپنی یافت کے لحاظ سے الگ الگ ہوگا۔ حالاں کہ مذہب کا حکم الٰہی ہونا یہ تقاضا کرتا ہے کہ وہ ایک متعین شکل میں ہو تاکہ اس کی بنیاد پر ہر شخص کے رویئے کے صحیح اور غلط ہونے کا تعین کیا جا سکے۔ اس طرح تصور مذہب کے فرق کی وجہ سے حقیقت مذہب میں بنیادی فرق ہو جاتا ہے۔ یہاں میں ٹائن بی کا ایک اقتباس نقل کروں گا:

"مختلف لوگوں کے عقائد بہرحال مختلف ہوں گے۔ کیوں کہ حقیقت مطلق (Absolute Reality) ایک راز ہے جس کی صرف ایک جزوی جھلک انسانی ذہن نے دیکھی ہے۔ اتنی بڑی حقیقت صرف ایک راستہ پر چل کر معلوم نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ کتنا ہی مضبوط اور پختہ کیوں نہ ہو کہ میرا ادراک صحیح ہے۔ مجھے اس سے باخبر رہنا چاہیئے۔ کہ میری روحانی نظر محدود ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ دوسرا کوئی مشاہدہ نہیں ہو سکتا۔ مذہبی اصطلاح میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ مجھے یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ دوسرے لوگوں کو خدا کا الہام نہیں ہوا۔ اور اسی طرح یہ بھی امکان ہے کہ دوسروں کا الہام اس سے زیادہ مکمل اور ترقی یافتہ ہو جو مجھ کو ہوا ہے۔ میں اور میرا ساتھی دونوں مختلف راستوں سے ایک ہی منزل کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ تمام انسان مخفی حقیقت تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ تاکہ وہ اپنی زندگی حقیقت مطلق کی مناسبت سے تعمیر کر سکیں یا مذہبی اصلاح کے مطابق خدا کی مرضی پر چل سکیں۔ یہ تمام لوگ ایک ہی قسم کی تلاش میں مصروف ہیں۔ انہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ سب روحانی بھائی ہیں۔ اور رواداری اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک وہ محبت میں تبدیل نہ ہو جائے۔"

An Historian's Approach to Religion, P. 251

اس طرح جماعتی سطح پر خدا کے بہت سے تصورات بن جاتے ہیں۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کے مؤلفین نے سماجی سطح پر خدا کے ۲۲ تصورات دریافت کئے ہیں اور ۲۲ الگ الگ عنوانات کے تحت ان کی تشریح کی ہے۔ (ملاحظہ ہو جلد ۶ عنوان خدا (God)

۳۔ اسی طرح اس تشریح کے خانے میں نبوت اور ختم نبوت سب بے معنی الفاظ ہو جاتے ہیں۔ ٹائن بی اپنی مذکورہ بالا کتاب میں لکھتا ہے:

"مورخ کا نقطۂ نظر اس سے متصادم نہیں ہے کہ خدا نے انسان کے اوپر الہام کیا تاکہ روحانی نجات کے لئے انسان کی مدد کرے۔ جو کہ بلاواسطہ کوشش سے انسان کے لئے ممکن نہ ہوتا مگر مورخ اس ابتدائی مقدمہ کو یہاں تک پہنچانے میں مشتبہ ہے کہ یہ دعویٰ کیا جائے کہ خدا کی طرف سے ایک مخصوص اور آخری الہام ہوا ہے۔ جو اس کہکشانی نظام میں سورج کے ایک کرہ پر ایک متعین وقت میں ایک خاص گروہ کو عطا ہوا ہے۔ " خدا اپنی مخلوق پر الہام کرتا ہے۔" کے مقدمہ کے اس ذاتی (Self-Centered) انطباق میں مورخ شیطانی شرارتوں کی جھلک دیکھتا ہے۔ کیوں کہ الہام اور مخصوص الہام میں منطقی طور پر کوئی لازمی رشتہ نہیں ہے۔ یعنی یہ کہ "میں" ہی وہ شخص ہوں جس پر تمام لوگوں کے درمیان خدا کا الہام ہوا ہے اور میرا الہام مخصوص اور آخری ہے۔" صفحہ ۱۳۲

میں کہوں گا کہ اس غلطی کی بنیاد خود اس تصور الہام میں ہے جو مورخ مان رہا ہے، ورنہ اسے معلوم ہوتا کہ فی الواقع الہام اور مخصوص الہام میں اتنا قریبی اور منطقی رشتہ ہے کہ دونوں کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ جدید مفکرین کا تصور الہام یہ ہے کہ وہ اس قسم کی ایک چیز ہے۔ جیسے کسی آرٹسٹ کے ذہن میں کسی عمدہ تصویر کا خیال آجائے۔ یا شاعر کو کوئی عمدہ شعر سوجھ جائے۔ خدا ان کے نزدیک کوئی شعوری وجود نہیں جو بالارادہ ایک خاص مقصد کے تحت کسی کو اپنی مرضی کے ارتقا کے لئے چنتا ہو، بلکہ وہ کسی قسم کی مجہول خارجی حقیقت ہے۔ جو ہماری کائنات کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس کی پرچھائیاں ہم پر پڑتی ہیں۔ اور بعض لوگوں کے نزدیک یہ بھی نہیں ہے۔ بلکہ یہ صرف ہمارا تحت شعور ہے جو وحی والہام کی صورت میں بولتا ہے، ظاہر ہے کہ مذہبی نقطۂ نظر سے صورت حال اس سے قطعی مختلف ہے۔ اس لئے مذہب کا تصور الہام جدید مفکرین کی سمجھ میں کیسے آسکتا ہے۔

۴۔ اس جدید تشریح میں مذہب صرف ایک دنیوی ضرورت بن کر رہ جاتا ہے۔ جب کہ مذہب دراصل ایک اخروی ضرورت ہے۔ یعنی خالص مذہبی نقطۂ نظر سے مذہب کا اصل کام انسان کو دوسری زندگی کی نجات کا راستہ بتانا ہے۔ مگر اس تشریح میں مذہب کا مقصد صرف یہ ہو جاتا ہے کہ دنیا میں سماجی تنظیم کے لئے ایک موزوں بنیاد فراہم کرے۔ وہ ایک مفروضہ عقیدہ ہے نہ کہ کوئی واقعی حقیقت:

> Indeed a dogma is only workable Thought-arrangement on which could be built a unity of purpose and practice among the believers of a particular religion.
> Hindustan Times, Oct. 1961

یعنی مذہبی عقیدہ صرف ایک قابلِ عمل تنظیم فکر ہے جس کی بنیاد پر ایک مخصوص مذہب کے ماننے

والوں کے درمیان مقصد اور جدوجہد کا اشتراک قائم رکھا جاسکتا ہے۔

۵۔ اس جدید تصور کے پیدا ہونے میں کسی قدر دخل مروجہ یہودیت کا بھی ہے۔ جس کا تعلق حضرت موسیٰ کی تعلیمات سے نہیں، بلکہ وہ ان کے بگڑے ہوئے پیرؤوں کا اپنا عقیدہ ہے۔ ٹائن بی لکھتا ہے:

"درحقیقت یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ خدا جس کا ذہن اور جس کا ارادہ پوری کائنات کے نظام پر حکومت کرتا ہے۔ وہ اس قسم کی ذہنی حرکت کرے گا۔ یہ نہایت بعید از قیاس بات ہے کہ وہ تمام لوگوں میں سے 'مجھ' کو اور میرے گروہ کو چن لے اور مجھ کو اپنا پیغمبر اور میرے قبیلہ کو اپنا محبوب گروہ (Choosen People) قرار دے۔ اس قسم کا کوئی بھی تصور حقیقت سے زیادہ ایک فریب ہے۔ جو آدمی نے خود ہی اپنے ذہن میں پیدا کرلیا ہے۔"

An Historian's Approach to Religion, P. 135

جہاں تک "محبوب گروہ" کا تعلق ہے اگر اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ کوئی گروہ محض ایک خاص نسل یا ایک خاص شخص سے منسوب ہونے کی وجہ سے محبوب ہے تو یہ ایک لغو تصور ہے۔ اور غالباً یہود کے عقیدہ کی بنا پر یہی مورخ کے ذہن میں ہے۔ مگر یہ اصل مذہبی تصور کی صحیح ترجمانی نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ خدا کے الہام کی جو لوگ پیروی کریں گے وہ خدا کی نظر میں محبوب لوگ قرار پائیں گے۔ اس سے قطع نظر کہ وہ نسلی اعتبار سے کس خاندان میں پیدا ہوئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مذہب کی اس تشریح کا مطلب مذہب کے نقطۂ نظر سے اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مذہب کو ملتے ہوئے مذہب کا انکار کر دیا جائے۔ ایک ایسا مذہب جس پر عذاب و ثواب مترتب نہ ہوتا ہو جو بس ایک قسم کی شخصی مہم ہو۔ اور دوسرے انسانوں سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو جو کسی زندہ اور باشعور خدا کی طرف سے نہ ہو۔ بلکہ خود انسان کے اپنے ذہن اور نفسیات کا کرشمہ ہو۔ ایسا مذہب لا الٰہ الا الانسان کے کلمہ کے تحت بن سکتا ہے۔ لا الٰہ الا اللہ کے کلمہ کے تحت نہیں بن سکتا۔ ایسے کسی فکر کو "مذہب" کہنا اگر مصلحت اندیشی کی بنا پر ہے تو وہ سادہ لوحی ہے اور اگر علمی مغالطہ ہے تو فریب۔ ■■

BIBLIOGRAPHY

Bertrand Russell
1. My Philosophical Devolopment
2. Human Knowledge
3. Our Knowledge of the External World
4. The problem of Philosophy
5. Why I am not a Christian ?
6. T.R. Miles, Religion & the Scientific Outlook
7. Science of Life
8. Philosophers of Science
9. G.G. Simpson, Meaning of Evolution
10. A.E. Mander, Clearer Thinking
11. R.S. Lull, Organic Evolution
12. Encyclopaedia Britanica (1958)
13. Haldane & Huxley, Animal Biology
14. Lunn. Revolt Against Reason
15. Chamber's Encyclopaedia (1874)
16. Nature and Science Speak About God
17. J. Huxley, Religion Without Revelation
18. John Wi lson, Philosophy and Religion
19. J.N. Sullivan, The Limitations of Science
20. Eddington, The Domain of Physical Science
21. Mortan White, The Age of Analysis
22. Sir James Jeans, The Mysterious Universe
23. A.N. Gilkesh, Faith for Modern Man
24. Alexis Carrel, Man the Unknown
25. C.M. Joad, Modern Wickedness
26. LE Comte Du Nouy, Human Destiny
27. Hindustan Times
28. Science and Christian Belief
29. Man in the Modern World
30. Freud, New Introductory Lectures on Psychoanalysis
31. Human Personality and its Survival of Bodily Death
32. A Philosophical Scrutiny of Religion
33. Religion, Philosophy and Psychical Research
34. An Historian's Approach to Religion
35. Encyclopaedia of the Social Sciences (1957)

قرآن کا مطلوب انسان

مولانا وحید الدین خاں

آغاز ۲
اسلام ایک عظیم جدوجہد ۳
قرآن کا مطلوب انسان ۱۹
مومن کی تصویر ۳۰
بامقصد زندگی ۴۱
یہ بے حسی کیوں ۴۸
دعوت اسلامی کے کارکنوں کی ذمہ داریاں ۶۰
کوئی سننے والا ہے جو سنے ۶۳
خدمت دین کی مشکلات ۷۰
ہمیں کیا کرنا ہے ۷۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زیر نظر مجموعہ راقم الحروف کی چند تقریروں پر مشتمل ہے۔ یہ تقریریں جماعت اسلامی ہند کے مختلف اجتماعات میں ۱۹۵۵ سے لے کر ۱۹۶۳ تک پیش کی گئی تھیں اور اس کے بعد اسی زمانہ میں اکثر ماہنامہ زندگی (رام پور) اور بعض ماہنامہ الفرقان (لکھنؤ) میں شائع ہوئیں۔ ان رسائل کے صفحات سے لے کر انھیں کتابی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔ ان مختلف تقریروں کو جو چیز ایک کتاب کا مشترک حصہ بناتی ہے، وہ ان کا مشترک موضوع ہے۔ یہ ہے: اسلام کی حقیقت کو واضح کرنا، اور اس کی خدمت و اشاعت کا جذبہ دلوں میں ابھارنا۔

آدمی فطرت سے کچھ صلاحیتیں لے کر آتا ہے۔ مثلاً کوئی فیاض ہوتا ہے کوئی شیریں بیان۔ کوئی فعال ہوتا ہے کوئی حوصلہ مند۔ یہ "انسان" وہ ہے جو ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے یہاں جس انسان کی قیمت ہے وہ یہ نہیں ہے۔ اللہ کے یہاں قیمت رکھنے والا "انسان" وہ ہے جو آدمی کے خود اپنے ارادہ سے ابھرتا ہے۔ آدمی اپنے شعوری عمل، بالفاظ دیگر خدائی محرک کے تحت اپنے کو جیسا بناتا ہے اسی کے مطابق وہ اللہ کے یہاں درجہ حاصل کرتا ہے۔

انسان بظاہر بہت سے اعضاء و جوارح اور بے شمار بالوں اور ناخنوں کا مجموعہ ہے۔ مگر حقیقۃً انسان ایک لطیف وحدت کا نام ہے۔ اس وحدت کی سطح پر جب کسی فکر کا غلبہ ہو جاتا ہے تو وہ اس کے وجود کے تمام حصوں میں ظاہر ہوتی چلی جاتی ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ دین کا بھی ہے۔ دین، اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے، کسی مجموعۂ قوانین کا نام نہیں، وہ ایک قلبی حالت کا نام ہے۔ قلب انسانی میں جب یہ حالت پیدا ہو جاتی ہے تو پوری زندگی اس کے رنگ میں رنگتی چلی جاتی ہے۔ خواہ "نماز روزہ" کا معاملہ ہو یا اسلامی دعوت کا، راہ سے کانٹا ہٹانے کا عمل ہو یا میدان جنگ میں جہاد کرنے کا، سب کا اصل مقصد یہ ہے کہ آدمی کے اندر وہ مومنانہ روح پیدا ہو جو آدمی کو اللہ سے قریب کرتی ہے اور اس کے اندر وہ اعلیٰ خصوصیات پیدا کرتی ہے جو اس کو جنتی دنیا کا شہری بنانے والی ہیں۔ یہی اندر کا "مومن"، وجود میں آنا تمام اعمال کا اصل مقصود ہے ——— زیر نظر مجموعہ کے مضامین میں، مختلف انداز سے، یہی حقیقت ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ چوں کہ یہ سب اجتماعی خطابات ہیں، اس لئے قدرتی طور پر ان کا انداز تقریری ہے نہ کہ تصنیفی۔

کتابی صورت میں شائع کرتے ہوئے راقم الحروف نے ان مضامین پر نظر ثانی کی ہے۔ تاہم یہ نظر ثانی صرف جزئی یا لفظی تبدیلیوں کی حد تک ہے۔ اصل مضمون میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ مضامین تقریباً اپنی اصل ابتدائی صورت ہی میں شائع کئے جا رہے ہیں۔ ایسا زیادہ تر اس جذبہ کے تحت کیا گیا ہے کہ ان کی تاریخی حیثیت برقرار رہے۔

وحیدالدین ۳۰ اپریل ۱۹۷۹

اسلام — ایک عظیم جدوجہد

قرآن مالک کائنات کا فرمان ہے، جو اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ عزت کس کے لیے ہے اور ذلت کس کے لیے۔ کامیاب کون ہے اور نامراد کون۔ دنیوی اعتبار سے جب ہم کامیابی کا لفظ بولتے ہیں تو اس کے معنی ہوتے ہیں، کسی سوسائٹی میں ایک شہری کو ترقی کے جو مواقع دیے گئے ہیں ان کو استعمال کر کے اونچے درجات تک پہنچنا۔ ایک شخص بڑا تاجر، اونچا عہدیدار اور اعلیٰ اعزازات کا مالک ہو تو اس کو کامیاب انسان کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ماحول کے اندر تجارت کو بڑھانے کی جو ممکن صورتیں ہیں، اعلیٰ عہدوں پر پہنچنے کے لیے جو صفات مقرر کی گئی ہیں، اعزازات کے حصول کے لیے جو راستے بنے ہوئے ہیں، وہ شخص ان کو عبور کر گیا ہے اور اپنی جدوجہد کے نتیجہ میں اس نے اس بلند مقام کو پا لیا ہے جو قانون وقت کے تحت اس کے لیے ممکن تھا۔ کامیابی کے معنی الہ دین کا چراغ پا لینے کے نہیں ہیں، بلکہ کامیابی اس واقعہ کا نام ہے کہ ایک شخص نے اپنی صلاحیت اور کام کے مواقع کو ان راہوں میں صرف کیا جو اس کے لیے کھلی ہوئی تھیں اور بالآخر اپنی کوششوں کے نتیجہ میں اس منزل تک پہنچ گیا جہاں ان راستوں کا کوئی چلنے والا پہنچتا ہے۔ کامیابی کوئی خوش قسمتی سے پیش آنے والا اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ وہ صحیح جدوجہد کا فطری نتیجہ ہے۔ اسی بات کو ایک مفکر نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے:۔

"لائق شخص اور کامیاب نہ ہو، یہ جھوٹ ہے"

یہی حال دوسری زندگی کی کامیابی کا بھی ہے جو انسان کی حقیقی منزل ہے، جہاں تمام اگلے پچھلے انسان اپنے رب کے حضور جمع کیے جائیں گے۔ اس دن عزت اور کامیابی ان لوگوں کے لیے ہوگی جو خدا کی رضا کو پالیں اور ذلت اور نامرادی ان کے لیے جو اس کی رضا کو حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ پہلے گروہ کے لیے دائمی عیش ہے اور دوسرے گروہ کے لیے دائمی عذاب۔ جو شخص قرآن پر ایمان لائے اور اسلام کو اختیار کرے وہ گویا پہلے انجام کا امیدوار ہے اور دوسرے انجام سے بچنا چاہتا ہے۔ مگر اس مقام بلند کا حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ ایک عظیم چڑھائی ہے جس کو عبور کرنے کے ایک لمبے عمل کے بعد آدمی اس کے اوپر پہنچتا ہے۔ خدا کا انعام کسی پڑی ہوئی چیز کی طرح محض اتفاق سے کسی کو نہیں مل جاتا، بلکہ دنیوی کامیابی کی طرح وہ ایک زبردست جدوجہد کا قدرتی نتیجہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق کسی شخص کو حاصل ہوتا ہے۔ آخرت میں انسان کی کامیابی دراصل ایک لمبے امتحان سے پار اتر جانے کا دوسرا نام ہے۔ انسان کو پیدا کر کے اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی دنیا میں ڈال دیا ہے جہاں طرح طرح کے باطل نظریات اور فاسد رجحانات ہیں جن سے اسے اپنے دل و دماغ کو پاک کرنا ہے۔ بہت سے غلط اور ناجائز طریقے ہیں جن سے اسے بچنا ہے۔ بہت سی شیطانی اور طاغوتی قوتیں ہیں جو انسان کو راہ حق سے پھیر دینے میں لگی ہوئی ہیں۔ ان طاقتوں سے

لڑتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھنا ہے۔ غرض دشواریوں سے بھرا ہوا ایک راستہ ہے جس کو طے کرکے اس کو اپنے رب تک پہنچنا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

حُجِبَتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ وَحُجِبَتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ (متفق علیہ)	جہنم لذتوں سے ڈھکی ہوئی ہے اور جنت کلیفوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔

اسلام کی حقیقت کو اگر ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو اس کے لیے "قربانی" سے زیادہ موزوں اور کوئی لفظ نہیں ہو سکتا۔ اسلام دراصل ایک زبردست جدوجہد ہے، وہ قربانی کا ایک مسلسل عمل ہے جو ایمان لانے کے بعد سے آدمی کی موت تک جاری رہتا ہے۔ سب سے پہلی قربانی آدمی اس وقت دیتا ہے جب وہ اپنے پسندیدہ خیالات اور قلبی رجحانات کو خیرباد کہہ کر دینِ حق کو قبول کرتا ہے۔ اس کے بعد دوسری قربانی وہ ہے جو عمل کی دنیا میں دی جاتی ہے۔ اخلاق و معاملات اور معیشت و تمدن میں وہ ان طریقوں کو چھوڑ دیتا ہے جو خدا کو ناپسند ہیں اور ان طریقوں کو اختیار کر لیتا ہے جو خدا کو محبوب ہیں۔ پھر جب وہ ان دونوں مرحلوں کو پار کر لیتا ہے تو وہ امتحان کے اس آخری میدان میں پہنچ جاتا ہے جہاں نہ صرف حرام چیزیں بلکہ زندگی کے جائز اثاثے بھی چھوڑ دینے ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنی جان بھی قربان کر دینی پڑتی ہے۔ یہ جان کی قربانی اس سلسلۂ امتحان کی تکمیل ہے اور عہد بندگی کو آخری طور پر ثابت کر دکھانا ہے جو ایمان لاکر آدمی نے اپنے رب سے کیا تھا۔

یہ تین دور جن سے گزر کر آدمی اپنے رب تک پہنچتا ہے اور اس کی رضا کا مستحق بنتا ہے، ان کو قرآن میں — ایمان۔ ہجرت اور جہاد — کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرمایا:-

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ٥ (توبہ - ۲۰)	جو لوگ ایمان لائے، جنھوں نے ہجرت کی اور اپنی جانوں اور مالوں سے خدا کی راہ میں جہاد کیا ان کے لیے خدا کے یہاں بڑا درجہ ہے اور یہی لوگ دراصل کامیاب ہونے والے ہیں۔

اس آیت میں ایمان سے مراد ان حقائق کو تسلیم کرنا ہے جو قرآن میں متعین کیے گئے ہیں، اور ہجرت سے مراد اس اعتراف اور اس کے تقاضوں کے خلاف جو کچھ ہے اس کو چھوڑ دینا اور جہاد اس کوشش اور جدوجہد کا نام ہے جو ایمان اور مہاجرت کی زندگی کو آخری حد تک باقی رکھنے کے لیے اس دنیا میں آدمی کرتا ہے۔ اس طرح یہ ایمان، ہجرت اور جہاد — ایک دوسرے سے الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی سلسلہ سفر کی اگلی پچھلی منزلیں ہیں۔ یہ ایک ہی کیفیت کے مختلف ارتقائی مراحل ہیں جن کو ممیز کرنے کے لیے جدا جدا عنوان دے دیا گیا ہے۔ نیز ہجرت اور جہاد کی کوئی متعین صورتیں نہیں ہیں۔ ایمان کی حقیقت، مختلف حالات میں، مختلف صورتوں میں ظہور کرتی ہے۔ کسی کے لیے ہجرت ترکِ وطن کے ہم معنی ہوتی ہے، کسی کے لیے صرف یہ کہ وہ اپنے اندر کے برے رجحانات کو چھوڑ دے۔ کسی کا جہاد اس کو بیرونی قوتوں سے ٹکرا دیتا ہے جاتا

ہے۔ کسی کا جہاد صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی داخلی ترغیبات کا مقابلہ کر کے اس کو زیر کرے۔

ایمان

سب سے پہلے ایمان کو لیجیے۔ یہ اس عظیم امتحانی مہم میں شریک ہونے کا فیصلہ کرنا ہے جس کی ابتدا زبان کے اقرار سے ہوتی ہے اور جس کی انتہا یہ ہے کہ اسی پر قائم رہتے ہوئے آدمی اپنی جان دے دے۔ یہ وہ عہد ہے جو بندہ اپنے خدا سے اس بات کے لیے کرتا ہے کہ وہ ساری عمر اس کا وفادار رہے گا۔ ایمان اس کیفیت کا نام ہے جو حقیقت کے صحیح اور مخلصانہ شعور سے پیدا ہوتی ہے۔ جب آدمی اس حیرت انگیز کائنات کے پیچھے ایک لامحدود قوت کا مشاہدہ کر لیتا ہے، جب وہ خدا کے رسولؐ کو تسلیم کر کے اس کے تمام فیصلوں پر راضی ہو جاتا ہے، جب اس کا دل پکار اٹھتا ہے کہ تخلیق کا یہ عظیم منصوبہ بے مقصد نہیں ہے بلکہ ایک ایسا دن آنے والا ہے جب ماضی اور مستقبل کے تمام انسانوں کو جمع کر کے ان کا حساب لیا جائے، تو اسی کیفیت کے مجموعہ کو ہم ایمان سے تعبیر کرتے ہیں۔

ایمان کی اصل روح اعتماد کرنا ہے۔ یہ اعتماد ایک ایسی ہستی کے بارے میں ہوتا ہے جس کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتے۔ اس لیے اس میں یقین کا مفہوم پیدا ہوا۔ اسی طرح خدا کو اس کی تمام صفات کے ساتھ ماننے کے لازمی معنی یہ ہیں کہ اس کے غضب سے ڈر جائے اور اس کے عذاب سے بچنے کی فکر کی جائے اس لیے اس کے ساتھ تقویٰ اور خوف کا ہونا ضروری ہے۔ اس طرح اگر قرآن کے تصور ایمان کی تشریح کے لیے تین الفاظ ــ یقین، اعتماد اور خوف ــ کو اکٹھا کر دیں تو ہم اس کی روح کے بالکل قریب پہنچ جاتے ہیں۔ ایمان اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے خدا اور اس کے رسولؐ پر اس کلی اعتماد کا نام ہے جو یقین کامل سے پیدا ہوتا ہے، اور خدا سے اس خوف کا نام ہے جو آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ کسی پولیس اور فوج کے تسلط کے بغیر خود سے اس کی اطاعت کو اپنے اوپر لازم کر لے۔

یہ یقین جو ایمان کا پہلا جزو ہے، یہ خارج سے درآمد کی ہوئی کسی چیز کا نام نہیں ہے بلکہ اس حقیقت کا زندہ شعور ہے جو خود انسان کی فطرت میں چھپی ہوئی ہے۔ انسان کائنات پر غور کرتا ہے۔ رسولؐ کی تعلیمات کو دیکھتا ہے اور اپنے اندر سے اٹھنے والی آواز پر کان لگاتا ہے تو یہ تینوں چیزیں بالکل ایک معلوم ہوتی ہیں۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی ایک ہی پیغام ہے جو ایک وقت میں تین مختلف مقامات سے نشر ہو رہا ہے۔ خدا کا رسولؐ جس حقیقت کی خبر دیتا ہے، کائنات پوری کی پوری بالکل اس کی ہم آہنگ معلوم ہوتی ہے اور انسان کی اندرونی آواز ہمہ تن اس کی تصدیق کرتی ہے۔ وہ کتاب الٰہی میں جو کچھ پڑھتا ہے زمین و آسمان کے اندر اسی کو دیکھتا ہے اور جو کچھ پڑھتا ہے اور دیکھتا ہے اس کی فطرت اس کو اس طرح قبول کر لیتی ہے جیسے کسی خانے میں بالکل اسی سائز کی چیز رکھ دی گئی ہو۔ مگر یقین کی یہ کیفیت کسی کو خود بخود حاصل نہیں ہوتی۔ جس طرح فطرت کی ہر صلاحیت اسی وقت روبکار آتی ہے جب اس کو نشوونما دے کر

ابھارا جائے، کائنات کا ہر راز اسی وقت انسان کے اوپر بے نقاب ہوتا ہے جب اس کی تلاش میں وہ اپنے آپ کو گم کر چکا ہو۔ اور کسی کتاب کے مضامین اسی وقت آدمی پر کھلتے ہیں اور اسے فائدہ پہنچاتے ہیں جب اس کا گہرا مطالعہ کر کے اس کے مطالب کو اخذ کیا جائے۔ ٹھیک اسی طرح یہ یقین بھی آدمی کو اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ اپنی قوت ارادی کو اس کے لیے کام میں لائے۔ یہ اگرچہ کائنات کی واضح ترین حقیقت ہے مگر اس دنیا کے لیے اللہ تعالیٰ کا قانون یہی ہے کہ آدمی کو وہی کچھ ملے جس کے لیے اس نے جدوجہد کی ہو۔

ایمان کا دوسرا جزو اعتماد ہے۔ اپنی ذات اور کائنات کا مطالعہ جہاں آدمی کو ایک طرف یہ بتاتا ہے کہ ایک عظیم خالق اور کارساز ہے جو اس کارخانے کے تمام واقعات کا حقیقی سبب ہے۔ اسی کے ساتھ اور عین اسی وقت اس کو دو اور باتوں کا شدید احساس ہوتا ہے۔ ایک اپنی انتہائی بے چارگی کا اور دوسرے خدا کے بے پایاں احسانات کا۔ وہ دیکھتا ہے کہ وہ اپنے وجود کے لیے بے شمار چیزوں کا ضرورتمند ہے، مگر وہ کسی ایک چیز کو بھی خود سے نہیں بنا سکتا۔ وہ ایک کمزور بچہ کی شکل میں پیدا ہوتا ہے اور بڑھاپے کی ناتوانیوں کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ وہ ایک ایسی زمین کے اوپر کھڑا ہے جو فضا کے اندر معلق ہے جس کے توازن میں معمولی بگاڑ بھی آجائے تو اس کو تباہ کر دینے کے لیے کافی ہے، وہ اپنے کو ایک ایسی عظیم کائنات کے اندر گھرا ہوا پاتا ہے جس پر اسے کوئی اختیار نہیں۔ ان حالات میں اس کو اپنا وجود بالکل بے بس اور حقیر معلوم ہونے لگتا ہے۔ دوسری طرف وہ دیکھتا ہے کہ وہ سب کچھ جس کی اسے ضرورت تھی، اس کے لیے مہیا کر دیا گیا ہے۔ اس کو ایسا جسم دیا گیا ہے جو دیکھتا ہے، جو سنتا ہے، جو بولتا ہے، جو سوچتا ہے اور اس کی قوتوں کو برقرار رکھنے کے لیے ایک خود بخود چلنے والی مشین کی طرح مسلسل کام کر رہا ہے، وہ دیکھتا ہے کہ زمین و آسمان کی ساری قوتیں پوری ہم آہنگی کے ساتھ اس کی خدمت میں لگی ہوئی ہیں۔ اس کو اپنا وجود مجسم احسان نظر آنے لگتا ہے۔ اس کے اندر بے پناہ جذبۂ شکر امنڈتا ہے اور وہ احسان مندی کے جذبہ سے لبریز ہو جاتا ہے۔ یہ واقعہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ اس ہستی کو اپنا سب کچھ قرار دے جس نے یہ سارا انتظام اس کے لیے کیا ہے پہلی چیز اس کو اپنی مکمل بے بسی کا یقین دلاتی ہے اس کو شدید احساس ہوتا ہے کہ کوئی بلندتر قوت ہو جو اس کی دستگیری کرے۔ اور دوسرا احساس اس کی اس طلب کا جواب بن کر سامنے آتا ہے۔ جو مطالعہ اس کو اپنے اندر خلاء کا احساس دلاتا ہے وہی مطالعہ بیک وقت اس خلا کو پر بھی کر دیتا ہے۔

ایمان کا تیسرا جزو "خوف" ہے۔ یہ خوف ایمان کے ابتدائی دو اجزاء۔ یقین اور اعتماد سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا لازمی نتیجہ اور اس کی تکمیل ہے۔ ایک طرف وہ خدا کو دیکھتا ہے جو عدل و حکمت کا خزانہ ہے۔ دوسری طرف کائنات کو دیکھتا ہے تو اس کا دل پکار اٹھتا ہے کہ اتنا بڑا تخلیقی منصوبہ بے مقصد نہیں ہو سکتا۔ پھر جب وہ زمین پر بسنے والے انسانوں کو دیکھتا ہے جن میں ظالم بھی ہیں اور مظلوم بھی۔ اچھے

بھی ہیں اور برے بھی، تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ محاسبہ کا ایک دن آنا ضروری ہے جہاں بھلوں کو ان کی بھلائی کا اور بروں کو ان کی برائی کا بدلہ دیا جائے۔ رب العالمین پر اعتماد ہی اس کے لیے رب العالمین سے خوف کی بنیاد بن جاتا ہے۔

یہ خدا کا خوف اس قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جو کسی ڈراونی چیز کو دیکھ کر آدمی کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کو کسی بھی ایک لفظ سے صحیح طور پر تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ انتہائی امید اور انتہائی اندیشہ کی ایک ایسی ملی جلی کیفیت ہے جس میں بندہ کبھی یہ طے نہیں کر پاتا کہ دونوں میں سے کس کو فوقیت دے۔ یہ سب کچھ کر کے اپنے کو کچھ نہ سمجھنے کا وہ اعلیٰ ترین احساس ہے جس میں آدمی کو صرف اپنی ذمہ داریاں یاد رہتی ہیں اور اپنے حقوق کو وہ بالکل بھول جاتا ہے۔ یہ محبت اور خوف کا ایک ایسا مقام ہے جس میں آدمی جس سے ڈرتا ہے اسی کی طرف بھاگتا ہے، جس سے چھننے کا خطرہ محسوس کرتا ہے اسی سے پانے کی بھی امید رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسا اضطراب ہے جو سراپا اطمینان ہے اور ایسا اطمینان ہے جو سراپا اضطراب ہے۔

یہ ایمان کے تین نمایاں پہلو ہیں۔ ایمان دراصل اس کیفیت کا نام ہے جو خدا کے خوف، اس پر مکمل اعتماد اور اس کے بارہ میں کامل یقین سے پیدا ہوتا ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ پر، اس کے رسولوں پر اور اس کے احکام پر ایمان لائے، اپنا سب کچھ اس کو سونپ دے، اس کے تمام فیصلوں پر راضی ہو جائے، وہ مومن ہے۔ ایمان عقل کے لیے ہدایت اور روشنی ہے اور دل کے لیے طہارت اور پاکیزگی۔ اس لیے یہ عقل اور ارادہ دونوں کو ایک ساتھ متاثر کرتا ہے اور خیالات و اعمال سب پر حاوی ہو جاتا ہے۔ قرآن کی زبان میں مومن وہ شخص ہے جو خدا کا خالص اور وفادار بندہ ہے اور اس کے احکام پر یقین و اعتماد کی ساری کیفیات کے ساتھ اطاعت کا معاہدہ کرتا ہے۔

ہجرت

اب ہجرت کو لیجیے — ہجرت کے معنی ہیں چھوڑنا، ترک تعلق کرنا۔ عام طور پر ہجرت کو ترک وطن کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ یقیناً ہجرت کا لفظ مخصوص طور پر جس واقعہ کے لیے بولا جاتا ہے وہ یہی ہے مگر کسی واقعہ کو اس کے پس منظر سے الگ کر کے سمجھا نہیں جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ترک وطن جو مومن کی زندگی میں پیش آتا ہے یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہوتا بلکہ ایک لمبی تاریخ کا اختتام ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جو مومن کی زندگی میں پہلے دن سے شروع ہوتا ہے اور بالآخر ترک علائق تک پہنچ جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایک شخص پر حق کا انکشاف ہوتا ہے اور وہ اٹھ کر لوگوں کو اس کی طرف بلانا شروع کر دیتا ہے۔ وہ وقت کے خلاف ایک نئی آواز کا علمبردار بن کر گویا یہ اعلان کرتا ہے کہ اس نے ماحول کی بندگی چھوڑ دی ہے اور زمانہ کے خلاف اپنے لیے ایک راہ بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ ہجرت کا آغاز ہے جب

آدمی ناجائز زندگی کو چھوڑ کر جائز زندگی کو اپنانے کا عزم کرتا ہے۔ اس کے بعد ایک مسلسل جدوجہد شروع ہو جاتی ہے جس میں اس کو بہت سی پرانی چیزوں کو چھوڑنا اور بہت سی نئی چیزوں کو اختیار کرنا ہوتا ہے۔ کتنے ہی اپنے لوگوں سے کٹنا اور کتنے ہی غیروں سے جڑنا ہوتا ہے۔ اندر سے باہر تک بے شمار پسندیدہ چیزوں کو ترک کرنا اور اس کے بجائے دوسری ناخوش گوار چیزوں کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح ایمان لانے کے ساتھ ہی مومن کی زندگی میں ہجرت — ایک نیا طرز عمل اختیار کرنے کے لیے بہت سی پرانی چیزوں کو چھوڑنے کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ یہ ہجرت جو اس نے خود کی ہے دوسروں کو بھی اسی کی طرف بلانا شروع کر دیتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں کچھ لوگ اس کا ساتھ دیتے ہیں اور کچھ مخالف بن جاتے ہیں۔ اس طرح ماحول میں دو بالکل مقابل گروہ ابھرنے لگتے ہیں جن میں سے ایک گروہ اس چیز سے چمٹا ہوا رہتا ہے جس کو دوسرا گروہ چھوڑ دینا چاہتا ہے۔

یہ اختلاف صرف اس پہلو سے نہیں ہوتا کہ ایک گروہ دوسرے گروہ پر تنقید کرتا ہے اور اس کے رویہ کو غلط قرار دیتا ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر دونوں کے درمیان ایک عملی کش مکش شروع ہو جاتی ہے انسانی معاشرہ ایک وحدت ہے جس میں کوئی شخص دوسرے تمام لوگوں سے الگ اپنے لیے کوئی راہ نہیں بنا سکتا۔ انسان اپنی عین فطرت کے اعتبار سے سماجی واقع ہوا ہے۔ اس کی تمام ضرورتیں دوسروں سے مل جل کر انجام پاتی ہیں اور اس کو دوسروں کے پھیلائے ہوئے نظریات کے درمیان زندگی بسر کرنی ہوتی ہے۔ کوئی شخص اپنے پسند کیے ہوئے نظریہ کے مطابق زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ جب تک وہ سماج کے تمام اداروں میں اسی نظریہ کو رائج نہ کر لے۔ اس کے بغیر نہ تو وہ مدرسہ میں اپنی مرضی کے مطابق تعلیم حاصل کر سکتا نہ بازار میں اپنی مرضی کے مطابق خرید و فروخت کر سکتا۔ نہ عدالتوں سے اپنے اصول کے مطابق فیصلے لے سکتا۔ حتیٰ کہ وہ یہ بھی نہیں کر سکتا کہ جس چیز کو وہ حلال سمجھتا ہے اسے کھائے اور جو چیزیں اس کے نزدیک حرام ہیں ان کو اپنے حلق کے نیچے اترنے نہ دے۔ اس لیے جب کوئی شخص وقت کے خلاف کسی مسلک کو اختیار کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کا یہ فیصلہ لازمی طور پر ان لوگوں سے ٹکراؤ کا سبب بن جاتا ہے جن کے بنائے ہوئے نظام کے اندر وہ زندگی گزار رہا ہے۔ انسانی معاشرہ کی مثال ایک جال کی سی ہے جس کے تمام افراد حلقوں کی مانند ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک حلقہ کو الگ کرنے کی کوشش پورے جال کو جھنجوڑ دیتی ہے۔ اس طرح ایک مستقل اختلاف شروع ہو جاتا ہے جو دن بہ دن نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے قدم قدم پر ایک دوسرے سے مزاحمت پیش آتی ہے۔ جس میں برسر اقتدار طبقہ اہل حق کو ستانے اور ان کو ذرائع حیات سے محروم کرنے کی ساری تدبیریں کرتا ہے۔ دونوں طرف سے شدت بڑھتی چلی جاتی ہے ایک طرف مظالم کی شدت۔ دوسری طرف یہ شدت کہ سب کچھ سہیں گے مگر اپنے عزم کو ترک نہیں کریں گے۔ جس چیز کو غلط سمجھ کر ایک بار چھوڑ چکے ہیں اس کی طرف دوبارہ واپس نہیں جائیں گے۔ یہ کش مکش بالآخر ایک ایسے نقطے پر پہنچ جاتی ہے جہاں معاشرہ حق پسندوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے اور یہ فیصلہ

کرتا ہے کہ ان کے وجود کو سرے سے ختم کر دیا جائے ۔ اس وقت اہل حق یہ طے کرتے ہیں کہ اس بستی کو چھوڑ کر زمین کے کسی دوسرے ٹکڑے میں چلے جائیں۔ پہلے انھوں نے غلط خیالات اور حرام معاملات کو ترک کیا تھا۔ اب وہ اپنے مکان، اپنی جائیداد، اپنے عزیزوں۔ غرض ساری متاعِ حیات کو چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ ہجرت کی آخری اور انتہائی شکل ہے۔

اس ہجرت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک مقام کو چھوڑ کر آدمی دوسرے مقام پر چلا گیا۔ بلکہ یہ باطل کو چھوڑ کر حق کی طرف بڑھنا ہے۔ یہ شیطان اور طاغوت کی بندشوں سے نکل کر خدا کی طرف بھاگنا ہے۔ چنانچہ قرآن و حدیث میں مومنین کی ہجرت کو "ہجرت الی اللہ" کہا گیا ہے۔ یعنی خدا کی طرف ہجرت۔ ایسا کیوں ہے ؟ ظاہر ہے کہ یہ لوگ زمین کو چھوڑ کر آسمان پر نہیں چلے جاتے بلکہ اسی دنیا میں رہتے ہیں۔ ایسا کہنے کی وجہ یہ ہے کہ چھوڑنے کا یہ عمل خدا پرستی کے نتیجہ میں ہوتا ہے۔ خدا کی طرف ہجرت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی راہ میں جو کچھ مانع آئے، جو چیز بھی اس کی طرف بڑھنے میں رکاوٹ بنے اس کو چھوڑ دینا۔ یہ خدا پرستانہ زندگی کی بنیاد ہے جب تک آدمی اس ہجرت کے لیے تیار نہ ہو وہ ایمان کے تقاضے پورے نہیں کر سکتا۔ اپنی زندگی کو اسلامی زندگی بنانے میں وہی کامیاب ہو سکتا ہے جو اس قربانی کے لیے تیار ہو۔ جب وہ دیکھے کہ اس کے اندر ایسے افکار اور رجحانات پرورش پا رہے ہیں جو خدا کی مرضی کے خلاف ہیں تو انھیں کھرچ کر نکال دے۔ اگر وہ غلط اعمال میں مبتلا ہو تو انھیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے۔ کسی کا تعلق دین کی طرف کھل کر آنے میں رکاوٹ بن رہا ہو تو ایسے تعلق کو خیرباد کہہ دے۔ کسی معیارِ زندگی کو برقرار رکھنے کا مسئلہ دین کے کام میں اپنا حصہ ادا کرنے کا موقع نہ دیتا ہو تو ایسے معیارِ زندگی کو دفن کر دے۔ دین کے تقاضے پورے کرنے میں معاشی خوشحالی کو خطرہ لاحق ہو تو اس کو گوارا کر لے۔ اپنے آپ کو خدمتِ دین کے لیے وقف کرنے میں اپنا اور بچوں کا مستقبل تاریک نظر آتا ہو تو اس کی پرواہ کیے بغیر آگے بڑھ جائے۔ غرض ہر بار جب آدمی کسی ایسی حالت میں مبتلا ہو کہ ایک طرف خدا بلا رہا ہو اور دوسری طرف کوئی دوسرا تقاضا آدمی کو کھینچ رہا ہو تو دوسرے تقاضوں کو چھوڑ کر خدا کی طرف بڑھ جانا ۔ اسی کا نام ہجرت الی اللہ ہے۔

اس ہجرت کے بہت سے مراحل اور اس کی بے شمار قسمیں ہیں مگر اس کی حقیقت سمجھنے کے لیے ہم اس کو دو بڑے عنوانات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک ناجائز اور حرام چیزوں کو چھوڑنا اور دوسرے ان چیزوں کو چھوڑنا جو فی نفسہٖ قابلِ اجتناب نہیں ہیں ۔ مگر دین کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں ایسے مراحل آتے ہیں کہ مومن کو ان سے بھی دست بردار ہونا پڑتا ہے۔

ہجرت کی پہلی قسم میں خیالات اور اعمال کی وہ پوری فہرست آتی ہے جس کو اللہ تعالے نے حرام اور قابلِ ترک قرار دیا ہے ہر آدمی کسی ماحول میں پیدا ہوتا ہے ماحول نام ہے تاریخ، روایات، عادات اور چال چلن کے ایک مخصوص ڈھانچہ کا۔ یہ افکار و اعمال کا ایک نظام ہے جو زندگی کے تمام گوشوں پر چھایا ہوا

رہتا ہے۔ جس طرح زمین کے گولے کے گرد ہوا کا ایک غیر مرئی غلاف ہے جس میں ہم سب لوگ ڈوبے ہوئے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ہر پیدا ہونے والا اپنے وقت کے ماحول میں ڈوبا ہوا پیدا ہوتا ہے۔ اسی کے اندر اس کی نشو و نما ہوتی ہے۔ ماحول کے افکار اور روایات اس کی رگ رگ میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ اور اکثر اوقات ان کے خلاف سوچنا اس کے لیے دشوار ہو جاتا ہے جب آدمی پر حق کا انکشاف ہوتا ہے تو سب سے پہلے اس "دین آباء" کو چھوڑنے کا مرحلہ سامنے آتا ہے۔ اس کو ان تمام غلط اثرات کو کھرچ کر اپنے اندر سے نکال دینا ہوتا ہے جو ماحول کے اثر سے اس نے قبول کر رکھے تھے۔ پھر ہر آدمی کے اندر ایک نفس ہوتا ہے، یہ نفس ہر لذتوں کو ڈھونڈتا ہے۔ اس کے نزدیک کسی چیز کو پسند یا ناپسند کرنے کا معیار یہ نہیں ہے کہ وہ صحیح ہے یا غلط، اچھی ہے یا بری۔ بلکہ اس کے نزدیک پسندیدگی کا معیار صرف یہ ہے کہ وہ اسے اچھی لگتی ہے اور اس کے ذریعے سے اس کو فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ آدمی اپنی جاہلی زندگی میں بہت سی ایسی دلچسپیاں اور مشغولیتوں کو اپنے اندر جمع کر لیتا ہے جو اگرچہ غلط ہیں مگر اس کے نفس کو پسند آتے ہیں اسی طرح وہ بہت سی ایسی ذمہ داریوں کو بھلا دیتا ہے اور انھیں ترک کر دیتا ہے جو اگرچہ اخلاقاً اس کے لیے ضروری ہیں۔ مگر اس کے نفس کو پسند نہیں آتیں۔ اس لیے جب کوئی شخص ایمان لاتا ہے تو اس کو اپنی زندگی میں شکست و ریخت کا ایک مستقل عمل جاری کرنا پڑتا ہے، بہت سی چیزیں جو اس کو پچھلی زندگی میں نہایت عزیز تھیں انھیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیتا ہے، اور بہت سی چیزیں جن سے اسے نفرت تھی، جن سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی، ان کو اپنی زندگی میں شامل کرنا ہوتا ہے، اس طرح ایمان لانے کے بعد غلط جذبات، غلط تعلقات، اور غلط اعمال سے جدائی کی ایک مستقل مہم شروع ہو جاتی ہے زندگی کے تمام معاملات میں ناجائز طریقوں سے بچنے کا ایک پیہم عمل کرنا ہوتا ہے جو موت کی آخری گھڑی تک جاری رہتا ہے یہ ہجرت کی پہلی اور ابتدائی قسم ہے جو ماضی کے غلط عادات واطوار سے اپنے کو پاک کرنے اور آئندہ اس طرح کی کوئی چیز قبول نہ کرنے کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس ہجرت کا ذکر قرآن میں سورہ مدثر میں کیا گیا ہے جو نبوت کے بالکل ابتدائی زمانے کی سورہ ہے۔ فرمایا

وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (مدثر۔ ۵) گندگی سے ہجرت کر یعنی خیال اور عمل کی تمام برائیوں کو چھوڑ دے

یہی بات آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مندرجہ ذیل الفاظ میں واضح فرمائی ہے۔

اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللّٰهُ عَنْهُ۔ مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ نے منع کیا ہے۔

یہ ہجرت الی اللہ کا ایک پہلو ہے جس میں آدمی کو تمام ناجائز چیزیں چھوڑ دینی ہوتی ہیں۔ خدا کی مرضی کے مطابق بننے کے لیے ان چیزوں سے اپنے کو پاک کرنا ہوتا ہے جو خدا کی مرضی کے خلاف ہیں۔ اس کا دوسرا پہلو وہ ہے جس میں آدمی مجبور ہوتا ہے کہ اپنے جائز مفادات بھی خدا کی راہ میں قربان کر دے۔ ایسا اس لیے ہے کہ اسلام آدمی کو کرنے کا اتنا بڑا کام دے دیتا ہے کہ اس کے بعد پھر اسے کچھ اور کرنے کا موقع باقی نہیں رہتا۔ اس کی توجہات اپنی ذات سے ہٹ کر ہمہ تن اسلام کی طرف لگ جاتی ہیں۔ اسی

لیے کہا گیا ہے کہ دنیا کے اندر مومن کی صرف ذمہ داریاں ہیں۔ یہاں اس کا کوئی حق نہیں ہے اس کا جو کچھ حق ہے وہ خدا کے یہاں ہے اور وہیں وہ اسے پائے گا۔

اسلام کو قبول کرنے کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی زندگی میں اس کو اختیار کرلے۔ بلکہ عین اسی کے ساتھ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ دوسروں کو اس کی طرف بلائے اور پورے معاشرہ میں اس کو قائم کرنے کی جدوجہد کرے۔ دین کا یہ دوسرا تقاضا ہماری ذمہ داری کو صرف دگنا نہیں کرتا بلکہ اس کو انتہائی حد تک دشوار بنا دیتا ہے۔ اگرچہ انفرادی زندگی میں ممکن حد تک دین کو اختیار کرنا بھی کچھ آسان کام نہیں ہے۔ یہ فتنوں سے بھری ہوئی دنیا میں اپنے اختیار اور اپنے ارادہ کو صرف صحیح سمت میں استعمال کرنا ہے۔ یہ خود مختار ہوکر اپنی مرضی سے اپنے آپ کو پابند بنا لینا ہے اور موت کی آخری گھڑی تک پابند بنائے رکھنا ہے۔ مگر دین کا دوسرا تقاضا — یعنی دوسرے بندگانِ خدا تک خدا کے پیغام کو پہونچانا اور اس کے دین کو عملاً زمین کے اوپر رائج کرنے کی جدوجہد کرنا — یہ اتنا گراں بار تقاضا ہے کہ اس کا تصور بھی آدمی کو لرزا دینے کے لیے کافی ہے۔ یہ ایک ایسا عظیم اور جاں گسل کام ہے جو اس کی ساری قوت اور اس کا سب کچھ مانگتا ہے۔ دعوتِ حق اور اشاعتِ دین کے علاوہ کسی کام میں وہ جتنا وقت اور قوت بھی صرف کرے گا اس کے معنی یہ ہیں کہ اسی کے بقدر وہ اصل فریضہ کی ادائیگی میں کمی کر رہا ہے۔

آدمی جب اس حیثیت سے دین کو قبول کرتا ہے تو وہ فوراً محسوس کرتا ہے کہ اس کام میں اپنا حصہ ادا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ میں اور کچھ نہ کروں۔ وہ اپنے لیے اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں پاتا کہ اپنی ضرورتوں کو انتہائی حد تک مختصر کردے۔ دنیا کے اندر اپنی تمناؤں کو ہمیشہ کے لیے دفن کردے اور اپنی ذات کے لیے کم سے مصروف رہ کر حق کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دے۔ وہ مجبور ہوتا ہے کہ بالکل ناگزیر ضروریات کی فراہمی کے بعد جو وقت بھی ملے اس کو شہادتِ دین کی راہ میں لگا دے۔ دوسرے لفظوں میں اسلام کو اپنی انفرادی زندگی میں اختیار کرنا ہو تو صرف حرام چیزوں کو چھوڑ کر بھی کوئی شخص "دیندار" بن سکتا ہے مگر اسلام کو اجتماعی زندگی میں اختیار کرنے کی مہم شروع کیجیے تو آپ کو بہت سی حلال چیزوں سے بھی دستبردار ہونا پڑے گا۔ اس کے بغیر صحیح طور پر اس کام کی ابتدا بھی نہیں کی جا سکتی۔ اس کو انجام تک پہنچانا تو بہت دور کی بات ہے۔

پہلی صورت میں آدمی کے اوپر صرف اس کی اپنی ذمہ داری ہوتی ہے اور دوسری صورت میں وہ ساری خلق تک پیغامِ حق پہنچانے کا ذمہ دار بن جاتا ہے۔ یہ چیز آپ کی مصروفیتوں اور دقتوں میں بے پناہ اضافہ کردیتی ہے اس کا تقاضا ہے کہ آپ اسلام کے برحق ہونے اور اس کے سوا دوسرے تمام افکار و نظریات کے ناحق ہونے کا بے پناہ یقین پیدا کریں تاکہ آپ اس کے پرجوش مبلغ بن سکیں۔ آپ کو اسلام کا تفصیلی علم حاصل کرنا ہے تاکہ دوسروں کے سامنے اس کو واضح انداز میں پیش کرسکیں۔ آپ کو ان غلط افکار و نظریات کے خلاف دلائل فراہم

لرنے ہیں جنھوں نے انسانی ذہنوں کو متاثر کر رکھا ہے تاکہ باطل کو چھوڑ کر لوگوں کو حق کی طرف آنے پر آمادہ کیا جا سکے۔ آپ کو ایک ایک شخص تک پہنچنا ہے اور اس کی نفسیات، اس کے حالات اور اس کی قوتِ فہم کے مطابق اسے بات سمجھانی ہے۔ آپ کو اسلامی اخلاق کا نہایت اعلیٰ نمونہ بننا ہے تاکہ آپ کی زندگی آپ کے دعوے کی تردید کرنے والی نہ ہو بلکہ اس کی صداقت پر گواہ ہو۔ غرض فرائض کی ایک عظیم فہرست ہے جو آپ سے آپ کی پوری عمر اور آپ کا پورا اثاثہ مانگتی ہے۔ پھر ایسے فرض کو ادا کرنے کی ذمہ داری اوڑھنے کے بعد کسی دوسری چیز میں دلچسپی لینے کا موقع کہاں باقی رہتا ہے۔

یہ ہجرت کی دوسری قسم ہے یعنی دین کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اپنی ذات کے تقاضوں کو چھوڑ دینا جب دین کی ضروریات اور اپنی ضروریات میں ٹکراؤ ہو، جب دین کا کام آپ سے آپ کا پورا وقت اور آپ کی ساری صلاحیتیں مانگتا ہو۔ جب دین کا تقاضا یہ ہو کہ آپ اپنی خوشی اپنا آرام اور اپنے عزیز و اقارب تک کو چھوڑ کر اس کی طرف بڑھیں تو آپ اپنا سب کچھ اس کے لیے قربان کر دیں اور کوئی چیز بھی ایسی نہ ہو جس کا تعلق آپ کو دین کی طرف جانے میں روک بن جائے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو مندرجہ ذیل آیت میں بیان کی گئی ہے۔ مومن، مہاجر اور مجاہد فی سبیل اللہ کے بلند درجات کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

(توبہ — ۲۴)

اے نبی کہہ دو، اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں اور تمہاری برادری کے لوگ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تجارت جس کے ماند پڑنے کا تمہیں ڈر لگا رہتا ہے اور مکانات جو تم کو پسند ہیں اگر یہ تم کو خدا اور رسول سے زیادہ محبوب ہیں اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے کے مقابلہ میں تم کو ان چیزوں سے زیادہ شیفتگی ہے تو انتظار کرو، یہاں تک کہ خدا کا فیصلہ آجائے اور اللہ فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

اس آیت میں جن چیزوں کا ذکر ہے وہ سب کی سب اصلاً جائز ہیں اور ان میں سے کوئی بھی فی نفسہ حرام نہیں ہے۔ مگر مومنین سے کہا گیا ہے کہ ان سب کو چھوڑ کر خدا کی طرف بڑھیں اور جو لوگ ایسا نہ کریں وہ فاسق (یعنی عہد شکن) قرار دیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مطالبہ ہمارے پیش رو حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے کیا تھا جنھوں نے نبی آخر الزماں کے ذریعہ اپنے رب سے یہ عہد کیا تھا کہ وہ دین کو سربلند کرنے کی جدوجہد میں اپنی ساری قوت لگا دیں گے۔ جب صحابۂ کرام کے اس عہد پر بیس سال کی مدت گزر گئی اور انھوں نے مسلسل قربانیوں کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا کہ وہ دین کی خاطر اپنا سب کچھ چھوڑنے کے لیے تیار ہیں تو غزوہ تبوک سے واپسی کے بعد ۹ھ میں اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل الفاظ میں ان کی کوششوں کی قبولیت کا اعلان فرمایا:-

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا فِی التَّوْرٰاۃِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ وَمَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ مِنَ اللّٰہِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِہٖ وَذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ہ

(توبہ ــــــ ۱۱۱)

اللہ نے مومنین سے ان کی جانوں اور مالوں کو خرید لیا ہے اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنت ہے وہ اللہ کی راہ میں لڑتے رہے ہیں، پھر مارتے رہے ہیں اور مارے جاتے رہے ہیں۔ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے، تورات میں انجیل میں اور قرآن میں اور اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے۔ بس خوش ہو جاؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے اللہ سے کیا ہے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔

یہ ہجرت یا دوسرے لفظوں میں جائز مفادات کی قربانی انسان کی خدا پرستی کا امتحان بھی ہے اور اسی کے ذریعہ سے خدا کا دین بھی خدا کی زمین پر قائم ہوتا ہے۔ یہ اعلاء کلمۃ اللہ کی جدوجہد کا لازمہ ہے۔ جو لوگ اس کام میں حصہ لینے کے لیے آگے بڑھیں، مگر ان کا حال یہ ہو کہ وہ دنیا میں اپنا مقام محفوظ کر لینے کے بعد آخرت کا کام کرنا چاہتے ہوں، جو اپنے معیار زندگی کو گھٹانے پر تیار نہ ہوں، جو اپنے بچوں کے مستقبل کو خطرے میں ڈالنا گوارا نہ کریں، جو دنیوی زندگی میں اپنی تمناؤں اور خواہشوں کو قربان نہ کریں، جو یہ نہ سوچیں کہ اپنی معاشی مصروفیات میں کمی کر کے دین کی خدمت کے لیے اور زیادہ وقت نکالنا چاہیے بلکہ اس کے برعکس جو ہمیشہ یہ سوچتے ہوں کہ کس طرح اور کوئی بڑا کام مل جائے تاکہ اپنے بڑھتے ہوئے اخراجات کو پورا کیا جا سکے۔ مختصر یہ کہ جن کے اندر اتنا حوصلہ نہ ہو کہ وہ آج کے فائدے پر کل کے فائدے کو ترجیح دے سکیں۔ ایسے لوگوں نے کبھی تاریخ میں دین کو سربلند نہیں کیا ہے اور جب تک یہ زمین و آسمان قائم ہیں آئندہ بھی ایسے لوگوں کے ہاتھوں یہ کام نہیں ہو سکتا۔

جہاد

اب جہاد کو لیجیے۔ جہاد کے معنی ہیں کسی چیز کے لیے اپنی آخری کوشش صرف کرنا۔ اتنی کوشش کرنا کہ آدمی تھک جائے۔ ہجرت کی طرح یہ جہاد بھی کسی وقتی کارروائی کا نام نہیں ہے بلکہ ایک ایسا عمل ہے جس کا تعلق ساری زندگی سے ہے۔ جہاد صرف میدان جنگ میں نہیں ہوتا بلکہ ایمان لانے کے بعد ہی سے اس کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور زندگی کے آخر لمحات تک جاری رہتا ہے۔ ایک غیر اسلامی معاشرہ میں جہاد کی مثال بالکل ویسی ہی ہے جیسی مارکس کے جدلیاتی فلسفہ میں ایک نظام کے اندر اس کے ضد کی ہوتی ہے۔ یہ ایک زبردست چیلنج ہے جو کسی نظام کے اندر اس کے عدو کی حیثیت سے ظاہر ہوتا ہے۔ جاہلی معاشرہ میں کسی کا اسلام قبول کرنا دراصل وقت کے خلاف فیصلہ کرنا ہے۔ یہ فیصلہ اگر صحیح شعور اور مکمل عزم کے ساتھ ہو تو بالکل لازمی نتیجہ کے طور پر معاشرہ کے ہر فرد اور اس کے تمام اداروں سے اس کا ٹکراؤ شروع ہو جاتا ہے۔ ایک طرف وقت کا معاشرہ ہوتا ہے جو اپنے تمام نظری اور عملی پہلوؤں کے اعتبار سے زندگی کے تمام شعبوں پر چھایا ہوا ہوتا ہے دوسری طرف یہ صاحب ایمان ہوتا ہے جو اس سے مختلف ایک اور ہی طرز زندگی کو اپنے گرد و پیش کی دنیا میں دیکھنا چاہتا ہے۔ ماحول کے ساتھ اس کا یہ اختلاف اس کو ایک

ایسی تیز گیس کی مانند بنا دیتا ہے جو کسی محدود خول کے اندر بند ہو اور ہر آن اس سے نکلنے کے لیے بے قرار ہو۔ یہ کش مکش اور جدوجہد کا عمل آدمی کے اپنے نفس سے شروع ہوتا ہے اور تمدن کے مختلف گوشوں میں پھیلتا ہوا ہر اس معاملہ تک پہنچ جاتا ہے جس کا تعلق انسانی زندگی سے ہو۔ یہ عمل مسلسل جاری رہتا ہے اور دن بہ دن تیز سے تیز تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے جب یہ کش مکش اپنے آخری نقطے پر پہنچ جاتی ہے۔ باطل کا بند ٹوٹ جاتا ہے اور جاہلی نظام شکست کھا کر اسلام کے لیے جگہ خالی کر دیتا ہے۔

جہاد کی اصل حقیقت خدا کی راہ میں چلنے کے لیے اپنے آپ کو تھکانا ہے۔ قرآن میں خدا کے دین کو "نجد" کہا گیا ہے جس کے معنی بلند مقام کے ہیں اور اس دین پر عمل کرنے کو اونچائی پر چڑھنے سے تشبیہ دی گئی ہے (بلد-۱۰-۱۱) اس مثال سے ہم جہاد کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔ دنیا میں زندگی گزارنے کی صرف دو راہیں ہیں۔ ایک نفس کی خواہش کے مطابق اور دوسری خدا کی مرضی کے مطابق۔ ایک غیر ذمہ دارانہ زندگی ہے اور دوسری ذمہ دارانہ زندگی۔ پہلی راہ بے حد آسان ہے اور دوسری راہ بے حد دشوار۔ پہلی صورت میں اوپر سے نیچے آنا ہوتا ہے اور دوسری صورت میں نیچے سے اوپر جانا۔ گاڑی کو ڈھلوان راستے پر چھوڑ دیجیے تو وہ خود بخود لڑھکتی چلی جائے گی۔ اس کے لیے کسی غیر معمولی کوشش کی ضرورت نہیں ہوگی۔ لیکن اگر اسی گاڑی کو کسی بلندی پر چڑھانا ہو تو مسلسل محنت کی ضرورت ہے۔ ایک تھکا دینے والی مشقت کے بغیر کوئی شخص اپنی گاڑی کو نیچے سے اوپر نہیں لے جا سکتا۔ یہی عمل جب وقت اور خواہش کے خلاف اپنی زندگی کو خدا کی طرف لے جانے کے لیے کیا جائے تو اس کو ہم جہاد کہتے ہیں۔

انسان جب یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ خدا کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرے گا، تو اس کو فوراً معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دو ایسی طاقتیں ہیں جو اس کے اس ارادہ کی راہ میں زبردست رکاوٹ ہیں۔ ایک خود اس کا اپنا نفس، دوسرے طاغوت۔ نفس سے مراد انسان کا یہ جذبہ ہے کہ وہ ہر حال میں اپنے لیے لذّت اور آرام کو پسند کرتا ہے۔ اس کو ہمیشہ آسانی کی تلاش رہتی ہے وہ عزّت اور برتری حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے بلکہ جدھر اس کا جی چاہتا ہے اس طرف نکل جاتا ہے۔ یہ جذبہ اس کو اکساتا ہے کہ ہر وہ کام کرے جس سے اس کی ان خواہشوں کو تسکین ملتی ہو اور ایسا کوئی کام نہ کرے جس سے اس کی ان خواہشوں پر ضرب پڑے۔ اور طاغوت سے مراد خارج کا وہ غلط اقتدار ہے جو ماحول کی روایات، وقت کے نظریات اور عوام الناس کی خواہشوں کی صورت میں آدمی کے اوپر دباؤ ڈالتا ہے۔ یہ طاغوت افراد کی زندگی میں متکبرانہ روش کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور اجتماعی زندگی میں غیر خدائی اقتدار کی صورت میں۔ یہ خارجی قوتیں براہ راست بھی مزاحمت کرتی ہیں اور بالواسطہ بھی۔ بالواسطہ اس طرح کہ سوسائٹی پر عملاً قابض ہونے کی وجہ سے زندگی کے تمام گوشوں میں انھیں کے نظریات پھیل جاتے ہیں۔ انسان کے لیے اس کے سوا کوئی شکل نہیں ہوتی کہ ان کو مانے اور اپنے آپ کو ان سے ملوث کرے، اس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور براہ راست اس لیے کہ اس طرح کے ایک ماحول میں حق پر چلنے کا ارادہ ان قوتوں

کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے وہ رائج الوقت نظام کے لیے موت کی پیشین گوئی ہے۔ اس لیے جو لوگ اس قسم کا ارادہ لے کر اٹھتے ہیں وہ ان کو روکنے اور ان کو کچل دینے کے لیے اپنا پورا زور صرف کرتی ہیں اور اپنے دائرہ میں ان کو زندگی کے مواقع سے محروم کر کے رکھ دیتی ہیں۔

ان حالات میں جب کوئی شخص خدا کی طرف بڑھتا ہے تو اس کو اپنے اندر سے لے کر باہر تک خیالات سے لے کر عمل کی دنیا تک قدم قدم پر بےشمار رکاوٹوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ کہیں آرام کے مقابلہ میں تکلیف گوارا کرنا ہوتا ہے، کہیں ایک لذیذ رجحان کو چھوڑنے اور ایک خشک عقیدہ کو قبول کرنے کے لیے کش مکش کرنی پڑتی ہے کہیں ملتے ہوئے ناجائز فائدوں کے ڈھیر کے بجائے ایک حقیر حاصل پر آمادہ ہونے کے لیے اپنے آپ سے زبردستی کرنی پڑتی ہے۔ کہیں عزت اور ناموری کے بجائے گمنامی اور ذلت پر قانع ہونے کے لیے مجاہدہ کرنا ہوتا ہے۔ کہیں اپنے جائز حقوق اور اپنے واقعی مفادات سے محرومی پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ غرض اس کے سامنے دو مختلف راہیں کھلی ہوتی ہیں اور اس کو پورا اختیار ہوتا ہے کہ جدھر چاہے چلا جائے۔ ایک طرف جانے میں دنیا کی ہر چیز ملتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور دوسری طرف جانے میں بظاہر کچھ بھی ملتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ اس کا نفس مجبور کرتا ہے کہ آسان راستہ کی طرف جائے۔ خارجی قوتیں اس مقصد کے لیے اپنا پورا وزن اس کے اوپر ڈال دیتی ہیں۔ مگر وہ ان ساری مزاحمتوں کے باوجود آسان اور پرلطف راستے کو چھوڑ دیتا ہے اور کھینچ کر اپنے کو مشکل راستہ کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی کش مکش کا نام جہاد ہے۔

جس چیز کو ہم اجتماعی انقلاب کہتے ہیں وہ بھی اسی کش مکش کا ایک قدرتی نتیجہ ہے جس کے بعد ماحول پر اسلام کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اجتماعی انقلاب برپا کرنا اسلام کا اصل مقصود ہے۔ کوئی کہتا ہے یہ مقصد نہیں بلکہ ذریعہ ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک مسلسل عمل کا آخری انجام ہے۔ اسلام کے مطابق جینے اور مرنے کا ارادہ جو ابتداً قلب کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ وہ جب عمل کی صورت اختیار کرتا ہے اور ذہن سے نکل کر ماحول میں پھیلنا شروع ہوتا ہے تو اسی پھیلاؤ کے ایک مخصوص دائرہ کو ہم اجتماعی انقلاب کہتے ہیں۔ انقلاب کو مصنوعی درخت کی طرح اگایا نہیں جا سکتا اور نہ اس کو بوریوں میں بھر کر کہیں باہر سے لایا جاتا ہے بلکہ وہ ایک عمل کے طبعی نتیجہ کے طور پر خود اپنی زمین سے ابھرتا ہے۔ جس طرح انڈے کے اندر ایک زندہ بچہ کا وجود یہ معنی رکھتا ہے کہ ایک روز اوپر کا خول ٹوٹ جائے اور جیتا جاگتا بچہ اس کے باہر آ جائے۔ ٹھیک اسی طرح مخالف ماحول کے اندر ایک اسلامی گروہ کی موجودگی اس کے لیے موت کا حکم رکھتی ہے۔ اگر یہ گروہ اپنے ایمان میں مخلص ہے اور عقیدہ کو عمل کی شکل دینے کا سچا عزم رکھتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ہر آن باطل کی دیوار کو متزلزل کر رہا ہے۔ ایسا ایک گروہ لازمی طور پر دیوار کو توڑ دے گا۔ وہ اس کے اندر نہیں ٹھہر سکتا۔

جہاد ہر اس رکاوٹ سے لڑنے اور اس سے کش مکش کرنے کا نام ہے جو دین پر عمل کرنے کے سلسلے میں پیش آئے اور چونکہ یہ رکاوٹ انسان کے اندر سے بھی ہوتی ہے اور باہر سے بھی۔ اس لیے جہاد میں آدمی کبھی خود

اپنے نفس کے بالمقابل ہوتا ہے اور کبھی خارجی دنیا سے کش کش کرتا ہے۔ اس کو کبھی خود اپنی خواہشوں سے لڑنا ہوتا ہے، کبھی زبان سے دوسروں کے طرز عمل پر گرفت کرنی ہوتی ہے اور کبھی ہاتھ کی قوت سے راہ حق کی رکاوٹوں کو دور کرنا ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

جَاهِدُوا اَهْوَاءَكُمْ كَمَا تُجَاهِدُوْنَ اَعْدَاءَكُمْ (مفردات امام راغب)

اپنی خواہشوں سے جہاد کرو جس طرح تم اپنے دشمنوں سے جہاد کرتے ہو۔

مگر جہاد اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے صرف کسی ظاہری عمل کا نام نہیں ہے بلکہ اس مخصوص کیفیت کا نام ہے جو کسی عمل کے ذریعہ پیدا کی جاتی ہے۔ ظاہری شکلیں اسی کیفیت جہاد کو پیدا کرنے کے لیے ہیں نہ کہ خود ان ظاہری شکلوں کا نام جہاد ہے۔ ایک شخص رات دن کی کوشش سے اسلام پر ایک اعلیٰ درجہ کی کتاب لکھتا ہے۔ بظاہر یہ جہاد کی ایک شکل ہے، لیکن اس کا مقصد اگر یہ ہے کہ اس کتاب سے اس کی شہرت ہوگی یا اس کو مالی فوائد حاصل ہوں گے تو اس کے اس عمل کی کوئی قیمت نہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں وہ جہاد کہے جانے کا مستحق نہیں ہے۔ اس کے برعکس کوئی نیک کام کرتے ہوئے جب اس کے دل میں ایک غلط خیال گزرتا ہے اور اس تصور سے وہ کانپ اٹھتا ہے کہ اس طرح اس کا سارا کیا کرایا مٹی ہو جائے گا، اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں اور بے اختیار وہ کہہ اٹھتا ہے کہ — "خدایا! مجھے شیطان کے حوالے نہ کر ورنہ میں تباہ ہو جاؤں گا" — تو یہ جہاد ہے۔

یہ بات صرف جہاد ہی سے متعلق نہیں ہے بلکہ دوسری عبادات کا بھی یہی معاملہ ہے۔ دین میں جو کام بھی کرنے کے لیے بتائے گئے ہیں وہ محض اپنی شکل کے اعتبار سے مطلوب نہیں ہیں۔ بلکہ حقیقت کے اعتبار سے مطلوب ہیں۔ جن اذکار اور دعاؤں کی فضیلت بیان کی گئی ہے جن عبادات کے ادا کرنے کو فرض قرار دیا گیا ہے، جن اخلاق و اعمال کو یہ اہمیت دی گئی ہے کہ ان کو اختیار کیے بغیر سرے سے دعوئے ایمان ہی معتبر نہیں ہوتا۔ ان سب کا مطلب دراصل یہ بتانا ہے کہ خدا پرستانہ زندگی کے مظاہر کیا ہوتے ہیں نہ یہ کہ کن مظاہر کا نام خدا پرستی ہے۔ اصل میں خدا کو جو چیز مطلوب ہے وہ یہ نہیں ہے کہ زبان سے اس کے لیے چند تعریفی کلمات کا ورد کر لیا جائے، نماز روزہ اور حج کے نام پر کچھ مخصوص عباداتی افعال انجام دیدیے جائیں۔ مال میں سے ایک مقررہ حصہ نکال کر غریبوں میں بانٹ دیا جائے۔ یا زبان و قلم کے ذریعہ سے خدا کے دین کی تبلیغ کر دی جائے۔ بے شک یہی وہ اعمال ہیں جو خدا پرستانہ زندگی کے لیے لازمی پروگرام کی حیثیت رکھتے ہیں اور خدا پر ایمان جب بھی انسانی زندگی میں ظہور کرے گا وہ انہی شکلوں میں ظہور کرے گا۔ ان کے ظاہر ہونے کا کوئی اور قالب اللہ تعالیٰ نے نہیں بنایا ہے۔ مگر ان خارجی شکلوں کے پیچھے وہ اصل چیز جو خدا کو مطلوب ہے اور جس کی موجودگی کسی آدمی کو اس بات کا مستحق بناتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اسے حاصل ہوں، وہ دراصل دل کی یہ اندرونی کیفیت ہے کہ آدمی کے جذبات و خیالات بالکل خدا کی مرضی کے تابع ہو جائیں۔ اس کو وہی چیز پسند ہو جس کو خدا پسند کرتا ہے اور وہی چیز ناپسند ہو جس کو خدا ناپسند کرتا ہے۔ جو چیز خدا کی مرضی کے خلاف ہو اس کا وہ دشمن بن جائے اور جو چیز خدا کو محبوب ہو اس کو حاصل کرنے کے لیے وہ اپنا

آخری سرمایہ تک قربان کردے۔

قرآن کی اسی بتائی ہوئی زندگی کو پورا کرنے یا نہ کرنے پر ہمارے مستقبل کا انحصار ہے۔ ایک شخص جو اس حقیقت کو جان چکا ہو کہ اس دنیا کا ایک خدا ہے، اور پھر جو اس واقعہ پر بھی ایمان لایا ہو کہ آخرت کا ایک عظیم دن آنے والا ہے جب پوری نسل انسانی خدا کی عدالت میں کھڑی کی جائے گی۔ اس کی خواہش اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ قیامت کے اس ہولناک دن، جب وہ مالک کائنات کے سامنے کھڑا ہو تو اس کے بارہ میں اللہ تعالےٰ یہ کہہ دے کہ یہ میرا بندہ ہے جو دنیا کی زندگی میں میرا وفادار رہا۔ مگر یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ مقام کسی کو محض خواہش کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی معمولی حکومتوں کا یہ حال ہے کہ وہ کسی کو وفاداری کا سرٹیفکٹ صرف اس وقت دیتی ہیں جب کہ وہ اس کا دین، اخلاق اور ضمیر سب کچھ اس سے خرید لیتی ہیں۔ پھر خدا جو تمام حاکموں کا حاکم ہے، جو بے حد غیرت مند ہے جو اپنی خدائی میں کسی کی معمولی شرکت بھی گوارا نہیں کرتا، وہ کیا محض دل کی ایک خواہش یا زبان کی حرکت سے خوش ہو جائے گا اور کسی کو محض اس بنا پر وفاداری کا اعزاز بخش دے گا کہ وہ ایسا چاہتا ہے، خواہ اس نے اپنی وفاداری کو عملاً اس کے لیے خاص کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری تمام وفاداریوں کی طرح خدا کا وفادار بننے کی خواہش بھی ایک عظیم جد وجہد کا تقاضا کرتی ہے۔ دنیا کے اداروں میں کسی کی اہمیت صرف اس وقت تسلیم کی جاتی ہے جب وہ اپنی بہترین صلاحیتیں اس کے لیے وقف کردے۔ ایک دکان اپنے اندر نفع کے امکانات کسی کے اوپر صرف اس وقت ظاہر کرتی ہے جب آدمی اپنا سب کچھ اسے دے دیتا ہے۔ حکومتوں کے نزدیک کوئی شخص صرف اسی وقت اعتماد اور احترام کا مستحق بنتا ہے جب وہ اپنے آپ کو پوری طرح اس کی نذر کر چکا ہو۔ ٹھیک اسی طرح اللہ تعالےٰ کے یہاں بھی وفاداری کا مقام صرف اسے حاصل ہوتا ہے جو اپنی قربانیوں کے ذریعہ اس کا استحقاق ثابت کردے ۔۔۔ شرک نہ دنیا کے معبودوں کو پسند ہے اور نہ خدا کو۔

اس حقیقت کو سامنے رکھیے اور پھر اس دن کا تصور کیجیے جب ہم اور آپ اور تمام اگلے پچھلے پیدا ہونے والے خدا کے پاس اس حال میں جمع کیے جائیں گے کہ ایک رب العالمین کے سوا سب کی آوازیں پست ہو چکی ہوں گی۔ جس دن آدمی اپنے سوا ہر ایک کو بھول جائے گا۔ خواہ وہ اس کا دوست اور قریب ترین عزیز کیوں نہ ہو۔ جس دن صرف حق بات میں وزن ہوگا اور اس کے سوا تمام چیزیں اپنا وزن کھو چکی ہوں گی۔ جس روز آدمی حسرت کرے گا کہ کاش اس نے ساری عمر صرف آج کی تیاری میں صرف کردی ہوتی۔ یہ فیصلہ کا دن ہوگا۔ ہمارے درمیان اور اس دن کے درمیان صرف موت کا فاصلہ ہے ۔ وہ موت جس کے متعلق کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کب آجائے گی۔ آج جو لمحات ہم گزار رہے ہیں اس کے ہر لمحہ کا انجام ہم کو آئندہ کروروں سال تک بھگتنا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص ایک ایسے انجام کی طرف چلا جا رہا ہے جہاں اس کے لیے یا تو دائمی عیش ہے یا دائمی عذاب۔ زندگی کی مثال ایک ڈھلوان کی ہے جس پر سارے انسان نہایت تیزی کے ساتھ بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ ہر لمحہ جو گزرتا ہے وہ ہم کو اس آخری انجام سے قریب تر کر دیتا ہے جو ہم میں سے ہر ایک کے لیے مقدر ہے۔

ہم کو زندگی کے صرف چند دن حاصل ہیں۔ ایسے چند دن جن کا انجام کروروں اور اربوں سال نہیں بلکہ ابدالآباد تک بھگتنا پڑے گا۔ جس کا آرام بے حد خوش گوار ہے اور جس کی تکلیف بے حد دردناک۔ ہر بار جب سورج غروب ہوتا ہے تو وہ آپ کی عمر میں ایک دن اور کم کر دیتا ہے۔ اس عمر میں جس کے سوا آنے والے ہولناک دن کی تیاری کا اور کوئی موقع نہیں۔ ہماری زندگی کی مثال برف بیچنے والے دوکان دار کی ہے، جس کا اثاثہ ہر لمحہ پگھل کر کم ہوتا جا رہا ہو اور جس کی کامیابی کی شکل صرف یہ ہو کہ وہ وقت گزرنے سے پہلے اپنا سامان بیچ ڈالے ورنہ آخر میں اس کے پاس کچھ بھی نہ ہوگا اور دکان سے اس کو خالی ہاتھ اٹھ کر جانا پڑے گا۔ پھر قبل اس کے کہ موت آکر ہم کو اس دنیا سے جدا کر دے، جہاں صرف کرنا ہے اور اس دنیا میں پہنچا دے جہاں کرنا نہیں بلکہ صرف پانا ہے، ہمارے لیے ضروری ہے کہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا صحیح مصرف سوچ لیں۔ ہم سب کو ایک روز مالک کائنات کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ پھر خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اپنے رب کے پاس اس حال میں پہنچیں کہ دنیا میں وہ حق کے لیے اپنا سب کچھ لٹا چکے تھے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سب سے پہلے انھیں پر نظر کرے گا۔

(تقریر اجتماع جماعت اسلامی ہند بمقام لکھنؤ، یکم مارچ ۱۹۵۸ء)

قرآن کا مطلوب انسان

ایک حدیث ہے کہ — اَلْمُؤمِنُ مِرْاٰۃُ الْمُؤمِنِ — یعنی مومن دوسرے مومن کے لیے آئینہ ہوتا ہے۔ آج کی صحبت میں آپ کے لیے میں یہی بننا چاہتا ہوں۔ اس موقع پر بہترین خدمت جو میری سمجھ میں آئی ہے وہ یہ کہ میں نہایت سادہ اور مختصر طور پر چند ایسی باتیں آپ کے سامنے رکھوں جس میں آپ خود کو بالکل برہنہ دیکھ سکیں۔ اللہ میری اور آپ کی مدد فرمائے۔

ایمان کی علامت کیا ہے۔ اس کی اگر مختصر ترین فہرست بنائی جائے تو شاید وہ دو چیزوں پر مشتمل ہوگی۔ قرآن اور نماز — یہ دو الفاظ دراصل پورے دین کا عنوان ہیں۔ ایک نظری حیثیت سے سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور دوسرا عملی پہلو سے۔ اسی نے دراصل خدا کو پایا ہے جس نے قرآن اور نماز کو پایا ہے۔ یہ دونوں چیزیں اگر آپ کی زندگی میں شامل ہوگئی ہوں تو سمجھیے کہ ایمان اور اسلام آپ کی زندگی میں شامل ہوگیا ہے اور اگر آپ کی زندگی ان سے خالی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ ابھی تک ایمان اور اسلام سے محروم ہیں۔

ان دونوں چیزوں کی بنیادی اہمیت خود قرآن سے ثابت ہے، جیسا کہ فرمایا:

وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ۝ (اعراف - ۱۷۰)

جو لوگ خدا کی کتاب کو مضبوط پکڑ لیتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، ہم ایسے مصلحین کا اجر ضائع نہیں کریں گے۔

گویا مصلح صرف وہ ہے جو قرآن اور نماز کو اپنی زندگی میں شامل کر چکا ہو۔ ایسے ہی لوگوں کی کوششیں خدا کی نظر میں "اصلاح" کی حیثیت رکھتی ہیں اور انھیں کے عمل کو اللہ تعالیٰ دنیا میں برومند کرے گا اور آخرت میں اپنے انعام سے سرفراز فرمائے گا۔ دوسرے مقام پر یہی چیز حکم کے انداز میں کہی گئی ہے:

اُتْلُ مَاۤ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ (عنکبوت - ۴۵)

کتاب الٰہی کا جو حصہ تمہارے پاس بھیجا گیا ہے اس کو پڑھو اور نماز قائم کرو۔

مگر قرآن اور نماز کو پانے کا مطلب کسی لفظی مجموعے یا کسی ظاہری ڈھانچے کو پالینا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد ایک عظیم حقیقت کو پانا ہے جو آدمی کے وجود پر چھا جاتی ہے، جو اس کی پوری زندگی بن جاتی ہے اصل یہ ہے کہ ہر چیز جو آپ کی زندگی میں نظر آرہی ہو اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس کو آپ نے حقیقی طور پر اختیار کیا ہو — دوسرے یہ کہ وہ آپ کی زندگی کا حقیقی جزء نہ ہو بلکہ کچھ دوسرے اسباب کے تحت وہ آپ کے اثاث البیت میں شامل ہوگئی ہو۔ یہ عین ممکن ہے کہ آدمی الفاظ کے ذریعے اپنے بارے میں جو دعوے کرے اس کا "لحن القول" اس کے خلاف گواہی دے رہا ہو (محمد - ۳۰) اس کی زبان و قلم سے نہایت اعلیٰ درجے کی باتیں نکل رہی ہوں مگر اس کا یہ تمام عمل يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ (آل عمران - ۱۶۶) کا مصداق ہو یعنی اس کی زندگی کا مرکز و محور اس کے معاشی مفادات، اس کی بیوی بچے اور اس کی دنیوی تمنائیں ہوں مگر گفتگو اور تعلقات

میں وہ اپنے آپ کو اس طرح ظاہر کرے گویا اس نے خدا اور اس کے دین کو اپنی زندگی کا مرکز و محور بنا رکھا ہے۔

مثال کے طور پر ایک شخص امت کی حالت زار پر تقریریں اور بیانات شائع کر رہا ہو مگر اس کی زندگی میں ایک رات بھی ایسی نہ گزری ہو جب کہ امت کے درد میں اس کی نیند اڑ جائے اور بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اس کی زبان سے نکلے کہ ـــــ "خدایا تو انھیں ہدایت دے، خدایا مجھے طاقت دے کہ میں ان کو تیرے راستے کی طرف بلا سکوں" تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ امت کے درد سے زیادہ اس کو خود اپنا درد ستا رہا ہے۔ کیونکہ اس عنوان کو اختیار کیے بغیر وہ پریس اور اسٹیج سے اپنے آپ کو نمایاں نہیں کر سکتا۔ میز کے گرد بات چیت میں اگر کوئی شخص مظلوم انسانوں کی حمایت پر گرما گرم حصہ لے رہا ہو مگر اس کی روزمرہ کی زندگی مظلوم انسانوں کی ہمدردی سے خالی ہو تو یہ ہمدردی کا نہیں بلکہ ریاکاری کا ثبوت ہے۔ رسمی قسم کے بحث و مباحثہ میں اگر کوئی شخص اصول اور ضابطے کا بہت حوالہ دیتا ہو، مگر اس گفتگو کے باہر جو زندگی وہ گزارتا ہے وہ بے اصولی کا نمونہ ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ حقیقتاً اس کے اندر موجود نہیں ہے اس کو وہ الفاظ کے ذریعہ اپنے اندر ثابت کرنا چاہتا ہے وہ اپنے کو ایک ایسی حیثیت میں ظاہر کر رہا ہے جو کہ دراصل اس کی حیثیت نہیں ہے۔ اگر آپ کسی کو دیکھیں کہ دوسروں پر تنقید کرنے میں اس کی زبان بہت تیز ہے مگر خود اس کو عمل کے جو مواقع حاصل ہیں ان میں وہ خود بھی اسی قسم کی کمزوریاں ظاہر کر رہا ہے جس میں دوسرے لوگ اپنے دائرے کے اندر مبتلا ہیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کو فی الواقع اصلاح حال سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس کو صرف تنقید عزیز ہے اور اسی کو وہ انجام دے رہا ہے۔

کئی سال پہلے کی بات ہے۔ میں ایک مرتبہ ٹراونکور کے ملاقے میں ٹرین سے سفر کر رہا تھا۔ میرے سامنے کی سیٹ پر کچھ عیسائی بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے کہا "مسلمانوں کے اندر مذہبی اسپرٹ بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ان کا ہر بچہ جب تعلیم شروع کرتا ہے تو سب سے پہلے اس کو قرآن پڑھایا جاتا ہے۔" بلاشبہ یہ بات بڑی حد تک صحیح ہے۔ بلکہ مسلمانوں میں تو یہ روایت رہی ہے کہ وہ روزانہ صبح کی نماز کے بعد سب سے پہلے کتاب الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں۔ اگرچہ موجودہ زمانے کی سطحیت پسندی نے اس ذوق کو بڑا نقصان پہنچایا ہے اور خاص طور پر پڑھے لکھے لوگوں کی صبح تو اب تلاوتِ قرآن کے بجائے تلاوت اخبار میں بسر ہونے لگی ہے۔ تاہم اب بھی ہمارے یہاں ایسے مردوں اور عورتوں کی کافی تعداد ہے جو کسی نہ کسی حد تک اس روایت کو باقی رکھے ہوئے ہیں۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ اس قسم کی تلاوت بھی ایک دینی کام ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو جو چیز مطلوب ہے وہ محض الفاظِ قرآن کی تلاوت نہیں بلکہ "تلاوتِ حق" ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:-

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ (البقرہ - ۱۲۱)	جو لوگ کتاب الٰہی کے حامل ہیں وہ اس کو اس طرح پڑھتے ہیں جیسا کہ اس کے پڑھنے کا حق ہے۔ یہی اس کے حقیقی مومن ہیں۔

یہ تلاوت حق جس کو حاصل ہوگئی ہو وہی دراصل قرآن کا قاری ہے اور وہی اس پر صحیح معنوں میں ایمان لانے والا ہے۔ تلاوت حق کی پہچان کیا ہے۔ اس پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمارے سامنے سب سے پہلے یہ آیت آتی ہے۔

وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ○ (توبہ-۱۲۴)

اور جب کوئی سورہ اترتی ہے تو بعض (منافقین) کہتے ہیں کہ اس سورہ نے تم میں سے کس کا ایمان بڑھادیا ہے۔ ہاں اس نے ان لوگوں کا ایمان بڑھادیا ہے جو واقعی مومن ہیں اور وہ اس کو پاکر خوش ہیں۔

اس آیت سے قرآن پر ایمان رکھنے والوں کی پہچان یہ معلوم ہوئی کہ وہ جب قرآن کو پڑھیں تو اس سے ان کے ایمان میں اضافہ ہو، وہ اپنے بہترین احساسات کو اس کے اندر بولتا ہوا پائیں۔ یہی وہ چیز ہے جس کو دوسرے مقام پر عرفان حق کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا:-

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ - (مائدہ-۸۳)

اور جب وہ اس کلام کو سنتے ہیں جو خدا کے رسول پر اترا ہے تو تم دیکھوگے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو ابل پڑتے ہیں عرفان حق کے سبب سے۔

اضافۂ ایمان اور عرفان حق دونوں ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔ جو لوگ قرآن کے واقعی مومن ہیں وہ جب قرآن کو پڑھتے ہیں تو یہ کتاب انھیں سراپا حقیقت نظر آتی ہے، وہ حقیقت جس کے متعلق علم انسانی نے تسلیم کیا ہے کہ وہ کبھی اسے معلوم نہیں کرسکتا۔ وہ حقیقت جس کو فلسفہ ہزاروں سال سے تلاش کررہا ہے مگر وہ اس تک پہنچ نہ سکا، اہل ایمان اس کو خدا کی کتاب میں پالیتے ہیں۔ قرآن کی شکل میں وہ حقیقت کو دیکھنے لگتے ہیں۔ یہ علم ان کے یقین کو بڑھاتا ہے، قرآن کے مضامین اپنے پڑھنے والے سے جس قسم کی جوابی کیفیات کا تقاضا کرتے ہیں ان کا دل ہر مقام پر بالکل اس کے مطابق ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ جب زمین و آسمان کی نشانیاں پیش کرکے اللہ تعالیٰ پوچھتا ہے کہ ان کا خالق کون ہے تو بے اختیار ان کی زبان سے نکل پڑتا ہے "بل انت یا رب"۔ جب خدا کے احکام بیان ہوتے ہیں اور انسان سے اس کی حیثیت کے مطابق صحیح رویے کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو وہ پکار اٹھتے ہیں رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ۔ قرآن کو پڑھتے ہوئے دل کے اندر یہ یقین ابھرنا چاہیے کہ یہ خدا کا کلام ہے، جس مطالعہ سے یہ کیفیت حاصل نہ ہو وہ اندھے بہرے کا مطالعہ ہے۔ (فرقان) مومن جب قرآن کو پڑھتا ہے تو اس کو اس طرح پڑھتا ہے گویا وہ رب العالمین کی آواز سن رہا ہے، گویا وہ خدا سے ہم کلام ہے۔ گویا قرآن خود اس کے اوپر نازل ہورہا ہے۔ قرآن اس کی سب سے محبوب کتاب بن جاتی ہے۔ جس میں وہ اپنے جذبات کی تسکین پاتا ہے، جس سے وہ اپنے دل کی دنیا کو آباد کرتا ہے، جس سے اس کو ایک نئی روشنی حاصل ہوتی ہے، جو اس کے تمام عقلی اور روحانی تقاضوں کا جواب بن جاتی ہے۔

قرآن کا یہ پانا محض ایک علمی دریافت کی قسم کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ بندے کا اپنے رب کو پانا ہے بلکہ اس تک

پہنچ جاتا ہے۔ تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں کہ بعض لوگوں کے علمی ذوق نے انھیں کتابوں کا عاشق بنادیا۔ اس کی بھی بہت سی مثالیں ملیں گی کہ کسی فلسفی یا مفکر کی تصنیفات نے لوگوں کو اتنا متاثر کیا کہ وہ بالکل اس کے مومن ہو گئے۔ مگر خدا کی کتاب کا معاملہ اس قسم کے واقعات سے بالکل مختلف ہے۔ یہ کائنات کے خالق و مالک کی کتاب ہے اور ہم اس کے حقیر بندے ہیں۔ اس نسبت کا قدرتی تقاضا ہے کہ قرآن سے ہمارا تعلق محض علمی تعلق نہ ہو بلکہ وہ بندے اور خدا کا تعلق بن جائے۔ ہم جب قرآن کو پڑھیں تو ہمارے اوپر وہ ہیبت طاری ہو جو کائنات کے فرمانروا کا حکم سن کر اس کے ایک عاجز غلام پر طاری ہونی چاہیے۔ اس کو پڑھتے ہوئے ہمارا دل پگھل جائے، ہماری آواز پست ہو جائے، ہمارا پورا وجود سراپا عجز و نیاز بن کر اس کے آگے جھک جائے، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

اللّٰهُ الَّذِیْ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِیْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ (زمر۔ ۲۳)

وہ اللہ ہے جس نے یہ بہترین کتاب اتاری ہے جس کی باتیں آپس میں ملتی ہوئی دہرائی ہوئی ہیں، اس کو سن کر ان لوگوں کے بدن کانپ اٹھتے ہیں جو خدا سے ڈرنے والے ہیں۔ پھر ان کے دل اور ان کے جسم خدا کی یاد کی طرف جھک جاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن خدا سے ڈرنے والوں کے لیے کپکپی پیدا کر دینے والی کتاب ہے، اس کو سن کر ان کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، وہ انھیں خدا کی طرف مائل کرتی ہے، وہ انھیں ذکر الٰہی میں غرق کر دیتی ہے۔ وہ جب اسے سنتے ہیں تو ان کے قلوب پگھل کر آنکھوں کے راستے سے بہنے لگتے ہیں۔ قرآن کو سنتے یا پڑھتے کے وقت دل کے اندر خدا کی یاد اور خشوع پیدا ہونا چاہیے، ایسا نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی "قساوتِ قلب" کی بیماری میں مبتلا ہو چکا ہے۔ (حدید۔ ۱۶)

یاد رکھیے قرآن سے ناآشنا صرف وہ لوگ نہیں ہیں جن کے لیے یہ کتاب "کتابِ مہجور" بن گئی ہے، جنھوں نے قرآن کو اس طرح پس پشت ڈال دیا ہے گویا کہ وہ اسے جانتے ہی نہیں، گویا ان کی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ وہ شخص بھی قرآن سے محروم ہے جس کے لیے یہ کتاب صرف خوش الحانی کے لیے موزوں الفاظ مہیا کرتی ہو، جس کے لیے وہ محض علمی غور و بحث کا موضوع ہو، جس کے لیے وہ حوالے کی کتاب ہو جس کو وہ تحریر و تقریر کے وقت الٹ پلٹ کر دیکھ لیتا ہو۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک شخص نے ہزاروں انسانوں کے درمیان صرف قرآن کی بنیاد پر اپنی شخصیت کا سکہ بٹھا رکھا ہو، مگر وہ قرآن کی نعمت سے محروم ہو۔ اسی طرح اگر آدمی زبان و قلم کے ذریعے قرآن کے اسرار و معارف بیان کر رہا ہو مگر اس کی اپنی زندگی ان حقیقتوں سے خالی ہو تو یہ بھی خدا کی کتاب سے محرومی کی ایک قسم ہے۔ دوسروں کو کتاب الٰہی کا درس دینا اور خود "نسیان" میں مبتلا رہنا، قرآن سے تعلق نہیں بلکہ بے تعلقی کا ثبوت ہے (بقرہ۔ ۴۴) اگر کسی نے لغت اور نحو کی مدد سے الفاظِ قرآن کو حل کر لیا ہو تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ قرآن کو بھی پا گیا ہے۔ قرآن کو پانے والا صرف وہ شخص ہے جس نے

اپنے سینے کی دھڑکنوں میں اس کو بولتے ہوئے سنا ہے، جس نے ان حقیقتوں کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے جن کا قرآن میں ذکر ہے، جس نے اس کو اس طرح پڑھا ہے گویا وہ خود اپنے اندر چھپے ہوئے صحیفے کو زبان سے دہرا رہا ہے۔ یاد رکھیے حقیقت کو پانے والا صرف وہ ہے جس نے اپنے دل کی کتاب پر اس کو لکھا ہوا پایا ہے۔ جس نے صرف لفظی تشریحات کے ذریعہ اسے جانا ہے، اس نے حقیقت کو ابھی تک پایا ہی نہیں:

بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ۔ (عنکبوت ـ ۴۹)

قرآن کیا ہے وہ کھلی ہوئی آیتیں ہیں جو ان لوگوں کے سینوں میں ہیں جو معرفت رکھتے ہیں۔

قرآن کی جو صفتیں بیان کی گئی ہیں وہ اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ صفتیں بتاتی ہیں کہ قرآن کے وہ کیا کیا پہلو ہیں جن کا ہماری زندگیوں میں شامل ہو جانا ہمارا خدا کی کتاب کو پالینا ہے۔ قرآن کو پانے والا وہ ہے جس کی مردہ روح کو قرآن سے زندگی ملی ہو، جس کے لیے وہ دل کے زنگ کو دور کرنے والی کتاب ہو، جس کے لیے وہ نور بن گیا ہو جس کی روشنی میں وہ چلتا ہو۔ قرآن کو ان لوگوں نے پایا ہے جن کا حال یہ ہے کہ جب وہ اسے پڑھتے ہیں تو ان کے دل دہل اٹھتے ہیں اور وہ اپنے آنسوؤں سے اس کا استقبال کرتے ہیں۔ ان کی شخصیت صاحب قرآن کے آگے سجدہ ریز ہو جاتی ہے۔ یہی وہ علامات ہیں جو بتاتی ہیں کہ آدمی کو قرآن کی تلاوت حق نصیب ہوئی ہے یا نہیں اور اس نے فی الواقع خدا کی کتاب کو پالیا ہے یا وہ ابھی تک اس سے محروم ہے:

إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا۔ (مریم ـ ۵۸)

جب اللہ کی آیتیں انھیں سنائی جاتی ہیں تو وہ روتے ہوئے سجدے میں گر پڑتے ہیں۔

یہاں ایک بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے۔ یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تمام چیزوں کو اس ڈھنگ پر بنایا گیا ہے کہ ایک ہی چیز سے آدمی نصیحت بھی حاصل کر سکتا ہے اور وہی بیک وقت اس کے لیے فتنے میں پڑنے کا بھی ذریعہ ہے۔ ٹھیک یہی حال خدا کی کتاب کا بھی ہے، جیسا کہ فرمایا:

كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ (مدثر ـ ۳۱)

اسی طرح اللہ (قرآن کی آیتوں سے) کسی کو گمراہ کرتا ہے اور کسی کو ہدایت دیتا ہے۔

بلاشبہ قرآن کتاب ہدایت ہے۔ مگر آدمی کا اپنا چہرہ جتنا صاف ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ آئینہ کے اندر صاف دکھائی دے گا۔ چنانچہ قرآن سے بھی آدمی کو وہی کچھ ملتا ہے جو وہ اس سے حاصل کرنا چاہتا ہو۔

قرآن کے ذریعہ بے راہ ہونے کی ایک صورت تو وہ ہے جب کہ آدمی اس میں سے ایسی باتیں ڈھونڈلے جو اس کے لیے قرآن پر ایمان نہ لانے کا بہانہ بن جائیں۔ مگر جو لوگ قرآن کو مانتے ہیں وہ بھی اس خطرہ سے محفوظ نہیں ہیں۔ اس قسم کی ممکن صورتوں میں سے ایک وہ ہے جس کا عنوان تحریف ہے۔ یعنی سب کچھ جاننے کے باوجود محض اپنی غلطی کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کلام الٰہی کے الفاظ یا اس کے معانی کو بدل دینا (بقرہ ـ ۷۵)

دوسری چیز اقتسام ہے (حجر۔ ۹۰) اقتسام کے معنی ہیں بانٹنا، تقسیم کرنا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ خدائی تعلیمات کو پوری شکل میں قبول نہ کیا جائے بلکہ اپنی خواہش کے مطابق ٹکڑے کرکے اس کے بعض حصوں کو لیا جائے اور بعض کو چھوڑ دیا جائے۔ تیسری چیز وہ ہے جس کو قرآن میں مضاہاۃ کہا گیا ہے (توبہ۔ ۳۰) مضاہاۃ کے معنی عربی زبان میں مشاکلۃ الشیٔ بالشیٔ کے آتے ہیں (لسان العرب) یعنی کسی چیز کو دوسری چیز کے ہم شکل قرار دینا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل باطل کے خیالات سے متاثر ہوکر یا دنیوی مصالح کی بنا پر ان کی بات کو اپنا لیا جائے اور اس کو اس طرح پیش کیا جائے گویا وہ خدائی تعلیم کے عین مطابق یا اس کے مشابہ ہے۔

جہاں تک پہلی صورت (تحریف) کا تعلق ہے اس کی بنیاد مکمل طور پر بدنیتی کے اوپر قائم ہے۔ اور ہم سب لوگ اس کی برائی سے اچھی طرح واقف ہیں۔ مگر دوسری اور تیسری صورت کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ یہ فتنہ کبھی کبھی اچھے خاصے نیک نیت لوگوں میں بھی اس طرح چپکے سے داخل ہو جاتا ہے کہ انھیں خبر نہیں ہوتی اور وہ اپنا کام تمام کرکے بالآخر انھیں کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔

ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ انسان اکثر حالات میں متاثر ذہن کے ساتھ واقعات کا مطالعہ کرتا ہے۔ وقت کی سوسائٹی میں جن خیالات کی اہمیت تسلیم کی جا چکی ہوتی ہے۔ قدرتی طور پر وہ ان کا اثر قبول کرتا ہے۔ اسی طرح حقیقی دنیا کی بہت سی مصلحتیں معصوم شکل میں آکر اس کے ذہن کی سطح سے بار بار ٹکراتی رہتی ہیں۔ یہ چیزیں مل کر کبھی شعوری اور زیادہ تر غیر شعوری طور پر اس کا ایک فکر بنا دیتی ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان ہمیشہ چیزوں کو صرف اس حیثیت سے نہیں دیکھتا جیسی کہ وہ فی الواقع ہیں۔ اکثر حالات میں وہ مجبور ہوتا ہے کہ چیزوں کو اس حیثیت سے دیکھے جیسا کہ اس کا ذہن انھیں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس طرح جب کوئی شخص ایک خاص ذہن لے کر قرآن کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ بلا ارادہ اقتسام کی ایک صورت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ قرآن کی بعض ایسی باتوں کو تو لے لیتا ہے جو اس کے ذہن کے چوکھٹے میں بیٹھ سکتی ہوں اور باقی تمام باتوں کو چھوڑتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح وہ سارا قرآن پڑھ لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس نے خدا کی کتاب کو پا لیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ قرآن سے بالکل بے خبر رہتا ہے۔ اس نے خدا کی کتاب کے بڑے حصہ کو چھوڑ کر اس کے بعض اجزا کو اپنے خود ساختہ مفہوم میں لے لیا ہے۔ اس نے جو چیز پائی ہے وہ وہی ہے جو اس کے ذہن میں پہلے سے موجود تھی اور جس کی تائید میں اتفاق سے قرآن کی بعض آیتیں بھی اسے ہاتھ آگئیں۔ ایسے آدمی کی مثال اس تعلیم یافتہ نوجوان کی ہے جو اپنی بے کاری سے پریشان ہو اور صرف "ضرورت ملازمت" کے اشتہارات دیکھنے کے لیے اخبار کا مطالعہ کرتا ہو۔ یہ نوجوان اپنے اس مطالعہ سے ممکن ہے ملازمت کی درخواست بھیجنے کے لیے کچھ پتے حاصل کر لے مگر وہ دنیا کی سیاست سے بے خبر رہے گا اور اخبار بینی کے اصل مقصد کو حاصل نہ کر سکے گا۔

اسی طرح مضاہاۃ کی خرابی بھی آدمی کے اندر خاموشی کے ساتھ داخل ہو جاتی ہے۔ اس میں ماحول کے ذاتی تاثر کے علاوہ خاص طور پر تبلیغی ضروریات کا بھی کچھ دخل ہوتا ہے۔ یہ خیال کہ جو بات لوگوں سے کہنی ہے وہ ایسی

ہونی چاہیے جو لوگوں کے ذہن سے قریب تر ہو تاکہ وہ اس کو قبول کر سکیں۔ نیز یہ کہ بات کو ایسے الفاظ اور اصطلاحات میں پیش کیا جائے کہ وقت کا معیار فکر اس کی اہمیت تسلیم کرنے پر مجبور ہو، وقت کے علمی خیالات کے ساتھ وہ پہلو بہ پہلو جگہ لے سکے۔ یہ اگرچہ بذات خود غلط نہیں ہے مگر بعض مرتبہ وہ آدمی کے ذہن میں خدائی تعلیمات کی ایسی تصویر بنا دیتا ہے جو اصل تعلیمات سے زیادہ وقت کے نظریات سے مطابقت رکھنے والا ہو۔ خدائی تعلیمات سے جزدی مشابہت تو ضرور اس میں موجود رہتی ہے۔ مگر درحقیقت وہ اسلامی الفاظ اور اصطلاحات میں غیر اسلامی خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے۔

اگر بے جا جسارت نہ ہو تو میں عرض کروں گا کہ تصوف[1] جو ایک رائے کے مطابق یونانی لفظ تھیوسوفیا (Theosofia) کی تعریب ہے، وہ بھی اسی نوعیت کا ایک واقعہ ہے جو دوسری صدی ہجری کے نصف آخر میں محض خارجی اثرات کے تحت اسلام کے اندر داخل ہو گیا۔ ہمارے قدیم بزرگ جب اسلام کا پیغام لے کر عرب کے باہر دوسرے ملکوں میں گئے تو انھوں نے اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پایا جہاں کچھ مخصوص افکار و اشغال لوگوں کے ذہنوں پر چھائے ہوئے تھے اور مذہب اور مذہبی زندگی کا تصور ان کے بغیر نہیں کیا جا سکتا تھا یہی نہیں بلکہ ان افکار و اشغال کی پشت پر ایک زبردست فلسفہ بھی موجود تھا۔ ان چیزوں نے کچھ دعوتی مصلحت اور کچھ انفعالی تصور کے تحت ہمارے بزرگوں کو آمادہ کیا کہ وہ اسلام کو اس رنگ میں پیش کریں جس سے لوگ پہلے سے مانوس ہیں۔ اس طرح نبوت کے تقریباً دو سو سال بعد اسلام کی متصوفانہ تعبیر ہماری تاریخ میں داخل ہو گئی۔

اب قدیم روحانی انداز میں سوچنے کا زمانہ ختم ہو رہا ہے اور ہم ایک ایسی دنیا میں سانس لے رہے ہیں جب کہ ہر طرف معاشی اور سیاسی تحریکوں کا زور ہے۔ آج کا انسان عام طور پر اس انداز میں سوچتا ہے کہ موجودہ سماجی ڈھانچے کو بدل کر نئی اور بنیاد پر دنیا کا نظام چلایا جائے۔ یہ اسی قسم کا ایک نیا فتنہ ہے جس سے ہمارے پیش رووں کو سابقہ پیش آیا تھا۔ وہ اگر تعبیر روحانیت کا فتنہ تھا تو یہ تعبیر مادیت کا فتنہ ہے۔ اب اگر ہم نے اس فتنے کو نہ پہچانا اور اس سے اپنے ذہن کو محفوظ رکھنے کی کوشش نہ کی تو ہم بھی دین کی تعبیر میں اسی قسم کی غلطی کریں گے جو اس سے پہلے صوفیائے کرام سے ہو چکی ہے۔ اور پھر قرآن کی ایک نئی تفسیر کر کے قدیم روحانی تصوف کی طرح اسلام کو ایک جدید سیاسی تصوف بنا کر رکھ دیں گے۔ اور اس کے بعد ان تمام نتائج سے دوچار ہوں گے جو سیاسی تحریکوں کے لیے مقدر رہیں۔

---

[1] تصوف کی اصل کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ دوسری زیادہ مقبول رائے یہ ہے کہ یہ لفظ صوف (اون) سے بنا ہے۔ ابتدائی زمانہ میں اس طبقہ کے لوگ اکثر اون کا معمولی لباس پہنتے تھے اس لئے ایسے لوگوں کو صوفی اور ان کے طریقہ کو تصوف کہا جانے لگا۔

نماز

اب نماز کو لیجیے۔ نماز دین کا بنیادی ستون ہے۔ اس کے بغیر کسی کا ایمان ہی معتبر نہیں۔ وہ آدمی کے لیے نجات کا ذریعہ ہے۔ (حدیث) مگر یہ فائدہ صرف اس نماز سے حاصل ہوتا ہے جو صلوٰۃِ خشوع ہو، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۝ (مومنون - ۲)

کامیاب ہوئے ایمان لانے والے، وہ جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔

میں یہاں چند چیزوں کا ذکر کروں گا جس سے معلوم ہوگا کہ صلوٰۃ خشوع کیا ہوتی ہے اور اس کی علامات کیا ہیں۔

پہلی بات یہ کہ اس سے مراد وہ نماز ہے جو اس طرح پڑھی جائے کہ آدمی اس کا نگراں اور محافظ بن گیا ہو:

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ (بقرہ - ۲۳۸)

اپنی نمازوں کی حفاظت کرو۔

یہاں حفاظت سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنی روزانہ زندگی کو ہر اس چیز سے بچائے جو اس کی نماز میں خلل ڈالنے والی ہو، جس سے وہ اپنی نمازوں کو ٹھیک ٹھیک ادا نہ کر سکے۔ اس میں وقت کا اہتمام خاص طور پر داخل ہے۔ محافظتِ صلوٰۃ، اپنے ابھرے ہوئے مفہوم کے لحاظ سے، محافظت اوقات کا دوسرا نام ہے۔ نماز اہل ایمان کے لیے "کتاب موقوت" ہے جس کو متعین لمحات میں "رکوع کرنے والوں" کے ساتھ باجماعت ادا کرنا ہے۔ اس لیے آدمی کو ہر اس عادت یا ہر اس مشغولیت سے اپنی زندگی کو بچانا اور پاک کرنا ہے جو اس کو وقت پر نماز باجماعت کی ادائیگی سے محروم کر دے یا تکبیر تحریمہ کے وقت وہ مسجد کی صف میں کھڑا ہوا نظر نہ آئے۔

ٹھیک وقت پر نماز کے لیے حاضر ہونا محض فوجی ڈسپلن کی قسم کی چیز نہیں ہے بلکہ وہ دراصل بندے کی طرف سے اس بات کا مظاہرہ ہے کہ وہ آقا کی پکار پر فوراً دوڑ پڑنے کے لیے تیار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب خدا کے گھر سے "آؤ نماز کی طرف" کی آوازیں بلند ہوتی ہیں تو خدا کا بندہ ہر دوسری مشغولیت سے اپنے آپ کو فارغ کر کے خدا کی پکار کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔ یہ انتہائی آمادگی اور انتہائی تعلق کا ثبوت ہے۔ وقت آتے ہی نماز کے لیے دوڑ پڑنا اس بات کا اظہار ہے کہ آدمی نے اپنی زندگی میں اولین مقام صرف خدا کو دے رکھا ہے۔ مگر جو شخص ایسا نہیں کرتا وہ گویا اس بات کا مظاہرہ کرتا ہے کہ خدا کے سوا دوسری چیزوں کو بھی وہ اپنی عبادت میں شریک کیے ہوئے ہے۔ وہ یا تو بے حسی کا شکار ہے یا کسی دوسری مشغولیت کو اس نے اپنی زندگی میں وہ مقام دے رکھا ہے جو دراصل خدا کا ہونا چاہیے۔

مسجدوں کی صف بندی دراصل خدا کے دربار میں کھڑے ہونے کا وقت ہے۔ جو اس اہم ترین وقت پر خدا کے گھر میں نظر نہ آئے یا دیر سے پہنچے وہ گویا اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کو خدا کی پکار سے زیادہ اپنے نفس کی پکار عزیز ہے۔ عین اس وقت بھی وہ اپنے آپ کو دوسرے مشاغل میں مصروف رکھتا ہے جب خدا کے بندے خدا کے حضور کھڑے ہو رہے ہوتے ہیں۔ ایسے آدمی کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ خدا کی یاد سے غافل ہے۔

ایک امام کا واقعہ ہے۔ ان کی مسجد کے نمازی عموماً دیر کر کے نماز کے لیے آتے تھے۔ ایک روز نماز شروع ہوئی تو حسب دستور پیچھے چند آدمی موجود تھے، اور جب امام نے سلام پھیرا تو پوری صف کھڑی ہوئی نظر آئی۔ یہ منظر دیکھ کر بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا "کاش اللہ تعالے مجھے متقیوں کا امام بنائے۔ ایسے لوگوں کی امامت نے تو مجھے بیمار بنا دیا جن کا حال یہ ہے کہ جب نماز شروع ہو چکتی ہے یا اس کا ایک حصہ گزر جاتا ہے تو وہ بھاگم بھاگ آتے ہیں اور دائیں بائیں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بخدا یہ وہ نماز نہیں ہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کو مطلوب ہے۔ یہ کسل کے ساتھ خدا کی عبادت کے لیے اٹھنا ہے جس کو ذکر قلیل کہا گیا ہے یا وہ صلوٰۃ سہو ہے جس پر قرآن میں سخت وعید آئی ہے"

خاص طور پر صبح کی نماز جو صلوٰۃ مشہود[1] ہے (بنی اسرائیل - ۸)، اس میں جو شخص وقت پر نہیں پہنچتا یا اس سے غیر حاضر رہتا ہے وہ تو اپنے آپ کو اس خطرے میں ڈال رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مدد کا لباس اس سے اتار لیا جائے اور شیطان کے مقابلہ میں اس کے پاس کوئی پناہ باقی نہ رہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے:۔

مَنْ صَلّٰى صَلٰوةَ الصُّبْحِ فَهُوَ فِىْ ذِمَّةِ اللّٰهِ فَلَا يَطْلُبَنَّكُمُ اللّٰهُ مِنْ ذِمَّتِهٖ بِشَىْءٍ فَإِنَّهٗ مَنْ يَطْلُبْهُ مِنْ ذِمَّتِهٖ بِشَىْءٍ يُدْرِكْهُ ثُمَّ يَكُبَّهٗ عَلٰى وَجْهِهٖ فِىْ نَارِ جَهَنَّمَ۔ (مسلم)	جس نے صبح کی نماز ادا کر لی وہ اللہ کے ذمہ میں آگیا۔ پس ایسا نہ ہو کہ اللہ تم سے اپنے ذمہ کے متعلق کسی چیز کے بارے میں پوچھے۔ کیونکہ اللہ جس سے اپنے ذمہ کے متعلق کسی چیز کے بارے میں سوال کرے گا وہ اس کو پکڑ لے گا اور اس کو منہ کے بل جہنم میں ڈال دے گا۔

فجر کی نماز حدیث کے الفاظ میں "اول نہار کی نماز ہے، وہ دوسری نمازوں کا مقدمہ ہے، ہر روز جب صبح کی سپیدی سورج کے آنے کی خبر دیتی ہے تو دو طرح کے مواقع انسان کے لیے کھلتے ہیں۔ ایک دنیا کا کام، دوسرا آخرت کا کام۔ عین اس وقت مؤذن بلند مقام پر کھڑے ہو کر آواز دیتا ہے:۔

حَىَّ عَلَى الصَّلٰوةِ، حَىَّ عَلَى الْفَلَاحِ	آؤ نماز کی طرف، آؤ کامیابی کی طرف۔

یہ پکار انسان کو دعوت دیتی ہے کہ وہ دن کی سرگرمیوں کو شروع کرنے سے پہلے خدا کے گھر میں آئے اور فجر کی نماز ادا کر کے اپنے اس ارادے کا اظہار کرے کہ وہ آنے والے لمحات کو آخرت کی کامیابی حاصل کرنے میں لگائے گا، وہ آنے والے دن کو خدا کی عبادت میں بسر کرے گا۔ عین اس وقت ایک اور پکارنے والا پکارتا ہے۔ یہ انسان کا دشمن شیطان ہے جو ایک ایک شخص کے دل میں یہ بات ڈالتا ہے کہ وہ اپنے دن کو صرف دنیا حاصل کرنے میں لگائے۔

پہلی پکار دیواروں سے ٹکرا کر واپس آجاتی ہے۔ ہزاروں کی آبادی میں صرف چند ایسے لوگ مسجد کے لیے نکلتے ہیں جو بوڑھے ہو چکے ہیں یا کسی اور کام کے قابل نہیں رہے ہیں۔ مگر دوسری پکار کو سن کر ہر شخص اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، کسان اپنے کھیتوں کی طرف چل پڑتے ہیں، تاجر کنجیوں کے بڑے بڑے گچھے لے کر اپنی دکانوں کی طرف

---

[1] صلوٰۃ مشہود کے معنی ہیں حضوری کی نماز، روبرو کی نماز۔

روانہ ہو جاتے ہیں۔ ملازم اپنے دفتروں کی تیاری شروع کر دیتے ہیں اور بہت سے لوگ جنھیں صرف آرام عزیز ہے وہ اس سہانے وقت میں اپنے نرم بستروں سے لپٹ جانے کو موزوں ترین خیال کرتے ہیں۔

کس قدر غافل ہے انسان جو اس وقت بھی محروم رہتا ہے جب کہ پانے کے امکانات سب سے زیادہ ہوں۔ ایک دروازہ جو ہر روز انسان کے لیے کھلتا ہے مگر نادان انسان ہر روز اسے اپنے اوپر بند کر لیتا ہے۔

صلوٰۃِ خشوع کی دوسری پہچان یہ ہے کہ نماز میں آدمی کا جھکنا اس کی پوری زندگی میں اسی قسم کے جھکاؤ کا عنوان بن جاتا ہے۔ اس کا رکوع اور سجدہ دراصل اس بات کا ایک عملی اقرار ہے کہ اس نے پوری زندگی خدا کے آگے ڈال دی ہے، وہ مکمل طور پر خدا کے حکم کا پابند بن چکا ہے۔ اسی لیے قرآن میں کہا گیا ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ (عنکبوت-۴۵) نماز بدکاریوں اور برائیوں سے روکتی ہے۔

ایک نبی نے جب لوگوں کو خدا کا عبادت گزار بننے کی دعوت دی تو ان کی قوم جس نے اپنی زندگی کی باگ اپنے نفس کے حوالے کر دی تھی اور کسی دوسرے نظام اطاعت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھی، اس نے جواب دیا:

یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَاؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا۔ ہود-۸۷

اے شعیب! کیا تمھاری نماز کہتی ہے کہ ہم ان چیزوں کی عبادت چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں اور ہمارے مالوں میں ہماری مرضی کا کوئی دخل نہ ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز محض رسمی قسم کی پوجا نہیں ہے بلکہ وہ اپنے وجود اور تمام اثاثے کو خدا کے آگے ڈال دینے کا نام ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ خدا کے حضور جھک کر زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ "میرے آقا تو مجھے حکم دے، میں تیرے حکم کی تعمیل کروں گا"۔ اس اقرار کے باوجود اگر آپ کسی کو دیکھیں کہ اس کی مسجد کی نماز اس کی پوری زندگی کی نماز نہیں بنی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ابھی تک صلوٰۃ خشوع سے محروم ہے۔ قرآن کی تصریح کے مطابق جس نماز کے ساتھ "اتباعِ شہوات" پایا جا رہا ہو، وہ ایسی نماز ہے جس سے روح صلوٰۃ ضائع ہو چکی ہے (مریم-۵۹)

بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ان کی نمازیں بہت اچھی نہ سہی تاہم وہ نماز تو پڑھ لیتے ہیں اور یہ بھی بہرحال فرض کی ادائگی کے لیے کافی ہے۔ مگر یہ صرف شیطان کا دھوکہ ہے۔ یاد رکھیے اللہ تعالیٰ کو جو چیز مطلوب ہے وہ ذکر قلیل نہیں، بلکہ ذکر کثیر ہے۔ ذکر قلیل کو تو منافقوں کی پہچان بتایا گیا ہے۔ (نساء-۱۴۲)

صلوٰۃ خشوع کی تیسری اور آخری پہچان یہ ہے کہ بندہ جب نماز میں مشغول ہو تو وہ اپنے آپ کو خدا سے بالکل قریب محسوس کرے، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (علق ۱۹) سجدہ کر اور قریب ہو جا

یہ سجدۂ قربت کیا چیز ہے اس کو شاید لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ جب آدمی اس عالم میں پہنچتا ہے تو اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ ایک ان دیکھی حقیقت کو کامل یقین کے ساتھ دیکھ رہا ہے۔ ایک بعید ترین چیز سے

انتہائی طور پر قریب ہے، کسی مخاطب کی موجودگی کے بغیر کامیاب ترین گفتگو میں مصروف ہے۔ ایک سب سے زیادہ پیچیدہ چیز کے لیے اپنے اندر سب سے زیادہ محبت کے جذبات پا رہا ہے۔ ایک چیز جس کو بظاہر کسی بھی واسطہ کے ذریعہ محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ کسی واسطہ کے بغیر وہ اس تک پہنچ گیا ہے۔

گویا سجدہ جو نماز کی انتہائی حالت ہے، وہ بیک وقت خدا سے قریب ہونے کی بھی انتہائی حالت ہے۔ نماز کی شکل میں اللہ تعالٰے نے ہمارے لیے یہ انتظام کیا ہے کہ ہم دنیا میں رہتے ہوئے اس کی معیت اور قربت حاصل کر سکیں۔ نماز کے ذریعہ آدمی جب اپنے آپ کو خدا کی طرف متوجہ کرتا ہے تو وہ روحانی طور پر خدا سے جڑ جاتا ہے۔ وہ یاد الٰہی کی ایسی حالت اپنے اوپر طاری کرتا ہے جب کہ وہ مکمل طور پر ایک حیاتی وجود بن جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لیے اپنے آپ کو خدا کے اندر گم کر دیتا ہے۔ وحدت وجود کا تصور غالباً اپنی ابتدائی شکل میں محض اس کیفیت کو بتانے کے لیے تھا جو تصور الٰہی میں غرق ہونے کے وقت آدمی کے اوپر طاری ہوتی ہے۔ مگر بعد کو منطقی تعیین کی کوشش نے اس کو ہمہ اوست کے ناقابل فہم فلسفے تک پہنچا دیا۔ اگر اس بدنام عقیدے کے متعلق میری تشریح کو صحیح مانا جائے اور اس کو محض حیاتی ارتباط کے مفہوم میں لیا جا سکے تو میں کہوں گا کہ سجدۂ قربت کے وقت آدمی پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے اس کے اظہار کے لیے شاید انسانی زبان میں یہ ایک قریب ترین تعبیر ہے۔ جب سپردگی کا لمحہ آتا ہے، جب عجز اور محدودیت کا پیکر اپنے آپ کو لامحدود کمال کے حوالے کر دیتا ہے، جب پیشانی اس طرح کھنچ اٹھتی ہے گویا وہ زمین سے چپک گئی ہے۔ اس وقت ایسا محسوس ہوتا ہے گویا قطرہ نے اپنے آپ کو سمندر میں ڈال دیا ہے، گویا انسان خدا سے جا ملا ہے۔

خاتمہ

یہ تلاوت حق اور صلوٰۃ خشوع کی مختصر ترین تشریح ہے جو میں نے آپ کے سامنے کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کچھ نئی باتیں نہیں ہیں۔ ہر وہ شخص جس نے قرآن کو پڑھا ہے وہ ان باتوں کو بخوبی جانتا ہے۔ مگر اس کے باوجود میں نے آج آپ کے سامنے ان کو اس لیے دہرایا ہے تاکہ انھیں یاد دلا کر آپ سے یہ عہد لوں کہ آپ ان کو اپنی زندگیوں میں شامل کریں گے۔ آپ میں سے ہر شخص کو کسی دوسرے سے نہیں بلکہ خود اپنے آپ سے اس معاہدہ پر بیعت کرنا ہے کہ وہ اپنے علم کو اپنا سانس بنائے گا۔ وہ جو کچھ جانتا ہے اس کو اختیار کرنے کی کوشش کرے گا۔ اگر آپ سچ مچ یہ اقرار کر لیں تو یقین مانیے کہ یہ کائنات آپ کے لیے سلام و مرحبا کی آواز سے اس طرح گونج اٹھے گی کہ آپ کے کان اس کی آواز سنیں گے، اور آپ کے لیے خدا کی جنت کے دروازے اس طرح کھول دیے جائیں گے کہ آپ جیتے جی اس کی خوشبو محسوس کریں گے۔

اور اگر آپ اس عہد کے لیے تیار نہ ہوں تو وہ سب کچھ جو اجالے میں ہے اور وہ سب کچھ جو اندھیرے میں چھپا ہوا ہے، گواہ ہے کہ خدا کے یہاں اب آپ کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ یہ کہہ کر کہ آپ ان باتوں کو پہلے سے جانتے ہیں، آپ نے خود اپنے اوپر حجت تمام کر دی ہے۔ اس کے بعد بھی اگر آپ اپنے کو نہیں بدلتے تو مجھے نہیں معلوم کہ آپ کے پاس وہ کونسا سہارا ہے جس کے بل پر آپ رب العالمین کے سامنے اتنی بڑی جسارت کر رہے ہیں۔ (زندگی ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ)

تقریر اجتماع جماعت اسلامی ہند، بمقام بدایوں، ۱۲، ۱۰ اپریل ۱۹۶۱ء

مومن کی تصویر

آج کا یہ اجتماع جس میں ہم آپ جمع ہوئے ہیں، یہ گویا ایک دور کا خاتمہ اور دوسرے دور کا آغاز ہے جماعت اسلامی کی دعوت پر ملک کے گوشے گوشے سے یہاں جمع ہو کر آپ نے اس بات کا مظاہرہ کیا ہے کہ پچھلے پندرہ سال کے اندر ہم اس ملک میں کتنا کام کر چکے ہیں اور یہاں جو کارروائی انجام پائے گی وہ ہماری طرف سے اس بات کا اعلان ہوگا کہ آئندہ ہم اس ملک میں کیا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ گویا ماضی اور مستقبل کے درمیان کا ایک وقفہ ہے جس کو ہم دار السلطنت یا قرآن کے الفاظ میں اس ملک کے ام القریٰ میں گزار رہے ہیں۔ اس وقت میں جو کچھ عرض کروں گا وہ ہمارے اس تاریخی دن کے دوسرے پہلو کا ایک جز ہے۔ خدا میری اور آپ کی مدد فرمائے۔

حضرت معاذؓ خدا کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی ایک گفتگو کی روداد ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں۔

قَالَ اَلَا اُدُلُّكَ بِرَأْسِ الْاَمْرِ وَعَمُوْدِهٖ وَذِرْوَةِ سَنَامِهٖ قُلْتُ بَلٰى يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ۔ قَالَ رَأْسُ الْاَمْرِ الْاِسْلَامُ وَعَمُوْدُهُ الصَّلٰوةُ وَذِرْوَةُ سَنَامِهِ الْجِهَادُ

(احمد، ترمذی، ابن ماجہ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا، کیا میں تمہیں بتاؤں کہ دین کا سرا کیا ہے اور اس کا ستون کیا ہے اور اس کی سب سے بلند چوٹی کیا ہے۔ میں نے جواب دیا: "ہاں اے خدا کے رسول"۔ آپ نے فرمایا۔ دین کا سرا اسلام ہے، اس کا ستون نماز ہے اور اس کی چوٹی جہاد ہے۔

اس حدیث کے مطابق دین کے تین درجے ہیں — اسلام، نماز اور جہاد — یہ تین الفاظ دراصل تین مختلف عمل کے عنوانات ہیں جو ایمان لانے کے بعد کسی کی زندگی میں ابھرتے ہیں۔ اسلام اس کا پہلا عمل اور اس کی بنیاد ہے اور نماز وہ چیز ہے جو اس عمارت کو اوپر اٹھاتی ہے اور جہاد اس کی آخری منزل ہے۔

سب سے پہلے اسلام کو لیجیے۔ اسلام کے معنی سپردگی اور حوالگی کے ہیں۔ بندہ جب اپنے خدا کو پالے اور اپنے آپ کو بالکل اس کے حوالے کر دے تو اسی کو اسلام کہتے ہیں۔ اسلام اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک قسم کا فنا فی اللہ ہے جس میں بندہ اپنے آپ کو بھول جاتا ہے اور جسمانی طور پر اپنے الگ وجود کو باقی رکھتے ہوئے نفسیاتی طور پر خدا کی ہستی میں گم ہو جاتا ہے۔ یہ آدمی کے پورے وجود کا خدا کے تصور میں ڈھل جانا ہے۔ اسلام یہ ہے کہ ہمارا ذہن اس حقیقت پر بالکل مطمئن ہو جائے کہ اس کائنات کا ایک خالق اور مالک ہے۔ ہمارے احساسات میں وہ اس طرح شامل ہو جائے کہ رگ رگ میں ہم اس کی کھٹک محسوس کرنے لگیں۔ ہم اپنے آپ کو اس طرح اس کے حوالے کر چکے ہوں کہ کسی معاملے میں اس کے خلاف جانے کا تصور تک نہ کر سکیں۔ ہمارا ذہن اسی کے بارے میں سوچتا ہو اور ہمارے جذبات اسی کے لیے متحرک ہوتے ہوں۔ ہم سب سے زیادہ اس سے ڈرتے

ہوں اور سب سے زیادہ اس سے محبت کرتے ہوں۔ جس شخص کی یہ کیفیت ہو جائے وہی دراصل اسلام کو قبول کرتا ہے۔ اسلام تسلیم و تفویض کی وہ آخری قسم ہے جس میں بندہ اپنے فکر کو، اپنے جذبات کو، اپنے وجود کو اور اپنے سارے اثاثے کو خدا کے سپرد کر دیتا ہے اور اپنے پاس کچھ بھی باقی نہیں چھوڑتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قربانی کا ذکر ہے وہاں اسی لفظ کو استعمال کیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم نے خواب دیکھا کہ وہ اپنے لڑکے کو ذبح کر رہے ہیں۔ انھوں نے سمجھا کہ خدا مجھ سے میرے لڑکے کی قربانی مانگ رہا ہے۔ چنانچہ انھوں نے فوراً لڑکے کو لیا اور اس کو لٹا کر اس کی گردن پر چھری رکھ دی۔ اس واقعہ کا ذکر قرآن میں ان لفظوں میں آیا ہے:-

فَلَمَّا اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ (صافات ۱۰۳)	جب وہ دونوں مسلم ہوئے اور ابراہیم نے اسمٰعیل کو پیشانی کے بل ڈال دیا۔

حضرت ابراہیم کا یہ عمل اسلام کی حقیقی تصویر ہے۔ یہ حوالگی اور سپردگی کی انتہا ہے کہ خدا کی طرف سے جو حکم بھی آئے بندہ فوراً اس کی تعمیل کے لیے تیار ہو جائے۔ حتیٰ کہ اگر اس کو محسوس ہو کہ اس سے اپنے لڑکے کو ذبح کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے تو وہ بے تکلف اپنے لخت جگر کو زمین پر لٹائے اور اس کی گردن پر چھری چلا دے۔

یہی اسلام خدا پرستانہ زندگی کا آغاز ہے۔ جب آدمی اس طرح مسلم اور مطیع ہو جائے تو وہ دین کا سرا پکڑتا ہے۔ اس مکمل حوالگی کے بغیر کسی کی زندگی حقیقی معنوں میں خدا پرستانہ زندگی نہیں بن سکتی۔ اس حوالگی میں جتنی کمی ہوگی اسی کے بقدر آدمی کی زندگی میں کمی رہ جائے گی۔ مثلاً ایک شخص نے اگر اپنے ذہن کو خدا کے حوالے کیا ہے مگر اس کے احساسات پر خدا کا غلبہ نہیں ہوا ہے تو وہ اسلام کا صرف ایک وکیل بن کر رہ جائے گا۔ وہ اسلام کے لیے بحثیں کرے گا، اور دوسروں پر تنقید کرنے میں اس کی زبان بہت تیز ہوگی۔ مگر اس کی اپنی زندگی خدا پرستی سے خالی ہوگی۔ کوئی شخص اگر اسلام کی طرف اس طرح آئے کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں کا نفع حاصل کرنا چاہتا ہو تو وہ خدا پرستی کو اسی حد تک اختیار کرے گا جس حد تک اس کے دنیوی مفاد کو نقصان نہ پہنچے۔ جہاں اس کا دنیا کا فائدہ خطرہ میں نظر آیا وہ خدا پرستی کو ترک کر دے گا اور دنیا کے بت کو پوجنے لگے گا۔ جو شخص کسی سطحی تاثر یا وقتی جذبات کے تحت اسلام کی طرف مائل ہوگا وہ چند دنوں تو بڑی سرگرمی دکھائے گا مگر اس کے بعد ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ یا جہاں سے آیا تھا وہیں واپس چلا جائے گا۔ جو شخص اسلام کی طرف اس طرح آئے کہ وہ اپنی خودی کے بت کو بھی ساتھ لیے ہو وہ خدا کے دین کی ان چیزوں کو بڑی خوشی سے لے لے گا جو اس کے ذوق کے مطابق ہوں گی اور جو چیز اس کے ذہنی سانچے میں فٹ نہ ہوگی وہ اسے رد کر دے گا۔ جو شخص اسلام کے ناقص مطالعہ کے تحت محض اس کے بعض پہلوؤں سے متاثر ہو کر اسلام کی طرف آئے وہ اپنے پسندیدہ پہلوؤں کے بارے میں تو اتنی گرما گرم تقریر کرے گا گویا وہ صحابۂ کرام سے بھی آگے بڑھ گیا ہے۔ مگر دوسرے پہلوؤں سے اسے کچھ زیادہ

نل جیسی نہ ہوگی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اسلام کو اپنے قومی اور تحریکی جذبات کی تسکین کے لیے اختیار کرے تو وہ قومی جوش وخروش اور تحریکی اخلاقیات میں تو بہت نمایاں نظر آئے گا۔ مگر حقیقی اسلامی اسپرٹ اور اسلامی اخلاقیات کا اس کے اندر کہیں پتہ نہ ہوگا۔ حتیٰ کہ جو لوگ مکمل حوالگی کے بغیر دین کی طرف آئیں ان کی کمزوریاں اس حد تک پہنچ سکتی ہیں کہ ایک شخص کو صبح سات بجے کسی دینی کام کے لیے بلایا جائے گا اور وہ کہے گا کہ میں اتنے سویرے نہیں آسکتا کیونکہ وہ میرے چائے پینے کا وقت ہے۔ ایک شخص کو کسی اسلامی اجتماع کے پروگرام میں حصہ لینے کے لیے رات کو گیارہ بجے کا وقت دیا جائے گا اور وہ جواب دے گا کہ گیارہ بجے تک میرے لیے سوجانا ضروری ہے۔ اس لیے میں اس پروگرام میں شریک نہیں ہوسکتا۔ ایک شخص سے کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو جو صلاحیت دی ہے اس کو دین کی خدمت میں لگاؤ مگر وہ کہے گا کہ میں تو دنیا کی خدمت کروں گا کیونکہ دنیا کے بازار میں میری صلاحیتوں کی زیادہ قیمت مل رہی ہے۔ ایک شخص اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود ہر وقت کھانے کپڑے کی فکر میں مبتلا رہے گا، اس کی مجلس میں ہر وقت روپے پیسے کا تذکرہ ہوگا اور جب اس سے کہا جائے گا کہ مومن کے گھر میں خدا اور آخرت کا چرچا ہونا چاہئے تو وہ بگڑ کر بولے گا کہ "ہاں یہ مومن کا نہیں کافر کا گھر ہے"۔ ایسا شخص اپنے آپ کو اسلام کے علمبردار کی حیثیت سے پیش کرے گا لیکن اگر اس کی روزانہ کی زندگی کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اسلام سے زیادہ اس کا ذہن اپنے ذاتی مسائل میں دلچسپی لیتا ہے، وہ اپنی اسلامی ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے زیادہ نجی قسم کے مشغلوں میں اپنا وقت صرف کر رہا ہے، وہ اپنی معاش کمانے اور اپنے بیوی بچوں کے مطالبات پورے کرنے کے لیے تو سارے جتن کرتا ہے مگر اسلام کا کوئی کام کرنا ہو تو معمولی معمولی باتوں کو عذر بنالیتا ہے۔ اس قسم کی کمزوریاں جہاں نظر آئیں سمجھ لیجیے کہ اس کا ایک ہی سبب ہے، وہ یہ کہ آدمی کے اندر مکمل حوالگی کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کے دین کی طرف نہیں آیا ہے۔ اس نے ادھوری شکل میں اسلام قبول کیا ہے۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ بعض احادیث میں چند مخصوص چیزوں کو "اسلام" کہا گیا ہے۔ مثلاً حدیث جبریل میں ہے کہ آپ سے پوچھا گیا: "اے محمدؐ! بتائیے اسلام کیا ہے؟" آپ نے جواب دیا "اسلام یہ ہے تم لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کی شہادت دو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور بشرطِ استطاعت بیت اللہ کا حج کرو"۔ اس طرح کی اور بھی روایتیں ہیں جن کو دیکھ کر بظاہر یہ شبہہ ہوتا ہے کہ شاید یہی وہ چند چیزیں ہیں جن کے مجموعے کا نام اسلام ہے۔ مگر اس قسم کا شبہہ وہی کرسکتا ہے جو ان احادیث کو پوری شریعت سے الگ کرکے دیکھے۔ قرآن وحدیث کی ساری تعلیمات کو سامنے رکھ کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ یہ چند چیزیں کل اسلام نہیں ہیں بلکہ یہ اسلام کے چند علامتی پہلو ہیں۔ کلمۂ توحید کا اقرار اپنے اندر ایک فکری انقلاب کا اعتراف ہے۔ نماز اس بات کا اظہار ہے کہ آدمی اپنے پورے وجود کے ساتھ خدا کے آگے جھک گیا ہے۔ زکوٰۃ اپنے مال واسباب کو خدا کے لیے وقف کردینے کا اعلان ہے روزہ اس بات کا

عزم ہے کہ بندہ اپنے رب کی خاطر ساری مشقتیں جھیلنے کے لیے تیار ہے اور حج گویا آدمی کی طرف سے اس بقراری کا اظہار ہے کہ وہ دنیا اور اس کی تمام چیزوں کو چھوڑ کر خدا تک پہنچ جانا چاہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کلمۂ توحید اور نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ بذات خود مکمل اسلام نہیں ہیں بلکہ یہ اسلام سے پیدا ہونے والی اندرونی کیفیات کے چند نشان ہیں۔ یہ مکمل حوالگی کی علامتی تصویر ہے نہ کہ انھیں کا نام مکمل حوالگی ہے۔

یہ چیزیں جن کا حدیث میں ذکر ہے یہ شریعت کی وہ مخصوص چیزیں ہیں جن کو ہمارے اوپر فرض قرار دیا گیا ہے اور فرائض کے متعلق سمجھ لینا چاہیے کہ وہ راستے کی حد نہیں ہیں بلکہ وہ صرف راستے کی سمت بتاتے ہیں۔ یہ فرائض ایک طرح کی لازمی تربیت ہیں جو ہم کو مخصوص وقتوں میں ایک مقررہ عمل کرا کے اس بات کی تعلیم دیتے ہیں کہ بقیہ وقت میں ہمیں کیا کرنا ہے۔ ان کی حیثیت محض علامات کی ہے نہ کہ ذمہ داریوں کے حدود متعین کرنے کی۔

ایک مثال سے اس کی وضاحت ہو جائے گی۔ نومبر ۱۹۵۹ء میں جب ہندوستان میں چینی جارحیت کا خطرہ بہت بڑھ گیا تھا۔ احمد آباد کے ۲۵ ہزار طلبہ نے یہ عزم کیا کہ وہ ملک کے دفاع کے لیے لڑیں گے اور اپنی جان دے کر چینی حملہ کا مقابلہ کریں گے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد ان میں سے ہر شخص نے ایک ایک پیسہ دے کر ۲۵ ہزار پیسے جمع کیے اور ان کو ہندوستانی وزیر اعظم کی خدمت میں پیش کیا۔ پیسے دیتے ہوئے انھوں نے وزیر اعظم سے کہا کہ یہ ہماری طرف سے اپنے آپ کو آپ کے حوالے کرنے (To give ourselves to you) کا نشان ہے۔ یہ وقت کی ایک مثال ہے جس سے ہم اسلامی فرائض کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں۔ بندہ فرائض اور واجبات کی شکل میں اپنے وجود کا تھوڑا حصہ خدا کو دے کر اس بات کا عہد کرتا ہے کہ وہ اپنا پورا وجود خدا کو دینے کے لیے تیار ہے۔ وہ اپنی بعض حیثیتوں میں سے "کچھ" دے کر تمام حیثیتوں سے اپنا "سب کچھ" اس کے حوالے کرنے کا ارادہ ظاہر کرتا ہے۔

اب نماز کو لیجیے جو اس سلسلے کی دوسری چیز ہے۔ جب کوئی شخص مکمل حوالگی کے ساتھ خدا کی طرف بڑھتا ہے تو اس کے بالکل قدرتی نتیجے کے طور پر اس کی پوری زندگی ذکر اور دعا میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسی ذکر اور دعا کی ایک مخصوص صورت کا نام نماز ہے۔ اہل ایمان کی تعریف قرآن میں يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا (سجدہ - ۱۶) کے الفاظ میں کی گئی ہے۔ یعنی وہ اپنے رب سے ڈرتے ہوئے اور اس کی رحمتوں کی تمنا کرتے ہوئے اسے پکارتے رہتے ہیں۔ جن واقعات کو دیکھ کر لوگ دوسری چیزوں کو یاد کرتے ہیں ان کو دیکھ کر مومن خدا کے تصور میں غرق ہو جاتا ہے۔ اگر وہ کسی جنازے میں شرکت کے لیے قبرستان جاتا ہے تو یہ موقع اس کے لیے بستی کے لوگوں سے ملاقات کی تقریب نہیں ہوتی بلکہ کھودی جانے والی قبر اس کے لیے ایک کھلا ہوا دروازہ بن جاتی ہے جس سے وہ آخرت کی حقیقتوں کو دیکھنے لگتا ہے۔ اگر وہ کسی عالیشان مکان میں اپنے آپ کو پائے تو وہ اس کے نقش و نگار دیکھنے میں محو نہیں ہو جاتا بلکہ وہ بے اختیار کہہ اٹھتا ہے کہ خدایا مجھے ایسا مکان

نہیں چاہیے، میں تو تیری رحمت اور مغفرت کا طلب گار ہوں اور وہی تو مجھے دے دے۔ اگر وہ کسی تاریخی کھنڈر کے سامنے کھڑا ہو تو وہ اس کو محض آثار قدیمہ کے طور پر نہیں دیکھتا بلکہ اس سے یہ عبرت حاصل کرتا ہے کہ ان آبادیوں کے بسنے والے اپنی آبادیوں کو چھوڑ کر جس دنیا میں چلے گئے ہیں وہیں مجھ کو بھی جانا ہے۔ اگر وہ کسی جدید طرز کے کارخانے میں داخل ہوتا ہے اور دیکھتا ہے کہ جو کام پہلے سخت قسم کی انسانی محنت سے انجام پاتا تھا، اس کو تیز رفتار مشینیں انجام دے رہی ہیں اور انسان ان کے سامنے کھڑا ہوا صرف ان کی دیکھ بھال کر رہا ہے تو اس کو "صنعتی انقلاب" کے عجائب یاد نہیں آتے بلکہ وہ کارخانے کی شکل میں خدا کے انعامات کو دیکھنے لگتا ہے۔ وہ پکار اٹھتا ہے کہ خدایا تو نے انسان کو وہ سب کچھ دے دیا ہے جس کی اسے ضرورت تھی۔ تو نے اسے ایک ایسی کائنات دی ہے جو اپنے سازوسامان کے ساتھ گویا اس بات کا انتظار کر رہی ہے کہ انسان آ کر ایک بٹن دبا دے اور ساری کائنات اس کی خدمت کے لیے حرکت میں آ جائے۔

اسی طرح وہ خود جتنے عمل کرتا ہے وہ بھی خدا کو اپنی طرف مائل کرنے کی ایک کوشش ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مومن کا ہر عمل اپنے رب سے درخواست ہے۔ جب وہ کسی کی عیب پوشی کرتا ہے تو گویا وہ خدا سے اس کا متمنی ہوتا ہے کہ وہ قیامت کے دن اس کے عیبوں کو چھپائے۔ جب وہ کسی کے ساتھ فیاضی کا معاملہ کرتا ہے اور اس کے حق سے زیادہ اسے دیتا ہے تو درحقیقت وہ دعا کرتا ہے کہ مالک حقیقی اس کے ساتھ بھی اسی طرح فیاضی کا معاملہ کرے۔ حتیٰ کہ جب وہ اپنے بچے کو گود میں لیتا ہے تو اس وقت بھی اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ جاتے ہیں اور وہ کہہ اٹھتا ہے کہ خدایا یہ بچہ جتنا کمزور ہے میں اس سے زیادہ تیرے سامنے بے بس اور کمزور ہوں تو میری مدد فرما! وہ کہتا ہے کہ میرے رب! جس طرح ایک چھوٹا بچہ ہمکتا ہے تو شفیق باپ لپک کر اسے اٹھا لیتا ہے اسی طرح میں تیری طرف آنا چاہتا ہوں، مگر اپنے کمزور قدموں کے ساتھ میں تجھ تک نہیں پہنچ سکتا۔ تو ہاتھ بڑھا کر مجھے اٹھا لے!

نماز درحقیقت اسی مومنانہ زندگی کا نشان اور اس کا مرکزی نقطہ ہے۔ مومن کی پوری زندگی نماز ہوتی ہے، مخصوص اوقات میں جب وہ نماز پڑھتا ہے تو گویا وہ اپنی حالت نماز میں ہونے کی حیثیت کو مجسم اور مکمل کرتا ہے۔ نماز بندگی کی تصویر ہے۔ نماز اپنے رب سے قریب ہونے کی کوشش ہے۔ نماز خدا کے دربار میں حاضری کا وقت ہے۔ نماز ان جذبات کا ایک خارجی مظہر ہے جو مومن کے سینے میں تڑپ رہے ہوتے ہیں نماز ایک لحاظ سے دعا ہے، وہ اپنی عاجزی کو پیش کر کے خدا سے اس کی رحمت و مغفرت مانگنا ہے اور دوسرے لحاظ سے وہ اسی قسم کا ایک بیتابانہ عمل ہے جو ایک شخص اپنے محبوب دوست کے لیے کرتا ہے جب کہ وہ اس سے بچھڑ گیا ہو اور تصور کی دنیا میں اس تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ نماز خدا کا اپنے بندے کی طرف آنا اور بندے کا اپنے رب تک پہنچ جانا ہے۔ بندہ جب نماز میں مشغول ہوتا ہے تو وہ دوسری تمام حالتوں کے مقابلے میں خدا سے زیادہ قریب ہوتا ہے چنانچہ نماز کے وقت اس کو ایک خاص طرح کی قربت کا احساس

ہوتا رہتا ہے مگر جوں ہی نماز پوری کر کے وہ سلام پھیرتا ہے اس کی کیفیت بدل جاتی ہے۔ اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی ایرکنڈیشنڈ عمارت سے یکایک باہر آگیا ہو۔ مختصر یہ کہ نماز وہ مقام ہے جہاں خدا اپنے بندوں سے ملاقات کرتا ہے۔ جس طرح جنت کی زندگی کے بارے میں آتا ہے کہ جب جنتیوں کو خدا کا دیدار کرایا جائے گا تو وہ جنت کے بہترین آرام وعیش بھول جائیں گے اور انھیں محسوس ہوگا کہ یہ سب سے بڑی نعمت ہے جو انھیں نصیب ہوئی ہے۔ اسی طرح کیفیت سے بھرا ہوا ایک سجدہ، ایسا سجدہ جس سے سر اٹھانے کا جی نہ چاہے دنیا کی تمام نعمتوں سے زیادہ لذیذ ہے۔ ایسے سجدوں والی نماز ہی حقیقی معنوں میں نماز ہے اور جس کو ایسے سجدوں کی توفیق نہیں ہوئی وہ گویا ابھی تک نماز سے آشنا ہی نہیں ہوا۔ ایسے شخص سے میں خدا کے رسول کی زبان میں کہوں گا: اِرۡجِعۡ فَصَلِّ فَاِنَّکَ لَمۡ تُصَلِّ ـــ (جاؤ اور پھر سے نماز پڑھو، کیونکہ تم نے ابھی تک نماز نہیں پڑھی)

حدیث میں نماز کو دین کا ستون کہا گیا ہے۔ یہ نماز کے تربیتی پہلو کی طرف اشارہ ہے۔ نماز مومن کی تربیت ہے۔ ایک طرف وہ آدمی کے اندر وہ خصوصیات پیدا کرتی ہے جن سے وہ دین کا حامل بن سکے۔ اور دوسری طرف وہ آدمی کو اس مقصد کے لیے تیار کرتی ہے کہ وہ حق کا علمبردار بن کر دنیا کے سامنے کھڑا ہو۔ نماز کے یہ دونوں فائدے سورۂ مزمل کی ابتدائی آیتوں میں بیان کیے گئے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے:۔

یٰاَیُّھَا الۡمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّیۡلَ اِلَّا قَلِیۡلًا ۝ نِّصۡفَہٗۤ اَوِ انۡقُصۡ مِنۡہُ قَلِیۡلًا ۝ اَوۡ زِدۡ عَلَیۡہِ وَ رَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِیۡلًا ۝ اِنَّا سَنُلۡقِیۡ عَلَیۡکَ قَوۡلًا ثَقِیۡلًا ۝ اِنَّ نَاشِئَۃَ الَّیۡلِ ھِیَ اَشَدُّ وَطۡاً وَّ اَقۡوَمُ قِیۡلًا ۝ اِنَّ لَکَ فِی النَّھَارِ سَبۡحًا طَوِیۡلًا ۝ وَاذۡکُرِ اسۡمَ رَبِّکَ وَ تَبَتَّلۡ اِلَیۡہِ تَبۡتِیۡلًا ۝

(مزمل: ۱-۸)

اے چادر اوڑھنے والے! راتوں میں قیام کر تھوڑے حصہ کو چھوڑ کر، یعنی آدھی رات یا اس سے کچھ کم یا اس سے کچھ زیادہ اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ۔ ہم تم پر ایک بھاری بات آتارنے والے ہیں بے شک رات کو اٹھنا نفس کو خوب کچلتا ہے اور ایسی حالت میں جو بات نکلتی ہے وہ بھی بہت درست ہوتی ہے۔ دن کے وقت تمہیں لمبی مشغولیت ہوتی ہے اور اپنے رب کے نام کا ذکر کر اور ہر طرف سے کٹ کر اسی کا ہو جا۔

ان آیات میں نماز کے ایک پہلو کو وَطۡاً شدید کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس سے آدمی مقال اقوم (درست گفتگو) کے قابل بنتا ہے اور اس کے دوسرے پہلو کو ذکر اسم رب کہا گیا ہے جس سے تَبَتُّل اِلَی اللہِ (خدا کی طرف یکسوئی) کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کے اوپر حق کی تبلیغ کرنے کی جو ذمہ ڈالی ہے وہ ایک نہایت گراں بار ذمہ داری ہے جس کو اوپر کے ٹکڑے میں قول ثقیل کہا گیا ہے۔ اس قول ثقیل کا بوجھ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی زبردست ریاضتیں کر کے اپنے اندر وہ قوت پیدا کرے جس سے اس کا بوجھ اٹھانا آسان ہو جائے۔ اس ریاضت

کا طریقہ لمبی قرأت والی طویل نمازیں ہیں جن کا بہترین وقت رات کی تنہائی ہے۔ رات میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا ایک بڑا مشقت کا عمل ہے جس کو یہاں وطأ شدید (بہت روندنا) کہا گیا ہے۔ اس وطأ شدید کے ذریعہ مومن اپنے نفس کو کچلتا ہے اور اس حالت میں قرآن پڑھ کر اپنے ذہن کو صاف اور دل کو پاک کرتا ہے۔ اس طرح تربیت پاکر وہ انسان تیار ہوتا ہے جو اعلیٰ اخلاقی اوصاف رکھنے والا ہو اور مقال اقوم کے ساتھ تبلیغ کا فریضہ انجام دے سکے۔ رات کو خدا کے سامنے کھڑا ہونا آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ دن کو بندگان خدا کے سامنے کھڑا ہو، اور خدا کے کلام کے مطالعہ سے اس کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ خدا کی طرف سے بول سکے۔

نماز کا دوسرا پہلو ذکر اسم رب ہے جو تبتل الی اللہ کی کیفیت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ یعنی خدا کی یاد میں اس قدر مشغول ہونا کہ ذہنی حیثیت سے آدمی ایسا ہو جائے گویا وہ دنیا سے کٹ کر خدا سے جڑ گیا ہے۔ یہ نماز صرف یاد کی شکل میں بھی ہوتی ہے جس کو قرآن میں ذکر کثیر کہا گیا ہے اور قیام وقعود اور رکوع وسجود کی شکل میں بھی جو نماز کی مخصوص صورت ہے۔ آدمی جب دن کے وقت اپنی مشغولیتوں میں خدا کو یاد کرتا رہتا ہے اور جب مخصوص اوقات کے آتے ہی وہ خدا کے حکم کی تعمیل میں مسجد کے لیے روانہ ہو جاتا ہے تو اس کے ذریعہ سے وہ اس بات کی تربیت حاصل کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مادی دنیا سے ہٹا کر روحانی دنیا کی طرف لے جائے۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے اس کی دلچسپیوں سے اس قدر بے تعلق ہو جائے گویا کہ وہ خدا کا راہب بن گیا ہے۔ اس طرح ذکر اور نماز آدمی کو مادی آلائشوں سے پاک کر کے اس قابل بناتے ہیں کہ وہ دنیا کے اوپر آخرت کو ترجیح دے سکے۔ فانی دنیا کو چھوڑ کر باقی رہنے والی دنیا میں اپنا دل لگائے۔

خدا کی راہ میں نفس کو کچلے بغیر آدمی کے اندر وہ سوز پیدا نہیں ہو سکتا جو دعوتِ حق کی جان ہے اور نہ اس کے بغیر کسی کو موعظہ حسنہ کی وہ زبان حاصل ہو سکتی جو دلوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ داعی کی زندگی سراپا اپنے نظریات کا مجسمہ بن گئی ہو۔ اس کے منہ سے جو الفاظ نکلیں وہ محض الفاظ نہ ہوں بلکہ اس کی اپنی زندگی ان کے اندر کھنچ آئی ہو۔ دعوت حق کے کام کے لیے علمی قابلیت کی ڈگریاں درکار نہیں ہیں بلکہ اس کے لیے ایسی زندگی کی ضرورت ہے جو اپنی ترجمان آپ ہو، جو بولنے سے پہلے بول رہی ہو۔ اس کو ایسے دل کی ضرورت ہے جو اس غم میں گھل رہا ہو کہ لوگ اپنے رب کو بھول گئے ہیں۔ جو ساری فکروں کو چھوڑ کر اس فکر میں دیوانہ ہو جائے کہ کس طرح لوگوں کو جہنم کے راستے سے ہٹا کر جنت کے راستے کی طرف لگایا جائے اور آدمی کے اندر ان خصوصیات کو پیدا کرنے والا ایک ہی نسخہ ہے اور وہ نماز ہے، ایسی نماز جس میں مشغول ہو کر بندہ اپنے آپ کو خدا سے قریب کرتا ہے۔ جس کے ذریعہ وہ خدا سے جڑ جاتا ہے۔ یہ نماز داعی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ اگر کوئی شخص سمجھتا ہے کہ وہ نماز کو اپنی زندگی میں شامل کیے بغیر حق کا داعی بن سکتا ہے تو یہ محض ایک غلط فہمی ہے اور جتنی جلد وہ اس غلط فہمی سے نکل آئے اچھا ہے۔

نماز کی اسی اہمیت کی بنا پر حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں تمام عمال کے نام ایک مکتوب

روانہ کیا جس میں یہ درج تھا کہ :-

اِنَّ اَھَمَّ اُمُوْرِکُمْ عِنْدِی الصَّلٰوۃُ مَنْ حَفِظَھَا وَحَافَظَ عَلَیْھَا حَفِظَ دِیْنَہٗ وَمَنْ ضَیَّعَھَا فَھُوَ لِمَا سِوَاھَا اَضْیَعُ۔ (مالک)

تمہارے معاملات میں سب سے اہم چیز میرے نزدیک نماز ہے جو شخص نماز کی حفاظت کرے گا اور اس پر قائم رہے گا وہ اپنے دین کو محفوظ رکھے گا اور جو شخص نماز کو ضائع کر دے وہ دوسری چیزوں کو اور زیادہ ضائع کرنے والا ہوگا۔

تیسری چیز جہاد ہے۔ جہاد کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے جس طرز زندگی کو خود اختیار کیا ہے اسی کی طرف دوسروں کو لانے کی کوشش کرے۔ دعوتِ حق اور جہاد دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک لفظ سے اس کی نوعیت کا اظہار ہوتا ہے اور دوسرے سے اس کی کیفیت کا۔ یا ان دونوں کے فرق کو ہم اس طرح بھی بیان کر سکتے ہیں کہ دعوت اس کی ابتدا ہے اور جہاد اس کی انتہا۔ ایمان لانا دوسرے لفظوں میں ایک حقیقت کا انکشاف ہونا ہے۔ اس حقیقت سے جب آدمی دوسروں کو آگاہ کرنا چاہے تو اسی کو جہاد کہتے ہیں۔ یہ جہاد ابتداً زبان سے شروع ہوتا ہے۔ مگر اپنے آخری درجے میں کبھی داعی کو تلواروں کے سایے اور پھانسی کے تختے پر کھڑے ہو کر حقیقت کا اعلان کرنا ہوتا ہے۔ جو ان تمام مراحل سے گزر کر اپنی ساری کوشش امرِ حق کے اعلان و اظہار میں صرف کر دے، وہی مجاہد فی سبیل اللہ ہے۔

اس جہاد میں بظاہر دوسروں کے خلاف جدوجہد ہوتی ہے مگر حقیقتاً یہ خود اپنے ساتھ جدوجہد کرنا ہے جو شخص اپنے آپ سے لڑنے کی طاقت رکھتا ہو، وہی دوسروں سے لڑ سکتا ہے۔ جو اپنے آپ کو زیر کر سکے وہی دوسروں پر غالب آسکتا ہے۔ داعی اور مجاہد بننے کے لیے سب سے پہلی ضروری چیز یہ ہے کہ آدمی خود اپنی زندگی میں اس چیز کو قائم کر چکا ہو جس کو وہ دوسروں کی زندگی میں قائم کرنے کے لیے اٹھا ہے۔ وہ ان باتوں پر سب سے پہلے خود ایمان لائے جن کو وہ دنیا کے سامنے پیش کرنے جا رہا ہے — وہ خود اس چیز کے لیے بیتاب ہو چکا ہو جس کی طلب وہ دوسروں کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ جو اس حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہو جس کو وہ لفظوں کے ذریعہ دوسروں کو دکھانا چاہتا ہے۔ داعی کے سامنے ایک طرف اس کے مخاطب ہوتے ہیں، دوسری طرف وہ دنیا ہوتی ہے جس کے حالات اسے لوگوں کو بتانے ہوتے ہیں، اس لیے وہ انتہائی بلندی پر کھڑا ہوتا ہے تاکہ وہ سامنے کی دنیا اور پیچھے کی دنیا دونوں کو دیکھ سکے۔ اپنی بات پر بے پناہ یقین اور خدا کے اوپر بے پناہ اعتماد، یہی دو چیزیں خدا کے لیے کوشش کرنے والوں کا سرمایہ ہیں۔ آپ حقیقی معنوں میں داعی اسی وقت بن سکتے ہیں جب آپ کا حال یہ ہو کہ آپ کسی کی غلط روش پر تنقید کریں تو درد کی شدت سے آپ کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑیں۔ آپ کی دعوتی تحریریں بازار سے خرید کی ہوئی روشنائی سے نہ لکھی گئی ہوں بلکہ اپنے خون سے تیار کی گئی ہوں، جس میں آپ نے خود اپنے کو نچوڑ دیا ہو۔ اسی طرح اگر آپ مقرر ہیں تو آپ کا حال یہ ہونا چاہیے کہ جب آپ اسٹیج پر

تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوں تو آپ کا دل بے قرار ہو جائے اور آپ اپنے رب سے عرض کریں کہ "خدایا! جو کچھ تو آخرت میں ان کے سامنے کھولنے والا ہے اس کو میں دنیا میں ان کے سامنے کھولنا چاہتا ہوں۔ تو مجھے اس کی توفیق دے"۔ جو شخص اس مقام سے بول سکے وہی دراصل داعی بن سکتا ہے اور جس کے اندر یہ حوصلہ نہ ہو اس کو جاننا چاہیے کہ وہ ابھی داعی بننے کے قابل نہیں ہوا ہے۔ اس کو دوسروں کی اصلاح کے لیے اٹھنے سے پہلے خود اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔

لوگوں کو خدا کی طرف بلانا، دنیا میں نظام عدل قائم کرنا، شیطان اور طاغوت کے خلاف جنگ کرنا، یہ جہاد فی سبیل اللہ کے میدان ہیں۔ مگر یہی جہاد فی سبیل اللہ کا مقصود و مطلوب نہیں ہے۔ جہاد اصل میں مومن کو مشکلات میں ڈال کر اس کا امتحان لیتا ہے اور اس کو ایک ایسا موقع فراہم کرتا ہے جس کے ذریعہ سے وہ اپنی ارتقار کے لامحدود منازل طے کر سکے۔ جس طرح انسان کے مادی وجود کو باقی رکھنے اور اس کو نشو و نما دینے کے لیے زمین و آسمان کی بے شمار چیزیں درکار ہیں۔ ٹھیک اسی طرح انسان کے روحانی ارتقار کے لیے ایک وسیع میدان بلکہ پوری کائنات کی ضرورت ہے۔ نظام اسلامی کا قیام اسی پھیلے ہوئے پروگرام کا ایک جزء ہے جو سماجی زندگی کے ساتھ مومنانہ کردار کو ظاہر کرتا ہے۔ اس لحاظ سے جہاد کی تکمیل یہ نہیں ہے کہ آپ دنیا میں نظام حق قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں بلکہ جہاد کی تکمیل یہ ہے کہ آپ اپنی قوتوں کا آخری حصہ تک اس راہ میں صرف کر دیں۔ خدا کے یہاں جن لوگوں کا شمار انبیاء اور شہداء میں ہوگا ان میں ایسے بھی لوگ ہوں گے جو ساری جد و جہد کے باوجود وقت کی سوسائٹی کو بدل دینے میں کامیاب نہیں ہوئے اور ایسے بھی لوگ ہوں گے جن کے پیغام کو اتنی بڑی اکثریت نے قبول کر لیا کہ وہ سوسائٹی کا دین بن گیا۔ یہ دونوں قسم کے لوگ خدا کے نزدیک کامیاب لوگ ہیں۔ ان کے درمیان خدا کے یہاں کوئی تفریق نہیں کی جائے گی بلکہ وہ سب کے سب یکساں اعزاز و احترام کے مستحق ہوں گے۔ کیونکہ جد و جہد کے نتیجہ کا تعلق دوسروں سے ہے نہ کہ جد و جہد کرنے والوں سے۔ جب خادم نے اپنا کام پورا کر لیا تو بہرحال وہ اپنی خدمت کا صلہ پانے کا مستحق ہو گیا۔ خواہ دوسرے لوگوں نے اس کی خدمت کو تسلیم کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

اس جد و جہد کا پروگرام کیا ہے، اس کو جاننے کے لیے آپ کو دور جانے کی کوئی ضرورت نہیں، یہ واقعہ کہ جو حقیقت آپ کے اوپر منکشف ہوئی ہے آپ کے ماحول کے بے شمار لوگ اس سے ناواقف ہیں۔ بس یہی آپ کے پروگرام کو متعین کر دیتا ہے۔ اسلامی شعور حاصل ہونے کے بعد جب ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ زندگی امتحان کی زندگی ہے اور ہر شخص جنت یا جہنم کی طرف بھاگا چلا جا رہا ہے تو اسی سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ اپنے آپ کو اور اپنی قوم کو آنے والے دن سے ہوشیار کریں۔ ہمارا جہاد یہ ہے کہ خدا کے عذاب سے دور بھاگنے کے لیے اپنی ساری کوشش صرف کر دیں۔ مومن کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ حالات کے مطابق لوگوں کو ان کی دنیوی مشکلات سے نکلنے میں مدد دے۔ مگر زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ دنیوی مشکلات سے نجات پانا نہیں ہے بلکہ آخرت کے عذاب سے نجات پانا ہے۔ مومن کا اصل کام یہ ہے کہ اپنی کوششوں کو اس راہ میں صرف کرے۔ لوگوں کو جہنم سے بچانے کے لئے وہ اپنی ساری طاقت لگا دے۔

یہ دعوتی جدوجہد اور خدا کی راہ میں آخری حد تک بڑھنے کی اسی کوشش کا نام جہاد ہے جس کو حدیث میں دین کی سب سے بلند چوٹی کہا گیا ہے۔ جہاد اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ہے کہ بندے کے لیے ایک ایسا میدان فراہم کیا جائے جہاں وہ اپنی تمام کوششوں کو خدا کی راہ میں لگا سکے۔ جہاد کی روح یہ ہے کہ بندہ اپنی کوششوں کو آخری حد تک صرف کر ڈالے تاکہ خدا اپنی رحمتوں کو اس کے اوپر آخری حد تک انڈھا دے۔ جہاد تکلیفوں اور دشواریوں کے میدان میں اپنے خدا پرست ہونے کا ثبوت دینا ہے۔ آدمی اکثر اپنی کوتاہیوں کے جواب میں دشواریوں کی ایک فہرست پیش کر دیتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہی دشواریاں وہ قیمتی مواقع ہیں جن کے خلاف جدوجہد کر کے آپ اپنے رب کو خوش کر سکتے ہیں۔ آپ جن ذاتی مسائل کی بنا پر اسلام کی طرف بڑھنے سے رک رہے ہیں، وہ دراصل آپ کے لیے ترقی کے زینے ہیں۔ یہ اس لیے نہیں ہیں کہ آپ ان کو دیکھ کر رک جائیں — وہ اس لیے ہیں تاکہ آپ انھیں پھاند کر آگے بڑھ جائیں۔ خدا کے نزدیک اس کا سب سے محبوب بندہ وہ ہے جو اپنی تمناؤں کو اس کے لیے دفن کر دے، جو اپنے آرام کو اس کی خاطر چھوڑ دے۔ جو اپنی مشکلات کو نظر انداز کر کے اس کی طرف چلا آئے۔ دنیا میں کسی شخص کی کامیابی یہ نہیں ہے کہ وہ یہاں کچھ حاصل کر لے — کامیاب دراصل وہ ہے جو خدا کی راہ میں اپنا سب کچھ لٹا دے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے پوچھا: سب سے افضل جہاد کون سا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ "وہ شخص جو اپنی بہترین سواری لے کر نکلا اور میدان جنگ میں اس کا گھوڑا مارا گیا اور وہ خود بھی شہید ہو گیا۔" گویا سب سے زیادہ خوش نصیب وہ شخص ہے جو بالکل لٹا ہوا اپنے رب کے پاس پہنچے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمتوں کو اس کے اوپر انڈیل دے گا۔

محترم رفقاء! یہ اجتماع جس میں آپ اس وقت شریک ہو رہے ہیں، اس کی بہترین تعبیر میرے نزدیک یہ ہے کہ یہ آپ کی طرف سے تجدید عہد ہے۔ آپ نے جماعت میں شریک ہو کر پہلے دن اپنے رب سے جو معاہدہ کیا تھا، یہ اس معاہدہ پر آئندہ قائم رہنے کا عزم ہے جو آپ اپنے سیکڑوں رفقاء کے سامنے کر رہے ہیں اور جس پر خدا اور اس کے فرشتے گواہ ہیں۔ اگر پچھلی مدت میں آپ اپنے معاہدے کو پورا کرنے والے ثابت ہوئے ہوں، اگر آپ کے دن اور آپ کی راتیں اس بات کی شہادت دیتی ہوں کہ آپ اپنے معاہدے میں پورے اترے ہیں تو میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ اس تجدید عہد کا موقع ملنا آپ کے لیے آپ کے رب کی طرف سے خوش خبری ہے۔ یہ آپ کی کوششوں کے قبول کیے جانے کا نشان ہے۔ اور اگر آپ اپنے معاہدے کو پورا کرنے میں کوتاہ ثابت ہوئے ہوں تو ایسی صورت میں آپ کو یہاں آنے کی توفیق دینے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو اس بات کا ایک اور موقع دیا گیا ہے کہ آپ اپنے معاہدے کی اہمیت کو سمجھیں اور جو کچھ پہلے نہیں کر سکے اس کو آئندہ کرنے کا عزم لے کر یہاں سے واپس جائیں۔

آپ جانتے ہیں کہ ہم جو کچھ کر سکتے ہیں اپنی موجودہ زندگی ہی میں کر سکتے ہیں اور اس زندگی کی مدت

بہت کم ہے۔ کتنے لوگ ہیں جن کو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا مگر آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ اسی طرح جو لوگ، آج ہمیں دیکھ رہے ہیں ایک وقت آئے گا کہ ہم ان کو دیکھنے کے لیے اس دنیا میں موجود نہ ہوں گے۔ ہم اپنی عمر پوری کر کے اپنے رب کے پاس جا چکے ہوں گے۔ ہماری موجودہ زندگی وہ پہلا اور آخری لمحہ ہے جب کہ انسان اپنے مستقبل کی تعمیر کے لیے کچھ کر سکتا ہے۔ نہ اس سے پہلے ایسا کوئی موقع انسان کو ملا تھا اور نہ اس کے بعد ایسا کوئی موقع انسان کو ملے گا۔ ہم ایک ایسے امتحان سے گزر رہے ہیں جس کا ایک لازمی نتیجہ ہمارے سامنے آنے والا ہے اور بہت جلد ہم ایک ایسے لازمی نتیجے سے دوچار ہوں گے جس کے بعد پھر کسی تیاری کا موقع ہم کو نہیں ملے گا۔ زندگی کا ہر لمحہ جو آپ صرف کر رہے ہیں، خوب سمجھ لیجیے کہ آخری طور پر صرف کر رہے ہیں۔ کیونکہ وہ پھر واپس آنے والا نہیں ہے۔

خدا کا دین ہم سے ہماری زندگی مانگ رہا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ ہم اپنا پورا وجود اس کے سپرد کر دیں۔ ہمارے دن اور ہماری راتیں اس کے لیے وقف ہو جائیں اپنی طاقت کا آخری حصّہ تک ہم اس کی راہ میں لگا دیں۔ جو لوگ اس سرفروشانہ جذبے کے ساتھ آگے بڑھیں اور جن کے اندر اپنے آپ کو قربان کر کے دین کی خدمت کرنے کا حوصلہ ہو، وہی دراصل دین کی خدمت کریں گے اور جن کے اندر یہ حوصلہ نہ ہو وہ صرف اپنی خدمت کر سکتے ہیں۔ خدا کے دین کو ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں۔ (ماہنامہ زندگی رام پور رجب ۱۳۸۰ھ)

نوٹ: جماعت اسلامی کے کل ہند اجتماع بمقام دہلی میں کی گئی ایک تقریر، ۱۲ نومبر ۱۹۶۰ء

بامقصد زندگی

دوستو! ہم مسلمان ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے بارے میں دعویٰ رکھتے ہیں کہ ہم بامقصد لوگ ہیں۔ کیوں کہ اسلام زندگی کا ایک مقصد ہے۔ مگر میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ بامقصد ہونے کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ ایک مقصدی تصور آپ کے ذہن میں پایا جارہا ہو۔ کچھ تقریروں کو سُن کر یا کچھ تحریروں کو دیکھ کر ایک مقصدی نظریہ کسی کے دماغ میں پہونچ جائے تو صرف اس بنا پر اسکو بامقصد انسان نہیں کہا جاسکتا۔ بامقصد انسان تو وہی ہے جو اپنے پورے وجود کے ساتھ بامقصد بن گیا ہو۔ جس کی زندگی اسکے مقصد میں اس طرح ڈھل جائے کہ دونوں کے درمیان کوئی دوئی باقی نہ رہے۔

آپ اس وقت ایک مسجد میں بیٹھے ہیں جس کے اوپر اونچے اونچے مینار کھڑے ہیں اگر ہوا کے ذریعے کچھ آم کے پتے اڑکر آئیں اور ان میناروں پر اٹک جائیں تو اس بنا پر ان میناروں کو آپ آم کا درخت نہیں کہنے لگیں گے۔ آم کا درخت تو وہی ہے جو اپنی جڑ میں بھی آم ہو، اپنے تنہ میں بھی آم ہو، اپنی شاخوں میں بھی آم ہو، اپنے پتوں میں بھی آم ہو، اور وہ آم ہی کے پھل دے۔ آم کا درخت آپ اسی کو کہتے ہیں جو اس طرح اوپر سے نیچے تک آم ہو۔ محض کسی لمبی کھڑی ہوئی چیز پر آم سے مشابہت رکھنے والی کچھ چیزوں کا اتفاق سے جمع ہو جانا اس کو ہرگز آم نہیں بنا دیتا۔ اسی طرح آپ کو بھی بامقصد انسان کا لقب اسی وقت دیا جاسکتا ہے جب آپ سر سے پاؤں تک اپنے پورے وجود میں بامقصد بن گئے ہوں۔ محض کچھ نظریات کا کہیں سے آکر آپکے ذہن میں اٹک جانا آپ کو بامقصد نہیں بنا دیتا۔ اسلام زندگی کا ایک مقصد ہے اور ہم اسی وقت مسلمان کہے جانے کے مستحق ہیں جب ہم نے واقعی ایک مقصد کی طرح اسلام کو اپنی زندگی میں شامل کیا ہو۔

بامقصد انسان کی پہچان کیا ہے۔ اس کو درجنوں پیرایہ سے بیان کیا جاسکتا ہے اس وقت میں اسکی چند خصوصیات کا مختصر طور پر ذکر کرونگا۔

۱۔ بامقصد آدمی کی پہلی پہچان وہ ہے جس کو میں "ارتکاز" کے لفظ سے تعبیر کروں گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی تمام فکری اور ذہنی قوتیں آپ کے مقصد میں مرکوز ہو جائیں۔ آپ کا سوچنا، آپ کا محبت کرنا، آپ کا نفرت کرنا، سب کچھ آپ کے مقصد کے ساتھ وابستہ ہو گئے ہوں۔ آپ کی کوئی چیز دوسری سمت بکھری ہوئی نہ ہو۔ جوتا بنانے والوں کے یہاں آپ نے دیکھا ہوگا، کام کرتے کرتے ان کے پاس بہت سی کیلیں پھیل جاتی ہیں۔ اس وقت وہ یہ کرتے ہیں کہ مقناطیس کا ایک ٹکڑا لے کر وہاں پھراتے ہیں جس سے تمام بکھری ہوئی کیلیں کھنچ کھنچ کر اس سے چمٹ جاتی ہیں۔ اور پھر وہ اٹھا کر اسے خانے میں رکھ لیتے ہیں۔ اس مثال میں اگر مقناطیس کی جگہ آپ اپنے مقصد کو رکھیں اور کیلوں کے بجائے اپنے افکار و خیالات اور جذبات و احساسات کا تصور کریں تو زندگی اور مقصد کے درمیان تعلق کو آپ سمجھ سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مقناطیس کے گرد لوہے کے ٹکڑے جس طرح ایک ایک کر کے اکٹھا ہو جاتے ہیں اور آس پاس کا کوئی ٹکڑا ایسا نہیں ہوتا جو اس سے آ کر چمٹ نہ گیا ہو، اسی طرح آدمی کے مقصد کے گرد اُس کے سارے دل اور سارے دماغ کو مرکوز ہو جانا چاہیئے۔

یہاں ایک واقعہ مجھے یاد آتا ہے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب میرے یہاں آئے ان کو بازار کا کچھ کام تھا۔ بازار جا کر جب وہ لوٹے تو انھوں نے ایک واقعہ بتایا جس سے مجھے بڑی عبرت ہوئی۔ واقعہ بہت چھوٹا سا ہے مگر اس میں ہمارے لئے بڑی نصیحت ہے، انھوں نے کہا کہ میں ایک جگہ پہونچا جہاں سڑک کے کنارے بہت سے موچی اپنی اپنی دوکان لئے بیٹھے تھے۔ جب میں انکے پاس سے گذرا تو میں نے دیکھا کہ ان میں سے ہر شخص میرے جوتے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ جس موچی کی نظر اٹھتی تھی۔ بس میرے جوتے پر آ کر رک جاتی ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ موچی بھی اپنے مقصد میں کس قدر گم ہیں۔ ان کو انسان صرف جوتے کی شکل میں نظر آتا ہے بھرے ہوئے بازار میں سینکڑوں انسان ان کے سامنے سے آتے جاتے ہیں۔ مگر انھیں ان انسانوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ ان کو نظر اٹھا کر دیکھتے تک نہیں۔ وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ یہ آنے جانے والے لوگ اپنے پاؤں میں ایک ایسی چیز پہنے ہوئے ہیں جس کی پالش کر کے یا جس کی مرمت کر کے وہ کچھ پیسے حاصل کر سکتے ہیں۔ گویا انسان ان کی نظر میں صرف ایک "جوتا" ہے اور بس۔

اسی طرح بامقصد آدمی اپنے مقصد میں گم رہتا ہے۔ اس کو ہر چیز میں صرف اپنا مقصد نظر آتا ہے۔ وہ ہر واقعہ کو، ہر مسئلہ کو، ہر بات کو اپنے مقصد کی روشنی میں دیکھتا ہے حتیٰ کہ وہ اپنے مقصد کے تصور میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ دوسری چیزیں اسے بھولنے لگتی ہیں۔ ایک صاحب ہیں جو بہت فعال آدمی ہیں۔ جو کام بھی کرتے ہیں اس کو پوری طرح لگ کر کرتے ہیں ایک مرتبہ

میں ایک ایسے زمانے میں ان سے ملنے گیا جب وہ اپنا نیا مکان بنوانے میں مصروف تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان کے پائجامہ میں ایک جگہ بہت سے لال لال دھبے پڑے ہوئے ہیں۔ پوچھا یہ کیا ہے۔ انھوں نے دیکھ کر کہا "مجھے خود بھی نہیں معلوم۔ اس کے بعد انھوں نے پائجامہ اٹھایا تو معلوم ہوا کہ کسی سخت چیز سے ٹکرانے کی وجہ سے ٹانگ میں ایک جگہ چوٹ لگ گئی ہے۔ چوٹ لگ کر خون بہا، کپڑے میں لگا، پھر خود بخود سوکھ کر بند ہو گیا۔ اور انھیں مطلق خبر نہیں ہوئی۔ جب آدمی کے سامنے کوئی مقصد ہو تو وہ اسی طرح اس میں منہمک ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ ایک اور ہی دنیا میں پہونچ جاتا ہے جہاں دوسری چیزیں اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔ جہاں دوسری چیزیں اُسے محسوس نہیں ہوتیں۔ حتیٰ کہ خود اپنی ذات کے جسمانی تقاضے بھی بعض اوقات اسے یاد نہیں رہتے۔

یہی وہ بات ہے جس کو میں نے "ارتکاز" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ بامقصد آدمی وہی ہے جس کو اپنے مقصد میں اس درجہ شغف اور انہماک ہو جائے۔ اس کے بغیر اپنے آپ کو بامقصد آدمیوں کی فہرست میں لکھنا، مقصد کے لفظ سے ایک طرح کا مذاق کرنا ہے۔

۲۔ بامقصد آدمی کی دوسری پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے مقصد کے مطابق زندگی گذارتا ہو۔ "مقصد کے مطابق عمل" سے میں ایک خاص چیز مراد لے رہا ہوں جس کو آپ ایک مثال سے سمجھ سکتے ہیں۔ ایک حکیم صاحب ہیں جو ایک دیہات میں دوا علاج کا کام کرتے ہیں وہ کوئی سندیافتہ طبیب نہیں ہیں نہ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ بس لوگوں کی صحبت اور تجربہ کی وجہ سے کچھ باتیں جان گئے ہیں اور اس کے مطابق کام کر رہے ہیں بلکہ اپنی محنت اور توجہ کی وجہ سے اپنے علاقہ میں اچھے خاصے متعارف بھی ہو گئے ہیں۔ انکے گھر پر کچھ کھیتی باڑی کا کام بھی ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے کہا کہ میں کھیتی کے موٹے کام مثلاً کھودنا، ہل چلانا وغیرہ اپنے ہاتھ سے نہیں کرتا۔ آپ سمجھیں گے وہ شاید کوئی شیروانی پوش آدمی ہونگے اور اپنی شیروانی کی عزت رکھنے کے لئے ایسے کاموں سے بچتے ہوں گے، مگر ان کو "شیروانی" اور "پتلون" کی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ بالکل سیدھے سادے دیہاتی حکیم ہیں۔ کھیتی کے سخت کاموں سے الگ رہنے کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ اگر میں اس طرح کے کام کروں تو میرا ہاتھ سخت ہو جائے گا۔ انگلیوں کی کھال موٹی ہو جائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مریض کی نبض میں ٹھیک طرح سے دیکھ نہ سکوں گا۔ نبض کی ضربیں ہلکی ہوتی ہیں اور ان میں بہت نازک اور لطیف فرق ہوتے ہیں۔ ان کو محسوس کرنے کے لئے انگلیوں کا نرم ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر انگلیاں ہل اور کدال پکڑتے پکڑتے سخت ہو جائیں، جیسا کہ اس طرح کا کام کرنے والوں کی ہوتی ہیں، تو وہ نبض کی ضربیں محسوس کرنے کے قابل نہیں رہیں گی۔

ہر مقصد اپنے اختیار کرنے والے سے اسی کا تقاضہ کرتا ہے۔ جو شخص بھی کسی مقصد کو

اپنائے، ضروری ہے کہ وہ اپنی عملی زندگی اور اپنی روزانہ کی سرگرمیوں کو اپنے مقصد کے ساتھ ہم آہنگ رکھے۔ وہ دونوں میں کوئی تضاد پیدا نہ ہونے دے۔ با مقصد آدمی ایک باشعور آدمی ہوتا ہے۔ اگر اس کے اندر حقیقۃً ایک مقصد اترا ہوا ہے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو ایسے عملی حالات اور ایسے مشاغل کی طرف نہ لے جائے جہاں وہ اور اس کا مقصد الگ الگ ہو جائیں۔ جب وہ ویسا بن کر نہ رہ سکے جیسا اپنے مقصد کے اعتبار سے اسے بن کر رہنا چاہیے۔

میں ایک ایسے مسلم خاندان کو جانتا ہوں جس کی آمدنی اتنی تھی کہ وہ معقول طریقہ سے ایک سادہ زندگی گذار رہا تھا اور اسی کے ساتھ دین کے تقاضے بھی پورے کر رہا تھا۔ اس کے بعد اس کے یہاں ایک لڑکی اور ایک لڑکے کی شادی ہوئی۔ اس کے مقصد کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ شادی کو اس طرح کرے کہ اس کی وجہ سے اس کے گھر میں معمول کے مطابق جو زندگی چل رہی ہے اس میں کوئی خلل پیدا نہ ہو۔ مگر اس نے پہلی غلطی یہ کی کہ شادی کے لئے ایک ایسے خاندان کا انتخاب کیا جس کا معیار زندگی اسکے مقابلے میں بڑھا ہوا تھا۔ پھر شادی بھی اس طرح کی جیسے عام دنیا دار لوگ اپنی شادیاں کرتے ہیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف اس کے گھر کا سارا سرمایہ شادی میں لگ گیا بلکہ وہ کافی مقروض بھی ہو گیا۔ اس کے پیچھے اس کا سارا کاروبار اجڑ گیا۔ اگر صرف اتنا ہی نقصان ہوا ہوتا جب بھی غنیمت تھا، کیوں کہ جس طرح مختلف قسم کے وقتی حادثے آدمی کے اوپر پڑتے ہیں اور پھر وہ سنبھل جاتا ہے، اسی طرح وہ دوبارہ سنبھل جاتا۔ مگر شادی نے اس کو ایک نئی مصیبت میں ڈال دیا۔ جس کا پہلے اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اپنی لڑکی کو اس نے جو کپڑے اور سامان دیئے اور سسرال سے اس کے لئے جو کپڑے وغیرہ آئے، اس کی وجہ سے شادی شدہ لڑکی کی پوشش اور رہن سہن کا معیار یکایک بہت بڑھ گیا۔ اور جب گھر کی ایک لڑکی کا معیار بڑھا تو اسی کیساتھ دوسروں کا لحاظ کرنا ضروری تھا۔ پھر اسی کے ساتھ نئے نئے فرنیچر سے لدی ہوئی پوری ایک گاڑی بھی اس کے گھر اتری ان چیزوں کے نتیجہ میں اس کی گھریلو زندگی کا معیار بالکل مصنوعی طور پر یکایک بدل گیا۔ اب ہر چیز میں پہلے سے زیادہ خرچ ہونے لگا۔ اس طرح ایک طرف پچھلے قرضوں کی ادائگی اور دوسری طرف بڑھے ہوئے اخراجات کو پورا کرنا، ایسے دو پاٹ بن گئے جن کے نیچے اس کی زندگی پس کر رہ گئی، اس کا گھر دیکھتے دیکھتے ایک دیندار گھرانے سے ایک دنیا دار گھرانے میں تبدیل ہو گیا۔

یہ صرف ایک واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ میں نے کتنے لوگوں کو دیکھا ہے کہ اسی طرح وہ اپنے دنیوی معاملات میں ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں کہ بالآخر وہ انھیں گھسیٹ کر تباہی کے غار میں پہونچا دیتا

ہے۔ جو شخص کسی مقصد کے لئے دنیا میں جینا چاہتا ہو، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ باشعور زندگی گذارے۔ وہ اپنی سرگرمیوں پر نظر رکھے۔ اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو اس مادی دنیا میں ہر وقت اس کا امکان ہے کہ آدمی ایسے بندھنوں میں اپنے آپ کو پھنسا لے جس کے بعد وہ بہ ظاہر زندہ نظر آتا ہو، مگر مقصد کے اعتبار سے اس نے خودکشی کر لی ہو۔ دنیا کی نمائشی چیزوں میں دلچسپی مادی سازوسامان کی کثرت، سطحی مشاغل میں پڑنا، غیر ضروری عادتوں میں اپنے کو ڈالنا، پست لٹریچر کا مطالعہ ــــ یہ وہ چیزیں ہیں جو آدمی کو مقصد سے دور کر دیتی ہیں، اس کے وقت کو غیر ضروری مشغولیتوں میں لگا دیتی ہیں، اس کے جذبات واحساسات کو مقصد کے بارے میں کمزور کر کے دوسری چیزوں کے بارے میں شدید کر دیتی ہیں۔ اس کو ایسے تعلقات اور ایسے تقاضوں میں الجھا دیتی ہیں کہ وہ نہ چاہنے کے باوجود دوسری طرف کھنچتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اپنے مقصد سے دور ہو جاتا ہے۔

اگر آپ کو اسلام عزیز ہے اور آپ اس کو اپنا مقصد بنا کر اسی کے لئے جینا اور اسی کے لئے مرنا چاہتے ہیں تو آپ کے لئے لازم ہے کہ اپنی عملی زندگی، اپنے تعلقات اور اپنی روزانہ کی مصروفیتوں کو اس سے ہم آہنگ رکھیں، آپ دونوں میں کوئی تضاد پیدا نہ ہونے دیں۔ اس معاملے میں آپ کو اس ہوشیار طبیب کی طرح بن جانا چاہیئے جو اپنی انگلیوں تک کی اس حیثیت سے حفاظت کرتا ہے کہ وہ ایسے حالات سے دوچار نہ ہوں کہ وہ نبض دیکھنے کی صلاحیت کو کھو دیں پھر ایک مسلمان کا مقصد اس سے زیادہ نازک اور اس سے زیادہ مشکل ہے، اس لئے آپ کو اس سے زیادہ ہوشیاری کے ساتھ اپنی حرکات پر نظر رکھنی چاہیئے۔

۳۔ تیسری چیز با مقصد آدمی کو پہچاننے کی یہ ہے کہ اس کے عمل میں مقصد کی روح موجود ہو۔ یہاں "عمل" سے میری مراد عام عمل نہیں ہے، بلکہ وہ عمل ہے جو مقصد کے تعلق سے ظاہر ہوتا ہے۔ آپ تعجب نہ کریں۔ مقصد سے متعلق عمل بھی کبھی بے مقصد ہوتا ہے۔ بہ ظاہر آدمی مقصد کا سا عمل کر رہا ہوتا ہے، مگر حقیقتاً اس کے عمل کا مقصد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ایک مثال لیجئے۔ ہمارے یہاں جو مذہبی فرقے ہیں ان کی ابتدا بھی اصلاً ایک مقصدی گروہ کی حیثیت سے ہوئی تھی۔ وہ ایک مخصوص مشن لے کر اٹھے تھے مگر ہر شخص جانتا ہے کہ آج وہ اپنی مقصدی حیثیت کو کھو چکے ہیں۔ وہ تحریک کے بجائے ایک جامد قسم کی روایتی انجمن بن کر رہ گئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کا مقصدی تصور ان کے ذہن سے نکل گیا، اور نہ ایسا ہے کہ مقصد کے لئے کام کرنا انھوں نے چھوڑ دیا ہے۔ یہ سب چیزیں آج بھی کسی نہ کسی شکل میں ان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ مگر ان میں اب وہ اسپرٹ باقی نہیں رہی جو ایک مشن کے علم بردار کے اندر ہوتی ہے۔

اب ان کا مقصد محض ایک بحث و گفتگو کا موضوع ہے جس پر وہ کبھی آپس میں کبھی دوسروں سے باتیں کر لیتے ہیں۔ ان کے رسالے اور اخبار نکلتے ہیں۔ مگر ان رسالوں اور اخباروں کی حیثیت مقصدی پرچوں سے زیادہ کاروباری اداروں کی ہے۔ ان کے اجتماعات بھی ہوتے ہیں۔ مگر ان اجتماعات کی حیثیت کسی مقصدی سرگرمی کی نہیں۔ بلکہ وہ ماضی کی پڑی ہوئی ایک لکیر ہے جس پر وہ رسمی طور پر چلے جا رہے ہیں۔ ان کے جماعتی فنڈ بھی ہیں جن میں وہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ دیتے ہیں۔ مگر یہ دینا زیادہ تر جماعتی تقاضے کے تحت ہوتا ہے نہ کہ حقیقۃً انفاق فی سبیل اللہ کے جذبے کے تحت۔ وہ اپنے خیالات کو پھیلانے کے لئے دورے اور تقریریں کرتے ہیں۔ مگر یہ سب کسی مقصدی بے تابی کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ یا تو محض روایتی ذوق کا اظہار ہوتا ہے یا اسی قسم کے جذبے کے تحت ہوتا ہے جیسے کسی فرم کی پبلسٹی برانچ کا افسر اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے لئے کیا کرتا ہے۔ وہ اپنے مخصوص موضوعات پر کتابیں اور پمفلٹ چھاپتے ہیں۔ مگر اس کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی کہ ایک بنے ہوئے حلقہ کی مانگ پوری کر دی جائے۔

وہ عمل جو حقیقۃً داعیانہ جذبے کے تحت نکلتا ہے اور وہ عمل جو روایتی طور پر یا محض ڈیوٹی انجام دینے کے لئے کیا جاتا ہے، دونوں میں بڑا فرق ہے۔ ایک حقیقت ہے اور دوسرا حقیقت کی نقل۔ ایک جگہ بات صرف حلق سے نکلتی ہے اور دوسری صورت میں آدمی جب بولتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے کلام میں اپنی پوری شخصیت کو انڈیل دیا ہے۔ ایک صورت میں آدمی کا عمل صرف ایک لگی بندھی کاروائی نظر آتا ہے، اور دوسری صورت میں اس کا عمل اس کے بے تاب جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک صورت میں آدمی کی تمام زندگی سراپا اس کے مقصد میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے اور دوسری صورت میں بعض مقصد نما اجزا اس کی غیر متعلق زندگی کے ساتھ اس طرح ادھر اُدھر اٹکے ہوئے ہوتے ہیں جیسے کسی مینار میں آم کے چند پتے۔

یہ خطرہ ہر اس گروہ کو ہے جو ایک مقصد کو لیکر اٹھے اور اس پر اس کو پچیس پچاس سال گذر جائیں۔ لیکن یاد رکھئے کوئی گروہ اسی وقت تک مقصدی گروہ ہے جب تک حقیقۃً وہ مقصدی تڑپ کے تحت کام کر رہا ہو۔ اس کے بعد جب اس کی گاڑی اس سے اتر کر روایتی ڈگر پر چل پڑے، جب اس کی سرگرمیاں بے تابانہ جذبات کے اظہار کے بجائے مقررہ کاروائی بن کر رہ جائیں، تو وہ تحریک کے بجائے رسم اور جماعت کے بجائے انجمن بن جاتی ہے۔ اس کے بعد بھی اگرچہ شکلاً وہ ایک با مقصد گروہ کے مانند نظر آتا ہے۔ مگر مقصدی حیثیت سے اب اس پر موت وارد ہو چکی ہوتی ہے۔

وہ بامقصد انسان نہیں ہوتا۔ بلکہ سابقہ بامقصد انسان کی لاش ہوتی ہے جو دیکھنے میں سابقہ انسان کی طرح نظر آتی ہے، مگر حقیقتہً انسان نہیں ہوتی ——— اللہ کو جو چیز مطلوب ہے وہ کوئی رسمی ڈھانچہ یا کوئی تنظیمی کارگزاری نہیں ہے۔ ایسے ڈھانچہ یا کارگزاری کا نمونہ تو مشینی انسان بھی پیش کرسکتے ہیں۔ اللہ کو ہمارے زندہ شعور اور ہمارے بیدار ارادہ کا نذرانہ مطلوب ہے۔ اللہ کو ہمارے عمل کا تقویٰ پہنچتا ہے نہ کہ عمل کے ظاہری ہنگامے۔ عمل کے دوران ہم اپنے شعور کو جس طرح متحرک کرتے ہیں، ہماری نفسیات میں جو اندرونی ہلچل پیدا ہوتی ہے، عمل کرتے ہوئے ہمارے قلب و روح کو جو حیاتی غذا ملتی ہے وہی ہمارا اصل حاصل ہے۔ جب مقصدیت زندہ ہو تو آدمی کا عمل ایک زندہ عمل ہوتا ہے اور جب مقصدیت مرجاتی ہے تو عمل ایک بے روح کارروائی بن کر رہ جاتا ہے۔ آدمی حرکت کرتا ہے مگر اس کی روح پر جمود طاری رہتا ہے۔ آدمی ظاہری کارنامے دکھاتا ہے مگر آدمی کا اندرونی وجود اس طرح سویا رہتا ہے جیسے اس پر نیند طاری ہوگئی ہو۔ آدمی اوپر سے زندہ دکھائی دیتا ہے مگر اندر سے وہ ایک مرا ہوا انسان ہوتا ہے۔

اب میں ایک آخری بات کہہ کر اپنی گفتگو کو ختم کروں گا۔ اس طرح کی باتیں جب کہی جاتی ہیں تو بعض لوگ جواب دیتے ہیں ——— "آپ کی باتیں تو سب ٹھیک ہیں، ہم خود بھی اپنے اندر یہی چیز پیدا کرنا چاہتے ہیں، مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ چیز کیسے پیدا ہو۔" یہ بظاہر ایک سوال ہے مگر حقیقتہً اس کے ذریعے سے اپنے الزام کو اپنے سے ہٹا کر اسے خارج کے اوپر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر سوچئے کہ وہ خارج جس کے اوپر آپ اپنا الزام ڈالنا چاہتے ہیں وہ کون ہے ظاہر ہے کہ وہ اس دنیا کا مالک خدا ——— ہے۔ اسی نے ساری چیزوں کو بنایا ہے۔ اس لئے خارج کو الزام دینے کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے یہ دنیا اس ڈھنگ سے بنائی ہے کہ ہم وہاں اپنے ایمانی تقاضوں کو حاصل کرنا چاہیں تو حاصل نہ کرسکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بالکل غلط بات ہے۔ خدا اس سے پاک ہے کہ اس پر یا اس کی تخلیق پر اس قسم کا الزام عائد ہوسکے۔ اس لئے خارج پر جب الزام ڈالا نہیں جاسکتا تو لامحالہ وہ آپ کی طرف لوٹے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اپنی ذات کے سوا اور کوئی نہیں ہے جو ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والا ہو۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ فطرت اور حقیقت میں تضاد نہیں ہوسکتا۔ اگر یہ حقیقت ہے کہ ہم کو ایسا ہی بننا چاہئے تو لازماً ہماری فطرت اور کائنات کو ایسا ہونا چاہئے کہ ہم ایسے بن سکیں۔

اس لئے ہر خرابی کا سبب اپنے اندر ڈھونڈیئے کیوں کہ آپ کے باہر درحقیقت کوئی چیز ہی نہیں ہے جہاں یہ اسباب پائے جارہے ہوں (الفرقان محرم ۱۳۸۴ھ)

(جماعت اسلامی ضلع اعظم گڑھ کے ایک اجتماع میں کی گئی تقریر۔ ۱۹۶۳)

یہ بے حسی کیوں

مجھ کو جب یہ حکم ملا کہ اس وقت کی مجلس میں مجھے کچھ کہنا ہے، تو میں نے سوچنا شروع کیا کہ وہ کیا بات ہے جو مجھے آپ سے کہنی چاہئے۔ یہ چونکہ نصیحت، یا قرآن کے الفاظ میں تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کی مجلس ہے، اس لئے اس مناسبت سے بہت سی باتیں ذہن میں آئیں۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک سوال نے میرے سلسلۂ خیال کو توڑ دیا ——— "تم جو باتیں سوچ رہے ہو کیا وہ سننے والوں کے لئے نئی ہیں، کیا ان کے کان بار بار یہ وازیں نہیں سن چکے ہیں۔ پھر جن الفاظ نے اس سے پہلے کوئی اثر نہیں دکھایا، وہی الفاظ ایک مرتبہ اور دہرا دینے سے کیا انقلاب آجائے گا" اس سوال کا آنا تھا کہ میرے سارے خیالات اس طرح منتشر ہو گئے جیسے یکایک ہوا کا تیز جھونکا آئے اور تنکوں اور پتوں کے ڈھیر کو اڑا لے جائے۔

اب میں دم بخود تھا۔ "آخر اس بے حسی کی وجہ کیا ہے" یہ سوال میرے سامنے گھومنے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے ساری باتیں کہہ ڈالی ہیں اور اب میرے پاس آپ سے کہنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔ میری مثال اس مقرر کی سی ہو گئی جو اپنی پوری تقریر ختم کر چکا ہو۔ مگر ساری قوت صرف کرنے کے بعد آخر میں جب وہ حاضرین سے کہے کہ لگائیے نعرہ "انقلاب زندہ باد"، تو سامنے بیٹھے ہوئے ہزاروں انسانوں میں سے کسی ایک کی زبان بھی حرکت میں نہ آئے۔ وہ بار بار کہے کہ "لگائیے نعرہ" مگر ہر شخص اس طرح خاموش بیٹھا رہے گویا کسی کے منھ میں زبان ہی نہیں ہے۔ عین اس وقت مجھے دور سے ایک آواز سنائی دی۔ مجھے نظر آیا کہ امام ترمذی سے لے کر کعب بن عیاض تک انسانوں کی ایک جماعت ایک دوسرے کو پکار رہی ہے کہ آخری رسول کا یہ پیغام اس بندۂ خدا تک پہنچا دو، کیوں کہ اسی پیغام میں اس کے سوال کا جواب ہے:

حدثنا احمد بن منیع نا الحسن بن سوّار نا لیث بن سعد عن معاویۃ بن صالح عن عبد الرحمٰن بن جبیر بن نفیر حدثه عن ابیه عن کعب بن عیاض قال سمعت النبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: ان لکل امۃ فتنۃ وفتنۃ امتی المال (ترمذی، ابواب الزہد)

امام ترمذی سے کہا احمد بن منیع نے، ان سے کہا حسن بن سوار نے، ان سے کہا لیث بن سعد نے، ان سے کہا معاویہ بن صالح نے، ان سے کہا عبد الرحمٰن بن جبیر نے، ان سے کہا ان کے باپ نے، ان سے بیان کیا کعب بن عیاض نے، انھوں نے کہا کہ میں نے سنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے، آپ نے فرمایا۔ ہر امت کا ایک فتنہ تھا اور میری امت کے لئے جو چیز فتنہ بنے گی وہ مال ہے۔

اس فقرے میں "مال"، دراصل "دنیا" کا قائم مقام ہے۔ کیوں کہ دنیا کی وہ تمام چیزیں جن کو عاجلہ پسند انسان للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے وہ مال ہی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں۔ مال دنیا کے ساز و سامان کی قیمت ہے۔ جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے، یہی دنیا ہر زمانے میں انسانوں کی گمراہی کا سبب رہی ہے۔ مگر بعد کے دور

میں یہ فتنہ پوری شدت سے ظاہر ہونے والا تھا۔ اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خاص طور پر امت اسلامیہ کا فتنہ قرار دیا۔ پہلے آدمی جن لذائذ ونعم کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا وہ آج سائنسی تحقیقات کے نتیجہ میں واقعہ بن کر انسان کو حاصل ہوچکی ہیں۔ یہی نہیں، پہلے دنیا کی جو رنگینیاں اور اس کے دل کش ساز و سامان صرف کسی بادشاہ کے محل میں ہوتے تھے، وہ آج خوب صورت الماریوں میں سجے ہوئے بازار کے اندر نظر آتے ہیں، وہ آج در و دیوار پر رنگین اشتہارات کی صورت میں لگے ہوئے ہیں، وہ پوری رعنائی کے ساتھ سڑکوں پر ظاہر ہوکر ہر راہ گیر کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا اس سے پہلے کبھی اتنی حسین نہیں تھی، اس لئے وہ اس سے پہلے انسان کے لئے اتنا بڑا فتنہ بھی نہیں بن سکتی تھی۔

یہاں میں ایک واقعہ کا ذکر کروں گا جو ابھی حال میں اخبارات میں آیا تھا۔ نئی دہلی میں ہندوستان کے بین اقوامی صنعتی میلہ میں امریکہ کی طرف سے ایک ہوائی موٹر کار کی نمائش کی گئی ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زمین پر بھی چلتی ہے اور ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہوا میں بھی اڑ سکتی ہے۔ اس عجیب و غریب کار کو جب ایک نوجوان سادھو نے دیکھا تو اس کے سامنے ایک نیا مسئلہ پیدا ہوگیا "کیا میں تیاگ اور قربانی کی زندگی کو چھوڑ کر مادی ترقیات کی دنیا میں اپنے حوصلوں کی تسکین ڈھونڈھوں" سادھو نے کہا۔ گیروے کپڑے میں ملبوس اور لمبے بکھرے ہوئے بالوں والا یہ ہندوستانی نوجوان بیس منٹ تک اس امریکی کار کو دیکھتا رہا جس کو نمائش کے ذمہ داروں نے مستقبل کی کار Car of the Future کا نام دیا ہے جب اس کے بارے میں سادھو کا تبصرہ پوچھا گیا تو اس نے گہرے تاثر کے ساتھ جواب دیا "اس نے مجھے اس سوچ میں ڈال دیا ہے کہ دونوں دنیاؤں میں سے وہ کون سی دنیا ہے جس کو میں اپنے لئے زیادہ بہتر سمجھوں" (ہندوستان ٹائمس ۲۰ نومبر ۱۹۶۱) یہ واقعہ بتاتا ہے کہ مادی ساز و سامان نے آج کس طرح ہر شخص کو اس خطرے میں مبتلا کردیا ہے کہ وہ ان کی ظاہری چمک دمک سے متاثر ہوکر زندگی کی اصل حقیقت کو بھول جائے۔

اس حدیث سے میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ امت محمدیہ کے افراد میں جب کوئی کمزوری نظر آئے تو اس کے اسباب سب سے پہلے دنیا کے فتنوں میں تلاش کرنے چاہئیں۔ جب اس امت کا فتنہ دنیا ہے تو امت کی خرابیاں بھی دنیا ہی کی پیدا کی ہوئی ہوں گی۔ جب میں نے اس حیثیت سے غور کیا تو بالآخر میرا ذہن اس پر مطمئن ہوگیا کہ دنیا ہی وہ سب سے بڑا روک ہے جو حق کی آواز کو آدمی کے لئے قابل فہم اور قابل قبول بننے نہیں دیتا۔ اسلام کی بلند تر حقیقتوں کو وہی شخص پا سکتا ہے جو دنیا اور دنیا کی چیزوں سے اپنے آپ کو اوپر اٹھا چکا ہو۔ جو اس سے اوپر نہ اٹھ سکے اس کے عین سر کے اوپر حقیقت کی آواز گونج رہی ہوگی مگر اس کو گرفت کرنے کی طاقت سے وہ محروم ہوگا۔ اس کے پاس وہ کان نہیں ہوں گے جس سے وہ سنے اور وہ دل نہیں ہوگا جس سے وہ اسے سمجھے

آپ کی سعادت و ترقی کے تمام امکانات اس وقت تک آپ سے دور رہیں جب تک آپ کی توجہات دنیا کے اندر بکھری ہوئی ہوں۔ آپ کا مومن بننا، آپ کا داعی بننا، آپ کا مجاہد فی سبیل اللہ بننا، سب کچھ منحصر ہے اس بات پر کہ اس

سے پہلے آپ "زھد فی الدنیا" کی کیفیت اپنے اندر پیدا کر چکے ہوں جو رسول کے الفاظ میں ــــ اول صلاحِ هٰذه الامة ہے۔ دنیا پسندی دوسرے لفظوں میں ظاہر پسندی کا نام ہے۔ اور زھد یہ ہے کہ ظاہری چیزوں کے پیچھے جو اصل حقیقت ہے وہ آدمی کے سامنے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا پسندی سطحیت پیدا کرتی ہے اور زھد سے وہ گہری نظر حاصل ہوتی ہے جو چھپے ہوئے واقعات کو بالکل بے نقاب دیکھ لے۔ اور حقیقت سے انتہائی حد تک آشنا ہو کر بول سکے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ما زهد عبدٌ فی الدنیا الا انبت الله الحکمة فی قلبه وانطق بها لسانه وبصره عیب الدنیا وداءها ودواءها واخرجه سالما الی دار السلام (بیہقی فی شعب الایمان)

جو شخص دنیا سے بے رغبت ہو جائے اللہ تعالیٰ اس کے دل میں حکمت پیدا کر دیتا ہے اور اس کی زبان پر کلماتِ حکمت جاری کر دیتا ہے۔ دنیا کے عیب اور اس کا مرض اور علاج اسے دکھا دیتا ہے۔ اور اس کو سلامتی کے گھر (جنت) تک محفوظ لے جاتا ہے۔

یہ حکمت جو زُہد کے صلے میں ملتی ہے، یہ خدا کی سب سے بڑی دین ہے جس کو قرآن میں "خیر کثیر" کہا گیا ہے یعنی سب سے بڑا خزانہ۔ قرآن کے بیان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکمت کا خزانہ اسی کو ملتا ہے جو دوسرے خزانوں سے اپنی نظریں ہٹا لے، جو دنیا کی محبت سے اپنے دل کو خالی کر چکا ہو۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں خدا کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:

یؤتی الحکمة من یشاء ومن یؤت الحکمة فقد اوتی خیرا کثیراً

اللہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے، اور جس کو حکمت دی گئی اس کو سب سے بڑا خزانہ دے دیا گیا۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ "خیر کثیر" اسی کو ملتا ہے جو "خیر قلیل" سے اپنے آپ کو خالی کر لے، جو خیر قلیل میں لپٹا ہوا ہو، وہ خیر کثیر سے اپنا دامن نہیں بھر سکتا۔

میں چاہتا ہوں کہ آج کی صحبت میں اسی زُہد فی الدنیا کے بارے میں کچھ عرض کروں۔ کیوں کہ اپنے مطالعہ اور تجربہ سے میں اس حقیقت پر مطمئن ہو چکا ہوں کہ جب تک کسی کے اندر زُہد کی کیفیت پیدا نہ ہو وہ دین کی اعلیٰ حقیقتوں کا ادراک نہیں کر سکتا اور نہ اس کے اندر کبھی گہرا عمل پیدا ہو سکتا۔ جس شخص کی آخرت طلبی نے اس کو دنیا کا زاہد نہیں بنایا، اس کے درمیان اور قرآن کے درمیان ایک "حجابِ مستور" حائل رہتا ہے۔ وہ سنتا ہے مگر نہیں سنتا، وہ سنتا ہے مگر نہیں سمجھتا۔ (بنی اسرائیل ۴۶-۴۵)

زہد فی الدنیا کے معنی ہیں دنیا سے بے رغبتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا سے دل چسپی کا تعلق ختم کر کے اس سے صرف ضرورت کا تعلق باقی رکھا جائے ــ یہی وہ چیز ہے جس کو حدیث میں التجافی من دار الغرور کہا گیا ہے۔ (دھوکا دینے والی جگہ سے دور رہنا) اس دوری کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ دنیا کے کاروبار سے

الگ تھلگ ہو جائیں۔ زہد دراصل دنیا سے حسیاتی بے تعلقی کا نام ہے نہ کہ عملی بے تعلقی کا۔ جیسا کہ حضرت سفیان ثوری نے فرمایا، زہد خراب کپڑے اور معمولی کھانے کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک کیفیت ہے جو دل کے اندر پیدا ہوتی ہے ظاہری شکلیں اس اندرونی کیفیت کا فطری اظہار ہیں، نہ کہ بجائے خود کسی ظاہری شکل کا نام زہد ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص جھونپڑی میں رہتا ہو مگر اپنے خیالات و احساسات کے اعتبار سے وہ مکمل طور پر ایک دنیا پسند آدمی ہو۔ اور دوسرا شخص اپنے آپ کو عالی شان عمارتوں کے درمیان پائے مگر دنیا پسندی سے اس کا ذہن خالی ہو

زہد کسی مصنوعی تدبیر کا نام نہیں ہے۔ بلکہ وہ آدمی کی ایمانی حالت کا ایک فطری اظہار ہے۔ جب کوئی شخص اعلیٰ حقیقتوں کو پا لیتا ہے تو اسفل حقیقتیں خود بخود اس کی نگاہ میں حقیر بن جاتی ہیں۔ اُخروی قدروں کی اہمیت کا احساس دنیوی قدروں کو غیر اہم بنا دیتا ہے۔ وہ اپنی ایمانی کیفیت کے بالکل لازمی نتیجے کے طور پر دنیا سے بے رغبت ہو جاتا ہے۔ جب آپ کا ذہن خدا کی باتیں سوچنے میں اتنا مصروف ہو کہ آپ دنیا کی باتیں بھولنے لگیں، جب آخرت کی فکر آپ کے اوپر اس طرح چھا جائے کہ دنیا کے غم آپ کو یاد نہ آئیں، جب آنے والے مستقل آرام و تکلیف کا مسئلہ آپ کو اتنا فکر مند بنا دے کہ عارضی آرام و تکلیف کے مسئلے آپ کے لئے بے حقیقت ہو جائیں۔ جب کل کی زندگی آپ کو اس طرح اپنی طرف کھینچ لے کہ آج کی زندگی کے بارے میں آپ لوگوں کو غافل نظر آنے لگیں، جب بلند تر حقائق کی طرف متوجہ ہونے کی وجہ سے آپ دنیا میں اس طرح رہنے لگیں گویا آپ دنیا میں نہیں ہیں۔ جب دنیا میں آپ کوئی آرام دیکھیں تو یہ سوچ کر رو پڑیں کہ معلوم نہیں کہ آخرت میں کیا ہونے والا ہے اور جب کوئی تکلیف ستائے تو آپ کی زبان سے نکلے کہ "خدایا دنیا کی معمولی تکلیف کا یہ حال ہے تو آخرت میں کیا ہوگا"۔ جب دنیا کی لذتیں آپ کو تسکین نہ دے سکیں اور دنیا کی زحمتیں آپ کی نگاہ میں حقیر بن جائیں —— جب آپ کا حال یہ ہو جائے تو اسی کا نام زھد فی الدنیا ہے۔ آنحضور صلعم نے ایک بار اپنے صحابی حضرت عبداللہ بن عمر رض کو پکڑ کر جو نصیحت فرمائی تھی، اس کا ایک فقرہ یہ تھا:

عُدَّ نفسکَ مِنْ اھل القبور (بخاری) اپنے آپ کو قبر والوں میں شمار کرو

گویا اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو دنیا میں بھیجا ہے اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم یہاں کی نعمتوں میں غرق ہوں اور یہاں رہ کر اپنے دل کی تمنائیں پوری کریں۔ بلکہ وہ تو یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ہم میں سے کون ہے جو دنیا کو اپنے حوصلوں اور تمناؤں کا قبرستان بناتا ہے۔

اس تشریح سے خود بخود یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زہد صرف محرمات دنیا سے بچنے کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی حالت ہے جس میں آدمی کو بہت سی جائز چیزوں سے بھی اپنے آپ کو محروم کر لینا پڑتا ہے۔ بے شک جو کچھ اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا ہے وہی حرام ہے اور جو کچھ اس نے حلال کیا ہے وہ سب حلال ہے۔ کسی انسان کو حق نہیں کہ اس میں بال برابر کوئی رد و بدل کر سکے۔ مگر شریعت کی قانونی حدود ہمارے ارتقا کی آخری حدود نہیں ہے۔ دائرہ ایمان میں داخل ہونے کے لئے یقیناً صرف اتنا ہی کافی ہے کہ آدمی احکام کے قانونی تقاضے پورے کر دے۔ مگر ایمان کے اعلیٰ

مراتب کو حاصل کرنے کا ذریعہ قانون نہیں، قربانی ہے، اگر آپ خدا کی راہ میں مسابقت کا جذبہ رکھتے ہیں تو آپ کو اپنی نیند، اپنا آرام، اپنی لذتیں، سب کچھ چھوڑنی پڑیں گی، ذوق اور عادت کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دینا ہوگا۔ حالاں کہ یہ سب کچھ آپ کے لئے جائز ہے اور ان میں سے کوئی بھی چیز شریعت نے حرام نہیں قرار دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری تمام راہوں کی طرح اسلام کی راہ میں بھی ترقی صرف اسی کے لئے ہے جو قانونی تقاضوں سے بلند ہو کر کام کرنے کا جذبہ رکھتا ہو۔ جو یہ نہ دیکھتا ہو کہ دنیا کی چراگاہ میں اس کے لئے کیا کیا جائز ہے بلکہ جس کی نگاہ اس پر لگی ہوئی ہو کہ کتنے عظیم امتحان میں اسے پیش ہونا ہے اور اس کے لئے کتنی بے پناہ تیاریوں کی ضرورت ہے۔ ایسا شخص یقیناً بہت سی ایسی چیزوں سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہ جائے گا جو اس کے لئے شرعاً حلال تھیں۔ جیساکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

لا يبلغ العبد ان يكون من المتقين حتى يدع مالا باس به حذرا لما به باس (ترمذی، ابن ماجہ)

کوئی شخص متقیوں میں شمار کئے جانے کے قابل نہیں ہو سکتا جب تک اس کا یہ حال نہ ہو جائے کہ وہ ان چیزوں کو چھوڑ دے جن میں کوئی حرج نہیں ہے ایسی چیزوں سے بچنے کی خاطر جن میں واقعتاً حرج ہے۔

اس "چھوڑنے" کی دو صورتیں ہیں۔ ایک، ایسی چیزوں کو چھوڑنا جو بذات خود مشتبہ ہوں۔ دوسرے، ایسی چیزوں کو چھوڑنا جو بذات خود مشتبہ نہ ہوں مگر ان کے متعلق یہ شبہ ہو کہ وہ آدمی کو غلط انجام تک پہنچا سکتی ہیں۔

پہلی صورت میں متعلقہ چیز کی حرمت کا یقین تو نہیں ہوتا مگر اس کی حلت کے بارے میں بھی ذہن پوری طرح مطمئن نہیں ہوتا۔ اس لئے آدمی احتیاط کی بنا پر اسے ترک کر دیتا ہے۔ دوسری صورت میں متعلقہ چیز اصلاً بالکل جائز ہوتی ہے مگر یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ ایسے نتائج پیدا کرے گی جو صحیح نہ ہوں۔ مثلاً دنیا کا عیش و آرام فی نفسہ بالکل جائز ہے۔ مگر ایک حساس مومن ان سے صرف اس لئے بچتا ہے کہ وہ ڈرتا ہے کہ اس میں پڑ کر اس کا نفس موٹا ہو جائے گا۔ اس کے درمیان اپنے آپ کو پاکر وہ اور اس کے اہل خاندان غلط قسم کے احساس برتری میں مبتلا ہو جائیں گے، دنیا کی آسودہ زندگی "کامیابی" کا غلط احساس پیدا کرے گی اور اس طرح آخرت میں کامیابی حاصل کرنے کی فکر نفسیاتی طور پر مضمحل ہو جائے گی۔

زہد فی الدنیا سے وہ انسان کیسے بنتا ہے جو ترقی کے اعلیٰ مراتب طے کر سکے، اس کے بہت سے پہلو ہیں، میں یہاں چند خاص پہلوؤں کا ذکر کروں گا۔

ا۔ زہد فی الدنیا سے جو چیزیں حاصل ہوتی ہیں ان میں پہلی چیز وہ ہے جس کو میں استغراق یا ذہنی یکسوئی کے لفظ سے تعبیر کروں گا۔ دنیا سے جتنا زیادہ آپ کا تعلق ہوگا اتنا ہی زیادہ آپ کے خیالات منتشر ہوں گے، اور یہ تعلق جتنا کم ہوگا اتنا ہی آپ اپنے خیالات کو یکجا کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ حقیقت ایک نہایت لطیف چیز ہے اس لئے اس کو گرفت کرنے کے لئے غیر معمولی ذہنی ارتکاز بہت ضروری ہے جس نے اپنی فکر کو مختلف سمتوں میں پھیلا

رکھا ہو وہ ہرگز اعلیٰ حقائق کا ادراک نہیں کر سکتا۔ تاریخِ سائنس کا عظیم ترین نام "نیوٹن" اپنے پیچھے جو عظمت رکھتا ہے اس کا سب سے بڑا راز نیوٹن کا ذہنی استغراق تھا۔ وہ اپنے بچپن میں Wool Gatherer کہا جاتا تھا۔ یعنی کھویا ہوا شخص۔ لوگ اسے نیوٹن کا طبعی نقص سمجھتے تھے۔ مگر بعد کو معلوم ہوا کہ اس کی یہ کیفیت اس کی استغراقی صلاحیت کی وجہ سے تھی۔ وہ کسی مسئلہ خاص پر ذہن کو بالکل مرتکز کر کے سوچنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا تھا۔ اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے وہ بہت جلد مسائل کی تہ تک پہنچ جاتا تھا۔ اور انتہائی پیچیدہ سوالات جن کے حل کرنے میں دوسرے لوگ مہینوں لگا دیتے تھے وہ انہیں گھنٹوں میں حل کر کے رکھ دیتا تھا۔

اگر آپ اس کے کمرے میں داخل ہوں تو آپ کے سامنے کتابوں اور کاغذات کی ایک بے ترتیب دنیا ہوگی جس میں کسی اہتمام کے بغیر ایک شخص اس طرح کھڑا یا بیٹھا ہوا نظر آئے گا جیسے نہ کوئی مجسمہ ہے جو کسی اسکیم کے بغیر اس ڈھیر میں لاکر ڈال دیا گیا ہے۔ مشہور سائنس داں اڈمنڈ ہیلی Edmund Halley جس کے نام پر ایک دمدار ستارہ ہیلی کامٹ Halley Comet کہا جاتا ہے۔ اس نے یہ دمدار ستارہ معلوم تو کر لیا تھا مگر اس کے مدار کا حساب لگانے میں وہ کوشش کے باوجود ناکام رہا۔ اس سلسلے میں مدد لینے کے لئے وہ نیوٹن کے پاس گیا۔ وہاں یہ سن کر اسے سخت حیرت ہوئی کہ الجھے ہوئے بالوں والا یہ آدمی اس کو پہلے ہی حل کر چکا ہے۔ اس نے اس کا حساب دیکھنا چاہا۔ مگر یہ نیوٹن کا کمرہ تھا۔ کوشش کے باوجود بکھرے ہوئے بے ترتیب انبار میں متعلقہ کاغذ برآمد نہ ہو سکا۔ نیوٹن نے فوراً ہی ایک سادہ کاغذ لیا اور اس انتہائی پیچیدہ ریاضیاتی سوال کو دوبارہ حل کر کے اسی وقت ہیلی کے سامنے رکھ دیا۔ ہیلی اس واقعہ سے بہت متاثر ہوا جب اسے معلوم ہوا کہ نیوٹن کی تصنیف Principia ابھی تک اس کے ڈسک کے ایک خانہ میں ردی کاغذات کی طرح بھری ہوئی رکھی ہے، تو اس نے کہا کہ ایسے قیمتی دماغ کے افکار اس طرح پڑے رہنے کے لئے نہیں ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے خرچ سے اس کو چھپانے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح نیوٹن کی یہ کتاب پہلی بار دنیا کے سامنے آئی۔

نیوٹن صرف مادی دنیا کے کچھ حقائق جاننا چاہتا تھا، اس کے لئے اُسے اس طرح مستغرق ہونا پڑا کہ وہ اپنا کھانا، اپنا سونا، اپنا آرام، اپنا ذوق، اپنی عادتیں، سب بھول گیا۔ تو آپ جو غیر مادی حقائق کا تصور اپنے ذہن میں جمانا چاہتے ہیں، ان کو شدید ذہنی استغراق کے بغیر کس طرح پا سکتے ہیں۔ آسمان پر جو ستارے جگمگاتے ہوئے نظر آتے ہیں ان کی حرکت کے قوانین منضبط کرنے کے لئے نیوٹن کو افکار میں اتنا ڈوبنا پڑا گویا اس نے اپنے آپ کو دنیا سے اٹھا کر اسی خلا میں پہنچا دیا ہے جہاں یہ روشن اجسام حرکت کر رہے ہیں۔ پھر وہ حقیقتیں جو ستاروں سے بھی دور ہیں، جو ٹمٹماتی ہوئی شکل میں بھی آنکھوں کو نظر نہیں آتیں، ان کو بے پناہ ذہنی یکسوئی کے بغیر کیسے گرفت کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ اس طرح خدا کی عبادت کریں گویا کہ آپ اسے دیکھ رہے ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ قیامت اور جنت دوزخ کا تصور ہر وقت آپ کی نگاہوں کے سامنے رہے، اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ ایسے ہو جائیں کہ آپ جہاں ہوں اور جو کام بھی کر رہے ہوں، ہر حال میں آپ کا سینہ "ذکر کثیر" سے لبریز رہے۔ اگر آپ اپنے اندر

وہ شدید یقین اور وہ زبردست استحضار دیکھنا چاہتے ہیں جو دل کو پگھلا دے اور آنکھوں کو اشکبار کر دے تو یہ سب کچھ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ آپ حدیث کے الفاظ میں "تشعّب ہموم" کو ختم کر کے اپنی ساری نظریں صرف ایک نقطہ پر لگا دیں۔ ارجن کے مشہور واقعہ کی طرح آپ کو درخت اور چڑیا اور پتے اور پھل نظر نہ آئیں بلکہ صرف ایک چیز نظر آئے ——— "شکار کی بائیں آنکھ"

جب آپ یہ ذہنی گم شدگی اور یہ استغراق اپنے اندر پیدا کریں گے تو عادت اور ذوق کے تقاضے آپ کا ساتھ چھوڑنے پر مجبور ہوں گے، لذتوں اور آسائشوں کا خیال مدھم پڑ جائے گا۔ فکر کی زیادتی جسمانی تقاضوں پر غالب آنے لگے گی۔ آپ کا ہنسنا اور بولنا کم ہو جائے گا، تصوراتی دنیا کو پانے کی کوشش میں آپ مادی دنیا سے دور ہوتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اس وقت ممکن ہے لوگ کہیں تم پاگل ہو گئے ہو۔ مگر اس سے گھبرائیے نہیں، کیونکہ یہی وہ صحیح ترین خطاب ہے جو کسی بامقصد آدمی کو اہلِ دنیا کی طرف سے دیا جا سکتا ہے۔

۲۔ زہد فی الدنیا کے ذریعہ دوسری چیز جو حاصل ہوتی ہے وہ لطافت روح ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مادی دنیا میں آدمی جتنا زیادہ مشغول ہوگا۔ اس کی روح میں اسی قدر کثافت پیدا ہوگی۔ اور جتنا وہ اس سے اپنے آپ کو دور لے جائے گا اسی کے بقدر اس کی روح پاک اور خالص ہوتی چلی جائے گی۔ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں رہبانیت کی تبلیغ کر رہا ہوں، رہبانیت دنیا سے اپنے آپ کو الگ کر لینے کا نام ہے حتیٰ کہ اس مقصد سے اگر کوئی شخص اپنے آپ کو مار ڈالے تو یہ بھی رہبانی فلسفہ کے مطابق جائز ہوگا۔ اس کے برعکس زہد یہ ہے کہ آدمی مکمل طور پر اسی دنیا میں ہو۔ مگر اس سے بے رغبت ہو چکا ہو۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے ذہنی حیثیت سے اس سے باہر نکل جائے۔ مومن بھی یقیناً راہب ہوتا ہے۔ مگر اس کی رہبانیت حسّی رہبانیت ہے جب کہ دوسرے مذاہب جسمانی رہبانیت میں عقیدہ رکھتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ نے کسی کے سینے میں دو دل نہیں بنائے" اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے احساسات کسی ایک ہی چیز کے بارے میں شدید ہو سکتے ہیں۔ وہ دو سمتوں میں حرکت نہیں کر سکتے۔ اگر آپ دنیا اور اس کے ساز و سامان کو اہمیت دینے لگیں تو آخرت کا خیال آپ کے اندر کمزور پڑ جائے گا اور اگر آپ آخرت کی فکر میں مشغول ہوں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا کے بارے میں آپ پر غفلت طاری ہونے لگے گی۔ جو شخص دنیوی قدروں کو اہمیت دیتا ہے، اس کا لازمی مطلب یہ ہے کہ وہ اُخروی قدروں کو پامال کر رہا ہے۔ آپ کو ایسے "خوش مذاق" ملیں گے جن کے کھانے کی پلیٹ میں مکھی پڑ جائے تو وہ اس کو کھانا پسند نہیں کریں گے۔ دوسری طرف ان کے اسلام میں کتنی ہی مکھیاں پڑی سڑ رہی ہوں گی۔ مگر اس کی عفونت کا انھیں اندازہ نہ ہوگا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ دنیا کی طرف رغبت نے آدمی کی حسیات کو دنیا کے بارے میں تو بہت تیز کر دیا، مگر اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ آخرت کے بارے میں اس کی حسیات کند ہو کر رہ گئیں۔

یہ دنیا جو آپ کے جسم کو موٹا کرتی ہے۔ یہ آپ کی روح کی قاتل ہے۔ اگر آپ اس کے اندر لذت ڈھونڈنے

لگیں۔ اگر اس کے سطحی اور ظاہری ساز و سامان آپ کو اپنی طرف کھینچ لیں، تو وہ آپ سے آپ کا سب سے بڑا جوہر چھین لیں گے۔ اس کے بعد آپ کے نازک جذبات مردہ ہو جائیں گے، آپ کے اندر وہ لطیف احساسات ابھر نہیں سکتے جو اعلیٰ ترین حقائق کا ادراک کرتے ہیں۔ جن پر تجلیات الٰہی کا نزدل ہوتا ہے۔ جس کے بعد آدمی تمام حجابات سے بلند ہو کر حقیقت کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے جس کے اندر دنیا سے بے رغبتی پیدا نہیں ہوئی، اس کے اندر گویا وہ صلاحیت ہی پیدا نہیں ہوئی جو کسی حقیقت کو سمجھے اور اسے قبول کر سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسے دل میں حکمت کا "انبات" نہیں ہو سکتا۔ جس زمین میں اخذ کی صلاحیت نہ ہو وہ کیسے کسی بیج کو قبول کرے گی اور اس کے اندر ڈالا ہوا دانہ نشو و نما پا کر پورا درخت کیسے بن سکتا ہے۔ یاد رکھئے، حقیقت ایک غیر مادی چیز ہے۔ اس لئے وہ روح جو مادی آلائشوں میں پھنسی ہوئی ہو، وہ حقیقت کو بے نقاب حالت میں نہیں دیکھ سکتی۔ اس کا مشاہدہ ہمیشہ دھندلا مشاہدہ ہوگا جس میں حقیقت کے بعض رُخ دکھائی دیں گے اور بعض رخ نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے۔

روح کی لطافت اور کثافت کوئی تصوف کا پُراسرار مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ بالکل ایک سادہ سی حقیقت ہے جس کو ہر شخص معمولی غور و فکر سے سمجھ سکتا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ آپ کا جو حیاتی اور تصوراتی وجود ہے وہ کسی اور کی محبت میں اٹکا ہوا ہے یا اس نے اپنے آپ کو دوسری تمام چیزوں کی گرفت سے بالکل خالی کر دیا ہے تاکہ مالکِ حقیقی کی یاد آپ کی روح کو اپنا مسکن بنا سکے۔ گرمیوں میں اگر مسجد میں بجلی کا پنکھا چلایا جائے اور اس کی ہوا میں نماز ادا کی جائے تو ظاہر ہے کہ کوئی اسے ناجائز نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اگر دل اللہ کے ذکر سے خالی ہو تو یہ حال ہوتا ہے کہ مسجدوں میں نماز کے لئے آنے والے پنکھے کے نیچے جگہ حاصل کرنے کے لئے مسابقت کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ نماز کے دوران میں اگر کرنٹ رکنے کی وجہ سے پنکھا بند ہو جائے تو سلام پھیرتے ہی ہر شخص کی نظریں اوپر اٹھ جاتی ہیں اور نماز کے بعد پاور سپلائی کے انتظام کی خرابی وہ اہم ترین موضوع ہوتا ہے جس پر لوگ اپنے جذبات اور اپنی معلومات کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کی آرام طلبی نے آپ کی روح کو گندا کر دیا۔ اس میں گرمی اور سردی کے مسائل نے اپنے آشیانے بنا لئے۔ ظاہر ہے کہ ایسا آدمی وہ نماز نہیں پڑھ سکتا جو ساری لذتوں سے بڑھ کر لذیذ ہے۔ جس میں مشغول ہو کر آدمی گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتا ہے، جب ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ اپنی دنیا سے نکل کر خدا کی دنیا میں پہنچ گیا ہے۔

مجھ کو بار بار اس کا تجربہ ہوا کہ ایک شخص اپنے ذوق اور اپنی عادتوں کے معاملے میں تو نہایت حساس ہے۔ اپنے طبعی تقاضوں میں کمی کو وہ کسی حال میں برداشت نہیں کرتا۔ مگر ایسے معاملات جو خدا اور آخرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو اس کی دوامی زندگی کو بہتر یا بدتر بنانے والے ہیں ان میں وہ اکثر نہایت سنگین حقیقتوں کو اس طرح نظر انداز کر دیتا ہے گویا ان کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ اس کے سامنے آپ قرآن و حدیث کے صریح ارشادات پیش کیجئے، مگر وہ ایسے سرسری جوابات دے کر بات کو ٹال دے گا کہ آپ حیرت میں یہ سوچتے رہ جائیں گے کہ "دوبارہ ان کا کوئی جواب بھی دوں یا نہیں" اس کی وجہ یہی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو دنیا سے اوپر اٹھا نہیں سکا۔ اس کے ایمان بالآخرۃ نے

اس کی روح کو ابھی تک دنیا کی کثافتوں سے پاک نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کی حسیات انھیں معاملات میں زیادہ کام کریں گی جہاں وہ عملاً پڑا ہوا ہے۔ مگر جس دنیا سے وہ دور ہے جہاں اس نے ابھی تک اپنے آپ کو پہنچایا نہیں اس کی حقیقتوں کو وہ کیسے گرفت کر سکتا ہے اور ان کے ذکر سے کس طرح اس کے اندر ہل چل برپا ہو سکتی ہے ——— شخصیت پرستی کسی کے ذہن کی تمام کھڑکیاں بند کر دے تو حق کی روشنی اس کے اندر کس راہ سے داخل ہوگی۔

اگر آپ چند آدمیوں کے ساتھ بیٹھے ہوں اور یکایک تار آئے کہ آپ کے اکلوتے لڑکے کا انتقال ہو گیا، تو دوسرے لوگ جیسے پہلے تھے ویسے اب بھی رہیں گے مگر آپ تڑپ اٹھیں گے۔ آپ کی حالت بالکل بدل جائے گی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ جس شخص کے متعلق خبر آئی ہے اس کی خبر سننے کے لئے پہلے سے آپ کے دل کے تمام گوشے خالی تھے اس لئے وہ سیدھی آپ کے دل میں گھس گئی۔ اس کے برعکس بقیہ لوگوں کے دل میں اس نے جانے کا راستہ نہیں پایا کیوں کہ ان کے دل کچھ دوسرے لوگوں کی محبت سے بھرے ہوئے تھے۔ ٹھیک اسی طرح جب قرآن کی "تلاوت" ہو رہی ہو۔ جب کلمات حکمت سنائے جا رہے ہوں، جب کوئی منادی کرنے والا ایمان کی منادی کر رہا ہو، تو اس کی آواز انھیں لوگوں کے دل سے ٹکرائے گی جنھوں نے اپنا سینہ اس کے لئے کھلا رکھا ہو۔ اور جس نے اپنے اندرون کو دوسری پرستشوں کا گودام بنا رکھا ہے اس پر کوئی آواز اثر نہیں کر سکتی، وہ تو اسی وقت سنے گا جب صاعقہ عظیم اس کے کان کے پردے پھاڑ دے۔

۳۔ زہد کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ وہ آپ کے لوازم زندگی میں کمی کر دیتا ہے۔ ہر با مقصد آدمی فطرتاً ایک تضاد میں مبتلا کیا گیا ہے۔ ایک طرف اس کے جسم کے تقاضے ہیں جن کی فہرست کا کوئی شمار نہیں۔ اور دوسری طرف اس کا مقصد ہے جو تقاضا کرتا ہے کہ ساری توجہ اسی کی طرف لگا دی جائے۔ اس تضاد کو ہم بالکلیہ ختم نہیں کر سکتے ہماری بہترین عقل مندی یہ ہے کہ ہم اس میں کمی کی کوشش کریں۔ دنیا کے تمام وہ لوگ جنھوں نے کوئی بڑا کام انجام دیا ہے، وہ اپنے مشن کی تکمیل کے لئے مجبور تھے کہ اپنے لوازم حیات میں ہر ممکن حد تک کمی کریں۔ آپ کے سامنے بھی ایک عظیم مشن ——— دنیا کے سامنے حق کی گواہی دینے کا مشن، ہے۔ اس لئے اگر آپ اسے تکمیل تک پہنچانا چاہتے ہیں تو آپ کو بھی اسی اصول پر عمل کرنا ہوگا۔ البتہ اس میں اسلام کے اپنے نظریۂ زندگی کا لحاظ ضروری ہے۔ میں ہرگز یہ نہیں کہوں گا کہ آپ نیوٹن کی طرح شادی نہ کریں۔ مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ آپ نیوٹن کی طرح سگرٹ نہ پئیں۔ کیوں کہ شادی ایک حقیقی ضرورت ہے جب کہ تمباکو، انسان کی فطری ضرورتوں پر ایک مصنوعی ضرورت کا اضافہ ہے۔

لوازم حیات میں کمی کا یہ پہلو تو بالکل واضح ہے کہ وہ آپ کو اپنے مقصد میں زیادہ حصہ لینے کے قابل بناتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کی دیگر ضروریات کی فہرست جتنی مختصر ہوگی، اسی کے بقدر آپ اپنے مقصد کے کاموں کے لئے زیادہ فارغ ہوں گے۔ خلا کا ایک مسافر راکٹ میں بیٹھ کر تین سو میل فی منٹ کی رفتار سے اڑتا ہے۔ مگر اس سفر میں جن بھاری ملبوسات اور مختلف قسم کے آلات سے وہ لیس ہوتا ہے، ان کو اپنے جسم پر لادے ہوئے زمین پر پیدل چلنا ہو تو وہ چند میل بھی مشکل سے اپنے آپ کو گھسیٹ کر لے جا سکے گا۔ اسی طرح اگر آپ نے اپنی زندگی کو حقیقی ضروریات

کے ماسوا اور بہت سی ضرورتوں کا عادی بنالیا ہے تو ان کو لئے ہوئے آپ زمین پر نہیں چل سکتے۔ جب تک یہ لوازم آپ کے گرد مہیا ہوں آپ متحرک نظر آئیں گے۔ مگر جہاں یہ لوازم رخصت ہوئے، آپ اسی طرح اپنے آپ کو بے بس پائیں گے جیسے مغلیہ سلطنت کے آخری شہزادے پالکی کی سواری کا عادی ہونے کی وجہ سے غدر کے وقت بھاگ نہیں سکے اور ان کے دشمنوں نے محل میں گھس کر ان کے بستروں پر انہیں قتل کیا۔

مگر لوازم حیات کو مختصر کرنے کا ایک اور فائدہ ہے جو اسلامی اعتبار سے اس سے زیادہ قیمتی ہے۔ وہ یہ کہ اس طرح کے لوازم میں جتنی کمی ہوگی اسی کے بقدر آپ کے اندر زیادہ سوز اور اخلاص پیدا ہوگا۔ اگر آپ کو ایک ہزار میل دور سے آکر یہاں تقریر کرنی ہے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرے لئے اسپیشل سیلون میں سفر کرنا ضروری ہے تاکہ جب میں اسٹیشن پر اتروں تو بالکل تازہ دم رہوں اور جلسہ گاہ پہنچ کر اپنے موضوع پر اچھی طرح بول سکوں، بیشک آپ کے لئے ایسا کرنا جائز ہے۔ کسی کو جرأت نہیں کہ اس کے خلاف فتویٰ دے سکے۔ بلکہ بہت سے ظاہر بینوں کو آپ کا زور خطابت اس دلیل کی معقولیت ماننے پر یہاں تک مجبور کر سکتا ہے کہ وہ آپ کے لئے مخصوص سیلون میں سفر کرنا ہی افضل سمجھنے لگیں کیونکہ اس کے بغیر اتنی شان دار تقریر وجود میں نہیں آسکتی تھی۔ مگر میں کہوں گا کہ خدا کو شان دار تقریر مطلوب نہیں ہے۔ اس کو تو آپ کے دل کے ٹکڑے درکار ہیں۔ اور وہ تقریر جس میں آپ کے دل کے ٹکڑے الفاظ بن کر نکلیں، جو دوسروں کو متاثر کرنے سے پہلے خود آپ کو رلادے، جو تقریر نہ ہو بلکہ درد اور تڑپ کا ایک مجسم اظہار ہو۔ وہ تو اسی وقت ممکن ہے جب کہ آپ بے آرامی سے سفر کر کے یہاں پہنچے ہوں جس میں یہاں تک اپنے آپ کو لانے میں آپ نے مشقت اٹھائی ہو جو آپ کے لئے محض سفر نہ ہو بلکہ خدا کی طرف بڑھنے کا ایک مجاہدہ ہو۔ ایسی ہی ایک زبان سے کلمات دردنکل سکتے ہیں۔ دردمند کلام، خدا کا ایک الہام ہے جو براہ راست عالم الغیب والشہادۃ کی طرف سے آپ کے اوپر القا کیا جاتا ہے۔ اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا الہام ایک "قول ثقیل" ہے جو کسی ایسے قلب ہی پر اتر سکتا ہے جو "وطأ شدید" کے مرحلے سے گزر چکا ہو (سورۂ مزمل)

امام احمد اور امام ترمذی کی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بار اپنے رسول کو سونے کی عظیم ترین کان دینے کی پیش کش کی، رسول نے جواب دیا، خدایا نہیں، بلکہ مجھے اس طرح رکھئے کہ کسی روز کھاؤں اور کسی روز بھوکا رہوں۔ تاکہ جب میں کھاؤں تو آپ کا شکر ادا کروں اور جب بھوک ستائے تو آپ کے سامنے گریہ و زاری کروں۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی حالات کے بغیر اپنے اندر کیفیات پیدا نہیں کر سکتا۔ جو حالات سے خالی ہو جائے وہ کیفیات سے بھی خالی ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ سختی اور مشقت کے لمحات اپنے اندر دو طرفہ فائدہ رکھتے ہیں۔ ایک طرف ان سے وہ "درد" حاصل ہوتا ہے جو دل کی زندگی ہے، جو آپ کو احساس حیات سے آشنا کرتا ہے۔ جو انسان کی اندرونی صلاحیتوں کو بیدار کرنے والا ہے۔ دوسری طرف مشقت کے لمحات ہی آپ کی راحت کے لمحات کو اسلامی رنگ دیتے ہیں۔ وہ آدمی کو اس قابل بناتے ہیں کہ جب وہ ایسی کوئی چیز دیکھے تو اس کا دل شکر کے جذبے سے لبریز ہو جائے۔ جو درد سے خالی ہے وہ زندگی سے خالی ہے، اور جو زندگی سے محروم ہو وہ کیسے کوئی بات سنے گا اور کیسے کوئی بات قبول کرے گا۔

۴۔ زہد فی الدنیا کا ایک اور پہلو ہے۔ وہ یہ کہ ایسا آدمی حرام اور مشتبہ چیزوں میں پڑنے سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ناجائز چیزوں کے ارتکاب سے وہی شخص بچ سکتا ہے جو جائز حدود میں بھی بچ کر چلتا ہے۔ جو تمام "جائز" چیزوں کو اپنا ضروری حق سمجھ لے، ایسے آدمی کے لئے ہر وقت خطرہ ہے کہ وہ کسی حرام کام میں پڑ جائے۔ حدیث کے الفاظ میں، ہر بادشاہ کی ایک ممنوعہ چراگاہ ہوتی ہے اور خدا کی چراگاہ وہ چیزیں ہیں جن کو اس نے حرام قرار دیا ہے۔ جو شخص سرحد تک اپنے مویشی چراتا ہوا پہنچ جائے اس کے لئے ہر آن یہ خطرہ ہے کہ مویشی کہیں چراگاہ کے اندر نہ گھس جائیں۔ (متفق علیہ)

عورتوں کے لئے زیب و زینت بالکل جائز ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ ہر وہ گھر جس نے اس جواز کو اپنے لئے کھلا دروازہ سمجھ لیا ہے، آج اس کے یہاں غیر ساتر ملبوسات اس طرح استعمال ہونے لگے ہیں کہ اب لوگوں کو شاید ان کے ممنوع ہونے کا بھی احساس نہیں رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کل کے بے دین گھرانے اور اسلام پسند گھرانے میں بس اتنا ہی فرق رہ گیا ہے کہ ہمارے گھروں کی عورتیں اور لڑکیاں خاندان اور رشتہ کے لوگوں اور دوسرے ملنے والوں کے سامنے اپنی غیر شرعی پوشاک کا مظاہرہ کرتی ہیں اور دوسرے گھرانوں کی عورتیں اپنے اس فتنہ کو لئے ہوئے بازاروں اور سڑکوں پر نکل آئی ہیں۔

اسی طرح سرکاری ملازمتوں میں جو لوگ ترقی کرتے ہیں یا بڑے عہدے حاصل کرتے ہیں وہ ضمیر کی قربانی دے کر ہی ان مناصب تک پہنچتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں کسی اونچی کرسی کو اپنی نشست گاہ بنانے کے لئے جو لیاقت درکار ہے اس میں سے ایک ضروری چیز یہ بھی ہے کہ دین کو آپ اپنے اندر سے کھرچ کر نکال دیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بادشاہوں سے تعلق رکھنے والوں کے بارے میں کہا تھا "اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم ان کی دنیا میں سے جتنا پاؤ گے اس سے زیادہ وہ تمہارے دین میں سے لے لیں گے" یہ بات جدید بادشاہت کے بارے میں بھی اسی طرح صحیح ہے جیسے وہ قدیم بادشاہت کے بارے میں صحیح تھی۔ اس فرق کے ساتھ کہ پہلے وہ دین کا زیادہ حصہ لیتے تھے اور اب وہ آپ کا کل دین لے لیتے ہیں۔

ایک بڑے تاجر نے ایک مرتبہ کہا کہ موجودہ زمانے میں بالکل جائز طریقہ پر کوئی بڑا کاروبار نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں آپ کی آمدنی ایک خاص حد سے آگے بڑھی، بے شمار قوانین آپ کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ آپ مجبور ہوتے ہیں کہ غلط طریقے سے کام کریں۔ ورنہ آپ کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ "اتنے بڑے کاروبار کا آپ کو مکلف کس نے کیا ہے" جواب دینے والے نے جواب دیا۔ مگر موجودہ انسان کو اس قسم کے جوابات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس نے تو یہ طے کر رکھا ہے کہ وہ اپنے امکان بھر ان تمام نعمتوں کو حاصل کرے گا جو خدا نے زمین پر پیدا کی ہیں۔ اس لئے یہ بھی ضروری ہو گیا ہے کہ وہ ان تمام چیزوں کو اپنے لئے حلال کرے جس کو خدا نے حرام ٹھہرایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ترقی کا ہر واقعہ جو آپ کو اپنے گرد و پیش نظر آتا ہے، وہ صرف حکمت زہد سے محرومی کا ثبوت نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی بڑھتے بڑھتے خدا کی حرام کی ہوئی چراگاہ میں گھس گیا ہے۔ اس کے بغیر وہ اتنی غیر معمولی فربہی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

ممکن ہے یہ باتیں سن کر آپ کہیں کہ اسلام کا مطلب اگر یہی ہے تو اس کا پانا بہت مشکل ہے۔ بیشک اسلام کا

پانا بہت مشکل ہے مگر وہ خدا کی مدد سے آسان ہو سکتا ہے۔ حضرت مسیحؑ نے جب روح دین کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "میں تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہی میں داخل ہو"، تو ان کے شاگرد یہ سن کر بہت اچنبھے میں پڑ گئے اور کہنے لگے کہ پھر کون نجات پا سکتا ہے۔ آپ نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا —— "یہ آدمیوں سے تو نہیں ہو سکتا لیکن خدا سے سب کچھ ہو سکتا ہے" اگر آپ اسلام کو اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتے ہیں، اگر آپ وہ حیات طیبہ حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے تو اس کو پانے کی صورت یہی ہے کہ آپ اسے خدا سے مانگیں۔ دوسری تمام چیزوں کی طرح یہ سب سے قیمتی چیز بھی آپ کو خدا ہی سے ملے گی۔ کہیں اور سے آپ اسے حاصل نہیں کر سکتے۔ مگر یاد رکھئے خدا سے مانگنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ دعا کے کچھ مقرر الفاظ یاد کرلیں اور اسے اپنی زبان سے دہرا دیا کریں ایک عیسائی عالم کے الفاظ میں:-

God is not a Cosmic belly-boy for whom
we can press a button to get things.

خدا سے مانگنے کی اصل زبان وہ نہیں جو لفظوں کی صورت میں اپنے مطالبات کا اظہار کرتی ہے۔ اس سے مانگنے کی زبان آپ کا قلب ہے۔ آپ اپنی حقیقی زندگی سے جو کچھ چاہ رہے ہیں وہی دراصل آپ اپنے رب سے مانگتے ہیں۔ خدا آپ کے لفظوں کو نہیں دیکھتا۔ وہ خود آپ کو دیکھتا ہے۔ آپ اپنے اصل وجود میں جس چیز کے لئے بے قرار ہوں اپنے رب سے آپ اسی چیز کے طلب گار ہیں۔

ایک بچہ اپنی ماں سے روٹی مانگے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ ماں اس کے ہاتھ میں انگارہ رکھ دے۔ خدا اپنے بندوں پر اس سے زیادہ مہربان ہے۔ یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ آپ خدا سے خشیت مانگیں اور وہ آپ کو قساوت دیدے۔ آپ خدا کی یاد مانگیں اور وہ آپ کو نسیان میں مبتلا کر دے۔ آپ آخرت کی تڑپ مانگیں اور وہ آپ کو دنیا کی محبت میں ڈال دے، آپ کیفیت سے بھری ہوئی دینداری مانگیں اور وہ آپ کو بے روح دینداری میں پڑا رہنے دے۔ آپ حق پرستی مانگیں اور وہ آپ کو شخصیت پرستی کی تاریک کوٹھری میں بند کر دے — آپ کی زندگی میں آپ کی مطلوب چیز کا نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ نے ابھی تک اس کو مانگا ہی نہیں۔ اگر آپ کو دودھ خریدنا ہو اور آپ چھلنی لے کر بازار جائیں تو ظاہر ہے کہ پیسے خرچ کرنے کے باوجود آپ خالی ہاتھ واپس لوٹیں گے۔ اسی طرح اگر زبان سے آپ دعا کے کلمات دہرا رہے ہوں مگر آپ کی اصل ہستی کسی اور طرف متوجہ ہو تو میں کہوں گا کہ نہ آپ نے مانگا تھا اور نہ آپ کو ملا۔ جو مانگے وہ کبھی محروم نہیں رہ سکتا۔ یاد رکھئے، یہ مالک کائنات کی غیرت کے خلاف ہے کہ وہ کسی بندے کو اس حال میں رہنے دے کہ قیامت میں جب خدا سے اس کا سامنا ہو تو وہ اپنے رب کو حسرت کی نظر سے دیکھے۔ وہ کہے کہ خدایا میں نے تجھ سے ایک چیز مانگی تھی مگر تو نے مجھے نہ دی۔ بخدا یہ ناممکن ہے، یہ ناممکن ہے۔ کائنات کا مالک تو ہر صبح و شام اپنے سارے خزانے کے ساتھ آپ کے قریب ترین آکر آواز دیتا ہے۔ "کون ہے جو مجھ سے مانگے تاکہ میں اسے دوں"، مگر جنھیں لینا ہے وہ سوئے ہوں تو اس میں دینے والے کا کیا قصور۔ (زندگی شعبان ۱۳۸۱ھ)

—— تقریر حلقہ وار اجتماع جماعت اسلامی ہند بمقام جون پور۔ ۱۲ نومبر ۱۹۶۱

دعوت اسلامی کے کارکنوں کی ذمہ داریاں

دنیا میں روزانہ لاکھوں آدمی پیدا ہوتے ہیں اور لاکھوں آدمی مرجاتے ہیں۔ وہ یہاں آنکھیں بند کئے ہوئے آتے ہیں اور انھیں کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کی زندگی کا مقصد کیا ہے اور انھیں کیا کرنا چاہئے۔ پھر صحیح یا غلط جو کچھ ان کی سمجھ میں آتا ہے کرتے ہیں اور دوبارہ آنکھیں بند کرکے اسی دنیا کی طرف لوٹ جاتے ہیں جہاں سے وہ آئے تھے۔ وہ نہیں جانتے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور آئندہ ان کے ساتھ کیا معاملہ ہونے والا ہے۔ یہ ایک عظیم خطرہ ہے جس سے انسانی نسل دوچار ہے۔ دنیا کی مثال ایک ایسی ریل گاڑی کی ہے جو بہت تیزی کے ساتھ اپنی پٹری پر دوڑی چلی جا رہی ہے۔ اس کو کچھ نہیں معلوم کہ آگے کیا ہے۔ حالانکہ آگے کا پل ٹوٹ چکا ہے اور وہاں پہنچتے ہی وہ اپنے انجن اور گاڑی سمیت الٹ جائے گی اور اس کے بعد تمام مسافر خواہ وہ اوپر کے درجہ میں سفر کر رہے ہوں یا نیچے کے درجہ میں، سب کے سب ایک ہی ہولناک انجام سے دوچار ہوں گے، حتیٰ کہ اس وقت کوئی خطرہ کی زنجیر بھی نہ ہوگی جس کو کھینچ کر وہ اپنے آپ کو تباہی سے بچا سکیں —— یہ زندگی کے بعد آنے والے روزِ حساب کا خطرہ ہے جو ہم کو اور ساری دنیا کو درپیش ہے۔ یہ اس اصل زندگی کا مسئلہ ہے جو ہمارے آج کے اعمال کے نتیجہ میں ہم کو آئندہ دائمی طور پر گزارنی ہوگی۔ وہ زندگی یا تو بہت خوش گوار ہے یا بے حد دردناک۔

دنیا کے لوگ زندگی میں ہائیڈروجن بم کے خطرہ سے گھبرائے ہوئے ہیں۔ مگر موت کے بعد ہر شخص کے سامنے جہنم کے عذاب کا خطرہ ہوگا جو اس سے بھی زیادہ خوفناک ہے۔ اس خطرہ سے آپ ہی دنیا کو باخبر کر سکتے ہیں۔ سوچئے کہ اس بھاری ذمہ داری کے لئے آپ کیا کر رہے ہیں۔ دنیا نادان ہے اور آپ علم رکھتے ہیں۔ دنیا سے صرف یہ پوچھا جائے گا کہ اس نے خدا کے حکموں کے مطابق زندگی بسر کی یا نہیں۔ مگر آپ سے اس کے سوا یہ سوال بھی ہوگا کہ بھٹکے ہوئے انسانوں کو راہ راست پر لانے کے لئے تم نے کیا کیا۔ دنیا کو صرف اپنا جواب دینا ہوگا اور آپ کو اپنا بھی اور دنیا والوں کا بھی۔

یہ عظیم ذمہ داری جو آپ کے حصہ میں آئی ہے، اس کا خیال بھی آپ کو بے چین کر دینے کے لئے کافی ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ آپ کی راتوں کی نیند اور دن کا سکون حرام ہو جائے۔ دنیا کی لذتوں اور آسائشوں میں آپ کے لئے کوئی دلچسپی باقی نہ رہے۔ آپ یہ بھول جائیں کہ آپ بھی کچھ ضروریات رکھتے ہیں آپ کو صرف یہ یاد رہے کہ دنیا کو آپ کی ضرورت ہے۔ آپ کو اپنے گھروں، اپنی جائدادوں اور اپنے اہل و عیال سے زیادہ دنیا کی اصلاح کی فکر ہو۔ آپ کی زبانوں پر ہر وقت اسی کا چرچا ہو کیوں کہ اس کے سوا جو کچھ ہے اس کا چرچا کرنے والے دنیا میں بہت لوگ ہیں آپ ان میں مشغول ہو کر اپنا وقت ضائع کریں گے اور دنیا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکیں گے۔ آپ کے قدم حرکت کریں تو اسی راہ میں حرکت کریں کیوں کہ اس کے سوا جتنے راستے ہیں وہ سب یا تو غلط ہیں یا بے فائدہ۔ آپ کے اوقات یا تو زندگی کی ناگزیر ضروریات فراہم کرنے میں صرف ہوں یا پھر اسی دعوتی مقصد کے لئے جدوجہد کرنے میں۔ آپ کی خواہشات، آپ کی تمناؤں اور آپ کی دلچسپیوں کا کوئی دوسرا مرجع باقی نہ رہے۔ آپ ہر طرف سے کٹ کر صرف اسی ایک کام کے ساتھ جڑ جائیں۔ آپ کی جانوں اور مالوں پر صرف اسی چیز کا حق ہو۔ غرض آپ اور جو کچھ آپ کے پاس ہے ان سب پر سب سے پہلے اسلامی دعوت کا حق ہو اور اس کے بعد

دوسری چیزوں کا۔ فائر بریگیڈ کی طرح آپ چوبیس گھنٹہ اپنے آپ کو ڈیوٹی پر سمجھیں اور کبھی اس سے غافل نہ ہوں۔ بے شمار انسانوں کی اس بھیڑ میں چند انسان جو حق کا کام کرنے کے لئے اٹھتے ہیں، اگر وہ لوگ بھی اپنی زندگیاں اس کے لئے وقف نہ کریں تو پھر دوسرے لوگ کہاں سے آئیں گے۔

یہاں کروروں انسان ہیں جو اس لئے صبح کرتے ہیں کہ دن کے اجالے میں اپنی روزی کمائیں اور اس لئے شام کرتے ہیں کہ دن بھر کی تکان دور کر کے اگلے روز پھر اسی مشغلہ میں جُتنے کے قابل ہو جائیں۔ وہ کہیں سفر بھی کرتے ہیں تو وہ سفر یا تفریح کے لئے ہوتا ہے یا روزگار کے لئے۔ اس بھیڑ کے اندر دوسرے تمام لوگوں کے خلاف آپ نے ایک نئے راستہ پر چلنے کا ارادہ کیا ہے۔ آپ دنیا کے بجائے آخرت کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس راہ کا تقاضا ہے کہ آپ کی راتیں اس غم میں بسر ہوں کہ جس دنیا میں آپ رہ رہے ہیں اس پر شیطان اور طاغوت کا غلبہ ہے۔ آپ کی صبحیں اس یاد کے ساتھ طلوع ہوں کہ خدایا جس طرح سورج نے خشکی اور تری کو روشن کیا ہے اسی طرح تو انسانی زندگیوں کو بھی ہدایت سے منور کر دے۔ آپ نکلیں تو خدا کی راہ میں نکلیں اور ٹھہریں تو خدا کے لئے ٹھہریں۔ آپ جنت کے امیدوار ہیں۔ پھر آپ کو معلوم ہے کہ جنت کس طرح ملتی ہے۔ جنت میں وہ قدم نہیں جائیں گے جو خدا کی راہ میں گرد آلود نہ ہوئے ہوں۔ جنت کو وہ آنکھ نہیں دیکھے گی جو خدا کے خوف سے تر نہ ہوئی ہو۔ جنت میں وہ وجود نہیں جائے گا جس نے آخرت کے لئے دنیا کی مصیبتیں برداشت نہ کی ہوں پھر سوچئے کہ آپ کہاں تک ان شرطوں کو پورا کر رہے ہیں۔

ہم اس وقت ایک ہولناک طوفان[۵] کے سرے پر کھڑے ہیں۔ جس نے چند ہفتوں کے اندر اس ضلع کی تقریباً پانچ سو بستیوں کو ویران کر دیا ہے اور ہزاروں انسانوں کو متاثر کیا ہے۔ شہر کا یہ حال تھا کہ دریا کے پانی نے اس کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا جس کے درمیان وہ بالکل جزیرہ بن گیا تھا۔ کنارے کے باشندے اپنے گھروں کو اس طرح خالی کر رہے تھے کہ ان کے گھروں کی گرتی ہوئی دیواریں ان کو رخصت کر رہی تھیں۔ اس سیلاب نے پچھلے سو برس کے تمام ریکارڈ توڑ دئے۔ شہر کے گرد ایک بہت بڑا باندھ ہے جو ۱۸۷۱ کے تاریخی سیلاب کے بعد بنایا گیا تھا۔ اسی باندھ سے اس وقت شہر کی قسمت بندھی ہوئی تھی جس کے دوسری طرف شہر کی عام سطح سے کئی گز اونچا پانی لگا ہوا تھا۔ ہر گھر میں اسی کا چرچا تھا اور ہر شخص کی زبان پر اسی کا تذکرہ تھا۔ یہاں تک کہ ۲۶ اور ۲۷ جولائی ۱۹۵۵ کی درمیانی رات کو کلکٹر کی طرف سے بذریعہ لاؤڈ اسپیکر یہ اعلان ہوا کہ:

"لال ڈگی کا باندھ ابھی ٹوٹنا چاہتا ہے آپ لوگ اپنی جانوں کو بچانے کے لئے اونچی جگہوں پر چلے جائیں۔"

اس وقت رات کے ایک بجے تھے۔ سارا شہر جاگ اٹھا اور عجیب سنسنی پھیل گئی۔ لوگ اپنے کچے اور پکے گھروں سے نکل کر باندھ کی طرف دوڑے اور سیکڑوں آدمیوں نے پھاوڑا اور بوریا لے کر اس جگہ مٹی ڈالنی شروع کر دی جہاں سے باندھ پھٹ گیا تھا۔ ایسے ایسے لوگ جنھوں نے شاید زمین پر کبھی ننگے پاؤں قدم بھی نہ رکھا ہوگا۔ وہ سروں پر مٹی کا ٹوکرا لئے گردھو رہے تھے۔

---

۵ اشارہ ہے اس تاریخی سیلاب کی طرف جس نے ۱۹۵۵ کی برسات میں مشرقی ہندوستان کو زبردست نقصان پہنچایا۔

درجنوں پٹرومیکس کی روشنی میں ساری رات کام ہوا اور دوسرے دن دوپہر تک ہوتا رہا۔ بالآخر انجینیئر نے کہہ دیا کہ اب باندھ قابو سے باہر جا چکا ہے۔ ۱۲ بجے دن کے بعد باندھ ٹوٹ گیا اور دم کے دم میں پانی سڑکوں پر بہنے لگا۔ سارے شہر میں کہرام مچ گیا۔ دکانیں بند ہوگئیں۔ لوگ اپنے ٹھکانوں کی طرف بھاگ رہے تھے اور پانی ان کے پیچھے اس طرح دوڑ رہا تھا گویا ان کا پیچھا کر رہا ہے۔ زندگی کے مسائل سمٹ کر بس سیلاب کے گرد جمع ہوگئے اور چند دنوں کے لئے شہر میں قیامت کا منظر دکھائی دینے لگا۔

اس سیلاب میں ہمارے لئے بہت سی نصیحتیں اور عبرتیں ہیں مگر میں اس وقت جس چیز کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ کہ ایک اس سے بھی زیادہ ہولناک طوفان نہ صرف ایک ضلع کو بلکہ ساری دنیا کو گھیرے ہوئے ہے اور تمام انسانوں کی زندگی اس کی زد میں ہے۔ سیلاب کا خطرہ ایک ایسا خطرہ ہے جس کو ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور سب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ ان کی زندگی کو کیا نقصان پہنچا سکتا ہے مگر حق کو اختیار نہ کرنے کا جو خطرہ ہے وہ کسی کو نظر نہیں آتا، اور نہ کوئی شخص یہ جانتا ہے کہ اس کی زندگی کو کیا نقصان پہنچنے والا ہے۔ سیلاب کے خطرہ سے آگاہ کرنے کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ ایک اعلان کر دیا جائے۔ مگر ہم جس خطرہ سے دنیا کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں اس کا سمجھنا بھی دنیا کے لئے مشکل ہے۔۔۔۔ آئن سٹائن کا نظریۂ اضافیت اور ایٹم کی حقیقت لوگوں کو سمجھائی جا سکتی ہے مگر یہ سمجھانا مشکل ہے کہ حق سے بے نیاز ہو کر وہ ایک ایسے جوالا مکھی پہاڑ کے دہانہ پر بیٹھے ہوئے ہیں جو کسی بھی وقت پھٹ کر ان کا خاتمہ کر سکتا ہے۔

ہمارا کام محض اس طرح نہیں ہو سکتا کہ اپنے پیغام کو کسی نہ کسی طرح لوگوں کے کان میں ڈال دیں بلکہ ہمیں اس کو مدلل بنا کر ان کے سامنے رکھنا ہوگا اور اس کے لئے لمبی مدت تک زبردست جد وجہد کرنی ہوگی۔ ایک ایسی چیز جو وقت کے پیمانوں کے لحاظ سے سب سے زیادہ بے وزن ہے اس کو اس انداز میں پیش کرنا ہوگا کہ وہ دوسری تمام چیزوں کے مقابلہ میں سب سے زیادہ باوزن نظر آنے لگے یہاں تک کہ لوگ اس پر سوچنے کے لئے مجبور ہو جائیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھنے لگیں کہ اس ایک راستہ کے سوا تمام راستے بالکل غلط اور تباہی کی طرف لے جانے والے ہیں۔ اس کے لئے ہمیں اپنے دماغ اور اپنے جسم کی ساری قوتیں صرف کرنی ہوں گی۔ اپنے اوقات اور اپنی کمائیوں کا سب سے بڑا حصہ اس مقصد عظیم کی نذر کرنا ہوگا۔ اور یہ سب کچھ کسی ایک رات اور کسی ایک دن کے لئے نہیں بلکہ سالہا سال کے لئے اور ساری عمر کے لئے کرنا ہوگا۔ ہمیں اس مقصد کے لئے قربان ہو جانا پڑے گا اور اپنی زندگیوں کو اس راہ میں کھپا دینا ہوگا۔ جبھی یہ ممکن ہے کہ لوگ ہمارے پیغام سے واقف ہوں اور آنے والے خطرہ سے آگاہ ہو کر اس سے بچنے کا سامان کر سکیں۔ پھر کون ہے جو حق کے لئے قربان ہوتا ہے۔ کون ہے جو دنیا کو تباہی سے بچانے کے لئے جان کی بازی لگا سکتا ہے۔ کون ہے جو اس کو چھوڑ سکتا ہے جو کہ اس کی نظروں کے سامنے ہے تاکہ وہ اس کو پا سکے جو کہ اس کی نظروں سے اوجھل ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اس کا حوصلہ کر سکیں کیوں کہ وہی انسانیت کا اصل جوہر ہیں اور وہی ہیں جو زندگی کی اصل کامیابی کے حق دار ہوں گے۔ (مطبوعہ سہ روزہ دعوت ۵ ستمبر ۱۹۵۵)

تقریر ماہانہ اجتماع جماعت اسلامی، بمقام سیدھا سلطان پور (اعظم گڑھ) ۵ اگست ۱۹۵۵

دفتر کے صحن میں دوڑنے کی آواز نے مجھے چونکا دیا، دیکھا تو ہاکر ہاتھ میں اخبار لئے بھاگا چلا آرہا ہے۔ یہ اس کا روزانہ کا معمول ہے۔ صبح کا اخبار اول ترین وقت میں تمام خریداروں کے پاس پہنچانے کا اس کو اتنا خیال ہے کہ وہ دوڑتا ہوا چلتا ہے۔ اور اگر اخبار لینے کے بعد اس سے کوئی سوال کیا جائے تو وہ ٹھہر کر اس کا جواب نہیں دے گا بلکہ واپس بھاگتے ہوئے کہتا چلا جائے گا۔ وہ دوڑ رہا ہے تاکہ وہ بھاگتے ہوئے وقت کو پکڑ لے، تاکہ وہ وقت کے پیچھے نہ رہ جائے۔

یہ دنیا کے لئے انسان کی دوڑ دھوپ کی ایک مثال ہے جس کو آپ اپنے قریب ترین دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اگر آپ کا حال یہ ہو کہ آپ صبح کی چائے "میں طویل وقت صرف کرنے کے بعد اپنے ساتھیوں کے درمیان بے تکلف باتیں کرتے ہوئے نہایت اطمینان کے ساتھ اخبار کی آمد کا انتظار کر رہے ہوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ آخرت کے اقرار میں اتنے سنجیدہ بھی نہیں ہیں جتنا وہ شخص اپنے پیشے میں سنجیدہ ہے جس کا آپ انتظار کر رہے ہیں۔ آپ مسلمان ہیں، آپ اسلام کے داعی ہیں، لیکن اگر صورت حال یہ ہو تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کا مسلمان ہونا آپ کی حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ آپ کی اسلامی دعوت محض اس سے ایک روایتی وابستگی کا نتیجہ ہے یا زیادہ سے زیادہ وہ ایک ذہنی موضوع ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آپ آخرت کے لئے اس سے زیادہ بیتاب ہوتے جتنا ایک دنیا پرست دنیوی فائدوں کے لئے بے تاب ہوتا ہے۔ آخرت کی طلب میں آپ اس سے زیادہ تیز دوڑنے کی کوشش کرتے جتنا کوئی شخص اپنی ملازمت اور کاروبار کے لئے دوڑتا ہے، اپنے وقت اور اپنی صلاحیتوں کے استعمال میں آپ اس سے زیادہ مستعد ہوتے جتنا کہ ایک اخبار بیچنے والا اپنے کام میں نظر آتا ہے۔

اسلام آدمی کو زندگی کی سب سے بڑی کامیابی کے لئے بلاتا ہے۔ جس کے دل میں یہ بات اتر گئی ہو، کیسے ممکن ہے کہ وہ شخص غیر متعلق کام میں یا کمتر درجے کے مقاصد میں اپنا وقت ضائع کرے، اسلام ہم کو موجودہ زندگی کی غفلتوں کے بدلے بے پناہ عذاب سے ڈراتا ہے۔ جو شخص فی الواقع اس خبر پر ایمان لایا ہو کیسے ممکن ہے کہ آپ اس کو بے فکری کے ساتھ قہقہہ لگاتا ہوا پائیں۔ اسلام کہتا ہے کہ تمھارے اوپر ایک عظیم خدا ہے جو ہر وقت تمھیں دیکھ رہا ہے۔ جو شخص اس حقیقت کو مانتا ہو۔ کیسے ممکن ہے کہ وہ ایک لمحے کے لئے بھی ایسے مشاغل میں مصروف ہونا پسند کرے جس کی خدائے ذوالجلال کے نزدیک کوئی قیمت نہ ہو، اسلام کہتا ہے کہ تمھاری زندگی بالکل غیر یقینی ہے، کسی بھی وقت موت کے فرشتے تمھاری گرفتاری کے لئے پہنچ سکتے ہیں۔ جو شخص حقیقی معنوں میں اس انتہائی نازک صورت حال کا احساس رکھتا ہو، کیسے ممکن ہے کہ وہ روزانہ اپنے اوقات کا ایک حصہ ایسے مشاغل میں صرف کرتا رہے جس کا طلبِ آخرت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جو شخص خدا سے ڈرتا ہو اس کے لئے ممکن نہیں ہے کہ ایک کام کو مہینوں اور سالوں کرتا رہے اور اس کو احساس نہ ہو کہ وہ ایک غلطی کو دہرا رہا ہے۔

"کیا یہی وہ تصویریں ہیں جو خدا اور آخرت پر ایمان لانے کے بعد بنتی ہیں" یہ فقرہ اکثر ایک دردناک آہ کے ساتھ میری زبان سے اس وقت نکل جاتا ہے جب میں اپنے گرد و پیش کے لوگوں کو دیکھتا ہوں۔ انسان کے لئے اس کے معاشی مفادات

اُخروی تقاضوں سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ خدا کی مرضی کے لئے سرگرم ہونے سے زیادہ اس کو یہ بات محبوب ہے کہ وہ اپنے ذوق کی تسکین اور اپنی عادتوں کی تکمیل میں لگا رہے۔ وہ اپنی زندگی کے مقررہ نقشہ کو نہیں بدل سکتا، خواہ اس کی وجہ سے اس کی عبادتیں ناقص ہو جائیں، خواہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو ٹھیک ٹھیک انجام نہ دے سکے، خواہ اس کو بالآخر اپنی بے حسی اور ناکردگی کو چھپانے کے لئے جھوٹے عذرات کا سہارا لینا پڑے۔

یہ شکایت مجھے صرف ان لوگوں سے نہیں ہے جو ملحدانہ ماحول میں پرورش پا کر نکلے ہیں۔ وہ لوگ جو "دیندار" کہے جاتے ہیں۔ جن کی طرف اسلامی مسائل معلوم کرنے کے لئے رجوع کیا جاتا ہے۔ ان کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے چند دن پہلے میں ایک راستے سے گزر رہا تھا کہ ایک پرجوش آواز میرے کان میں آئی ــ " ہر آدمی کی زبردست خواہش ہوتی ہے کہ اپنی اولاد کو پھلتا پھوتا دیکھے اِس سے دل کو بڑی تسکین ہوتی ہے" دیکھا تو ایک بزرگ ایک دکان میں بیٹھے تقریر کر رہے تھے۔ چہرے پر داڑھی ان کے دین دار ہونے کی علامت تھی اور زبان اور وضع قطع بتا رہی تھی کہ یقیناً کوئی عالم ہوں گے۔ میں نہیں کہتا کہ یہ کوئی ناجائز خواہش ہے۔ مگر جب میں دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں کے اندر یہ تمنا تو بہت زیادہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کو پھلتا پھوتا دیکھیں مگر اسلام کو پھلتا پھوتا دیکھنے کی تڑپ ان میں باقی نہیں ہے، تو یہ جائز خواہش بھی مجھے ایک جرم معلوم ہونے لگتی ہے۔ ایک بزرگ کو میں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ وہ ایک نوجوان کو اس بات پر تنبیہ کر رہے تھے کہ وہ نماز کے بعد دعا کے لئے نہیں ٹھہرتا بلکہ سلام پھیرنے کے بعد فوراً اٹھ کر چلا جاتا ہے۔ بے شک یہ نوجوان کی غلطی تھی۔ مگر میں جانتا ہوں کہ خود ان بزرگ کا یہ حال ہے کہ صبح کی اور دوپہر کی نیند اکثر انھیں فجر اور ظہر کی نمازوں میں وقت پر مسجد پہنچنے نہیں دیتی۔ شام کی گفتگو میں وہ کبھی کبھی اتنا مصروف ہوتے ہیں کہ مسجد اس وقت پہنچتے ہیں جب امام ایک رکعت پوری کر چکا ہوتا ہے۔ آپ کو ایسے کتنے "عالم دین" ملیں گے جن کے سامنے اگر ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر کا ترجمہ "تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے جو لوگوں کو خیر کی طرف بلائے"ــــ کر دیا جائے تو وہ اس پر دو گھنٹے بحث کریں گے کہ یہاں مِنْ "تبعیضیہ" نہیں بلکہ "بیانیہ" ہے۔ یعنی آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "تم کو ایسا گروہ بننا چاہئے جو لوگوں کو خیر کی طرف بلائے"۔ (نہ یہ کہ تم میں سے ـ ـ ـ) مگر ان حضرات کے ساتھ آپ مہینوں اور سالوں زندگی گزاریں، آپ یہ نہ دیکھیں گے کہ ان کے اندر فی الواقع دعوت الی الخیر کی کوئی واقعی تڑپ پائی جاتی ہے۔ وہ آیت میں عموم ثابت کرنے کے لئے قابلیت صرف کریں گے۔ مگر اس عموم کو اپنی ذات تک پہنچانے کی ضرورت نہیں سمجھیں گے۔ صلوٰۃ وسطیٰ کا ترجمہ اگر "بیچ کی نماز" یا "عصر کی نماز" کر دیجئے تو وہ آپ کے اوپر جہالت کا فتویٰ صادر کر دیں گے۔ وہ اصرار کریں گے کہ قرآن میں جو صلوٰۃ وسطیٰ کا لفظ آیا ہے اس سے مراد "بہترین نماز" ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس سے مراد کوئی ایک نماز نہیں بلکہ ساری نمازیں ہیں۔ مگر ان کی اپنی نمازوں کو دیکھئے تو آپ یہ نہ پائیں گے کہ وہ اپنی نماز کو "بہتر" بنانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ دوسروں پر تبلیغ کرتے ہوئے وہ نہایت جوش کے ساتھ اس واقعہ کو بیان کریں گے کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کو لے کر غزوۂ بدر کے لئے نکلے، دوسری طرف مشرکین کا لشکر تھا۔ آپ نے فرمایا،

بڑھو ایک ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت زمین و آسمان کے برابر ہے۔ ایک انصاری عمیر بن حمام نے یہ سنا تو ان کی زبان سے بخ بخ کے الفاظ نکل گئے یعنی خوب! آپ نے فرمایا، تم نے بخ بخ کیوں کہا۔ انھوں نے جواب دیا۔ خدا کی قسم صرف اس لئے کہ شاید میں بھی ان لوگوں میں سے ہوں۔ آپ نے فرمایا۔ ہاں تم انھیں میں سے ہو۔ یہ سن کر انھوں نے اپنے برتن میں سے کچھ کھجوریں نکالیں اور اسے کھانے لگے۔ پھر بولے ان کھجوروں کو کھانے کے لئے میں کب تک زندہ رہوں گا۔ اِنَّهَا لَحَيٰوةٌ طَوِيْلَةٌ یہ تو بڑی لمبی زندگی ہے۔ یہ کہہ کر انھوں نے بقیہ کھجوریں ایک طرف ڈال دیں اور جنگ میں کود پڑے اور لڑ کر شہید ہو گئے۔" (مسلم)

مگر خود ان مبلغین کا کیا حال ہے۔ مذکورہ صحابی نے تو خدا تک پہنچنے کے شوق میں اپنی واقعی خوراک پھینک دی تھی مگر یہ حضرات اپنے ذوق اور اپنی عادتوں کو بھی خدا کی خاطر پھینکنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ بدر کے میدان میں اسلام اور کفر کا جو معرکہ ہوا تھا وہ آج ہر گلی اور ہر سڑک پر پوری شدت کے ساتھ جاری ہے مگر ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ وقت کے اس غزوے میں شرکت کے لئے اپنے موجودہ مفاد کو ترک کرنا تو درکنار، مستقبل کی تمناؤں اور اپنی آنے والی پشتوں کے مفاد کو بھی خدا کے دین کے لئے خطرے میں ڈالنا وہ گوارا نہیں کر سکتے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ اسلام کے دعوے کے ساتھ اتنے بڑے تضاد کو لوگ کس طرح اپنے اندر جمع کئے ہوئے ہیں۔ ہر بار مجھے یہی جواب ملا کہ دراصل "تاویل" کے فتنے نے لوگوں کو اس تضاد میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ہر آدمی نے اپنے طرزِ عمل کو صحیح ثابت کرنے کے لئے کچھ خوب صورت جوابات تراش رکھے ہیں اور ضرورت کے وقت وہ فوراً انھیں پیش کر دیتا ہے۔ ایک مسلمان ڈاکٹر کو میں نے ایک بار دعوتِ دین کی جدوجہد میں حصہ لینے کی ترغیب دلائی۔ انھوں نے فوراً اپنے پیشے کی اہمیت پر تقریر شروع کر دی۔ ان کے نزدیک ان کا پیشہ خدمتِ خلق کا ایک زبردست کام ہے جس کو وہ رات دن کی محنت سے انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے بعض سنگین مریضوں کا ذکر کیا جو ان کے زیرِ علاج تھے۔ انھوں نے کہا "بتائیے میں انھیں چھوڑ کر کیسے کہیں جا سکتا ہوں۔ میرا ایسا اقدام انسانیت دوستی ہوگی یا انسانیت دشمنی"۔ بظاہر یہ بہت معقول جواب ہے۔ لیکن اگر میں آپ کو یاد دلاؤں کہ اکثر ڈاکٹروں کی "انسانیت دوستی" ہمیشہ ان مریضوں کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے جو اس کے زیرِ علاج ہوں اور ان میں بھی سب سے زیادہ اس کی توجہ کے مستحق وہ مریض ہوتے ہیں جو زیادہ "قیمتی گاہک" ہوں تو آپ سمجھ جائیں گے کہ اس خدمتِ خلق کی حقیقت کیا ہے۔

اسی طرح ہر شخص کے پاس اپنے طرزِ عمل کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ایک جواب موجود ہے۔ کوئی لوگوں کی ناکردگی کو اس بات کے لئے کافی سمجھے ہوئے ہے کہ وہ خود بھی کوئی کام نہ کرے، کوئی دوسروں کے غلط خیالات کو اپنے لئے رکاوٹ سمجھتا ہے، کوئی دقتوں اور پابندیوں کی ایک فہرست لئے بیٹھا ہے، کسی کو ایک ایسا فقہی اور قانونی پیمانہ مل گیا ہے جس سے ناپنے میں اس کا جامہ بالکل درست اترتا ہے، کسی نے احادیث کے ذخیرے میں سے اپنے مناسبِ حال چند موزوں حدیثوں کو چھانٹ لیا ہے جو اس کے طرزِ عمل کو صحیح ترین ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اسی طرح ہر شخص کے پاس اپنے غیر اسلامی رویے کی ایک اسلامی توجیہہ اور اپنی آخرت فراموش زندگی کی ایک خالص دینی تاویل موجود ہے۔ اور اگر آپ ان تاویلات کی حقیقت کھول دیں تو موجودہ

دنیا میں شیطان نے چند ایسے الفاظ مہیا کر دئے ہیں جن کے ذریعہ کسی بھی صحیح ترین تنقید کو نہایت آسانی سے رد کیا جا سکتا ہے ـــــ "یہ شدت پسندی ہے"۔ "یہ تمہارا انتہا پسندانہ ذوق ہے" "تم یک رُخے انداز میں سوچتے ہو" "تم اعتدال کے راستے سے ہٹ گئے ہو" وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ آپ کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔ کیوں کہ خدا کے رسول پہلے ہی اعلان فرما چکے ہیں کہ اَلدِّینُ یُسْرٌ!

مگر یاد رکھئے آج آپ ایک ناصح کو ان جوابات سے خاموش کر سکتے ہیں۔ مگر خدا کے یہاں اس قسم کے جوابات ہرگز کافی نہ ہوں گے۔ وہاں تو آپ کی پوری زندگی کا بخیہ ادھیڑ کر رکھ دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ تم خود دیکھ لو کہ دنیا کی زندگی میں تم جن مشاغل میں مصروف تھے ان کے پیچھے کیا کیا محرکات کام کر رہے تھے۔

میرے ایک ساتھی نے ایک مرتبہ بہت عمدہ بات کہی ـــــ "آخرت میں خدا کا انعام اسی کو ملے گا جس نے دنیا میں خدا کے انعام کو پا لیا ہو" اس بات پر غور کیجئے تو اس میں نصیحت کے بہت سے پہلو چھپے ہوئے ہیں۔ آپ اپنے کو مسلمان کہتے ہیں، آپ دینِ حق کے علم بردار ہیں، یہ دراصل اس بات کا اعلان ہے کہ آپ خدا کی جنت کے امیدوار ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ انعام "جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کسی کان نے سنا" وہ محض دعووں اور خوش گمانیوں کے ذریعہ تو کسی کو نہیں مل سکتا۔ یہ انعام صرف اس کے لئے ہے جس نے دنیا میں اپنی آخرت طلبی کو نمایاں طور پر ثابت کر دیا ہو، جس نے اپنے مسلسل رویے سے یہ دکھا دیا ہو کہ دوسرے انسانوں کے مقابلے میں وہ اس کے پانے کا استحقاق رکھتا ہے۔ جب دوسرے لوگ دنیا کی لذتوں میں کھوئے ہوئے تھے تو وہ خدا کے انعام کے تصور میں اتنا محو ہوا کہ اسے دنیا کی لذتیں بھول گئیں۔ جب دوسرے لوگ اپنے ذوق کو تسکین دینے میں مصروف تھے تو وہ خدا کی رضا حاصل کرنے کے لئے تڑپ رہا تھا، جب دوسرے لوگ سوتے تھے تو وہ جاگتا تھا، جب دوسرے آرام کرتے تھے تو وہ تکلیف اٹھاتا تھا، جب دوسرے لوگ ہنسی اور تفریح میں دل بہلا رہے تھے تو وہ آنسو بہا رہا ہوتا تھا۔ مختصر یہ کہ جب دوسرے لوگ دنیا کی زندگی میں اپنے آپ کو گم کئے ہوئے تھے تو وہ آخرت کی زندگی کے لئے اپنا ایک ایک لمحہ صرف کر رہا تھا۔

جنت کا مستحق ہونا دوسرے لفظوں میں آخرت میں کسی کا ممتاز مقام حاصل کرنا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں صرف وہی شخص کسی ممتاز مقام کو پاتا ہے جس نے اس کے لئے بے پناہ جد و جہد کی ہو۔ ٹھیک اسی طرح آخرت کے درجاتِ عالیہ بھی وہی لوگ پائیں گے جنھوں نے اپنے آپ کو اس کے لئے کھپا دیا ہو۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اپنی سطحی زندگی کے نتیجہ میں وہ آخرت کے انعامات کو حاصل کرے گا تو یہ محض خوش فہمی ہے۔ ٹھیک ویسی ہی خوش فہمی جیسے کوئی شخص سمجھ لے کہ وہ بستر پر لیٹے لیٹے وہ مقام حاصل کر سکتا ہے جب کہ دنیا اسے "فاتح ایورسٹ" کے نام سے پکارے اور اس کو وہ اعزازات نصیب ہوں جو ہلیری اور تین زنگ کو لمبی جد و جہد کے بعد حاصل ہوئے۔

۱۶۴۲ میں انگلینڈ کے دیہات میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ پیدائش کے وقت وہ اتنا کمزور تھا کہ دائیوں نے اس کی زندگی کی طرف سے مایوسی ظاہر کی۔ اس کا کمزور سر حفاظت کی خاطر چمڑے کی پٹی سے لپیٹ دیا گیا۔ اس کے بعد جب وہ بڑا ہو کر ہائی اسکول پہنچا تو وہ اپنے ساتھیوں میں سب سے پیچھے تھا۔ مگر یہی کمزور لڑکا جب پچاسی سال کی عمر میں مرا تو وہ نیوٹن کے

پُرعظمت نام سے مشہور ہوچکا تھا۔ نہ صرف انگلینڈ میں اس کو بلند ترین اعزازات حاصل ہوئے بلکہ ساری دنیا میں اپنی ذہنی عظمت کا اس نے ایسا سکہ بٹھایا کہ اس کے مرنے کے سو سال بعد جب دوربینی مطالعہ میں سائنس دانوں نے دیکھا کہ سیارہ یورے نس نیوٹن کے قانون تجاذب کے بتائے ہوئے راستے سے کچھ ہٹا ہوا ہے تو انھوں نے نیوٹن کے اصول کی غلطی تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ انھوں نے کہا کہ یہاں کوئی اور سیارہ ہونا چاہئے جس کی کشش سے اس کی رفتار میں یہ فرق پیدا ہوا ہے۔

نیوٹن کو یہ عظمت کیوں کر حاصل ہوئی اس کا جواب خود اس کی زبان سے سنئے۔ ایک مرتبہ اس کے کارناموں کی تعریف کی گئی تو اس نے کہا:

"I had no special sagacity ——————
only the power of patient thought".

یعنی میرے اندر کوئی خصوصی قابلیت نہیں ہے۔ مجھے جو کچھ ملا وہ صرف اس وجہ سے ملا کہ میں نے کائنات کو سمجھنے کے لئے انتھک جدوجہد سے کام لیا ہے۔ اپنی مشہور کتاب (Principia) کی تیاری کے دوران میں اٹھارہ مہینے تک اس کا یہ حال تھا کہ وہ گھنٹوں بے حس و حرکت پڑا سوچتا رہتا۔ اس کے بعد یکایک اپنی ڈسک پر جاکر کھڑا ہوجاتا اور گھنٹوں مسلسل لکھتا رہتا۔ اس کو اتنا بھی ہوش نہیں رہتا تھا کہ قریب کی کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ جائے۔ اس کے سکریٹری کی رپورٹ ہے کہ اس دوران میں بہت کم ایسا ہوا کہ وہ دو بجے سے پہلے بستر پر گیا ہو اور بعض اوقات تو پانچ اور چھ بج جاتے تھے۔ کھانا بھی وہ اکثر بھول جاتا تھا۔ اس کی زندگی کی ضروریات بہت محدود تھیں۔ ایک مرتبہ اس سے پوچھا گیا کہ تم سگریٹ کیوں نہیں پیتے، اس نے جواب دیا:

"Because I do not want to
aquire any new necessities".

یعنی میں سگریٹ اس لئے نہیں پیتا کہ اس کی وجہ سے میری ضروریات زندگی میں خواہ مخواہ ایک نئی ضرورت کا اضافہ ہوجائے گا۔

ولیم ہرشل (William Harschell) ایک جرمن سائنس داں گزرا ہے۔ اس نے فلکیات کے مطالعہ میں انسان کے علم کو بہت آگے بڑھایا۔ اس کا حال یہ تھا کہ معاشی تنگی کی وجہ سے اسکول کے بعد وہ اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا اور ایک ملازمت کرلی۔ لیکن صحت کی خرابی کی وجہ سے انیس سال کی عمر میں یہ ملازمت بھی چھوڑنی پڑی۔ اس کے بعد اس نے اپنے خاندانی پیشے کو اختیار کیا اور وائلن بجانے لگا۔ اسی دوران میں اس کو فلکیات کے موضوع پر ایک کتاب ملی۔ اس کتاب کو اس نے بہت غور سے پڑھا۔ اس کے بعد ہرشل کو ستاروں کے مطالعہ سے گہری دل چسپی پیدا ہوگئی۔ اس کا یہ شوق اتنا بڑھا کہ کبھی کبھی رات کے وقت جب اس کی ٹولی ساز و نغمہ میں مصروف ہوتی تھی وہ مجلس چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لئے باہر نکل جاتا تاکہ آسمان پر جگمگاتے ہوئے ستاروں کی ایک جھلک دیکھ آئے۔

ستاروں کے مطالعہ کے لئے دوربین ضروری تھی۔ مگر یہ اٹھارھویں صدی کا زمانہ تھا جب کہ دوربین ابھی جلد ہی ایجاد ہوئی تھی اور نہ صرف یہ کہ ناقص تھی بلکہ اس کا ملنا بھی آسان نہیں تھا۔ ہرشل نے خود اپنی دوربین بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس کے متعلق فنی واقفیت حاصل کرنے کے لئے اس نے ریاضی پڑھنی شروع کی اور لمبی محنت کے بعد خود اپنے ہاتھ سے دوربین

تیار کی۔ ظاہر ہے کہ اس کی پہلی دوربین ابھی بہت ناقص تھی۔ مگر وہ ہمت نہ ہارا۔ دوربین کو ترقی دینے اور اس کو بہتر بنانے میں اس کا انہماک اتنا بڑھا کہ اس کا پورا گھر دوربین کا ایک کارخانہ بن گیا۔ اس زمانے میں ہرشل کی مشغولیت کا یہ حال تھا کہ وہ کھانے کے لئے بھی اپنی ورکشاپ سے نہیں نکلتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی بہن کو اکثر اس طرح اسے کھانے کے لئے آمادہ کرنا پڑتا تھا کہ وہ اپنے کام میں لگا رہتا اور بہن اس کے پہلو میں کھڑی ہوئی اس کے منھ میں لقمہ ڈالتی جاتی۔

صاف راتوں میں جب کہ آسمان پر بادل نہیں ہوتے تھے، بہت کم ایسا ہوتا کہ ہرشل بستر کے اوپر نظر آئے۔ ایسی راتوں کا بہترین مصرف اس کے نزدیک یہ تھا کہ اس کو ستاروں کا مشاہدہ کرنے میں بسر کرے۔ اس کی انھیں کوششوں کا نتیجہ تھا کہ اس کو تاریخ میں وہ مقام حاصل ہوا جس کو ایک مصنف نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

". . .he had looked farther into space
than any other eye had yet seen"

یعنی اس نے کائنات میں اتنی دور تک دیکھا جتنا اس سے پہلے کسی آنکھ نے نہیں دیکھا تھا۔

نومبر ۱۸۴۷ء کی ایک تاریخ کو جب ایک یوروپین ڈاکٹر کے کمرے میں اس کا ملازم داخل ہوا تو ڈاکٹر اور اس کے دو ساتھی اپنی کرسیوں سے گرکر فرش پر اوندھے منھ بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ ملازم نے سمجھا کہ شاید ان لوگوں نے کوئی تیز قسم کی شراب پی لی ہے۔ اس نے ان کے کپڑے درست کئے اور خاموشی کے ساتھ باہر چلا گیا۔ مگر حقیقت کچھ اور تھی۔ یہ دراصل جیمز سمپسن اور اس کے دو اسسٹنٹ تھے جنھوں نے پہلی بار کلوروفارم کے اثرات کا تجربہ کرنے کے لئے اس کو سانس کے ذریعہ اپنے اندر داخل کر لیا تھا۔ سمپسن ایک دیہاتی نانبائی کے سات لڑکوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ چار سال کی عمر میں اس نے دیہات کے اسکول میں تعلیم شروع کی اور اس میں اتنی دلچسپی اور توجہ دکھائی کہ اس کا باپ اور چھ بھائی اس پر راضی ہو گئے کہ نہایت ضروری مصارف پر قناعت کرکے اس کو اعلیٰ تعلیم کے لئے شہر بھیجیں۔ اس طرح وہ اڈنبرا یونیورسٹی پہنچا۔ اسی نانبائی کے لڑکے کے سر اس بات کا سہرا ہے کہ اس نے آپریشن کے موقع پر کلوروفارم کا استعمال دریافت کرکے انسانیت کو ایک طویل اور جانکاہ مصیبت سے نجات دی — اس نے انسان کو وہ چیز دی جس کو ڈاکٹر جان براؤن نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے:

". . .one of God's best gifits
his suffering children."

یعنی دکھی انسانوں کے نام خدا کے تحفوں میں سے ایک بہترین تحفہ —— مگر سمپسن یہ تاریخی کام صرف اس وقت کر سکا جبکہ اس کی تحقیق میں اس نے اپنے آپ کو پوری طرح لگا دیا اور اس کے لئے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالنے سے بھی گریز نہیں کیا۔

یہ ان لوگوں میں سے صرف چند کا ذکر ہے جنھوں نے دنیا میں عزت کا مقام حاصل کیا۔ آپ اس طرح کے بہت سے واقعات کو کتابوں میں پڑھ سکتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جنتِ دنیوی میں صرف وہ لوگ داخل ہو سکے جنھوں نے بے پناہ مشقت اٹھائی۔ جنھوں نے اپنی ساری صلاحیتوں کو اس کے پیچھے جھونک دیا۔ دنیا اپنی پشت پر چلنے والے کروروں اور اربوں انسانوں میں سے صرف ان تھوڑے سے لوگوں کو عزت اور سربلندی کا مقام دینے کے لئے منتخب کرتی ہے جو اس کے لئے اپنے آپ کو فنا کر دیتے ہیں، جو اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دیتے ہیں پھر خدا کی جنت جو اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے، کس قدر

خام خیالی ہوگی اگر کوئی شخص سمجھے کہ محض سطحی قسم کے عمل کے ذریعہ وہ اسے حاصل کرلے گا:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَاۤءُ وَالضَّرَّاۤءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ○

بقرہ ۲۱۴

(اے مسلمانو!) کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ تمھیں جنت میں داخلہ مل جائے گا۔ حالاں کہ ابھی تم پر وہ حالات گزرے ہی نہیں جو اس سے پہلے کے لوگوں پر گزر چکے ہیں۔ ان کو تکلیفیں اور مصیبتیں لاحق ہوئیں، وہ ہلا مارے گئے، یہاں تک کہ رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان پکار اٹھے کہ خدا کی مدد کب آئے گی۔ سن لو (ایسے لوگوں کے لئے) خدا کی مدد قریب ہے۔

آخر میں آپ کو میں ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں جو پچھلے دس سال سے میری یادداشت کا بہترین حصہ رہا ہے یہ ایک انگریز مسٹر آرنلڈ کا واقعہ ہے جو علی گڑھ میں فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ ۱۸۹۲ء میں جب مولانا شبلی نے قسطنطنیہ کا سفر کیا تو جہاز میں پورٹ سعید تک مسٹر آرنلڈ کا بھی ساتھ رہا مولانا شبلی لکھتے ہیں:

"۱۰ مئی کی صبح کو میں سوتے سے اٹھا تو ایک ہم سفر نے کہا کہ جہاز کا انجن ٹوٹ گیا۔ میں نے دیکھا تو واقعی کپتان اور جہاز کے ملازم گھبرائے پھرتے تھے اور اس کی درستی کی تدبیریں کر رہے تھے۔ انجن بالکل بے کار ہوگیا تھا اور جہاز نہایت آہستہ آہستہ ہوا کے سہارے چل رہا تھا۔ میں سخت گھبرایا اور نہایت ناگوار خیالات دل میں آنے لگے۔ اس اضطراب میں اور کیا کرسکتا تھا۔ دوڑا ہوا مسٹر آرنلڈ کے پاس گیا۔ وہ اس وقت نہایت اطمینان کے ساتھ کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو خبر بھی ہے۔ بولے کہ ہاں انجن ٹوٹ گیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کو کچھ اضطراب نہیں۔ بھلا یہ کتاب دیکھنے کا موقع ہے۔ فرمایا کہ جہاز کو اگر برباد ہی ہونا ہے تو یہ تھوڑا سا وقت اور بھی قدر کے قابل ہے اور ایسے قابل قدر وقت کو رائگاں کرنا بالکل بے عقلی ہے۔" سفرنامہ روم و مصر و شام صفحہ ۱۲

سمندر کی لہروں کے درمیان جہاز کی یہ غیر یقینی حالت آٹھ گھنٹے قائم رہی۔ آٹھ گھنٹے کا یہ وقت مسٹر آرنلڈ کے لئے جو حیثیت رکھتا تھا مومن کے لئے وہی حیثیت اس کی پوری زندگی کی ہے۔ آپ ہر وقت اس خطرے میں مبتلا ہیں کہ اچانک آپ کی موت آجائے۔ ہر لمحہ آپ کے لئے زندگی کا آخری لمحہ ہے۔ اگر آدمی کو اس بات کا واقعی احساس ہوجائے تو وہ اسی طرح ہمہ تن مشغول نظر آئے گا جیسے امتحان میں بیٹھا ہوا وہ طالب علم جس کا وقت ختم ہو رہا ہو اور ابھی اسے کئی سوال کرنے باقی ہوں۔ لیکن اگر آپ غفلت کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اگر آپ اپنے وقت کی اہمیت نہیں سمجھتے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو اس نازک صورت حال کا احساس نہیں ہے جس میں آپ کی زندگی کا جہاز گھرا ہوا ہے۔ آپ موت سے نہیں ڈرتے آپ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ سوچئے کہ آپ کی زندگی آپ کے بارے میں کس چیز کا ثبوت دے رہی ہے (زندگی ۱۳۸)

اسلامک یوتھ آرگنائزیشن (رام پور) کے اجتماع میں کی گئی تقریر۔ ۱۲ جولائی ۱۹۶۱

خدمت دین کی مشکلات

پندرہ سال پہلے کا ایک واقعہ مجھے یاد آرہا ہے۔ رواں نامی بستی کے باہر ایک باغ میں جماعت اسلامی کا ضلعی ماہانہ اجتماع ہو رہا تھا۔ ظہر کا وقت تھا۔ اذان ہو چکی تھی، ایک بڑے درخت کے نیچے فرش بچھا ہوا تھا جہاں کچھ لوگ سنتیں پڑھ رہے تھے اور کچھ نماز کے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک حادثہ پیش آیا۔ اجتماع کے بالکل قریب ایک بڑا سا گڑھا تھا جس کے عین کنارے سے راستہ گزرتا تھا۔ اس راستہ پر ایک بیل گاڑی جارہی تھی۔ جیسے ہی وہ گڑھے کے کنارے پہنچی اس کا ایک طرف کا پہیہ پھسل گیا اور پوری گاڑی کروٹ ہو کر گڑھے میں اس طرح گر گئی کہ ایک پہیہ اوپر کھڑا تھا اور دوسرا نیچے دبا ہوا تھا۔ جیسے ہی ہم میں سے کچھ لوگوں کی نظر اس پر پڑی، وہ فوراً اس کی مدد کے لئے دوڑ پڑے۔ گاڑی سامان سے لدی ہوئی تھی۔ بیل بھی اس کے ساتھ جوئے میں پھنسے ہوئے تھے۔ بظاہر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ چند لوگ کیسے اس مسئلہ کو حل کر سکیں گے۔ مگر یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا، بلکہ فی الفور اقدام کرنے کا وقت تھا۔ آنے والے فوراً اپنے کام میں لگ گئے۔ کچھ نے نیچے سے زور لگایا اور کچھ نے اوپر سے پکڑ کر گاڑی کو اٹھانا شروع کیا۔ میں ان خوش نصیبوں میں تھا جو گاڑی کو نیچے سے اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس کے بعد ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آیا۔ یکایک ہم نے دیکھا کہ گاڑی اٹھا کر اوپر رکھ دی گئی ہے۔ واقعی ایسا ہی ہوا۔ جو چند آدمی اس کام میں لگے تھے ان سب کا متفقہ احساس تھا کہ گاڑی ہم نے نہیں اٹھائی ہے، بلکہ وہ تو کسی اور نے اٹھا کر کھڑی کر دی ہے۔ نیچے ہاتھ دینے والوں کو ایسا لگ رہا تھا جیسے اوپر سے کوئی اس کو کھینچے چلا جارہا ہے۔ اور جو لوگ اوپر تھے ان کو ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا گاڑی نیچے سے اٹھتی چلی آرہی ہے۔

یہ واقعہ جو پچھلے پندرہ سال سے میری یادداشت کا بہترین سرمایہ رہا ہے اس کو میں نے قصہ خوانی کے طور پر آپ کے سامنے پیش نہیں کیا ہے، خدا مجھ کو اس سے بچائے کہ میں قصہ خوانی کو اپنا طریقہ بناؤں اور قصے سنانے میں آپ کا وقت ضائع کروں۔ میں نے اس کو صرف اس لئے بیان کیا ہے کہ آپ اس پر غور کریں۔ کیوں کہ اس کے اندر ہمارے لئے بڑی عبرت کا سامان ہے، یہ واقعہ ہمارے لئے اس بات کا پیغام ہے کہ خدا انسانوں کی مدد کرتا ہے، یہ ہمارے لئے خدا کی مدد کا ایک ذاتی تجربہ ہے۔ تاریخ میں ایسے بے شمار واقعات ہم پڑھتے ہیں۔ مگر یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو ہماری اپنی زندگی میں پیش آیا ہے جس کا ہم نے براہ راست تجربہ کیا ہے۔ لدی ہوئی اور پھنسی ہوئی گاڑی کا محض چند آدمیوں کے ہاتھ لگانے سے دم بھر میں اٹھ کر کھڑی ہو جانا، یقیناً خدا کی مدد کی وجہ سے تھا۔ اگر ہم کو وہ آنکھیں حاصل ہوتیں جن سے غیر مادی حقیقتوں کو دیکھا جا سکے تو ہم دیکھتے کہ عین اس وقت جب کہ چند کمزور آدمی محض خدا کے بھروسے پر بالکل حسبۃً للہ ایک نیک کام کے لئے دوڑ پڑے تو اسی وقت آسمان سے فرشتوں کی بھی ایک فوج اتر آئی اور اس نے آن کی آن میں وہ کام کر دیا جو ہمارے کم زور ہاتھوں سے نہیں ہو سکتا تھا۔

دوستو! اسی طرح سے ایک اور گاڑی پھنسی ہوئی ہے۔ یہ دین کی گاڑی ہے۔ اسلام کی گاڑی چلتے چلتے حالات

میں پھنس گئی ہے۔ پاسبانوں کی غفلت سے باطل اس پر حملہ آور ہو گیا ہے۔ زمین کی خرابی سے اس کے پہیے اپنی جگہ سے ہٹ گئے ہیں۔ اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ آپ اس کے لئے دوڑ پڑیں۔ آپ اس کو اٹھانے کے لئے اپنے وجود کو لگا دیں۔ آپ کی زندگی کا بہترین مصرف، آپ کے اوقات کا اعلیٰ ترین استعمال اس وقت اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ یہی ہے کہ آپ خدا کے دین کی گاڑی کو اٹھانے میں لگے ہوئے ہوں۔ اس زمین پر انسان کے لئے اس سے بڑی اور کوئی سعادت نہیں۔ خدا کے دین کا مظلوم ہونا ہمارے لئے سعادت و کامرانی کا بہترین موقع فراہم کرتا ہے۔ یہ اگرچہ دین اور اہل دین کے لئے انتہائی سخت حالت ہے، مگر انھیں سخت حالات میں ہمارے لئے اُس سب سے بڑی کامیابی کا راز چھپا ہوا ہے جس کی اس دنیا میں کوئی شخص تمنا کر سکتا ہے۔

انسان کے لئے اس سے بڑی اور کوئی سعادت نہیں کہ وہ خدا کے کام میں لگا ہوا ہو۔ ہمارا عاجز اور کمزور وجود خدا کی خدمت میں مصروف ہو۔ کیا اس سے بڑی بھی کوئی بات ہو سکتی ہے جس کی ہم آرزو کریں۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی اس سے بڑی بات یہ ہے کہ خدا کی مدد کے لئے اٹھنا خود ہم کو خدا کی مدد کا مستحق بناتا ہے۔ جب بندہ خدا کے کام میں مصروف ہوتا ہے تو وہ تنہا نہیں ہوتا، بلکہ خود خدا بھی اس کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ خدمت دین وہ بہترین وقت ہے جب بندے کو خدا کی معیت حاصل ہوتی ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ لمحات کس قدر قیمتی ہیں جب بندہ خدا کے ساتھ چل رہا ہو، جب وہ خدا کے سایہ میں سفر کر رہا ہو، جب خدا کے فرشتے اس کے ہم رکاب ہوں، جب وہ براہ راست خدا کی نگرانی میں آ گیا ہو۔ آپ جانتے ہیں کہ ایک معمولی آدمی کو اگر کسی حاکم کی معیت حاصل ہو جائے تو وہ پھولا نہیں سماتا۔ پھر خدا کی معیت اور اس کی مدد کا کیا ٹھکانا۔

دین آج جس چیز کا تقاضا کر رہا ہے، اسے آپ ہی کو پورا کرنا ہے۔ یہ کام آپ کو انجام دینا ہے۔ خدا کی طرف سے آپ کو ایمان کی توفیق ملنا اور آخری رسول کی امت میں شامل کیا جانا، گویا خدا کی طرف سے آپ کو اس کام پر مقرر کیا جانا ہے۔ آپ کا ایمان، اس کام پر آپ کے تقرر کا نشان ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جب کسی شخص کو کسی کام پر مقرر کیا جاتا ہے تو اس کے لئے اس کی ڈیوٹی کے مطابق تمام انتظامات بھی کر دئے جاتے ہیں۔ ایک شخص کو حکومت کی طرف سے خط ملے کہ تم کو فلاں جنگلی علاقے میں فارسٹ افسر بنایا گیا ہے، تم وہاں جا کر اپنی ڈیوٹی سنبھالو۔ تو اس کے ذہن میں فوراً چند سوالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس وقت وہ سرکاری ملازمتوں کے متعلق حکومت کے شائع شدہ قواعد و ضوابط سے رجوع کرے تو وہ دیکھے گا کہ وہاں اس کے سارے سوالات کا پیشگی جواب لکھ دیا گیا ہے۔ "گھر سے ڈیوٹی کے مقام تک جانے کی صورت کیا ہوگی" جواب یہ کہ تم کو پوری مسافت کے لئے معقول سفر خرچ دیا جاتا ہے۔ "میں وہاں جا کر کس جگہ رہوں گا" اس کا جواب یہ ہوگا کہ وہاں تمھارے رہنے کے لئے سرکاری بنگلہ بنا ہوا ہے۔ "جنگل میں اپنی حفاظت کے لئے میں کیا کروں گا" حفاظتی دستہ تمھارے ساتھ موجود رہے گا۔ "گھر کے اخراجات کے لئے کیا ہوگا" تم کو ماہانہ تنخواہ کے طور پر ایک معقول رقم دی جائے گی۔" اسی طرح ملازم کے ہر سوال کا ایک اطمینان بخش جواب حکومت کے پاس موجود ہوگا۔ ہر تقرر لازماً یہ چاہتا ہے کہ جس کو مقرر کیا جائے، اس کی ضروریات اور مشکلات کا بھی اس میں پورا لحاظ کیا گیا ہو۔

اسی طرح خدا نے جب آپ کو ایک کام پر مقرر کیا ہے تو اسی کے ساتھ اس نے یقینی طور پر آپ کی ہر ضرورت کا انتظام بھی کر دیا ہے۔ خدا تمام مہربانوں سے بڑھ کر مہربان ہے۔ اس کے ہاتھ میں زمین و آسمان کا اقتدار ہے۔ ذرائع و وسائل کا

سارا خزانہ اس کی مٹھی میں ہے۔ ناممکن ہے کہ وہ اپنے عاجز اور حقیر بندوں کو ایک کام پر مقرر کرے اور پھر ان کی ضروریات کا لحاظ نہ کرے۔ یہ اس کی صفت رحیمیت کے خلاف ہے۔ یہ اس کی شان اقتدار کے منافی ہے۔ بلا شبہ اس نے خادمان دین کی تمام ضروریات کا اس دنیا میں مکمل انتظام کر دیا ہے۔ ایسا انتظام کہ آخرت میں کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ دین کی خدمت کرنا چاہتا تھا مگر دشواریوں اور مشکلوں کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکا۔

یہ انتظام کیا ہے اور ہم کس طرح اسے جانیں، اس کی میں نہایت آسان صورت آپ کو بتاؤں۔ آپ خدمت دین کے کام کا ارادہ کیجئے اور اس کے بعد سوچئے کہ اس کام میں آپ کی کیا کیا ضرورتیں ہو سکتی ہیں۔ جتنی معقول ضرورتیں اور عملی مسائل آپ کی سمجھ میں آئیں، ان سب کی ایک فہرست بنا ڈالئے اور اس کے بعد خدا کی کتاب کھول کر اس کو ابتدا سے پڑھنا شروع کیجئے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک ملازم سرکار اپنی ملازمت کے مسائل کے متعلق جاننے کے لئے حکومت کے قواعد و ضوابط کا مطالعہ کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب آپ ایسا کریں گے تو آپ کو نظر آئے گا کہ خدا کی کتاب آپ کے ہر معقول مطالبے کا قطعی اور یقینی جواب دیتی چلی جا رہی ہے۔ کسی بھی ایسی حقیقی ضرورت کا آپ تصور نہیں کر سکتے جس کا خدا کی کتاب ذمہ نہ لے رہی ہو۔ اس معاملہ میں ہرگز آپ کتاب الٰہی کو خاموش نہ پائیں گے۔ اس کے بعد مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ خدا کی کتاب میں ہماری کسی ضرورت کے بارے میں ایک یقین دہانی کا مل جانا اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ ہم اس پر بھروسہ کریں۔ ایمان کا مطلب خدا پر توکل ہے اور ایمان کے لفظی معنی بھروسہ اور اعتبار ہی کے آتے ہیں (یوسف ۱۱) خدا پر اور قرآن پر ایمان لانے کا اصل مطلب یہی ہے۔ اس لئے اگر ہم خدا کی کتاب میں ایک یقین دہانی پا لینے کے باوجود اس پر اعتماد نہ کریں تو یہ خود ہمارے ایمان کے خلاف ہوگا۔ ایسی صورت میں ہم کو خود اپنے ایمان پر نظر ثانی کرنی چاہئے نہ کہ ہم قرآن کے الفاظ پر شبہ کریں۔

۱۔ آئیے ہم اس حیثیت سے قرآن کا ایک مختصر مطالعہ کریں۔ موجودہ زمانے میں دین کی خدمت کرنے کا ارادہ ہم سے کن ضرورتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک داعی کے سامنے سب سے پہلا سوال جو آتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ بڑا مشکل کام ہے اور میں نہایت کمزور ہوں۔ خاص طور پر اس کے لئے زبان و قلم کی زبردست طاقت درکار ہے اور مجھے اس پر قدرت نہیں۔ اس کا آغاز زبان و قلم ہی سے ہوتا ہے۔ اس لئے اس اعتبار سے اپنی بے مائگی کا احساس اور حالات کی ناموافقت کی وجہ سے پست ہمتی ـــــ یہ دو چیزیں سب سے پہلے موجودہ زمانے میں دعوتی کام کی بات سوچنے والے پر طاری ہوتی ہیں۔

یہ مسئلہ ذہن میں رکھ کر جب ہم قرآن کے صفحات پر نظر ڈالتے ہیں تو بنی اسرائیل کی تاریخ کا ایک واقعہ ہمارے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ بنی اسرائیل کے ایک مرد صالح کو اللہ تعالیٰ کوہ طور پر بلا کر اس کو پیغمبری عطا کرتا ہے اور اس کو یہ خدمت سونپتا ہے کہ وہ فرعون اور مصر کی قبطی قوم کے پاس جا کر اس کو خدا کا پیغام پہنچائے۔ حضرت موسیٰ محکوم فرقہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کو ملک کی حکمراں قوم کو خطاب کرنے کا کام سونپا جا رہا تھا۔ اس تقرر کو سن کر وہ بے اختیار کہہ اٹھے کہ خدایا میں اپنے اندر اس کی ہمت نہیں پا رہا ہوں اور میری زبان میرا ساتھ دیتی ہوئی نظر نہیں آتی:

رَبِّ اِنِّیْٓ اَخَافُ اَنْ یُّکَذِّبُوْنِ وَیَضِیْقُ صَدْرِیْ وَلَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ ـ شعراء ۱۲-۱۳	خدایا مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھے جھٹلا دیں گے میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے اور میری زبان نہیں چلتی۔

خدا کی طرف سے جواب ملتا ہے کہ تم ڈرو مت۔ تمھاری ضرورت کی سب چیزیں تم کو ہماری طرف سے دے دی گئیں ——
قَدْ اُوْتِیْتَ سُؤْلَکَ یٰامُوْسٰی (طٰہٰ - ۳۶)
یہ مانگنے اور دیے جانے کا واقعہ جو قرآن میں نقل کیا گیا ہے، وہ بنی اسرائیل کی تاریخ کے ایک واقعہ کی شکل میں ہماری اسی قسم کی مانگ کا جواب ہے۔ امت محمدیہ کے افراد جو ختم نبوت کے بعد نبوت کے کام پر مامور کیے گئے ہیں ان کے لیے بنی اسرائیل کے پیغمبر کا یہ واقعہ ایک پیشگی بشارت ہے۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ اگر تم ہمارے دین کی دعوت دینے کے لئے اٹھو تو ہم تم کو زبان دیں گے جس سے تم بولو گے، اور ہم تمھاری ڈھارس بندھائیں گے۔ جس کے بعد تم بڑے بڑے مواقع پر کسی ہچکچاہٹ کے بغیر ہماری آواز پہنچا سکو گے۔ مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ اگر آج کسی بندۂ خدا کے اندر حقیقۃً داعی بننے کا جذبہ ابھر آئے اور وہ بے تابانہ اپنے رب کو پکار اٹھے کہ میں یہ کام کرنا چاہتا ہوں مگر:

اللھم یضیق صدری ولا ینطلق لسانی — خدایا میرا سینہ تنگ ہو رہا ہے اور میری زبان چلتی نہیں

تو یقیناً کلام الٰہی اس کو دوبارہ آواز دے کر کہے گا کہ جاؤ ہم نے تم کو وہ چیز دے دی جس کی تمھیں ضرورت تھی۔ وہی خدا آج بھی اس دنیا کا خدا ہے جس نے کوہ طور پر حضرت موسیٰ کو خطاب کیا تھا۔ وہ آج بھی وہی کچھ کر سکتا ہے جو اس نے ہزاروں برس پہلے اپنے ایک بندے کے ساتھ کیا تھا۔ وہ چاہے تو گونگے کو ناطق بنا دے اور بولتے ہوئے شخص کو گونگا کر دے۔ کم زور دل کو ہمت دے دے اور ہمت والے کو پست کر کے بٹھا دے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ پھر ہم کیوں نہ اس کے اوپر بھروسہ کریں۔

۲۔ دوسری ضرورت جس کا اس سلسلے میں سوال پیدا ہوتا ہے، وہ معاش کا مسئلہ ہے۔ آدمی جب دین کی ضرورت پوری کرنے کے لئے اٹھتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی اپنی ضروریات تو ختم نہیں ہو جاتیں۔ اس کے جسمانی تقاضے، اس کا گھر، اس کا خاندان، اس سے بہت سی چیزیں مانگتے ہیں۔ اگر وہ دین کے کام کی طرف جھکے تو ذاتی کاموں میں کمی ہوتی ہے اور ذاتی ضروریات میں اپنی توجہ صرف کرے تو دین کا خانہ خالی رہ جاتا ہے۔ یہ دوسرا سوال ہے جو ہر داعی کے سامنے لازماً پیش آتا ہے اور اس کو پریشان کرتا ہے۔

یہ سوال لے کر ہم قرآن پڑھنا شروع کرتے ہیں تو بہت سے مقامات ہم کو ملتے ہیں جہاں اس معاملہ میں ہم کو خدا کی مدد کا یقین دلایا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ہم قرآن کی ۶۵ ویں سورہ میں پہنچ جاتے ہیں اور وہاں یہ الفاظ لکھے ہوئے پاتے ہیں:

وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ (طلاق ۲)

جو اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا تو اللہ اس کے لئے کشادگی پیدا کر دے گا اور اس کو ایسی ایسی جگہوں سے رزق پہنچائے گا جہاں اس کا گمان بھی نہیں جا سکتا۔

یہ ایک بہت بڑی یقین دہانی ہے، یہ ایک عظیم انشورنس ہے جو خدا کی طرف سے اہل ایمان کو دیا گیا ہے۔ آج کا انسان سمجھتا ہے کہ صرف اس کا کھیت، اس کی دکان اور اس کی ملازمت واحد ذریعے ہیں جو کسی کو رزق دیتے ہیں۔ اس کو خدا کے عظیم سرچشمے کی سرے سے خبر ہی نہیں۔ اس کو معلوم ہی نہیں کہ یہاں ایک اور خزانہ ہے جو تمام معلوم خزانوں سے زیادہ بھرا ہوا ہے۔ یہاں ایک

اور دینے والا ہے جو تمام دینے والوں سے زیادہ دے سکتا ہے۔ اس لئے یہ لوگ خدا کے خزانے کو چھوڑ کر بس ادنیٰ خزانوں کے سامنے دامن پھیلائے کھڑے ہیں۔ وہ چھوٹے ذریعہ کو پاکر خوش ہیں۔ حالاں کہ وہ اس سے بڑا ذریعہ بھی حاصل کر سکتے تھے۔ موجودہ انسان کی مثال اس بے صبرے نوجوان کی سی ہے جس کو گھر پر باپ کی وراثت میں معقول زمین ملی ہو۔ مگر دیہات کے خشک ماحول سے گھبرا کر وہ بمبئی بھاگ جائے اور وہاں واشنگ فیکٹری میں کلرکی حاصل کر کے سمجھے کہ میں نے اپنے رزق کا ذریعہ حاصل کر لیا۔ حالاں کہ بمبئی کی اس ملازمانہ زندگی میں وہ جو کچھ حاصل کر رہا ہے، اس سے بہت زیادہ خود اپنے گھر پر وہ اپنے کھیتوں اور باغوں میں کام کر کے آزادانہ طور پر حاصل کر سکتا تھا۔

۳۔ اب تیسری ضرورت کا تصور کیجئے جو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب داعی مشکلات میں پھنس گیا ہو۔ جب حالات سے اس کا ٹکراؤ شروع ہو گیا ہو، جب باطل طاقتیں اس کو کچلنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی ہوں۔ یہ ہمارے احتیاج کا نازک وقت ہوتا ہے۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب داعی کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔

اس صورت حال کا احساس لے کر جب ہم قرآن کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے بار بار نازک اوقات میں اہل ایمان کی مدد کی ہے۔ بلکہ ایسے وقت میں مدد کے لئے پہنچنا، اس نے اپنے اوپر اہل ایمان کا حق قرار دیا ہے۔

كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ   روم ۴۷   اہل ایمان کی مدد کرنا ہمارے اوپر اہل ایمان کا حق ہے

بندے کے لئے احتیاج کا انتہائی وقت، آقا کے لئے بھی اس کی طرف متوجہ ہونے کا انتہائی وقت ہوتا ہے حتیٰ کہ نازک اوقات میں وہ یہاں تک کرتا ہے کہ اپنی مخصوص فوج کو اہل ایمان کی کمک کے لئے روانہ کر دیتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ (انفال ۔ ۹)

جب تم اپنے رب سے مدد مانگ رہے تھے تو اللہ نے جواب دیا کہ میں ہزار فرشتے بھیج کر تمہاری مدد کروں گا

یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا کے خادم، حقیقی خادم پر خدا کے دشمن حملہ آور ہوں۔ انھوں نے اس کا نرغہ کر لیا ہو، اور خدا بس دور سے اس کا تماشا دیکھتا رہے، یہ بالکل ناقابل تصور ہے۔ ایسے مواقع پر تو خدا کی غیرت و حمیت دوسرے مواقع کے مقابلے میں اور زیادہ شدت کے ساتھ بھڑک اٹھتی ہے۔ مگر مدد کا یہ معاملہ صرف ایسے ہی لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو حقیقی خادم اور سچے وفادار ہوں۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء میں جب تیزپور میں چینی حملہ کا خطرہ بہت بڑھ گیا تھا حکومت ہند کا ایک اعلیٰ افسر وہاں سے ڈر کر قبل از وقت بھاگ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے اس کو ملازمت سے برخاست کر دیا۔ اگر وہ جرأت اور وفاداری کے ساتھ اپنے مقام پر ڈٹا رہتا، تو ہو سکتا تھا کہ خطرہ پیش آنے کی صورت میں حکومت کا خاص ہوائی جہاز بھیجا جاتا تاکہ وہاں جا کر افسر اور اس کے خاندان کو شہر سے نکال لائے۔

یہ چند مثالیں یہ سمجھنے کے لئے کافی ہیں کہ کس طرح خدا نے اپنے دین کے خادموں کی تمام ضروریات و مسائل کا ذمہ لیا ہے۔ مگر یاد رکھئے قرآن میں ہماری ضرورتوں کے بارے میں یہ جو یقین دہانیاں کی گئی ہیں اس کا مطلب لازمی طور پر یہ نہیں ہے کہ خدا کے فرشتے ہر صبح و شام آسمان سے خوان لے کر اتریں گے اور ہمارے سامنے بچھا دیا کریں گے۔ اگرچہ ایسا بھی ہو سکتا ہے مگر عام حالات میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہ نہیں ہے۔ ہماری احتیاجات کی تکمیل کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی مدد کا مطلب

دراصل یہ ہے کہ وہ حالات کو اس طرح ہمارے موافق بنادے گا کہ ہم بآسانی اپنی ضروریات پوری کرسکیں ــ وہ ایسے امکانات پیدا کرے گا جن کو استعمال کرکے ہم اپنی کاربرآری کرسکتے ہوں، وہ لوگوں کے دلوں میں ہمارے متعلق ایسے خیالات ڈالے گا کہ وہ ہمارے کام آسکیں، وہ ہمارے ذہن کو ایسی تدبیروں کی طرف لے جائے گا، جس کے بعد مسائل خود بخود حل ہوجائیں گے۔ وہ ایمان کی برکت سے ذہنی اور نفسیاتی صلاحیتوں کو ایسی جلا دے گا کہ کم صلاحیت والے بہتر صلاحیت والوں سے زیادہ کام کرسکیں گے، مقابلے کے وقت وہ ہمارے دل کو مضبوط کرے گا اور دشمن کو مرعوب کرکے شکست کو آسان بنادے گا۔ مختصر یہ کہ ہمارے کام بھی انھیں ظاہری حالات کے اندر ہوں گے جیسے سب کے ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایمان کی برکت اور اللہ تعالیٰ کی توجہ کی بنا پر حالات میں کچھ ایسا غیر معمولی پن آجائے گا کہ کمتر وسائل سے ہم زیادہ کام لے سکیں گے اور معمولی ساز و سامان کے باوجود زیادہ نتائج حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔

دوستو! یہ باتیں جو میں نے آپ کے سامنے عرض کی ہیں، یہ کوئی جذباتی نعرہ نہیں ہے اور نہ شاعری ہے۔ یہ ایک سراپا حقیقت کا اظہار ہے۔ اگر اس دنیا میں کوئی چیز ممکن ہے تو سب سے بڑا ممکن یہ ہے کہ بندہ جب خدا کی مدد کا محتاج ہو تو خدا اس کی مدد کرے۔ اس زمین و آسمان میں ہر دوسرے امکان کے بارے میں مجھے شبہ ہوسکتا ہے۔ مگر یہ امکان میرے لئے ہر شبہ اور تردد سے بالاتر ہے کہ خدا اپنے ان بندوں کی مدد کرتا ہے جو اس کے دین کی مدد کے لئے اٹھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ بندے کے اندر کوئی ذاتی طاقت ہے۔ بعض مذاہب کی طرح میں اس نظریے پر کوئی عقیدہ نہیں رکھتا کہ انسان اپنی ریاضت سے خدا کو یا فطرت کی برتر طاقتوں کو مسخر کرلیتا ہے۔ میرے نزدیک یہ بالکل لغویات ہے۔ خدا کی مدد کو میں سب سے زیادہ قطعی اس لئے قرار دے رہا ہوں کہ یہ خدا کی اپنی صفت ہے۔ خدا کا رحیم اور قادر ہونا، اس کا خالق اور مالک ہونا لازمی طور پر تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے عاجز اور محتاج بندوں کی مدد کرے۔ یاد رکھئے کہ یہ خدا کی شانِ خدائی کے بالکل خلاف ہے کہ وہ بندوں کو عاجز و مجبور کی حیثیت سے پیدا کرے۔ اور جب بندوں کا عجز کسی ضرورت کا محتاج ہو تو وہ ان کی مدد نہ فرمائے۔ یہ خدا کی شان کے خلاف ہے۔ اس لئے یہ قطعاً ناممکن ہے۔

دوستو! اگر آپ کے پاس سننے کے لئے کان ہوں تو خدا کی کتاب پکار رہی ہے ــــ من انصاری إلی اللہ (کون ہے جو خدا کے کام میں اس کا مددگار بنے) اور اسی کے ساتھ اس میں یہ ضمانت بھی موجود ہے کہ ــــ ان تنصروا اللہ ینصرکم) اگر تم خدا کی مدد کے لئے اٹھو گے تو خدا تمھاری مدد کرے گا) خدا آپ کو ایسے کام کے لئے پکار رہا ہے جس میں وہ خود آپ کا مددگار ہے۔ دین کی خدمت خدا کی معیت کا راستہ ہے۔ اس کی مدد سے ہم کنار ہونے کا راستہ ہے۔ یہ وہ راستہ ہے جو آپ کو جنت کی طرف لے جاتا ہے، اگر ایک ایسے کام کے لئے بھی آپ نہیں اٹھیں گے تو اور کس کام کے لئے اٹھیں گے۔ اور اس خدمت کے بغیر مرگئے تو خدا کا سامنا کس طرح کریں گے۔

اٹھئے کہ اس سے بڑا کوئی کام نہیں، اٹھئے کہ اس سے بڑی کوئی سعادت نہیں ہوسکتی (الفرقان ربیع الثانی ۱۳۸۴ھ)

جماعت اسلامی ضلع اعظم گڑھ کے اجتماع میں کی گئی ایک تقریر، اوائل ۱۹۶۳

ہمیں کیا کرنا ہے

"ہمیں کیا کرنا ہے" —— اس سوال کا جواب ایک لفظ میں یہ ہے کہ ہمیں اپنے آپ کو اور دوسرے بندگانِ خدا کو آگ کے عذاب سے بچانا ہے۔ قرآن نے زندگی کا جو تصور دیا ہے اس کے مطابق زندگی کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ آدمی آخرت میں خدا کی گرفت سے بچ سکے۔ اس آنے والے دن کی سختیوں سے اپنے آپ کو بچانا اور دوسرے انسانوں کو اس سے بچنے کی تلقین کرنا —— یہی مسلمان کا اصل کام ہے اور اس کے سارے اعمال کا مرکز و محور یہی ایک چیز ہے۔

ہمارے ملک میں جو سب سے بڑا حادثہ پیش آرہا ہے وہ یہ کہ یہاں بسنے والے انسانوں میں سے ہر روز تقریباً ڈیڑھ لاکھ آدمی مرجاتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ موت کے فرشتے کل کے لئے جن ڈیڑھ لاکھ آدمیوں کی فہرست تیار کررہے ہیں اس میں ہمارے ملک کے باشندوں میں سے کس کس کا نام ہو۔ ہم میں سے ہر شخص کو موت آنی ہے، مگر ہم میں سے کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس کی موت کب آئے گی اور جن لوگوں کے درمیان ہم زندگی گزار رہے ہیں ان کے متعلق بھی کچھ نہیں معلوم کہ ان میں سے کون کل اٹھالیا جائے گا اور کون کل کے بعد ہمارا پیغام سننے کے لئے باقی رہے گا۔

ایک طرف یہ حقیقت ہے اور دوسری طرف یہ واقعہ کہ موت ہماری زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ ہماری اصل زندگی کا آغاز ہے۔ موت دراصل کسی انسان کا وہ وقت ہے جب وہ کائنات کی عدالت میں آخری فیصلے کے لئے پیش کر دیا جاتا ہے۔ اب اگر آپ ان دونوں چیزوں کو ملادیں، یعنی زندگی کی بے اعتباری اور یہ کہ زندگی کا اصل مسئلہ کیا ہے، تو فوراً آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ موت سے پہلے آدمی کو بہت سے کام نظر آتے ہیں۔ مگر موت کے بعد آدمی کے سامنے ایک ہی کام ہوگا۔ وہ یہ کہ خدا کے غضب سے وہ کس طرح بچے۔ جب آدمی کے پاس بہت زیادہ وقت ہو تو وہ بہت سے کام چھیڑ دیتا ہے مگر جس کو وقت کے صرف چند لمحے حاصل ہوں وہ صرف وہی کام کرتا ہے جو انتہائی ضروری ہے فیصلہ کن لمحات میں کوئی شخص غیر متعلق کام میں مصروف ہونے کی حماقت نہیں کر سکتا۔

یہ آنے والا وقت ہم میں سے ہر شخص کی طرف دوڑا چلا آرہا ہے۔ ہر زندہ انسان اس خطرے میں مبتلا ہے کہ کل اس کی موت آجائے اور اس کے بعد نہ اس کے لئے سننے کا موقع باقی رہے اور نہ ہمارے لئے سنانے کا۔ یہ صورتِ حال خود بتارہی ہے کہ آپ کے کرنے کا کام کیا ہے۔ آپ کے کرنے کا کام یہ ہے کہ آپ اس ملک کے ایک ایک شخص تک پہنچیں اور اس کو زندگی کے حقیقی مسئلہ سے آگاہ کریں۔ اس ملک کی آبادی اگر ساٹھ کروڑ ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کو ساٹھ کروڑ کام کرنے ہیں۔ کیوں کہ آج کا ہر انسان حقیقت سے غافل ہے۔ ہر آدمی اس بات کا حاجت مند ہے کہ اس کو حقیقت کا علم پہنچایا جائے۔

ہمارے رہنما حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جب دعوت حق کے کام پر مامور کیا گیا تو آپ نے مکہ میں ایک تقریر کی۔ نبی کی حیثیت سے یہ آپ کی پہلی تقریر تھی۔ حمد و ثنا کے بعد آپ نے فرمایا:

إِنَّ الرَّائِدَ لَا يَكْذِبُ أَهْلَهُ، وَاللهِ لَوْ كَذَبْتُ النَّاسَ جَمِيعًا مَا كَذَبْتُكُمْ وَلَوْ غَدَرْتُ النَّاسَ جَمِيعاً ما

راہنما اپنے آدمیوں سے جھوٹ نہیں بول سکتا خدا کی قسم اگر میں تمام لوگوں سے جھوٹ کہہ سکتا جب بھی تم سے جھوٹ نہ کہتا۔ اور

غررتكم، والله الذی لا الٰہ الا ھو انی لرسول اللہ الیکم خاصۃ والی الناس کافۃ والله لتموتن کما تنامون ولتبعثن کما تستیقظون ولتحاسبن بما تعملون ولتجزون بالاحسان احسانا وبالسوء سوءا وانھا لجنۃ ابدا او لنار ابدا

(جمہرۃ خطب العرب، حصہ اول، صفحہ ۵۱)

اگر میں تمام لوگوں کو دھوکا دے سکتا جب بھی تمہیں دھوکا نہ دیتا۔ اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی خدا نہیں، میں خدا کی طرف سے بھیجا ہوا رسول ہوں تمھاری طرف خاص طور پر اور دوسرے انسانوں کی طرف عام طور پر۔ خدا کی قسم تمھیں مرنا ہے جس طرح تم سوتے ہو اور پھر تمھیں اٹھنا ہے جس طرح تم جاگتے ہو۔ اور یقیناً تم سے تمھارے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ پھر اچھے عمل کا اچھا بدلہ ملے گا اور برے عمل کا برا بدلہ۔ اس کے بعد یا تو ہمیشہ کے لئے جنت ہے، یا ہمیشہ کے لئے آگ۔

ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا: انا النذیر العریان (متفق علیہ) یعنی میرا کام تم کو آخرت کے عذاب سے ڈرانا ہے جس طرح "نذیر عریاں" اپنے قبیلے کو آنے والے خطرے سے ہوشیار کرتا ہے۔ اسی لئے نبی کو قرآن میں "نذیر و بشیر" کہا گیا ہے۔ یعنی وہ مستقبل کے خطرے سے لوگوں کو آگاہ کرتا ہے اور جو لوگ اس کے مطابق اپنے کو بنالیں ان کو اس بات کی خوش خبری دیتا ہے کہ وہ کامیاب ہوں گے۔ اور اسی لئے امت مسلمہ کا مقصد "شہادت حق" بتایا گیا ہے یعنی لوگوں کے سامنے اس بات کو واضح کرنا کہ حق کیا ہے اور خدا کے یہاں ان کی نجات کا دار و مدار کس چیز پر ہے۔

یہ خدا کی طرف بلانا اور آنے والے دن سے ہوشیار کرنے کے لئے نذیر عریاں بن جانا وہ سب سے بڑا انقلابی پروگرام ہے جس سے اب تک انسان واقف ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے بڑے کسی عملی پروگرام کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے پروگرام جو دنیا میں اختیار کئے جاتے ہیں وہ اپنے الفاظ اور نعروں کے لحاظ سے بہت بڑے بڑے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ سب کے سب نہایت حقیر اور محدود ہیں۔ ان کا دائرہ انسانی زندگی میں تھوڑی تھوڑی دور جاکر ختم ہوجاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں یہ نظریہ انسان کے اندر آخری حد تک سرایت کرتا ہے، یہ فساد کبیر کے خلاف جہاد عظیم ہے جو داعی کو سرتاپا مصروف بناکر رکھ دیتا ہے۔ وہ اس کے تمام ظاہری و باطنی معاملات میں انقلاب برپا کرنے والا ہے۔ یہ کام اپنی ابتدا میں ایک کام ہے مگر جب وہ عمل میں آتا ہے تو شاخ در شاخ پھیلتا ہوا ہزار کام بن جاتا ہے۔

جو لوگ صرف اقتدار کے لئے اٹھتے ہیں ان کا کام اس وقت ختم ہوجاتا ہے جب وہ ایک حکمراں خاندان کو قتل کردیں یا چند سیاسی لیڈروں کو زیر کرکے ان سے حکومت کی کرسی چھین لیں۔ جب کہ یہ نظریہ ان تمام انسانوں کو فتح کرنا چاہتا ہے جو زمین کے اوپر چل پھر رہے ہیں۔ سماجی اصلاح کا پروگرام چند اسکول اور چند ہسپتال بنوانے کے بعد مطمئن ہوجاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کا کام ہوگیا، جب کہ یہ نظریہ دلوں اور دماغوں کو بدل کر نئے قسم کے انسان وجود میں لانا چاہتا ہے۔ جس سے زیادہ مشکل کوئی کام اس سرزمین کے اوپر نہیں ہے۔ معاشی اسکیمیں چند سال کی دنیوی زندگی کے لئے کچھ نشانے آدمی کے سامنے رکھ دیتی ہیں۔ جب کہ یہ نظریہ لامتناہی زندگی کی بے حساب کامرانیاں حاصل کرنے

کے لئے آدمی کو متحرک کرتا ہے۔ ہر دوسرے کام کا ایک خاص میدان ہے۔ یہ میدان جہاں موجود نہ ہو وہاں اس کے کارکن بے دست و پا نظر آنے لگتے ہیں۔ مثلاً اشتراکیت ایسے ماحول میں اپنے آپ کو بے بس پاتی ہے جہاں مزدور اور سرمایہ دار کے درمیان جھگڑے نہ ہوں۔ آزادی کی تحریک کے لئے اس وقت کرنے کا کام کچھ نہیں رہتا جب بیرونی آقا ہٹ گئے ہوں اور ان کی جگہ ملکی آقاؤں نے لے لی ہو۔ مگر یہ نظریہ ایک ایسا وسیع اور ہمہ گیر نظریہ ہے جس کے لئے ہر وقت کرنے کا کام ہے اور ہر جگہ اس کے لئے کام کا میدان موجود ہے۔

پھر اس نظریے کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ وہ سب سے پہلے خود داعی کو بدل دیتا ہے، جب کہ دوسرے نظریات کا حال یہ ہے کہ وہ صرف دوسروں سے تبدیلی کا مطالبہ کرتے ہیں، خود اپنے پیرووں کے اندر تبدیلی لانے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ چنانچہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک تحریک کچھ انسانوں کو جمع کرتی ہے تاکہ وہ غذائی قلت کے خلاف حکومت سے احتجاج کریں۔ مگر یہ افراد بجلی کے کھمبے توڑنا شروع کر دیتے ہیں، دکانوں کو لوٹتے ہیں، غلے کے گوداموں میں آگ لگا دیتے ہیں، ریلوں اور بسوں کو چلنے سے روک دیتے ہیں۔ اس طرح ایک چیز کی قلت دور کرنے کے لئے وہ بے شمار قلتیں ملک میں پیدا کر دیتے ہیں اور ساری زندگی کو تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں۔ وہ دوسروں کی جس برائی کے خلاف احتجاج کرتے ہیں خود اسی میں لت پت ہوئے رہتے ہیں۔ اس کے برعکس "آنے والے دن" کی گواہی دینے کے لئے جو لوگ اٹھتے ہیں ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ کام کا آغاز خود اپنی ذات سے کرتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں سب سے پہلے خود اس پر عمل کرتے ہیں۔ تمام اصلاحی اسکیمیں یہاں پہنچ کر ناکام ہو جاتی ہیں کہ اپنے پروگرام کے نفاذ کے لئے جن انسانوں سے انھیں کام لینا ہے وہ خلوص اور بے غرضی کے ساتھ ان کو نافذ کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام انقلابی اسکیمیں کسی نہ کسی مقام پر پہنچ کر اپنے مخالف سے سمجھوتہ کر لیتی ہیں۔ بادشاہوں کے اقتدار کے خلاف اٹھنے والی تحریکیں سیاسی لیڈروں کے اقتدار پر آکر ٹھہر جاتی ہیں۔ نجی مالکوں کی سرمایہ داری سے بغاوت کرنے والے دولت اور زمین کو اشتراکی متولیوں کے حوالے کر کے خاموش ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ نظریہ وہ واحد نظریہ ہے جو انسان کے اندر حقیقی تبدیلی پیدا کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ وہ آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ اپنے عقیدہ کو عمل بنائے اور ساری زندگی اس پر عمل کرتا رہے۔

دوسرے نظریات عام طور پر صرف تنقید کا جذبہ ابھارتے ہیں، جب کہ "آنے والے دن" کا تصور عمل کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس نظریہ پر ایمان لانے کے بعد آدمی مجبور ہوتا ہے کہ سب سے پہلے خود عمل کرے جب کہ دوسرے نظریات صرف دوسروں سے عمل کا تقاضا کرتے ہیں، ان کے اندر ایسا کوئی محرک نہیں ہوتا جو داعی کو خود عمل کرنے پر ابھارتا ہو۔ مگر جس شخص کو اس حقیقت نے متحرک کیا ہو کہ موجودہ زندگی امتحان کی زندگی ہے، ہم آزاد نہیں ہیں کہ جو چاہیں کرتے رہیں۔ بلکہ ہمارے تمام کھلے اور چھپے اعمال کا ایک روز حساب لیا جانے والا ہے۔ ایسا شخص عین اپنے ایمان کے تقاضے سے مجبور ہوتا ہے کہ اپنی پوری زندگی کو درست کرے۔ اپنے آپ کو آخری حد تک مقصد کی خدمت میں لگا دے۔ دوسروں کو بدلنے کی دعوت دینے کے ساتھ خود بھی اپنے آپ کو بدل ڈالے۔ کیوں کہ اس کے بغیر وہ اپنی کامیابی کا تصور نہیں کر سکتا۔ صرف دوسروں کی تبدیلی اس کی نجات کا سبب نہیں بن سکتی۔ اس کی نجات تو اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ

وہ خود بھی اپنے آپ کو بدل چکا ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ نظریہ ——— دعوت اور تربیت ——— دونوں کو ایک کر دیتا ہے۔ اس نظریہ کا آدمی جب دوسروں کو پکارتا ہے تو وہ خود اپنے آپ کو مخاطب کر رہا ہوتا ہے اور جب وہ اپنے آپ کو مخاطب بناتا ہے تو اسی وقت اس کا تعلق دوسروں سے ہو جاتا ہے۔

اس نظریہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے کارکن کو کبھی جمود میں مبتلا نہیں کرتا اور نہ اسے مایوس ہونے دیتا۔ جو شخص اس مقصد کے لئے اٹھتا ہے اس کے سامنے بنیادی طور پر جو چیز ہوتی ہے وہ آخرت ہے۔ وہ اس لئے عمل کرتا ہے تاکہ اپنی بعد کی زندگی کو بہتر بنائے، تاکہ آخرت میں خدا کی گرفت سے بچ سکے۔ یہ چیز اس کو نفع نقصان اور کامیابی و ناکامی کے دنیوی تصور سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ وہ نتیجے کی طرف سے بے پروا ہو کر اپنا کام صرف یہ سمجھتا ہے کہ کوشش کرتا رہے اور اسی کوشش میں اپنی جان دے دے۔ اس کی انتہائی تمنا صرف یہ ہوتی ہے کہ فرشتے جب اس کی رپورٹ لے کر خدا کے پاس جائیں تو اس سے عرض کریں کہ خدایا تیرا بندہ تیرے حکم کی تعمیل میں سرگرم ہے۔ ایک شخص کو بی۔ اے کرنے کے بعد روزگار نہ ملے تو وہ خودکشی کر لیتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک صرف تعلیم حاصل کرنا کامیابی نہیں ہے بلکہ تعلیم کے دنیوی فوائد کو حاصل کرنے کا نام کامیابی ہے۔ ایک سیاسی لیڈر کو اپنے مشن میں کامیابی نہ ہو تو وہ سیاسیات کا کام چھوڑ کر گوشہ نشین ہو جاتا ہے اور اپنی ناکامی کے احساس کو مختلف قسم کے مشغلوں میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک نوجوان دنیا کے مسائل کو دیکھتا ہے، اس کے اندر جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ان کو حل کرے، اس جذبے کے تحت وہ "نئی دنیا کی تعمیر" کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ مگر چند سال بعد جب خود اپنی زندگی کے مسائل اسے گھیرتے ہیں اور اس سے اپنی تکمیل کا مطالبہ کرتے ہیں تو مسائل عالم کی اصلاح کا پروگرام اسے بھول جاتا ہے اور وہ اپنا گھر بنانے اور اپنے ذاتی مسائل کو حل کرنے میں لگ جاتا ہے۔ مگر جو شخص اللہ کے بندوں کو خدا کی طرف بلانے کے لئے اٹھا ہو اس کے لئے ٹھہرنے اور مایوس ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ کیوں کہ اس کا راستہ دنیا میں کہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ وہ سیدھا آخرت تک جاتا ہے۔ وہ پہلے دن سے جانتا ہے کہ اس نے جس منزل کی طرف اپنا سفر شروع کیا ہے وہ اس وقت آتی ہے جب زندگی کی گاڑی اپنے آخری اسٹیشن پر پہنچ جائے۔ وہ آخر وقت تک لوگوں کو صراط مستقیم کی طرف پکارتا رہتا ہے یہاں تک کہ اسی حال میں اپنے رب سے جا ملتا ہے۔ مومن کے نزدیک کامیابی یہ ہے کہ وہ دنیا میں اپنے رب کی رضا کے لئے کام کرتا رہے، جب کہ دوسروں کے نزدیک کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنی کوشش کے نتیجے کو پا لیں۔

حاشیہ [۱] صحرائی سفر میں قافلے بار بار منزل کرتے ہوئے چلتے ہیں چنانچہ دوران سفر میں کسی ہوشیار اور قابل اعتماد آدمی کو تیز رفتار سواری کے ذریعہ آگے بھیج دیا جاتا ہے تاکہ وہ معلوم کر کے آئے کہ اگلی منزلوں میں قافلے کو ٹھہرانے کی موزوں جگہ کون سی ہو سکتی ہے جو شخص اس کام کے لئے بھیجا جاتا ہے اسکو "رائد" کہتے ہیں۔

[۲] عرب کی قبائلی زندگی میں جب کوئی شخص دیکھتا کہ دشمن اس کی قوم کے سر پر آگیا ہے اور اس کو ڈر ہوتا کہ اب وہ حملہ کر دے گا تو وہ اپنے کپڑے پھاڑ دیتا اور ننگا ہو کر چلانا شروع کرتا کہ "دشمن آگیا دشمن آگیا" ایسے شخص کو "نذیر عریاں" کہا جاتا تھا یعنی ننگا ہو کر ہوشیار کرنے والا۔

نوٹ: یہ تحریر ماہنامہ زندگی رام پور (شوال۔ ذی قعدہ ۱۳۷۹) میں اداریہ کے طور پر شائع ہوئی۔

زلزلۂ قیامت

ایک شخص اپنے بچوں کے ساتھ باغ
میں داخل ہوا۔ وہاں کیڑے مکوڑے تھے۔
چوہے اور چیونٹیاں تھیں۔ پھر سب
کے بیچ میں ایک بھیانک بھیڑیا کھڑا
ہوا تھا۔ اس منظر کو دیکھنے کے بعد
اس کے منہ سے کیا چیخ نکلے گی۔ وہ بے ساختہ
پکار اٹھے گا:
بچو! بھیڑیا۔ بچاؤ اپنے کو بھیڑیے سے۔
بھیڑیے کے بھیانک چہرے کو دیکھنے کے
بعد وہ دوسری تمام چیزوں کو بھول
جائے گا۔ اس کو ایسا نظر آئے گا گویا
سارا باغ بھیڑیا بن گیا ہے۔ اس کے
سامنے اس کے سوا کوئی مسئلہ نہ ہوگا کہ
بھیڑیے سے بچنے کی تدبیر کرے۔

ہم جس دنیا میں ہیں، اس میں بھی
بہت سے مسائل ہیں۔ ویسے ہی جیسے باغ
میں کیڑے اور چیونٹیاں۔ مگر انھیں
کے بیچ میں ایک سب سے بڑا مسئلہ کھڑا
ہوا ہے۔ یہ آخرت کا مسئلہ ہے۔ اگر ہم
اس کو جان لیں تو ہم کو پوری کائنات میں
آخرت کے سوا کوئی دوسری چیز
دکھائی نہ دے۔ اس کے بعد ہم آخرت
کے لئے پکاریں گے۔ نہ کہ "کیڑوں اور
چیونٹیوں" کے لئے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"قرآن کو پڑھ کر بڑا ڈر لگنے لگتا ہے" شری تیج پال سنگھ نے کہا "اس میں تو بس آگ کی اور جہنم کی باتیں ہیں" یہ دہلی کے ایک تعلیم یافتہ غیر مسلم کے تاثرات ہیں۔ انھوں نے قرآن کا ہندی ترجمہ پڑھا تھا اور اس کے بعد دسمبر ۱۹۷۷ میں راقم الحروف سے مندرجہ بالا الفاظ کہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرآن میں سب سے زیادہ جس چیز کا بیان ہے، وہ آخرت کا عذاب ہی ہے۔ اسی کو قرآن کا مقصد نزول بتایا گیا ہے:

وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لِّتُنذِرَ أُمَّ الْقُرَىٰ وَمَنْ حَوْلَهَا وَتُنذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ لَا رَيْبَ فِيهِ ۚ فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ (شوری ۷)	اور ہم نے عربی قرآن تمھارے اوپر اتارا تاکہ تو اس بڑی بستی اور اس کے آس پاس والوں کو خبردار کردے اور جمع ہونے کے دن سے ڈرا دے جس میں کوئی شک نہیں۔ ایک گروہ جنت میں ہوگا اور ایک گروہ دوزخ میں۔

بار بار مختلف طریقوں سے انسان کو متوجہ کیا گیا ہے کہ تمھارا اصل مسئلہ آخرت کا مسئلہ ہے۔ اس لئے وہاں کی پکڑ سے بچنے کی کوشش کرو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ (انعام ۔ ۶)	اے ایمان والو اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن ہیں آدمی اور پتھر۔ اس پر سخت دل اور زور آور فرشتے مقرر ہیں۔

تمام انبیاء اسی لئے آئے کہ وہ لوگوں کو آنے والے دن کی چیتاونی دے دیں (انعام ۱۳۰)۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جس دعوت رسالت کا حکم دیا گیا، وہ قرآن کے الفاظ میں یہ تھی:

وَأَنذِرْهُمْ يَوْمَ الْآزِفَةِ إِذِ الْقُلُوبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كَاظِمِينَ (مومن ۔ ۱۸)	اور اس آنے والے دن سے ان کو ڈرا جب کہ کلیجے منھ کو آجائیں گے، غم سے بھرے ہوئے۔

قریش نے مکی دور میں اپنے ایک ہوشیار سردار عتبہ بن ربیعہ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھیجا کہ وہ آپ سے گفتگو کرکے معلوم کرے کہ آپ کا پیغام کیا ہے۔ واپسی کے بعد عتبہ نے اپنے ساتھیوں کو جو رپورٹ دی اس کے الفاظ یہ تھے:

ما فهمت شيئا مما قال غير انه انذركم صاعقة مثل صاعقة عاد وثمود	انھوں نے جو کچھ کہا اس سے میں اس کے سوا اور کچھ نہیں سمجھا کہ وہ تم لوگوں کو عاد و ثمود جیسے عذاب سے ڈراتے ہیں

اسی احساس کے تحت یہ کتابچہ شائع کیا جا رہا ہے۔ اس کے تمام مضامین کا موضوع آخرت ہے۔ تاہم وہ معروف تصنیفی ترتیب کے مطابق تیار نہیں کیا گیا ہے۔ اس کا انداز ترتیب شذرات یا خواطر کا سا ہے۔ اس کو جو چیز ایک مسلسل کتاب بناتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے ہر صفحہ کا موضوع آخرت کی چیتاونی ہے۔ مختلف پہلوؤں سے اس سنگین مسئلہ کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے جو موت کے بعد آدمی کے سامنے آنے والا ہے

وحید الدین، ۱۵ مئی ۱۹۷۸

قال اللہ ، قال الرسول

جب سورج لپیٹ دیا جائے گا۔ جب ستارے بکھر جائیں گے۔ جب پہاڑ چلائے جائیں گے۔ جب دس مہینے کی گابھن اونٹنیاں چھٹی پھریں گی۔ جب وحشی جانور اکھٹے ہوجائیں گے۔ جب دریا بھڑکائے جائیں گے۔ جب ایک ایک قسم کے لوگ اکھٹا کئے جائیں گے۔ جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور میں ماری گئی۔ جب اعمال نامے کھولے جائیں گے۔ جب آسمان کا پردہ ہٹا دیا جائے گا۔ جب دوزخ دہکائی جائے گی۔ جب جنت قریب لائی جائے گی۔ اس وقت ہر آدمی جان لے گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے۔ (تکویر)

جب آسمان پھٹ جائے گا۔ جب ستارے جھڑ جائیں گے۔ جب دریا بہہ پڑیں گے۔ جب قبریں کھول دی جائیں گی۔ اس وقت ہر شخص اپنے اگلے پچھلے اعمال کو جان لے گا۔ اے انسان تجھ کو کس چیز نے اپنے مہربان پروردگار کے متعلق بھول میں ڈال رکھا ہے۔ جس نے تجھ کو پیدا کیا۔ پھر تجھ کو درست کیا۔ پھر تجھ کو برابر کیا۔ اور جس صورت میں چاہا تم کو جوڑ دیا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ تم انصاف ہونے کو جھوٹ جانتے ہو۔ حالانکہ تمھارے اوپر نگہبان مقرر ہیں۔ معزز لکھنے والے۔ وہ جانتے ہیں جو تم کرتے ہو۔ بے شک نیک لوگ نعمتوں میں ہوں گے۔ اور یقیناً برے لوگ دوزخ میں ہوں گے۔ انصاف کے دن اس میں داخل ہوں گے۔ وہ اس سے چھپ نہ سکیں گے۔ اور تم کو کیا خبر کہ وہ انصاف کا دن کیا ہے۔ اس دن کوئی کسی کا کچھ بھلا کرنے پر قادر نہ ہوگا۔ حکم اس روز صرف اللہ کا ہوگا (انفطار)

جب آسمان پھٹ جائے گا۔ وہ اپنے رب کے فرمان کی تعمیل کرے گا اور یہی اسے واجب ہے۔ جب زمین پھیلا دی جائے گی۔ اور جو کچھ اس کے اندر ہے باہر اگل دے گی اور خالی ہو جائے گی۔ وہ اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرے گی اور یہی اسے واجب ہے۔ اے انسان تو کشاں کشاں اپنے رب کی طرف چلا جا رہا ہے اور اس سے ملنے والا ہے۔ پھر جس کا نامہ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا اس سے ہلکا حساب لیا جائے گا۔ وہ اپنے لوگوں کی طرف خوش خوش پلٹے گا۔ اور جس کا نامۂ اعمال اس کی پیٹھ پیچھے سے دیا جائے گا، وہ موت کو پکارے گا۔ وہ بھڑکتی آگ میں داخل ہوگا۔ وہ اپنے لوگوں میں خوش خوش رہتا تھا۔ اس نے گمان کر رکھا تھا کہ خدا کی طرف لوٹنا نہیں ہے۔ کیوں نہیں۔ اس کا رب اس کو خوب دیکھ رہا تھا۔ (انشقاق)

ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں وہ چیزیں دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے۔ آسمان میں چرچراہٹ ہو رہی ہے اور حق ہے کہ اس میں چرچراہٹ ہو۔ آسمان میں چار انگل جگہ بھی نہیں مگر ایک فرشتہ اپنی پیشانی جھکائے ہوئے اللہ کے لئے سجدہ میں پڑا ہوا ہے۔ خدا کی قسم اگر تم وہ باتیں جانو جو میں جانتا ہوں تو تم ہنسو کم اور روؤ زیادہ۔ عورتوں میں تمھارے لئے لذت باقی نہ رہے۔ تم خدا کو پکارتے ہوئے میدانوں کی طرف نکل جاؤ۔ (ترمذی)

اسلام کا مطلب کیا ہے

اسلام کا مطلب ہے اپنے آپ کو خدا کے آگے سپرد (Surrender) کر دینا۔ مسلمان وہ ہے جو اس بات پر یقین رکھتا ہو کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ وہ مرنے کے بعد ہر ایک سے اس کے کارنامہ زندگی کا حساب لے گا۔ اس کے بعد اپنے وفادار بندوں کے لئے دائمی جنت کا فیصلہ کرے گا، اور غیر وفادار بندوں کو دائمی جہنم میں ڈال دے گا۔ اس احساس کے تحت جو زندگی بنتی ہے، اس کو ایک لفظ میں آخرت رخی زندگی (Akhirat-oriented life) کہہ سکتے ہیں۔

یہ احساس جب کسی دل میں پیدا ہو جائے تو اس کی پوری زندگی بدل جاتی ہے۔ وہ ہر وقت خدا سے ڈرنے لگتا ہے۔ کیوں کہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ خدا اس کو کھلے اور چھپے ہر حال میں دیکھ رہا ہے۔ بندوں سے معاملہ کرتے ہوئے وہ ہمیشہ انصاف اور خیر خواہی کا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ ہر انسان کے پیچھے اس کا خدا کھڑا ہوا ہے۔ وہ کبھی اس بات کو نہیں بھولتا کہ بالآخر وہی چیز صحیح قرار پائے گی جس کو خدا صحیح کہے اور وہ سب کچھ غلط ٹھہرے گا جس کو خدا غلط ٹھہرائے۔

اسی کے ساتھ مسلمان کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ زندگی کی اس حقیقت کو دوسری تمام قوموں تک پہنچائے۔ اس سنگین واقعہ سے لوگوں کو باخبر کرنے کے لئے پہلے انبیاء آتے تھے۔ ختم نبوت کے بعد یہ ذمہ داری نبی آخر الزماں کی امت پر ڈال دی گئی ہے۔ مسلمان پر جس طرح خود عمل کرنے کی ذمہ داری ہے، اسی طرح دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری ہے۔ ان میں سے کوئی ایک کام، دوسرے کام کے لئے خدا کے یہاں عذر نہیں بن سکتا۔

قیامت کا زلزلہ بڑا ہول ناک ہے

یَاَیُّہَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمْ اِنَّ زَلْزَلَۃَ السَّاعَۃِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ یَوْمَ تَرَوْنَہَا تَذْہَلُ کُلُّ مُرْضِعَۃٍ عَمَّا اَرْضَعَتْ وَتَضَعُ کُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَہَا وَتَرَی النَّاسَ سُکٰرٰی وَمَا ہُمْ بِسُکٰرٰی وَلٰکِنَّ عَذَابَ اللّٰہِ شَدِیْدٌ

لوگو! اپنے رب سے ڈرو۔ بے شک قیامت کا زلزلہ بڑی ہولناک چیز ہے۔ جس روز تم اس کو دیکھو گے کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے اس بچہ کو بھول جائے گی جس کو دودھ پلایا تھا اور ہر حاملہ کا حمل گر جائے گا۔ لوگ تم کو نشہ کی سی حالت میں دکھائی دیں گے۔ حالاں کہ وہ نشہ میں نہ ہوں گے۔ بلکہ اللہ کا عذاب بے حد سخت ہے۔ (حج ۱-۲)

ایک فرانسیسی مصنف نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے ۲۵ واں گھنٹہ (25th hour) مصنف نے دنیا کی تمام تہذیبوں کا جائزہ لے کر دکھایا ہے کہ انسانیت اب اپنی بربادی کے آخری کنارے پر ہے۔ ہمارے ۲۴ گھنٹے ختم ہو چکے ہیں:

24th hour is past

یہی بات دنیا کے آخری انجام کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ قیامت بالکل اچانک آئے گی۔ گویا ہمارا ہر لمحہ آخری لمحہ ہے۔ ہر وقت یہ امکان ہے کہ انسانیت اپنی مہلتِ عمر پوری کر چکی ہو۔ انسان اپنے "۲۴ گھنٹوں" کو ختم کر کے ۲۵ ویں فیصلہ کن گھنٹے میں داخل ہو جائے۔

یہ دنیا امتحان گاہ ہے اور ہر آدمی امتحان میں کھڑا ہوا ہے۔ وہ کوشش کرے تو امتحان میں اعلیٰ امتیاز کے ساتھ اپنے کو کامیاب بنا سکتا ہے۔ اور اگر وہ غافل رہے تو دوسرے انجام کے لئے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے آپ ہر آدمی کی طرف دوڑا چلا آرہا ہے خواہ وہ اس کو کتنا ہی زیادہ ناپسند کرتا ہو۔

"زندگی صرف ایک بار ملتی ہے" ، کالج کے ایک استاد نے کہا "میں بی ایس سی کر کے ملازمت میں لگ گیا۔ ایم ایس سی نہیں کیا۔ اب کتنے اعلیٰ مواقع میرے سامنے آتے ہیں۔ مگر میں ان سے صرف اس لئے محروم رہتا ہوں کہ میرے پاس ماسٹر ڈگری نہیں"

یہی انجام زیادہ بڑے پیمانہ پر آخرت میں ظاہر ہونے والا ہے۔ ہر آدمی کے سامنے عالی شان مواقع ہوں گے۔ مگر وہ ان سے محروم رہے گا۔ کیوں کہ ان کے لئے اس نے دنیا میں تیاری نہیں کی تھی۔

ساری پوتھی نہیں دیکھی جائے گی

ایک بزرگ راستہ چل رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے معتقدین کی ایک بڑی جماعت تھی۔ راستہ میں ایک فقیر نے روکا:

"آپ نے بہت کچھ پڑھا اور جانا ہوگا۔ ایک بات میری بھی سن لیجئے"۔ اس نے کہا اور رکھ۔ ایک وقفہ کے بعد بولا: "سنئے! وہاں کسی کی ساری پوتھی نہیں دیکھیں گے۔ آدمی سچ مچ جہاں ہے، بس وہیں انگلی رکھ دی جائے گی"۔ اتنا کہا اور خاموشی سے غائب ہو گیا۔

آدمی لوگوں کے درمیان اِس سے جانا جاتا ہے کہ وہ مقرر ہے، مصنف ہے، فلاں عہدے اس کے پاس ہیں۔ فلاں فلاں ملکوں کی اس نے سیاحت کی ہے۔ اتنے آدمیوں کی جماعت اس کے ساتھ ہے۔ اس نے فلاں فلاں کارنامے انجام دیئے ہیں۔ وغیرہ۔ مگر اکثر یہ تمام چیزیں مصنوعی ہوتی ہیں۔ انسان حقیقۃً کہیں اور ہوتا ہے۔ مگر دیکھنے میں کہیں اور نظر آتا ہے۔ اس کی تمام سرگرمیاں اپنی ذات کے گرد گھومتی ہیں۔ اگرچہ بظاہر یہ دکھائی دیتا ہے کہ وہ خدا اور اس کے دین کے لئے سرگرم عمل ہے۔

کوئی انسان کہاں ہے، یہ ہم نہیں جان سکتے۔ مگر خدا اس کو اچھی طرح جانتا ہے۔ آخرت میں کسی آدمی کی زندگی کے ٹھیک اسی مقام پر وہ انگلی رکھ دے گا جہاں وہ حقیقۃً جی رہا تھا۔

ایک وزیر اعظم جب اقتدار کی کرسی پر ہو تو ملک کی تمام رونقیں اس کے جلو میں چلتی ہیں۔ ہر طرف بس اسی کے شان دار کارناموں کی دھوم ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس سے بڑھ کر انسانیت کا پیکر اور کوئی نہیں۔ مگر جب عوام کی عدالت اس کو بے نقاب کرتی ہے اور اس کو مصنوعی رونقوں کے تخت سے اتار کر وہاں رکھ دیتی ہے جہاں وہ فی الواقع تھا تو اچانک دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ اس کی بظاہر روشن زندگی مکمل طور پر ایک تاریک زندگی تھی۔ وہ تمام تر اپنی ذات کی سطح پر جی رہا تھا۔ اگرچہ اس کے تحت ابلاغ کے تمام محکمے رات دن اس پروپگنڈے میں مصروف تھے کہ وہ خدمت قوم اور تعمیر ملک کی سطح پر زندگی گزار رہا ہے۔ اسی مثال سے آخرت کے معاملہ کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

اسلام وہی ہے جو زندگی میں بھونچال بن کر داخل ہو

موجودہ زمانہ کے بعض ملحد مفکرین نے دیکھا کہ انسان کسی طرح مذہب کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتا۔ انھوں نے مذہب کو ایک ناگزیر نفسیاتی ضرورت کے طور پر مان لیا۔ البتہ انھوں نے کہا کہ مذہب کی بنیاد خدائی الہام پر نہیں ہونی چاہئے۔ اس فکر کی ترجمانی کرتے ہوئے جولین ہکسلے نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے:

Religion without Revelation

(مذہب بغیر الہام) ۔ اس قسم کا مذہب تو ابھی عملاً وجود میں نہیں آیا۔ تاہم "اسلام بغیر آخرت"، کے بہت سے نسخے ہمارے یہاں رائج ہو گئے ہیں۔ اس اسلام میں سب کچھ ہے مگر جہنم کا اندیشہ نہیں۔ اصحاب رسول کو جو اسلام ملا تھا، اس نے انھیں اس درجہ بے قرار کر دیا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا جہنم کی آگ انھیں کے لئے بھڑکائی گئی ہے۔ اب اسلام کے مجاہدین نے ایسا اسلام دریافت کر لیا ہے جس کے خزانے میں صرف جنت ہی جنت ہے۔ جہنم کا اس میں کہیں گزر نہیں۔

کچھ لوگوں کے لئے ان کی دنیا کی کامیابی ہی اس بات کی یقینی علامت ہے کہ ان کی آخرت بھی ضرور کامیاب ہوگی۔ کچھ لوگوں نے ایسے زندہ یا مردہ بزرگ پالئے ہیں جن کا دامن تھام لینے کے بعد اب ان کے لئے آخرت کا کوئی خطرہ نہیں۔ کچھ لوگ اتنے خوش قسمت ہیں کہ معمولی معمولی باتوں پر صبح و شام ان کے لئے جنت کے محلات رزرو ہو رہے ہیں، پھر ان کو آخرت سے ڈرنے کی کیا ضرورت۔ کچھ لوگوں کو اسلام نے عالیشان سیاسی منصوبے دیے ہیں اور وہ قائدانہ اعزازات کے زیر سایہ جنت کا راستہ طے کر رہے ہیں۔ کچھ لوگوں نے اور بھی زیادہ آسان راستہ تلاش کر لیا ہے —— جگمگاتے ہوئے پنڈالوں میں تقریر کے کرتب دکھاؤ اور سیدھے جنت الفردوس میں پہنچ جاؤ۔

اس قسم کا اسلام خواہ دنیا میں کتنا ہی دلفریب نظر آتا ہو، آخرت میں اس کی کوئی قیمت نہ ہوگی۔ آخرت میں کام آنے والا اسلام وہ ہے جو آدمی کی زندگی میں بھونچال بن کر داخل ہوا ہو۔ جو قیامت کے زلزلہ سے پہلے آدمی کے لئے زلزلہ ثابت ہو۔ اس قسم کا اسلام جب کسی کو ملتا ہے تو اس کے لئے ہر معاملہ خدا کا معاملہ بن جاتا ہے۔ "چھوٹے" کو بے عزت کرتے ہوئے اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ رب العالمین کے سفیر کو بے عزت کر رہا ہے۔ "بڑے" کی خوشامد کرتے ہوئے اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ خدا کی غیرت کو چیلنج کر رہا ہے۔ حق واضح ہونے کے بعد اس کو نظر انداز کرنا اس کے نزدیک ایسا ہی بن جاتا ہے جیسے کوئی شخص جنت اور جہنم کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھے، پھر بھی جنت کو چھوڑ کر جہنم میں کود پڑے۔

عمل کی حقیقی سطح پر آدمی ناکام رہتا ہے، اور مصنوعی سطح پر کامیابی کے جھنڈے لہرا رہا ہے

امریکہ میں انسانی حقوق کے عنوان پر ایک بین اقوامی سیمینار ہو، اس کے لئے آپ کے پاس دعوت نامہ آئے، آپ ہوائی جہاز سے اڑ کر امریکہ پہنچیں اور وہاں شاندار اسٹیج پر ایک تقریری ریکارڈ دہرادیں۔ تو یہ خبر فوراً اخبار میں چھپ جائے گی۔ اس کے برعکس اگر آپ کو آخرت کا ڈر ہے۔ اور جہنم کے اندیشے کے تحت آپ لوگوں کے حقوق ادا کرتے ہیں تو یہ واقعہ کبھی اخبار کی سرخی نہیں بنے گا۔

آخر الذکر، عمل کی حقیقی سطح ہے ۔ اول الذکر، عمل کی مصنوعی سطح۔ آج صورت حال یہ ہے کہ ہر شخص، خواہ وہ مذہبی ہو یا غیر مذہبی، عمل کی مصنوعی سطح پر زندگی گزار رہا ہے۔ وہ ان امور میں تو خوب کارنامے دکھاتا ہے جن میں "نیوز ویلو" ہو، جن سے اس کی امیج بنتی ہو، جن میں عزت و جاہ کے استقبالیے وصول ہوتے ہوں، جن میں حق کی علم برداری کا عالمی کریڈٹ ملتا ہو، جو اس کو اخبار کی سرخیوں میں جگہ دینے والے ہوں ——— مصنوعی سطح کی چمک دمک نے لوگوں کو اتنا زیادہ اپنی طرف کھینچ رکھا ہے کہ عمل کی حقیقی سطح کی طرف توجہ دینے کی کسی کو فرصت نہیں۔

دوسری طرف لوگوں کا حال یہ ہے کہ اگر ان سے کوئی معاملہ پڑ جائے تو وہ کچے ثابت ہوں، کسی سے اختلاف پیدا ہو تو انصاف پر قائم نہ رہ سکیں، ان کی غلطیاں روز روشن کی طرح واضح ہوجائیں جب بھی وہ اعتراف نہ کریں۔ ایک مظلوم ان سے بے لاگ فیصلہ کی امید نہ کرسکے۔ خدا کی کھلی کھلی نشانیاں ظاہر ہوں مگر وہ عبرت نہ پکڑیں۔ وہ اپنے دل کو حسد، بغض، کینہ، نفرت، عصبیت سے پاک نہ کریں۔ وہ طاقت کے آگے جھک جائیں، مگر دلیل کے آگے جھکنے کے لئے تیار نہ ہوں۔ خدا کی آیتیں سن کر ان کے دل نہ دہلیں اور آخرت کی جواب دہی کے خوف سے ان کے جسم کے رونگٹے کھڑے نہ ہوں۔

لوگ عمل کی مصنوعی سطح پر کامیابی کے جھنڈے لہرا رہے ہیں۔ اور عمل کی جو حقیقی سطح ہے وہاں ناکامی کے گڑھے میں پڑے ہوئے ہیں ——— جلسوں اور کنونشنوں کی دھوم ہے، جہاد اور انقلاب کے نعرے لگ رہے ہیں۔ دوسری طرف خاموش تعمیری کام کا سارا میدان خالی پڑا ہوا ہے اور اس کے لئے کوئی نہیں اٹھتا۔

دعا آدمی کی پوری ہستی سے نکلتی ہے نہ کہ محض زبانی الفاظ سے

حضرت مسیح نے اپنے ایک وعظ میں فرمایا: مانگو تو تم کو دیا جائے گا۔ ڈھونڈو تو پاؤ گے۔ دروازہ کھٹکھٹاؤ تو تمھارے واسطے کھولا جائے گا۔ کیوں کہ جو کوئی مانگتا ہے اسے ملتا ہے۔ اور جو ڈھونڈتا ہے وہ پاتا ہے، اور جو کھٹکھٹاتا ہے اس کے واسطے کھولا جائے گا۔ تم میں ایسا کون آدمی ہے کہ اگر اس کا بیٹا اس سے روٹی مانگے تو وہ اس کو پتھر دے۔ یا اگر مچھلی مانگے تو اس کو سانپ دے۔ پس جب کہ تم برے ہو کر اپنے بچوں کو اچھی چیزیں دینا جانتے ہو تو تمھارا باپ جو آسمان پر ہے اپنے مانگنے والوں کو اچھی چیزیں کیوں نہ دے گا۔ (متی ۷: ۷-۱۲)

یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا سے مانگنے والا کبھی محروم نہیں ہوتا۔ مگر مانگنا صرف کچھ لفظوں کو دہرانے کا نام نہیں ہے۔ مانگنا وہی مانگنا ہے جس میں آدمی کی پوری ہستی شامل ہو گئی ہو۔ ایک شخص زبان سے کہہ رہا ہو "خدایا مجھے اپنا بنالے" مگر عملاً وہ اپنی ذات کا بنا رہے، تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے مانگا ہی نہیں۔ اس کو جو چیز ملی ہوئی ہے، وہی دراصل اس نے خدا سے مانگی تھی۔ خواہ زبان سے اس نے جو لفظ بھی ادا کئے ہوں۔

ایک بچہ اپنی ماں سے روٹی مانگے تو یہ ممکن نہیں کہ ماں اس کے ہاتھ میں انگارہ رکھ دے۔ خدا اپنے بندوں پر تمام مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ آپ خدا سے خشیت مانگیں اور وہ آپ کو قساوت دیدے۔ آپ خدا کی یاد مانگیں اور وہ آپ کو خدا فراموشی میں مبتلا کر دے۔ آپ آخرت کی تڑپ مانگیں اور وہ آپ کو دنیا کی محبت میں ڈال دے۔ آپ کیفیت سے بھری ہوئی دینداری مانگیں اور وہ آپ کو بے روح دین داری میں پڑا رہنے دے۔ آپ حق پرستی مانگیں اور وہ آپ کو شخصیت پرستی کی کوٹھری میں بند کر دے۔

آپ کی زندگی میں آپ کی مطلوب چیز کا نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ نے ابھی تک اس کو مانگا ہی نہیں۔ اگر آپ کو دودھ خریدنا ہو اور آپ چھلنی لے کر بازار جائیں تو پیسے خرچ کرنے کے بعد بھی آپ خالی ہاتھ واپس آئیں گے۔ اسی طرح اگر آپ زبان سے دعا کے کلمات دہرا رہے ہوں مگر آپ کی اصل ہستی کسی دوسری چیز کی طرف متوجہ ہو تو یہ کہنا صحیح ہو گا کہ نہ آپ نے مانگا تھا اور نہ آپ کو ملا۔ جو مانگے وہ کبھی پائے بغیر نہیں رہتا۔ یہ مالک کائنات کی غیرت کے خلاف ہے کہ وہ کسی بندے کو اس حال میں رہنے دے کہ قیامت میں جب خدا سے اس کا سامنا ہو تو وہ اپنے رب کو حسرت کی نظر سے دیکھے۔ وہ کہے کہ خدایا میں نے تجھ سے ایک چیز مانگی تھی مگر تو نے مجھے نہ دی۔ بخدا یہ ناممکن ہے، یہ ناممکن ہے۔ یہ ناممکن ہے۔ کائنات کا مالک تو ہر صبح و شام اپنے تمام خزانوں کے ساتھ آپ کے قریب آکر آواز دیتا ہے ——— "کون ہے جو مجھ سے مانگے تاکہ میں اسے دوں" مگر جنھیں لینا ہے وہ اندھے بہرے بنے ہوئے ہوں تو اس میں دینے والے کا کیا قصور۔

"میرے لئے ایک سائیکل خرید دیجئے" بیٹے نے باپ سے کہا۔ باپ کی آمدنی کم تھی۔ وہ سائیکل خریدنے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ اس نے ٹال دیا۔ لڑکا بار بار کہتا رہا اور باپ بار بار منع کرتا رہا۔ بالآخر ایک روز باپ نے ڈانٹ کر کہا "میں نے کہہ دیا کہ میں سائیکل نہیں خریدوں گا۔ اب آئندہ مجھ سے اس قسم کی بات مت کرنا"۔

یہ سن کر لڑکے کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ کچھ دیر چپ رہا۔ اس کے بعد روتے ہوئے بولا: "آپ ہی تو ہمارے باپ ہیں۔ پھر آپ سے نہ کہیں تو اور کس سے کہیں"۔ اس جملہ نے باپ کو تڑپا دیا۔ اچانک اس کا انداز بدل گیا۔ اس نے کہا: اچھا بیٹے اطمینان رکھو میں تمھارے لئے سائیکل خریدوں گا۔ اور کل ہی خریدوں گا"۔ یہ کہتے ہوئے باپ کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ اگلے دن اس نے پیسہ کا انتظام کر کے بیٹے کے لئے نئی سائیکل خرید دی۔

لڑکے نے بظاہر ایک لفظ کہا تھا۔ مگر یہ ایک ایسا لفظ تھا جس کی قیمت اس کی اپنی زندگی تھی، جس میں اس کی پوری ہستی شامل ہوگئی تھی۔ اس لفظ کا مطلب یہ تھا کہ اس نے اپنے آپ کو اپنے سرپرست کے آگے بالکل خالی کر دیا ہے۔ یہ لفظ بول کر اس نے اپنے آپ کو ایک ایسے نقطہ پر کھڑا کر دیا جہاں اس کی درخواست اس کے سرپرست کے لئے بھی اتنا ہی بڑا مسئلہ بن گئی جتنا خود اس کے لیے۔

اس واقعہ سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ذکرِ الٰہی کی وہ کون سی قسم ہے جو میزان کو بھر دیتی ہے اور جس کے بعد خدا کی رحمتیں بندے کے اوپر امنڈ آتی ہیں۔ یہ رٹے ہوئے الفاظ کی تکرار نہیں ہے۔ نہ اس کا کوئی "نصاب" ہے۔ یہ ذکر کی وہ قسم ہے جس میں بندہ اپنی پوری ہستی کو انڈیل دیتا ہے۔ جب بندے کی آنکھ سے عجز کا وہ قطرہ ٹپک پڑتا ہے جس کا تحمل زمین و آسمان بھی نہ کر سکیں۔ جب بندہ اپنے آپ کو اپنے رب کے ساتھ اتنا زیادہ شامل کر دیتا ہے کہ "بیٹا" اور "باپ" دونوں ایک ترازو پر آجاتے ہیں۔ یہ وہ لمحہ ہے جب کہ ذکر محض لغت کا لفظ نہیں ہوتا بلکہ ایک شخصیت کے پھٹنے کی آواز ہوتا ہے۔ اس وقت خدا کی رحمتیں اپنے بندے پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔ بندگی اور خدائی دونوں ایک دوسرے سے راضی ہو جاتی ہیں۔ قادرِ مطلق عاجزِ مطلق کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔

مارشل اسٹالن (۱۹۵۳-۱۸۷۹) تاریخ کے پہلے ملحدانہ نظام کے سربراہ تھے۔ ان کو ۳۰ سال تک انتہائی مطلق العنانی کے ساتھ حکومت کرنے کا موقع ملا۔ مگر ان کی موت اتنے بھیانک حالات میں ہوئی کہ ان کی اکلوتی لڑکی سوتلانا نے الحاد کو چھوڑ کر مذہبی زندگی اختیار کر لی۔

"میرا باپ ایک مشکل اور بھیانک موت مرا" سوتیلانا لکھتی ہے "یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے کسی شخص کو مرتے ہوئے دیکھا۔ ہیمورج آہستہ آہستہ اس کے دماغ کے بقیہ حصوں میں پھیل رہا تھا۔ چوں کہ اس کا دل صحت مند اور مضبوط تھا۔ اس نے سانس کے مرکز کو بتدریج متاثر کیا اور اس کی وجہ سے گلا گھٹنے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اس کی سانس کم سے کم ہوتی جارہی تھی۔ آخری بارہ گھنٹوں میں آکسیجن کی کمی بڑی سنگین تھی۔ اس کا چہرہ بدل گیا اور کالا ہو گیا۔ اس کے ہونٹ بھی سیاہ پڑ گئے اور شکل پہچاننی مشکل ہو گئی۔ آخری لمحات میں اس پر اختناق کی حالت طاری تھی۔ موت کی تکلیف ہولناک تھی۔ دیکھنے والے کو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا گلا گھونٹا جارہا ہے۔

بالکل آخری لمحات میں اچانک اس نے آنکھ کھول دی اور کمرہ کے ہر شخص پر ایک نظر ڈالی۔ یہ دیکھنے کا منظر بھی بڑا بھیانک تھا۔ وہ باؤلا ہو رہا تھا یا غصہ میں تھا۔ اس پر دہشت طاری تھی۔ شاید موت کے ڈر سے اور ڈاکٹروں کے نامانوس چہروں سے جو اس کے اوپر جھکے ہوئے تھے۔ اس کی نظر ایک سکنڈ میں سب کے اوپر سے گزر گئی۔ تب ایک ہولناک اور ناقابل فہم واقعہ ہوا۔ جس کو آج تک نہ میں بھلا سکی ہوں اور نہ سمجھ سکی ہوں۔ اس نے اچانک اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا جیسے وہ اوپر کسی چیز کی طرف اشارہ کرنا چاہتا تھا۔ اور کوئی آتا ہوا عذاب ہم سب پر ڈال دینا چاہتا تھا۔ اشارہ ناقابل فہم تھا اور خوف سے بھرا ہوا تھا۔ کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس کی طرف یا کس چیز کی جانب اشارہ کرنا چاہتا تھا۔ اگلے لمحہ ایک آخری کوشش کے بعد، جھٹکا ہوا اور جان اس کے جسم سے نکل گئی۔ (انڈین ایکسپریس ۱۲ ستمبر ۱۹۶۷)

غیر اسلامی زندگی یہ ہے کہ آدمی کی سرگرمیوں کا رخ دنیا کی طرف ہو جائے — اس کو اپنے مادی مفادات سے دلچسپی ہو، وہ اپنے دنیوی مستقبل کی تعمیر میں لگا ہوا ہو۔ وہ انھیں چیزوں کے لئے متحرک ہوتا ہو جس میں اس کے دنیوی معاملات درست ہوتے ہوں، جس میں اس کی شخصیت چمکتی ہو، جس میں اس کے احساس برتری کو تسکین ملتی ہو۔

اس کے برعکس اسلامی زندگی آخرت رخی زندگی (Akhirat-oriented life) ہوتی ہے۔ مومن کی دلچسپیوں کا مرکز آخرت ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ اخروی مستقبل کی فکر میں رہتا ہے۔ اس کو خدا کے یہاں سرخرو ہونے کا شوق رہتا ہے نہ کہ دنیا میں اپنی امیج بنانے کا۔ اس کی توجہ، اس کی تمنائیں، اس کی سرگرمیاں سب آخرت کے گھر کو بنانے کی طرف لگی رہتی ہیں۔ مختصر یہ کہ غیر مومن دنیا میں زندگی گزارتا ہے، اور مومن آخرت میں۔ غیر مومن مرنے کے بعد اپنی آخرت کو دیکھے گا اور مومن دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کے عالم میں پہنچ جاتا ہے۔

ہم میں سے ہر شخص زندگی کے مقابلہ میں موت سے زیادہ قریب ہے۔ یہ احساس اگر زندہ ہو تو آدمی ہر موت کو اپنی موت سمجھے۔ وہ دوسرے کا جنازہ دیکھے تو ایسا معلوم ہو گویا خود اس کی لاش اٹھا کر قبر کی طرف لے جائی جا رہی ہے۔

۲۴ اگست ۱۹۷۷ کو دہلی کے اخبارات کا پہلا صفحہ بڑا عبرت ناک تھا۔ اس میں شری بنسی لال کی گرفتاری کی خبر تھی۔ اسی کے ساتھ ایک تصویر تھی جس میں ہندستان کے سابق وزیر دفاع کو پولیس کی حراست میں دکھایا گیا تھا۔ اپریل ۱۹۷۷ کے الکشن میں کانگرس کی شکست سے پہلے جو شخص وزیر اعظم کے بعد ملک کا دوسرا سب سے طاقت ور آدمی سمجھا جاتا تھا، وہ یہاں ہتھکڑی میں بندھا ہوا نظر آ رہا تھا۔

اخبار پڑھنے والوں کے لئے یہ کوئی انوکھی خبر نہیں۔ اس قسم کی گرفتاری کی خبریں آئے دن اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں جن میں بتایا جاتا ہے کہ ایک شخص جو کل اعلیٰ اختیارات کا مالک تھا۔ آج اس کو ایک معمولی آدمی کی طرح پکڑ کر جیل کی کوٹھری میں بند کر دیا گیا ہے۔ کل تک وہ وی وی آئی پی (VVIP) تھا آج وہ صرف ایک مجرم ہے، ایسا مجرم جس کو قانون نے اپنی تمام بے رحمیوں کے ساتھ اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔

آدمی اگر خدا کی پکڑ سے ڈرتا ہو تو ہر گرفتاری کو وہ اپنی گرفتاری سمجھے دوسرے کے ہاتھ میں ہتھکڑی لگتی ہوئی دیکھے تو اس کو محسوس ہو گویا خود اسی کو باندھا جا رہا ہے

موت بھی اسی قسم کی ایک گرفتاری ہے وہ تمام دوسری گرفتاریوں سے زیادہ سخت ہے۔ کیوں کہ وہ زمین و آسمان کے مالک کی طرف سے اس کے بندوں کی گرفتاری ہے۔ گرفتاری کا یہ دن ہر آدمی کی طرف تیزی سے دوڑا چلا آ رہا ہے۔ مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ "بنسی لال" اور "بھٹو" کی گرفتاری سے تو خوب واقف ہیں۔ مگر خود اپنی گرفتاری کی انھیں خبر نہیں۔ وہ دوسروں کے پکڑے جانے کا خوب چرچا کرتے ہیں۔ مگر اس دن کو یاد نہیں کرتے جب کہ خدا کے فرشتے خود ان کو اس سے زیادہ بے رحمی کے ساتھ پکڑ کر خدا کی عدالت میں حاضر کر دیں گے۔

خدائی گرفتاری کا یہ دن اتنا ہولناک ہے کہ اگر آدمی کو اس کا واقعی احساس ہو جائے تو ہر گرفتاری کو وہ اپنی گرفتاری سمجھے۔ دوسرے کے ہاتھ میں ہتھکڑی لگتی ہوئی دیکھے تو اس کو ایسا محسوس ہو گویا خود اسی کو باندھا جا رہا ہے۔ (۹ مئی ۱۹۷۹)

۱۷۷۵ میں یورپ کے ایک شہر میں تباہ کن زلزلہ آیا۔ چند روز بعد لوگوں نے دیکھا کہ ایک آدمی آواز لگا کر بھونچال روک گولی (Anti-earthquake pill) بیچ رہا ہے۔ کسی نے پوچھا کہ تمھاری یہ گولی بھونچال کو کس طرح روکے گی۔ اس نے فوراً جواب دیا:

But what is the alternative

(پھر دوسری صورت کیا ہے)۔ بھونچال روک گولی کا یہ کاروبار اگرچہ آگے نہیں بڑھا۔ وہ محض لطیفہ بن کر رہ گیا۔ مگر عجیب بات ہے کہ سب سے بڑے بھونچال (زلزلہ آخرت) کے لیے لوگوں نے اسی قسم کی گولیاں بنالی ہیں اور نہایت بڑے پیمانہ پر اس کا کاروبار ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔

بھونچال روک گولی کے ایک بہت بڑے مبلغ لکھتے ہیں:

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دو خصلتیں ایسی ہیں کہ جو مسلمان ان کا اہتمام کرلے، جنت میں داخل ہو اور وہ دونوں بہت معمولی چیزیں ہیں۔ مگر ان پر عمل کرنے والے بہت کم ہیں۔ ایک یہ کہ سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر ہر نماز کے بعد دس دس مرتبہ پڑھ لیا کرے تو روزانہ ایک سو پچاس مرتبہ (پانچوں نمازوں کے بعد کا مجموعہ) ہو جائے گا اور دس گنا ہو جانے کی وجہ سے ۱۵۰۰ نیکیاں حساب میں شمار کی جائیں گی۔ اور دوسری چیز یہ کہ سوتے وقت اللہ اکبر ۳۴ مرتبہ، الحمد للہ ۳۳ مرتبہ، سبحان اللہ ۳۳ مرتبہ پڑھ لیا کرے تو ۱۰۰ اکلمے ہو گئے جس کا ثواب دس گنا بڑھ کر ایک ہزار نیکیاں ہو گئیں۔ اب ان کی اور دن بھر کی نمازوں کے بعد کی میزان کل دو ہزار پانچ سو نیکیاں ہو گئیں۔ بھلا اعمال تولنے کے وقت ڈھائی ہزار برائیاں روزانہ کی کس کی ہوں گی جو ان پر غالب آجائیں" (۱۳۳) "ایک حدیث میں ارشاد نبوی ہے کہ کوئی شخص تم میں سے اس بات کو نہ چھوڑے کہ ہزار نیکیاں روزانہ کر لیا کرے۔ سبحان اللہ وبحمدہ سو مرتبہ پڑھ لیا کرے۔ (دس گنا بڑھ کر) یہ ہزار نیکیاں ہو جائیں گی۔ اتنے گناہ تو انشاء اللہ روزانہ کے ہوں گے بھی نہیں۔ اور اس تسبیح کے علاوہ جتنے نیک کام کئے ہوں گے ان کا ثواب علیحدہ نفع میں رہا" (۱۳۶)

مغفرت کا معاملہ اگر اس قسم کے سادہ حساب کا معاملہ ہوتا تو صحابہ کا یہ حال نہ ہوتا کہ وہ آخرت کے خوف سے بے قرار رہتے اور یہ کہتے کہ کاش میں ایک تنکا ہوتا، کاش میں ایک درخت ہوتا جو کاٹ دیا جاتا۔

اس قسم کا عجیب و غریب اسلام اس لیے وجود میں آیا کہ ذکر کو ورد کے ہم معنی سمجھ لیا گیا۔ اب گناہ اور ثواب دونوں گنتی کی چیز بن گئے اور یہ ممکن ہو گیا کہ ایک گنتی کی کمی کو دوسری گنتی کی زیادتی سے برابر کر لیا جائے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ذکر کوئی شماریاتی چیز نہیں۔ ذکر اپنی شعوری ہستی کا نذرانہ ہے۔ بندہ جب اپنے رب کو اس کی تمام عظمتوں کے ساتھ پالیتا ہے تو اس کا پورا وجود اس کی یاد میں غرق ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام ذکر ہے۔ یہ ذکر آدمی کے اندر قناعت یا بے خوفی پیدا نہیں کرتا، بلکہ وہ آدمی کو خوف و دہشت سے بھر دیتا ہے۔ خدا کے جلال و جبروت کی یاد جس کے اندر بے خوفی کی نفسیات پیدا کرے، اس نے خدا کو یاد ہی نہیں کیا۔ اسی لئے قرآن میں کہا گیا ہے کہ بندہ جب خدا کو یاد کرتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے — خدایا ہم کو آگ کے عذاب سے بچا (رَبَّنَا فَقِنَا عَذَابَ النَّار، آل عمران

جب کسی کے لئے یہ موقع نہ ہوگا کہ حق کو ٹھکرا کر بھی وہ حق کا چیمپین بنا رہے

کسی کے اسلام نے اس کو یہ اطمینان عطا کیا ہے کہ جنت کے محلات اس کے لئے رزرو ہیں۔ کسی کے اسلام نے اس کو تقریر وخطابت کا شاندار عنوان دے رکھا ہے۔ کسی کا اسلام اس کو انقلاب عالم کا چیمپین بنائے ہوئے ہے۔

بخدا یہ وہ اسلام نہیں جس کو رسول اور اصحاب رسول نے پایا تھا۔ لوگ اگر اُس اسلام کو پالیں تو ان کی زبانیں بند ہو جائیں۔ ان کی آنکھیں آنسو بہائیں اور ان کے دل خدا کے خوف سے لرز اٹھیں۔ روشنی کے بجائے تاریکی اور پر رونق مجالس کے بجائے تنہائیاں ان کی محبوب ترین چیز بن جائیں۔ دوسروں کے سامنے شاندار تقریروں کا کرشمہ دکھانا ان کو بے ہودہ فعل معلوم ہونے لگے۔ اپنی غلطیوں اور حماقتوں کا جائزہ لینے میں وہ اتنا مشغول ہوں کہ دوسروں کے پیچھے دوڑنے کی انھیں فرصت نہ رہے۔

آج کی دنیا میں آدمی کھاتا پیتا ہے۔ گھر بناتا ہے۔ عہدے اور مناصب حاصل کرتا ہے۔ اعزازات وصول کرنے کے لئے دوڑتا ہے۔ یہ صورت حال اس کو دھوکے میں ڈالے ہوئے ہے۔ وہ اپنی موجودہ حیثیت کو مستقل حیثیت سمجھ بیٹھا ہے۔ حالانکہ اس کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک بے زور کیڑا ہے۔ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب کہ اس کی یہ تمام اضافی حیثیتیں چھین لی جائیں گی۔ حتی کہ لباس بھی اتار لیا جائے گا جو آدمی کے اثاثہ کی آخری چیز ہوتا ہے۔ وہ اچانک اپنے آپ کو اس حال میں پائے گا کہ وہ "ننگے جسم، ننگے پاؤں اور غیر مختون" حالت میں رب العالمین کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔

اس دن ساری اونچ نیچ مٹ جائے گی۔ خوف ودہشت سے لوگوں کی زبانیں بند ہو چکی ہوں گی۔ آدمی کے اپنے وجود کے سوا ہر چیز اس کا ساتھ چھوڑ دے گی۔ کسی کے لئے یہ موقع نہ ہوگا کہ حق کے پیغام کو نظر انداز کر کے بھی حق کا ٹھیکیدار بنا رہے ——— اس آنے والے دن کو جو آج دیکھ لے، وہی کامیاب ہے۔ جو شخص اسے کل دیکھے گا، اُس کے لئے اِس کے سوا کوئی انجام نہیں کہ وہ "ابد تک روتا اور دانت پیستا رہے"

تعریف سے خوش ہونا اور تنقید سے بپھرنا، پستی کی علامتیں ہیں۔

فانی بدایونی (۱۹۴۰-۱۸۷۹) نے کہا ہے کہ دنیا کی رنگینیاں انتہائی بے حقیقت ہونے کے باوجود اپنے ظاہر میں اتنی پرکشش ہیں کہ انسان ان کو حقیقت سمجھ بیٹھتا ہے۔ بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی شخص دھوکا دینے والے ان مناظر سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے:

فریب جلوہ اور کتنا مکمل! اے معاذ اللہ
بڑی مشکل سے دل کو بزم عالم سے اٹھا پایا

اس میں شک نہیں کہ دنیا کی رنگینیوں سے اپنے کو اوپر اٹھالینا سخت مشکل کام ہے۔ تاہم کم تعداد میں سہی، ایسے لوگ پھر بھی کچھ نہ کچھ مل جاتے ہیں۔ مگر اس سے بھی زیادہ مشکل ہے خود اپنی ذات سے اوپر اٹھنا۔ اس پہلو سے دیکھئے تو کامیاب افراد کی تعداد کم یابی سے گزر کر نایابی تک پہنچ جائے گی۔ یہ وہ مقام ہے جب کہ آدمی مقید فکر (Conditioned thinking) سے باہر آجاتا ہے۔ ہر آدمی جن حالات میں پیدا ہوتا ہے اور بڑھتا ہے، اس کے لحاظ سے ماحول اور روایات کا ایک ہالہ اس کے گرد قائم ہو جاتا ہے۔ اس کا ایک فکری مدار (Orbit) بن جاتا ہے جس میں وہ گھومتا رہتا ہے۔ اس غیر محسوس مدار سے باہر آکر سوچنا اور مکمل طور پر آزادانہ رائے قائم کرنا اس قدر دشوار ہے کہ وہ لوگ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں جو آزادانہ فکر کے علم بردار بنے ہوئے نظر آتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ خلائی راکٹ جب اپنی گردش کے دوران زمین کے مدار سے نکل کر دوسرے سیارہ کے مدار میں داخل ہوتا ہے تو تحول کے نقطہ پر دھاکہ کے ساتھ زبردست آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہی قانون شاید انسانی زندگی کے لئے بھی ہے۔ کوئی شخص اپنے مدار سے نکل کر آزاد شعوری مدار میں اس وقت داخل ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے اس فکری خول کو توڑنے کے لئے پوری طرح تیار ہو جائے جو روایات اور ماحول کے اثر سے محض اتفاقی طور پر اس کے گرد بن گیا ہے۔

کوئی شخص کب اس قابل ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو روایتی مدار سے نکال کر آزاد مدار کی طرف لے جانے کا عمل شروع کر سکے، اس کا ایک ہی جواب ہے: جب وہ اپنے آپ کو ایسا بنانے میں کامیاب ہو جائے کہ نہ ذاتی تعریف سے اسے خوشی حاصل ہو اور نہ ذاتی تنقید اسے بری لگے۔ کوئی آدمی کس مقام پر ہے، اس کو جاننے کی یہ واحد یقینی پہچان ہے۔

اگر آدمی اپنی ذات کے مدار میں گھوم رہا ہے تو وہ اپنے آپ کو اس سے نہیں بچا سکتا کہ ذاتی تعریف اس کو اچھی لگے اور ذاتی تنقید پر وہ بوکھلا اٹھے۔ مگر جو شخص اپنے ذاتی مدار سے بلند ہو جائے وہ کبھی اس بیماری میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ اس کو تعریف اور تنقید دونوں ہی بے معنی معلوم ہوں گی۔ کیوں کہ وہ حقائق کو ایسی بلند سطح سے دیکھ رہا ہوگا جہاں روایات اور ماحول کے اثرات اس کے لئے ایک خارجی چیز بن جاتے ہیں۔ بعض اعتبار سے ان میں ملوث ہونے کے باوجود وہ ان کو اس طرح دیکھ سکتا ہے جیسے کوئی شخص اپنے سے باہر کی ایک چیز کا دور سے مشاہدہ کر رہا ہو۔

اگر لوگوں کو معلوم ہو کہ کیسا ہیبت ناک دن ان کی طرف دوڑا چلا آرہا ہے تو
ان کے چلتے ہوئے قدم رک جائیں اور ان کے پاس بولنے کے لئے الفاظ نہ رہیں

اس آئینہ میں آپ اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں

خدا کے وفادار بندوں کے مشیر فرشتے ہوتے ہیں اور خدا کے باغیوں کے مشیر شیطان۔ جو آدمی اختلاف کے وقت تواضع اختیار کرے، وہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کو یہ توفیق ملی ہے کہ خدا کے فرشتے اس کے مشیر بنیں۔ کیونکہ فرشتوں کی صفت یہ ہے کہ وہ استکبار نہیں کرتے۔

اس کے برعکس جو لوگ اختلاف کے وقت ظلم اور ناانصافی پر اتر آئیں اور متکبرانہ روش اختیار کریں، وہ یہ ثابت کر رہے ہیں کہ انھوں نے شیطان کو اپنا مشیر بنا رکھا ہے۔ کیونکہ قرآن میں گھمنڈ اور سرکشی کو صرف شیطان کی صفت بتایا گیا ہے

کیا خدا کی دونوں دنیاؤں میں تضاد ہے

"انسانوں کی دنیا سے دور خدا کی دنیا کتنی حسین ہے" میری زبان سے نکلا۔ میں ایک ٹیلہ پر کھڑا تھا۔ قدرت کے آفاقی مناظر میری آنکھوں کے سامنے تھے۔ "کیا خدا کی دونوں دنیاؤں میں تضاد ہے۔ بقیہ کائنات کو خدا انتہائی محکم بنیادوں پر چلا رہا ہے۔ مگر انسانوں سے اس کو مطلوب ہے کہ وہ کرامتوں کی ایک پر اسرار دنیا بنا کر اس کے اندر طلسماتی کارنامے دکھائیں۔ خدا کو شیشم یا چنار کا ایک درخت اگانا ہو تو وہ سو سال کا ہمہ گیر منصوبہ بناتا ہے۔ مگر اپنے بندوں سے وہ چاہتا ہے کہ نعروں اور تقریروں کا طوفان اٹھا کر آناً فاناً حالات کو بدل ڈالیں۔ کائناتی کارخانہ میں ہر طرف نفع رسانی اور منفعت بخشی کا سیلاب بہہ رہا ہے۔ مگر کائنات کا مالک اپنے بندوں سے جو کچھ چاہتا ہے وہ یہ کہ وہ دوسروں کو "نقصان پہنچانے" کا کمال دکھائیں اور خیر امت ہونے کا ٹائٹل حاصل کریں۔ ستاروں اور سیاروں کی دنیا میں وہ ہر آن متحرک ہے۔ مگر مدرسوں اور خانقاہوں میں وہ تقلید اور جمود پر راضی ہو گیا ہے۔ پھولوں اور پتیوں میں وہ خوش ذوقی کا دریا بہا رہا ہے۔ ہوا کے جھونکوں اور پانی کے جھرنوں میں وہ لطافت کا خزانہ بکھیر رہا ہے۔ آسمان کی وسعت اور پہاڑوں کی بلندی میں وہ خاموش عظمتوں کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ مگر انسانوں سے اس کو مطلوب ہے کہ وہ گدھے اور کوے کی طرح چیخیں اور احتجاج اور مطالبات کی غوغا آرائی کریں۔ ہری بھری گھاس سے لے کر نیلے آسمان تک ہر طرف اتھاہ حکمت نظر آتی ہے۔ ہر جگہ انتہائی بامعنی سرگرمیاں جاری ہیں۔ مگر اپنے بندوں سے خدا ایسی عبادات پر راضی ہے جس میں کچھ رٹے ہوئے الفاظ کو زبان سے دہرا لینے سے بڑے بڑے مقامات طے ہوتے ہیں اور عالی شان جنتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔

کائنات کی سطح پر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ خدا کی دنیا رنگ اور خوشبو بکھیرنے والے پھولوں اور پیار اور بے نفسی کا سبق دینے والی چڑیوں کے لئے ہے۔ مگر دین کے ٹھیکیدار آج جس دین کا مظاہرہ کر رہے ہیں، اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی جنت گویا نکمے لوگوں کا کباڑ خانہ ہے یا مسخروں کی نمائش گاہ۔ حقیقت یہ ہے کہ جو دین آج مقررین اسلام اور مفکرین ملت ہر طرف تقسیم کر رہے ہیں، اس کو دین کہنا قرآن پر اتہام ہے۔ ایسا دین خدا کی اس عظیم اور حسین کائنات میں ایک مسخرہ پن کے سوا اور کچھ نہیں۔

خدا کی جنت لطیف ترین سرگرمیوں (دینس ۵۵) کی ایک دنیا ہوگی۔ موجودہ دنیا میں وہ افراد چنے جا رہے ہیں جو ان اعلیٰ سرگرمیوں میں شرکت کے اہل ثابت ہو سکیں۔ یہ اہلیت حدیث کے الفاظ میں یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر الٰہی اوصاف پیدا کرے (تخلقوا باخلاق اللّٰہ) وہ ذاتی میلانات کی پست سطح سے اوپر اٹھ جائے اور خدائی شعور کی بلند سطح پر جینے لگے۔ تقریری چمتکار یا عملیاتی کرشموں کو جنت کا دروازہ سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص سرکس میں کمال دکھا کر سمجھے کہ وہ ملک کا وزیر اعظم بننے کا استحقاق پیدا کر رہا ہے۔

ایک لیڈر جب وزیر ہو جائے یا کسی بڑے سیاسی عہدہ پر پہنچ جائے تو اس کے بعد اس کے لئے اپنے محکمہ میں کوئی کام نہیں رہتا۔ اس کا کام ہمیشہ کسی ایسے مقام پر ہوتا ہے جو اس سے ہزاروں میل دور ہو۔ اس کے قدموں کے نیچے جو زمین ہے، وہ مسائل کا انبار لئے ہوئے کراہ رہی ہوگی، مگر یہ کراہ اس کو سنائی نہ دے گی۔ البتہ دور کے کسی مقام پر مسائل انسانی پر ایک سیمینار ہو رہا ہو تو اس کا افتتاح کرنے کے لئے اس کے پاس کافی وقت ہوگا۔ ہمارے حکمرانوں کی اسی روش کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک عظیم ملک اتنی لمبی مدت سے ان کے زیر انتظام ہے۔ مگر وہ ملک کو اس کے سوا کوئی اور تحفہ نہ دے سکے کہ اس کو مہنگائی، رشوت، بدعنوانی اور بے انصافی سے بھر دیں۔

یہی روایت ہمارے ملی رہنماؤں میں بھی گھس آئی ہے۔ ہمارے رہنماؤں کی پہنچ اتنی بلند نہیں جتنی ملک کے سیاسی عہدہ داروں کی ہو سکتی ہے۔ تاہم اپنے دائرہ میں وہ بھی ٹھیک اسی عمل کو دہرا رہے ہیں جس کا نمونہ ان کے حکمرانوں نے ۳۰ سال سے قائم کر رکھا ہے۔ ہمارے ہر رہنما کا یہ حال ہے کہ اس کے قدموں کے نیچے اس کے لئے کوئی کام نہیں۔ چھوٹے رہنماؤں کی پرواز چند سو میل کے دائرہ تک محدود ہے۔ جو اس سے بڑے ہیں ان کا کام ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع ہوتا ہے اور جو اور بڑے ہیں وہ بین اقوامی دائرہ میں اپنی خدمات انجام دینے کے لئے کام پا رہے ہیں۔ غرض ہر ایک کا کام دور کے کسی علاقہ میں واقع ہے جہاں وہ چند روز کے لئے مہمان بن کر جائے اور اعزازات کے ماحول میں شاندار تقریر کر کے اس طرح لوٹے کہ دوبارہ اسی قسم کے کسی دور دراز مقام پر واقع ایک اسٹیج اس کے جلووں کا انتظار کر رہا ہو۔

بخدا یہ کام کرنے کا طریقہ نہیں۔ اگر ہمارے رہنماؤں کی یہ روش باقی رہی تو ۱۹۴۷ء کے بعد کے دور کو بھی ہم اسی طرح کھو دیں گے جس طرح اس سے پہلے کے دور کو ہم کھو چکے ہیں۔ کام کا یہ طریقہ صرف عالی شان قیادتیں وجود میں لا سکتا ہے وہ عالی شان قوم وجود میں نہیں لا سکتا۔ اس قسم کی قیادتیں قوم کو جو آخری وراثت دے سکتی ہیں، وہ صرف شاندار مقبرے ہیں۔ وہ قوم کو شاندار مستقبل تک نہیں پہنچا سکتیں۔

کیا لوگوں کو یہ ڈر نہیں کہ خدا کے یہاں ان سے پوچھا جائے گا کہ جو مواقع انھیں دیئے گئے تھے ان کو انھوں نے کہاں خرچ کیا۔ یا وہ اتنے نادان ہیں کہ انھیں خبر ہی نہیں کہ اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے انھیں کیا کرنا چاہئے۔

ہار آخرت کی ہار ہے اور جیت آخرت کی جیت

قرآن کی سورہ نمبر ۶۴ میں ارشاد ہوا ہے:

یَوْمَ یَجْمَعُکُمْ لِیَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِکَ یَوْمُ التَّغَابُنِ — جب اللہ تم کو جمع کرے گا جمع ہونے کے دن۔ یہی دن ہے ہار جیت کا۔

تغابن کا لفظ ایسے معاملہ کے لئے بولا جاتا ہے جب کہ ایک فریق نیچا رہے اور دوسرا فریق اونچا۔ ایک کو گھاٹا ہو اور دوسرا نفع اٹھا لے جائے۔ مطلب یہ کہ لوگ غلط فہمی سے اسی دنیا کو ہار جیت (تغابن) کا دن سمجھے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ہار جیت کا دن تو دراصل آخرت ہے۔ آیت کی تفسیر کرتے ہوئے مقاتل بن حیان نے کہا ہے:

لا غبن اعظم من ان یدخل ھٰؤلاء الی الجنۃ ویذھب باولٰئک الی النار (ابن کثیر) — کوئی ہار جیت اس سے بڑی نہیں کہ ایک گروہ کو جنت میں داخل کیا جائے اور دوسرے گروہ کو جہنم میں ڈالا جائے۔

دنیا میں شہرت، عزت، دولت، اقتدار اور عیش کے بے شمار مواقع کھلے ہوئے ہیں۔ ہر شخص اپنے اپنے حالات کے مطابق ان کی طرف دوڑ رہا ہے۔ جو شخص ان مواقع میں سے کوئی حصہ اپنے لئے پالیتا ہے اس کے اندر فخر کی نفسیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنے کو کامیاب سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے برعکس جو شخص ان کو نہیں پاتا، اس کو لوگ حقیر سمجھنے لگتے ہیں۔ عام خیال یہ ہو جاتا ہے کہ یہ وہ شخص ہے جو زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگ، شعوری یا غیر شعوری طور پر، اسی دنیا کو ہار جیت کی جگہ سمجھتے ہیں۔ ان کا ذہن یہ ہو جاتا ہے کہ اسی دنیا کی جنت، جنت ہے اور یہیں کی دوزخ، دوزخ۔ قرآن نے بتایا کہ یہ محض دھوکا ہے۔ ہار جیت تو دراصل وہ ہے جو اگلی زندگی میں سامنے آنے والی ہے۔ وہ لوگ جو دنیا میں اپنے کو فاتح سمجھتے ہیں، جب پردہ ہٹے گا تو یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ اصل حقیقت تو کچھ اور تھی۔ وہاں جا کر معلوم ہوگا کہ کون گھاٹے میں رہا اور کون نفع کما لے گیا۔ اصل میں دھوکا کس نے کھایا اور کون ہوشیار نکلا۔ کون زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا اور کون آگے بڑھنے والا ثابت ہوا۔ کس نے اپنی صلاحیتوں کو نتیجہ خیز کام میں لگایا اور کون تھا جس نے اپنی تمام توانائیوں کو وقتی تماشوں میں برباد کر ڈالا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہار اسی کی ہے جو آخرت میں ہارا اور جیت صرف اس کی ہے جس کو آخرت میں جیت حاصل ہوئی۔ وہ لوگ جو دنیوی مصلحتوں میں مہارت دکھا کر آج کی دنیا میں عزت اور ترقی حاصل کر رہے ہیں، کل کی دنیا میں ان کی یہ مہارتیں بالکل بے کار ثابت ہوں گی۔ مرنے کے بعد جب وہ آخرت کے عالم میں پہنچیں گے تو وہاں کے حالات میں عزت کی جگہ پانے کے لئے وہ اسی طرح اپنے آپ کو نااہل پائیں گے جس طرح ایک قدیم طرز کا دستکار روایتی ماحول میں باکمال نظر آتا ہے لیکن اگر اس کو ٹکنکل معاشرہ میں پہنچا دیا جائے تو وہ بالکل بے قیمت ہو جائے گا۔

ہمارے اور آخرت کے درمیان صرف ایک غیر یقینی دیوار حائل ہے

چسنالا (دھنباد) میں ایک پرانی کوئلہ کی کان تھی جو ۱۹۴۵ سے بند تھی۔ ساڑھے چارسو فٹ گہری اس کان میں دھیرے دھیرے پانی بھر گیا۔ اس سے ۸۰ فٹ کے فاصلہ پر دو سال پہلے ایک اور کان کھودی گئی۔ عالمی بنک اور بیرونی ماہرین کی مدد سے تیار کی ہوئی یہ کان جدید طرز کی مشینوں سے آراستہ تھی۔

۲۷ دسمبر ۱۹۷۵ کو اس کان میں ایک بھیانک حادثہ ہوا۔ دونوں کانوں کے درمیان ۸۰ فٹ کا فاصلہ کافی محفوظ فاصلہ سمجھا جاتا تھا۔ مگر اچانک اس کے اندر تقریباً ۶ فٹ چوڑا شگاف ہو گیا اور اس کے اندر سے پرانی کان کا پانی نئی کان میں اتنی تیزی سے داخل ہوا کہ صرف تین منٹ کے اندر نئی کان بھر گئی۔ ۳۷۲ مزدور اور انجنیئر جو اس وقت کان کے اندر کام کر رہے تھے ایک سو ملین گیلن سے بھی زیادہ پانی کے سیلاب میں غرق ہو گئے۔ صرف ایک شخص بھگوان سنگھ (مونگیر) بچا جو حادثہ سے صرف چند منٹ پہلے باہر آ گیا تھا۔

یہ واقعہ حیرت انگیز طور پر ہماری زندگی کی تصویر ہے۔ ہماری موجودہ دنیا اور آخرت کی دنیا کے درمیان موت کی غیر یقینی دیوار حائل ہے۔ ہر آن یہ اندیشہ ہے کہ یہ دیوار ٹوٹ جائے اور آخرت کے حقائق ایک بے پناہ سیلاب کی طرح ہمارے اوپر پھٹ پڑیں۔ اس وقت کوئی زور اور کوئی لفظی بازی گری کام نہ آئے گی۔ آدمی بالکل بے سہارا ہو کر اپنے مالک کے سامنے کھڑا ہو گا۔ وہ سارے لوگ ناکامی اور بربادی کے دائمی جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے جو دنیا کی دلفریبیوں میں اس قدر گم تھے کہ کوئی نصیحت کی بات سننے کے لئے تیار ہی نہ ہوتے تھے صرف وہ شخص بچے گا جس نے مالک کائنات کے سامنے حساب کے لئے پیش ہونے سے پہلے خود اپنا حساب کر لیا ہوگا۔

بہت سے دیوار اٹھانے والے اپنی دیوار کو گرا رہے ہیں۔
بہت سے لوگ جو اپنے کو دوسروں سے بڑا سمجھ رہے ہیں، وہ دوسروں کے پیروں تلے روندے جائیں گے۔
یہ اس دن ہو گا جب خدا اپنے فرشتوں کے ساتھ ظاہر ہو گا، جب سارے انسانوں سے پوچھا جائے گا کہ انھوں نے اپنے پیچھے کیا چھوڑا اور اپنے آگے کے لئے کیا روانہ کیا۔

آخرت کے لئے کوئی شخص جو کچھ کر سکتا ہے، اسی موجودہ زندگی ہی میں کر سکتا ہے۔ اور اس زندگی کی مدت بہت کم ہے۔ کتنے لوگ ہیں جن کو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا مگر آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ اسی طرح جو لوگ آج ہم کو دیکھ رہے ہیں، ایک وقت آئے گا کہ ہم ان کے دیکھنے کے لئے اس دنیا میں موجود نہ ہوں گے۔ ہم اپنی عمر پوری کر کے اپنے رب کے پاس جا چکے ہوں گے۔ ہماری موجودہ زندگی وہ پہلا اور آخری لمحہ ہے جب کہ انسان اپنے ابدی مستقبل کی تعمیر کے لئے کچھ کر سکتا ہے۔ نہ اس سے پہلے ایسا کوئی موقع انسان کو ملا تھا اور نہ اس کے بعد ایسا کوئی موقع انسان کو ملے گا۔ ہم ایک ایسے امتحان سے گزر رہے ہیں جس کا ایک لازمی نتیجہ سامنے آنے والا ہے۔ اور بہت جلد ہم ایک ایسے لازمی نتیجہ سے دوچار ہوں گے جس کے بعد پھر کسی تیاری کا کوئی موقع نہیں۔ زندگی کا ہر لمحہ جو آپ صرف کر رہے ہیں، آخری طور پر صرف کر رہے ہیں۔ کیونکہ وہ پھر واپس آنے والا نہیں ہے۔

میں نے سمجھا تھا ۔۔۔

- میں نے سمجھا تھا کہ دلیل میں وزن ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ طاقت اپنے اندر اس سے بھی زیادہ وزن رکھتی ہے۔
- میں نے سمجھا تھا کہ کارکردگی سے انسان تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر معلوم ہوا کہ لیاقت کا سب سے بڑا سرٹیفکٹ موقع پرستی ہے۔
- میں نے سمجھا تھا کہ عہدے اور مناصب کام کرنے کے مواقع ہیں مگر معلوم ہوا کہ یہ سب محض اعزاز کے لئے حاصل کئے جاتے ہیں۔
- میں نے سمجھا تھا کہ لوگ جو کچھ زبان سے کہتے ہیں وہی ان کے دل میں بھی ہوتا ہے مگر معلوم ہوا کہ ان دونوں میں کوئی تعلق نہیں۔
- میں نے سمجھا تھا کہ لوگ مقاصد کے علم بردار ہیں مگر معلوم ہوا کہ اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کے سوا لوگوں کو کسی چیز سے دلچسپی نہیں۔
- میں نے سمجھا تھا کہ جو لوگ خدا کی باتیں کرتے ہیں وہ خدا سے ڈرتے بھی ہیں مگر معلوم ہوا کہ خدا ان کے لئے ایک تجارتی عنوان کے سوا اور کچھ نہیں۔
- میں نے سمجھا تھا کہ لوگ اصلاح چاہتے ہیں مگر معلوم ہوا کہ ہر شخص کو اپنا مفاد عزیز ہے خواہ وہ دوسروں کو برباد کر کے ہی کیوں نہ حاصل ہو۔
- میں نے سمجھا تھا کہ ایک انسان دوسرے انسان کا خیر خواہ ہے مگر معلوم ہوا کہ ہر ایک دوسرے کا استحصال کر رہا ہے۔
- میں نے سمجھا تھا کہ جنت کا راستہ وسیع اور جہنم کا راستہ تنگ ہے مگر معلوم ہوا کہ سب سے وسیع راستہ وہ ہے جو جہنم کی طرف جاتا ہے۔

سیاست جب نشہ بن جائے

مکھن بنانے والی کوئی کمپنی اگر اپنے مکھن کی پیکنگ پر لکھ دے : "یہ مکھن صحت کے لئے مضر ہے" تو اس کا مکھن کوئی بھی شخص نہیں خریدے گا۔ ایسی کمپنی چند ہی روز میں دیوالیہ ہوجائے گی۔ مگر جدید قوانین کے تحت سگرٹ کا ہر پیکٹ جو سگرٹ ساز کمپنی سے تیار ہوکر بازار میں آتا ہے۔ اس پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہوتا ہے:

Cigarette smoking is injurious to health

(سگرٹ پینا صحت کے لئے مضر ہے) مگر اس سے سگرٹ کی خریداری میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سگرٹ پینے والوں کی تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے۔ سگرٹ سازی کا کاروبار آج بھی دنیا بھر میں سب سے زیادہ نفع بخش کاروبار سمجھا جاتا ہے۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مکھن ایک مفید غذا ہے۔ اس کو آدمی صحت اور طاقت حاصل کرنے کے لئے کھاتا ہے۔ اس لئے جب کسی مکھن کی یہ حیثیت مشتبہ ہوجائے تو وہ فوراً اس کو چھوڑ دے گا۔ مگر سگرٹ کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اس کے ساتھ غذائی افادیت کا کوئی تصور وابستہ نہیں۔ سگرٹ صرف نشہ حاصل کرنے کے لئے پیا جاتا ہے اور نشہ کا فائدہ سگرٹ میں اس وقت بھی پوری طرح موجود ہوتا ہے جب کہ صحت کے اعتبار سے اس کا مضر ہونا ثابت ہوگیا ہو۔ جب اصل مقصد حاصل ہورہا ہو تو کوئی شخص کیوں اُسے چھوڑے۔

اسی طرح اگر کچھ لوگوں کو "سیاست" کا چسکا لگ جائے تو خواہ کتنے ہی یقینی دلائل سے اس کا بے حقیقت ہونا ثابت کردیا جائے بہرحال لوگ اس سے چمٹے رہیں گے۔ وہ کسی بھی طرح اس کو چھوڑ نہیں سکتے۔ کیونکہ دلائل کی کوئی بھی مقدار سیاست سے نشہ کی کیفیت چھین نہیں سکتی۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ سیاست تمام نشہ آور چیزوں میں سب سے زیادہ نشہ کی چیز ہے۔ سگرٹ اور بھنگ کا نشہ اتر سکتا ہے۔ مگر سیاست کا نشہ کبھی آدمی سے نہیں اترتا۔ آپ دلائل کا انبار جمع کردیجئے۔ تجربات اس کے بے فائدہ ہونے کا عملی ثبوت دیتے چلے جائیں۔ مگر جن لوگوں کو سیاست کا نشہ لگ گیا ہے۔ تخیلات کی دنیا میں بدستور وہ اپنا سیاسی رومان جاری رکھیں گے۔ موت کے سوا کوئی طاقت نہیں ہے جو ان کے اور سیاست کے درمیان تفریق کرا سکے۔ اور اگر اتفاق سے سیاست میں کسی نے ملی ترقی کا راز دریافت کرلیا ہو یا کسی کو ایسی قرآنی ڈکشنری مل گئی ہو جس میں دین کے معنی سیاست لکھے ہوئے ہوں تو ایسے لوگوں کو سیاسی مشغلہ سے ہٹانا شاید اس وقت سے پہلے ممکن نہیں جب کہ خدا خود ظاہر ہوکر کہہ دے کہ یہ وہ دین نہیں جو مجھ کو مطلوب تھا۔ یہ تو وہ دین ہے جو تم نے خود سے گھڑ لیا تھا۔

ایسی شاندار چیزیں خدا کے یہاں کہاں!

نئی دہلی کے بین اقوامی صنعتی میلے (۱۹۶۱) میں امریکہ کی طرف سے ایک ہوائی موٹر کی نمائش کی گئی تھی۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ زمین پر بھی دوڑتی تھی اور ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہوا میں بلند ہوکر بھی اڑتی تھی۔ ایک نوجوان سادھو جب نمائش کے مختلف عجوبوں اور رنگینیوں کو دیکھتا ہوا امریکی پویلین کے پاس پہنچا اور اس جادوئی گاڑی کو اڑتے اور دوڑتے ہوئے دیکھا تو اس کے ذہن میں ایک نیا سوال پیدا ہو گیا "کیا میں تیاگ اور قربانی کی زندگی کو چھوڑ کر مادی ترقیات کی دنیا میں اپنے حوصلوں کی تسکین ڈھونڈوں" سادھو نے کہا۔ گیروے کپڑے میں ملبوس اور لمبے بکھرے ہوئے بالوں والا یہ ہندستانی نوجوان ۲۰ منٹ تک اس امریکی موٹر کو دیکھتا رہا جس کو نمائش کے ذمہ داروں نے "مستقبل کی کار" کا نام دیا تھا۔ جب اس کے بارے میں سادھو کا تبصرہ پوچھا گیا تو اس نے گہرے تاثر کے ساتھ جواب دیا: "اس نے مجھے اس سوچ میں ڈال دیا ہے کہ دونوں دنیاؤں میں سے وہ کون سی دنیا ہے جس کو میں اپنے لئے زیادہ بہتر سمجھوں" (ہندوستان ٹائمس ۔ ۲۰ نومبر ۱۹۶۱)

اسی قسم کا ایک اور واقعہ پڑھئے ۔

جولائی ۔ اگست ۱۹۷۵ میں بہار میں ہولناک سیلاب آیا تھا۔ اس میں بہت سے خاندان بے گھر ہوکر مجبور ہوئے کہ کسی دوسری جگہ اپنے لئے پناہ گاہ تلاش کریں۔ انھیں مصیبت زدگان میں ایک غریب مسلم خاندان دہلی آیا۔ گھر کا مرد طوفان میں ختم ہو چکا تھا۔ ۱۲ سال کے یتیم لڑکے شریف اور اس کی دبلی اور بیمار ماں کو جو امید دہلی لائی، وہ یہ تھی کہ اس کا داماد یہاں رکشا چلا کر اپنی روزی کما رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ رکشا کھینچنے والا ایک شخص دو خاندانوں کی پرورش کس طرح کر سکتا تھا۔ شریف کو ملازمت تلاش کرنی پڑی۔ اولاً کچھ دنوں ایک معمولی ہوٹل میں پلیٹیں دھوتا رہا۔ اس کے بعد ایک خوش حال مسلم خاندان میں اس کو گھریلو کاموں کے لئے ۵۰ روپے ماہوار پر جگہ مل گئی۔

شریف ایک انتہائی غریب خاندان کا لڑکا تھا۔ اس دنیا میں آنکھ کھولنے کے بعد اسے جو بستر ملا وہ زمین پر بچھا ہوا ایک ٹاٹ تھا۔ اب تک کی زندگی اس نے اس طرح گزاری کہ نہ کبھی اس کے پاؤں میں جوتا پڑا اور نہ جسم پر پورا لباس پہننے کو ملا۔ سردیوں کی رات کے معنی اس کے نزدیک صرف یہ تھے کہ لکڑی کے ٹکڑے اور پتیاں جمع کرکے کچھ دیر آنچ اور دھوئیں میں گزارے جائیں اور اس کے بعد ایک پھٹا ہوا ٹاٹ بچھا کر دوسرا پھٹا ہوا ٹاٹ اوپر سے لپیٹ لیا جائے۔

دسمبر کی ایک صبح کو جب کہ شریف مالکہ مکان کا بستر سمیٹ رہا تھا۔ اچانک ایک خیال اس کے دماغ میں رینگا۔ مسہری کے اوپر بچھا ہوا موٹا نرم گدا، اس کے اوپر خوبصورت چادر اور مخملی کپڑے میں بنا ہوا شاندار لحاف، ان چیزوں نے اس کو تھوڑی دیر کے لئے مبہوت کر دیا۔ "آپا"، وہ مالکہ کی لڑکی سے بولا "کیا اللہ میاں کے یہاں ایسا بستر ہوگا۔" وہ اپنے اس سوال میں اتنا گم تھا کہ وہ یہ بھی نہ سن سکا کہ لڑکی یہ کہتی ہوئی چلی گئی ہے "بیوقوف وہاں تو اس سے بھی اچھے بستر ہوں گے۔"

گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو موجودہ زمانے میں سارے لوگ اسی نفسیات میں مبتلا نظر آئیں گے۔ چھوٹے بڑے امیر غریب، عالم جاہل، سب کے سب دنیا کی دلفریبیوں پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ لذت، دولت، شہرت، عزت، مرتبہ اقتدار، غرض دنیا کی چیزوں میں سے کسی چیز کا ایک ذرہ بھی اگر کسی کے سامنے آ گیا ہے تو وہ اس کی طرف اس طرح دوڑ رہا ہے

گویا زبان حال سے یہ کہہ رہا ہو "خدا کے یہاں بھلا ایسی شان دار چیزیں کہاں ملیں گی، پھر کیوں نہ ابھی دنیا میں جو کچھ ملے اس کو حاصل کر لیا جائے"۔

سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں مذہبی لوگوں کا حال بھی وہی ہے جو دوسرے اہل دنیا کا ہے۔ موجودہ زمانے میں جو دنیوی امکانات ان کے لئے کھلے ہیں ان کی طرف دوڑ بھاگ میں وہ دوسروں سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہیں ——— عہدوں اور مناصب کی دھوم، صدارت و نظامت کے اعزازات، جلسوں اور جلوسوں کی نمائش، بین اقوامی کانفرنسوں کے لئے پرواز، ایڈرس اور استقبال کے تماشے، اخبارات کی سرخیوں میں چھپنا اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کا شوق ان کو بھی اتنا ہی ہے جتنا کسی عام دنیا دار کو ہو سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص آخرت پر تقریر کر رہا ہے اس کو بھی آخرت کا یقین نہیں، اگر ہے تو بہت کم۔

ایک کامیاب ترین انسان جب موت کے دروازہ پر پہنچتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ دروازہ کے دوسری طرف اس کے لئے مایوسی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں

ہوورڈ ہیوز امریکہ کا ایک ممتاز ترین ارب پتی تھا۔ اپریل ۱۹۷۶ میں ایک ہوائی سفر کے دوران اس پر دل کا حملہ ہوا۔ اس کے ہوائی جہاز کو فوراً ہاؤسٹن میں اتارا گیا۔ مگر اسپتال پہنچنے سے پہلے وہ ختم ہو چکا تھا۔

اپنے قانون داں باپ سے اس کو ایک ملین ڈالر بطور وراثت ملے تھے۔ مگر اس نے اپنی غیر معمولی تجارتی صلاحیت سے اپنے سرمایہ کو ۲۰۰۰۰ کروڑ ڈالر سے بھی زیادہ بڑھالیا۔ اس کے ہوائی جہاز کا عملہ جو اس کے ساتھ شریک سفر تھا اس نے اس کے آخری لمحات کے بارے میں جو چشم دید تاثرات بیان کئے اس کی بنیاد پر مشہور امریکی آرٹسٹ شرل سالومن نے اس کا خاکہ تیار کیا ہے۔ اس خاکہ میں اس کے سفر حیات کے آخری لمحات کو مصور کیا گیا ہے ——— امریکہ کا کامیاب ترین تاجر اس خاکہ میں دہشت، مایوسی، بے چارگی، ناکامی اور بے یقینی کا مجسمہ نظر آتا ہے۔ امریکی تاجر کی یہ وحشت ناک تصویر اس کیفیت کو مجسم کر رہی ہے جو ایک آدمی کی اس وقت ہوتی ہے جب وہ موت کے دروازے پر پہنچ چکا ہو اس کے پیچھے وہ زندگی ہو جس کو وہ چھوڑ چکا اور آگے وہ زندگی ہو جس میں اب وہ ہمیشہ کے لئے داخل ہو جائے گا۔

This is how a multi-millionaire looked in the last moments of his life—a sketch of the American legendary figure, Howard Hughes, who died en route from Acapulco (Mexico) to Methodist Hospital, Houston. The sketch was drawn by an artist on the basis of details furnished by the pilots who flew him.

اپنے معاملہ میں ہوشیار
دوسرے کے معاملہ میں بیوقوف

یوگنڈا کے صدر عیدی امین نے وزیر اعظم مرار جی ڈیسائی کو مبارک باد کا خط بھیجا ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی کے نام بھی ایک خط روانہ کیا ہے جس میں اس بات کا شکریہ ادا کیا ہے کہ ان کی حکومت نے ہندوستان اور یوگنڈا کے درمیان اچھے تعلقات قائم رکھے۔

صدر عیدی امین نے اندرا گاندھی کے نام اپنے خط میں لکھا ہے:

> I personally support those who have described you as a very intelligent leader, because soon after accepting defeat you and your government lifted at the right time the 21 month state of emergency imposed by yourself and which brought imprisonment without trial. This timely decision by yourself and your government to lift the emergency relieved our minds because it would have been possible for the same emergency regulations to be used against those who have now lost power.
>
> (*Hindustan Times*, March 30, 1977)

"میں ذاتی طور پر ان لوگوں سے اتفاق کرتا ہوں جن کی رائے یہ ہے کہ آپ نہایت ذہین لیڈر ہیں۔ کیونکہ اپنی شکست تسلیم کرنے کے فوراً بعد آپ نے اور آپ کی حکومت نے نہایت صحیح وقت پر اکیس ماہ کی ایمرجنسی کو ختم کر دیا جس کو آپ نے نافذ کیا تھا اور جس کے تحت لوگوں کو بغیر عدالتی کارروائی کے قید کیا جا سکتا تھا۔ ایمرجنسی کو ختم کرنے کے بارے میں آپ اور آپ کی حکومت کے اس بر وقت اقدام کے بعد ہم نے اطمینان کا سانس لیا، کیونکہ یہ ممکن تھا کہ اسی ایمرجنسی کے قوانین کو نئی حکومت ان لوگوں کے اوپر استعمال کرے جنھوں نے اب اقتدار کھو دیا ہے۔"

اندرا حکومت سے الیکشن کا نتیجہ سامنے آنے سے پہلے ایمرجنسی ہٹانے کے لئے کہا جاتا تھا تو اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایمرجنسی کے جاری رہنے سے کسی کا کیا نقصان ہے۔ مگر ۲۰ مارچ کی شب کو جب الیکشن کے نتائج کا اعلان ہوا تو اس حکومت کو ایمرجنسی کی حقیقت سمجھنے میں ایک منٹ کی دیر نہیں لگی۔ اس نے راتوں رات میٹنگ کر کے ایمرجنسی کے مکمل خاتمہ کا اعلان کر دیا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنے معاملہ میں آدمی کتنا ہوشیار ہوتا ہے اور دوسرے کے معاملہ میں کتنا بے وقوف۔ آج کی دنیا میں جس شخص کا بھی تجربہ کیجئے، تقریباً بلا استثنار آپ پائیں گے کہ وہ اپنے موافق پہلو کو سمجھنے کے لئے انتہائی ذہین ہے۔ اس کے برعکس جب معاملہ دوسرے کے موافق پہلو کو سمجھنے کا ہو تو وہ ایسا بے وقوف بن جاتا ہے، جیسے اس کو کچھ آتا ہی نہیں۔ جیسے کہ وہ اینٹ پتھر ہے نہ کہ انسان۔

ہوشیاری کی یہ قسم آدمی کے اوپر بہت بڑا وبال ہے۔ ایسا کر کے در اصل وہ حاکم حقیقی کے آگے اپنے خلاف خود حجت قائم کر رہا ہے۔ اگر آدمی اپنی باتوں میں بھی بے وقوفی ظاہر کرتا تو شاید وہ خدا کی پکڑ سے بچ جاتا۔ مگر اپنی باتوں میں ہوشیاری اور دوسرے کی باتوں میں بے وقوفی اس کو خدا کی پکڑ سے بچا نہ سکے گی۔ کیونکہ اپنی باتوں میں ہوشیاری دکھا کر وہ ثابت کر چکا ہے کہ دوسرے کی باتوں میں بھی وہ اتنا ہی ذہین اور ہوشیار ہو سکتا تھا۔

جو اپنے کو جہنم کے دروازہ پر کھڑا ہوا پائے وہی جنت میں داخل ہوگا۔

جو چپ رہنے لگے اس کو بولنا آگیا ____________

جو بے عزتی پر راضی ہو جائے اس نے اپنی عزت کو بچا لیا ____________

جو خاموش آوازوں کو سننے لگے وہی کان والا ہے۔ ____________

جس کو اپنی برائیاں دکھائی دینے لگیں وہی قابل تعریف ہے ____________

جو اپنے سے آغاز کرے وہی دوسروں تک پہنچے گا ____________

جو اپنی غلطی کو مان لے وہی صحیح راستہ پر ہے ____________

جس کی نظر میں تمام چیزیں بے لذت ہو جائیں اس نے لذت کا راز پالیا ____________

جو اپنے کو بے علم جانے وہی علم والا ہے۔ ____________

وہی آدمی باشعور ہے جس نے اپنے لاشعور کو جان لیا ____________

جو کمزوروں سے ڈرے وہی طاقت ور کی پکڑ سے بچ سکتا ہے ____________

جو دوسروں کو دیتا ہے اسی نے اپنے آپ پر خرچ کیا ____________

جو اپنے معاملات میں نادان ہو جائے وہی ملت کے معاملات میں ہوشیار ثابت ہوگا۔

جس کو اپنے منافق ہونے کا اندیشہ ہو وہی ایمان والا ہے ____________

جو کھونے والا ہے اسی نے دراصل پایا ____________

جس کو ہارنا آجائے اس کو کوئی ہرا نہیں سکتا ____________

اپنی محبوب شخصیتوں کے چرچے ہیں مگر خدا کے چرچے نہیں

کوئی تحریک کیسی ہے، اس کو جاننے کا سب سے زیادہ یقینی ذریعہ یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ اس سے جو لوگ متاثر ہوتے ہیں ان میں کیسا مزاج بنتا ہے۔ دور اول میں قرآن نے صحابہ کے اندر جو مزاج پیدا کیا، وہ خدا پرستی اور آخرت پسندی کا مزاج تھا۔ ان میں کے چند آدمی جب ایک جگہ بیٹھتے تو وہ خدا و آخرت کے چرچے کرتے، ان کے جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جاتا تو ان کو خدا یاد آتا۔ ہوا اگر تیز ہو جاتی، تب بھی وہ کانپ جاتے کہ کہیں قیامت نہ آگئی ہو۔

موجودہ زمانہ میں اسلام کے نام پر جو تحریکیں اٹھیں اور ان سے جو لوگ متاثر ہوئے، ان کو دیکھئے تو کسی میں یہ مزاج دکھائی نہ دے گا ——— کسی تحریک نے یہ مزاج پیدا کیا ہے کہ اس کے چند وابستگان جب کہیں اکٹھا ہوتے ہیں تو ان کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے بزرگوں کی فضیلتیں اور کرامتیں بیان کریں۔ کسی تحریک نے اپنے لوگوں کو ایک قسم کا عملیاتی اسلام تقسیم کر رکھا ہے اور اس کا ہر فرد اس کے طلسماتی فوائد کا ٹیپ ریکارڈ بنا ہوا ہے۔ کسی تحریک نے اسلام کے نام پر ایک عجیب و غریب قسم کا سیاسی مزاج بنایا ہے۔ اس کے متاثر افراد کا لذیذ ترین موضوع گفتگو صرف وہ چیزیں ہوتی ہیں جن میں سیاست کی چاشنی ہو۔ وہ وہیں متحرک ہوتے ہیں جہاں کوئی سیاسی اقدام کا موقع ہو۔ خواہ یہ سیاسی اقدام عملاً سیاسی خندق میں چھلانگ لگانے کے ہم معنی کیوں نہ ہو۔

آج کل جس اسلامی گروہ کو دیکھئے سب کا یہی حال نظر آئے گا۔ ان کی مجلسوں میں اپنے "حضرت" کے چرچے ہیں۔ مگر خدا کے چرچے نہیں۔ ان کی زبانوں پر کرامات اسلام کی داستانیں ہیں۔ مگر اس اسلام کی گونج نہیں جو خدا کا خوف اور بندوں کی خیر خواہی پیدا کرتا ہے۔ ان کے یہاں سیاسی مسائل پر بحثیں ہیں۔ مگر قیامت میں قائم ہونے والی عظیم عدالت کے ذکر سے ان کی صحبتیں خالی ہیں۔ ان حالات میں بڑی بڑی اسلامی تحریکوں کے وجود میں آنے کے باوجود اگر اسلام سربلند نہ ہو رہا ہو تو تعجب کی کوئی بات نہیں، کیونکہ خدا کی نصرت خدا والے دین پر نازل ہوگی نہ کہ ہمارے اپنے بنائے ہوئے دین پر۔

> خدا سے ڈر کی پہچان یہ ہے کہ آدمی انسان سے ڈرنے لگے۔ اس معنی میں نہیں کہ جو زور آور ہو یا جس سے کوئی مفاد وابستہ ہو، اس سے آپ ڈریں۔ یہ تو دنیا پرستی بلکہ شرک ہے۔ انسان سے ڈرنے کا مطلب صاحب حقوق سے ڈرنا ہے۔ یہ سمجھ کر لوگوں سے معاملہ کرنا کہ ہر آدمی کے پیچھے اس کا خدا کھڑا ہوا ہے اور وہ ہمیشہ اس کا ساتھ دیتا ہے جس کی حق تلفی کی جائے۔
> جو شخص ایک کمزور صاحب حق کو اس بنا پر نظرانداز کر دے کہ اس کی طرف سے اس کو کسی نقصان کا خوف نہیں ہے، وہ یقیناً خدا کے خوف سے بھی خالی ہے۔

بہت سے چمک دار سکّے آخرت کے بازار میں کھوٹے ثابت ہوں گے

خواہ دنیا میں وہ کتنے ہی کامیاب دکھائی دیتے ہوں

سعدی شیرازی کا ایک شعر ہے

بزرگ زادہ ناداں بہ شہروا ماند
کہ در دیارِ غریبش بہ ہیچ نستانند

"شہروا" کے معنی ہیں رواج دادۂ حکومت۔ اس سے مراد وہ نقود یا سکے ہیں جن کو کسی حکومت نے رائج کر رکھا ہو۔ ایسے سکے کی قیمت صرف اس حکومت کے حدود میں ہوتی ہے۔ اس سے باہر اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ سعدی شیرازی کہتے ہیں کہ بڑے آدمی کے کوئی صاحبزادے جو خود ناداں ہوں، وہ اپنے وطن میں اپنے باپ کی وجہ سے عزت دار بنے رہتے ہیں، مگر اپنے وطن سے باہر اسی طرح بے قیمت ہو جاتے ہیں جس طرح ایک ملک کا نوٹ دوسرے ملک میں اپنی قیمت کھو دیتا ہے۔

موجودہ دنیا میں اللہ تعالٰی نے شیطان کو آزاد چھوڑ دیا ہے۔ جو لوگ شیطان کے پسند کئے ہوئے راستوں پر چلتے ہیں، ان کو یہاں بہت جلد عزت اور ترقی حاصل ہو جاتی ہے۔ مگر اس قسم کے لوگ جیسے ہی اگلی دنیا میں داخل ہوں گے وہ بالکل بے قیمت ہو جائیں گے۔ کیونکہ اگلی دنیا وہ ہے جہاں شیطان کی عمل داری مکمل طور پر ختم ہو جاتی ہے۔ جو لوگ شیطان کی سرپرستی کی وجہ سے موجودہ دنیا میں عزت دار بنے ہوئے تھے وہ وہاں مکھی اور مچھر سے زیادہ بے قیمت ہوں گے کیوں کہ وہاں عزت صرف اس کے لئے ہے جس کو خدا اپنی سرپرستی میں لے لے۔

موجودہ صدی کے ربع اول کے آخر میں خلافت تحریک اٹھی اور سارے ملک میں طوفان کی طرح پھیل گئی۔ یہ تحریک اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے سیاسی تھی۔ مگر تحریک نے جو نعرے اور دلائل استعمال کئے وہ سب مذہبی تھے۔ چنانچہ جو لوگ اس تحریک سے متاثر ہوئے ان میں مذہبیت اتنے زور شور کے ساتھ پیدا ہوئی کہ "قرآن کی تلاوتیں اور تہجد کی نمازیں بھی عام فیشن بن گئیں"

یہ مثال بتاتی ہے کہ کس طرح ایک سیاسی تحریک بھی مذہبی اخلاقیات پیدا کر دیتی ہے۔ اگرچہ اس قسم کی اخلاقیات کی کوئی اسلامی قیمت نہیں۔ اسلامی قیمت صرف ان اخلاقیات کی ہے جو جہنم کے شعلوں کو دیکھ کر آدمی کے اندر ابھری ہو نہ کہ سیاسی مسائل کو دیکھ کر ——— دنیا کے لحاظ سے ان اخلاقیات کی اہمیت ہے جو دیر پا ہوں اور آخرت کے لحاظ سے وہ اخلاقیات اہمیت رکھتی ہیں جو خدا کے سامنے جوابدہی کے احساس سے ابھری ہوں۔ مگر ہنگامی تحریکوں میں دونوں میں سے کوئی قدر بھی موجود نہیں ہوتی۔

جب خیمے اکھاڑ دیئے جائیں گے

شریمتی اندرا گاندھی کی ہار (۱۹۷۷) میں لوگوں کو صرف سیاست کا منظر نظر آرہا ہے۔ لیکن اگر دیکھنے والی آنکھیں ہوں تو اللہ تعالےٰ نے اس کے ذریعہ سے لوگوں کو قیامت کا منظر دکھا دیا ہے۔

الہ آباد ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس جے۔ ایم۔ ایل سنہا نے ۱۲ جون ۱۹۷۵ کو ایک فیصلہ دیا جس میں سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی کے الکشن (۱۹۷۱) کو ناجائز قرار دیا گیا تھا۔ مگر اندرا گاندھی کی اولوالعزم طبیعت نے ہار نہیں مانی۔ انھوں نے اپنے عہدہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۲۵ جون ۱۹۷۵ کی رات کو ایمرجنسی لاگو کردی۔

اب سارے ملک میں ایک نیا عمل شروع کردیا گیا۔ تمام ناپسندیدہ افراد جیلوں میں بند کردیئے گئے۔ مخالف جماعتوں کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ پریس پر سنسر قائم کردیا گیا۔ ہر قسم کے اشاعتی ذرائع کو مکمل طور پر سرکاری پروپیگنڈے کے لئے وقف کردیا گیا۔ عدالت کو ایک آزاد ادارہ کی حیثیت سے ختم کردیا گیا۔ دستور میں ترمیمیں کرکے اس کو مکمل طور پر اپنے موافق بنا لیا گیا۔ ایسے قوانین جاری کئے گئے جن کے تحت حکومت کسی بھی شخص کو جرم بتائے بغیر گرفتار کرسکتی تھی اور نامعلوم مدت تک کے لئے اس کو جیل میں محبوس رکھ سکتی تھی۔ اپنی پوزیشن کو یہاں تک محفوظ کیا گیا کہ دستور میں چالیسویں ترمیم کے ذریعے طے کردیا گیا کہ وزیر اعظم اپنے کسی بھی عمل کے لئے کسی بھی ملکی عدالت میں جواب دہ نہیں ہیں۔ حتیٰ کہ حکومتی عہدہ سے الگ ہونے کے بعد بھی نہیں۔ اس طرح کی بے شمار تدبیروں کے ذریعہ سابق وزیر اعظم نے ملک میں اپنی پوزیشن کو اتنا زیادہ مضبوط کرلیا جتنا شاید پوری تاریخ میں کبھی کسی حکمراں نے نہیں کیا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ان کو یہ اعلان کرنے کی جرأت ہوئی کہ "ایمرجنسی سے پہلے والے حالات اب کبھی واپس نہیں آئیں گے" ان کو یقین تھا کہ نہ صرف وہ آخر تک ملک کے اقتدار پر قابض رہیں گی بلکہ ان کے بعد ان کا خاندان اس کا وارث بنتا رہے گا۔

مگر پچھلے عام الکشن نے ثابت کیا کہ تمام بندشوں کے باوجود آخری عدالت کا فیصلہ ابھی باقی تھا۔ یہ ملک کے عوام کی عدالت تھی۔ مارچ ۱۹۷۷ میں سابق وزیر اعظم کا مقدمہ دیس کی جنتا کے سامنے آیا۔ اور اس کے ایک فیصلہ نے اچانک سارے استحکامات کو اس طرح ڈھا دیا جیسے کہ وہ ریت کی دیوار سے بھی زیادہ بے حقیقت تھے۔ نہرو خاندان کی پچاس سالہ عظمت کا وارث صرف ایک دن میں بے یار و مددگار ہو کر رہ گیا۔

یہ واقعہ آخرت میں ہونے والی عدالت کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔ دنیا میں آدمی اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے کے لئے دلائل کے پہاڑ کھڑے کرتا ہے۔ وہ دولت و عزت اور جاہ و منصب کے قلعے تعمیر کرتا ہے۔ اقتصادی ذرائع پر قبضہ کرکے اپنے مستقبل کو محفوظ کرتا ہے۔ اپنے گرد بڑی بڑی عمارتیں بنا کر سمجھتا ہے کہ اس نے اپنے بچاؤ کا آخری انتظام کرلیا ہے۔ مگر جب قیامت آئے گی تو سارے مضبوط خیمے اکھڑ جائیں گے۔ انسان اچانک پائے گا کہ وہ سب سے بڑی عدالت کے سامنے بالکل بے بس کھڑا ہوا ہے۔

زندگی کی سب سے زیادہ سنگین حقیقت یہ ہے کہ سارے انسان خدا کے بندے ہیں۔ ہر ایک کو بہرحال ایک نہ ایک دن خدا کی عدالت میں پیش ہونا ہے۔ عقل مند وہ ہے جو اس آنے والے دن کی تیاری میں اپنے آپ کو لگا دے

وہ خوابوں کے فریب میں مبتلا ہے جو۔۔۔

چوتھی صدی ہجری کے آخر میں جب اسپین میں طوائف الملوکی شروع ہوئی اور صوبوں کے گورنر مرکز سے بغاوت کرنے لگے تو چھوٹی چھوٹی بہت سی آزاد حکومتیں بن گئیں۔ مثلاً قرطبہ میں بنو حمود، اشبیلیہ میں بنو عباد، بطلیوس میں ابن افطس، وغیرہ۔ اشبیلیہ میں بنو عباد کی حکومت ۴۱۴ھ میں قائم ہوئی اور ۸۰ برس رہ کر ختم ہوگئی۔ شاہ مراکش یوسف بن تاشقین نے جب اسپین پر چڑھائی کی تو اس کا آخری فرماں روا معتمد بن عباد اشبیلیہ کے تخت پر تھا۔ ۴۸۴ھ میں اس نے معتمد کو گرفتار کر لیا اور اس کو مراکش کے ایک مقام اغمات میں قید کر دیا۔ چار سال قید میں رہ کر وہ ۴۸۸ھ میں مرگیا۔

معتمد بن عباد جس زمانہ میں قید میں تھا، عید کے دن اس کی لڑکیاں اس سے ملنے کے لئے آئیں، اس وقت اس کے غم انگیز تاثرات اشعار کی صورت میں ڈھل گئے۔ چند اشعار یہ ہیں:

فیما مضی کنت بالاعیاد مسرورا　　فساءك العید فی اغمات ماسورا

تری بناتك فی الاطمار جائعة　　یغزلن للناس ما یملکن تطمیرا

یطأن فی الطین والاقدام حافیة　　کانها لم تطأ مسکا و کافورا

قد کان دهرك ان تامره ممتثلا　　فردّك الدهر منهیا و مامورا

من بات بعدك فی ملك یسرّ به　　فانما بات بالاحلام مغرورا

ماضی میں تو خوشی کے ساتھ عید مناتا تھا، مگر آج اغمات کے قید میں تیرے لئے عید کی کوئی خوشی نہیں۔

تو اپنی بیٹیوں کو دیکھ رہا ہے کہ وہ بھوکی، پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ وہ لوگوں کے لئے سوت کاتتی ہیں اور ان کے پاس کچھ بھی نہیں۔

وہ کیچڑ میں ننگے پاؤں چلتی ہیں، گویا کہ ان پیروں نے کبھی مشک اور کافور کو روندا ہی نہیں۔

ایک وقت وہ تھا کہ زمانہ تیرے حکم کا تابع تھا، آج زمانہ نے تجھ کو محروم و محکوم بنا دیا ہے۔

تیری اس حالت کو دیکھنے کے بعد بھی اگر کوئی شخص حکومت پر خوش ہوتا ہے تو وہ خوابوں کے فریب میں مبتلا ہے۔

انسان دنیا کی عزت اور کامیابی حاصل کرنے میں لگا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی موت آجاتی ہے۔ اور پھر اس کو معلوم ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ وہ تھا ہی نہیں جس میں وہ ساری عمر مشغول رہا۔ اصل مسئلہ آخرت کا تھا نہ کہ دنیا کا ——— آخرت کی رسوائی، آخرت کی محرومی، آخرت کا عذاب، آخرت میں بے جگہ ہو جانا، یہ وہ مسائل ہیں جن کے لئے آدمی کو بے چین ہونا چاہئے۔ نہ یہ کہ وہ دنیا میں الجھا رہے۔ یہاں تک کہ جب اس کو موت آئے تو معلوم ہو کہ عزت اور کامیابی کے سارے سامان جمع کرنے کے بعد بھی اپنی زندگی کے اگلے مرحلہ میں وہ اس حال میں داخل ہو رہا ہے کہ وہاں کی ابدی دنیا میں اپنی جگہ بنانے کے لئے اس کے پاس کچھ نہیں۔

قریب ہے کہ کسی بھی صبح و شام وہ انسانوں کے اوپر پھٹ پڑے

انڈے کے اندر زندہ بچہ کا وجود یہ معنے رکھتا ہے کہ ایک روز اس کے اوپر کا خول ٹوٹ جائے اور جیتا جاگتا بچہ خول کے باہر آجائے ——— اسی قسم کی نسبت موجودہ دنیا کو آخرت سے ہے۔ آخرت موجودہ دنیا کے اندر سے ابلی پڑ رہی ہے۔ کائنات کے احوال پر گہرائی کے ساتھ غور کیجئے تو دل پکار اٹھے گا کہ بے شک آخرت آنے والی ہے (آل عمران ۱۹۱) بلکہ وہ آپ کو بالکل آتی ہوئی نظر آئے گی۔ آپ دیکھیں گے کہ حاملہ کے پیٹ میں جس طرح اس کا حمل باہر آنے کے لئے بیتاب ہو، اسی طرح وہ کائنات کے اندر بوجھل ہو رہی ہے اور قریب ہے کہ کسی بھی صبح و شام وہ انسانوں کے اوپر پھٹ پڑے:

"یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ کہاں ہے قیامت۔ کہو اس کا علم تو صرف اللہ کو ہے۔ وہی اپنے وقت پر اس کو ظاہر کرے گا۔ وہ زمین و آسمان میں بھاری ہو رہی ہے۔ وہ بالکل اچانک تم پر آجائے گی (اعراف ۱۸۷)

وہ دن آنے والا ہے جب تمام اگلے پچھلے پیدا ہونے والے خدا کے پاس اس حال میں جمع کئے جائیں گے کہ ایک رب العالمین کے سوا سب کی آوازیں پست ہو چکی ہوں گی۔ اس دن صرف حق بات میں وزن ہوگا اور اس کے سوا تمام چیزیں اپنا وزن کھو دیں گی۔ یہ فیصلہ کا دن ہوگا۔ ہمارے اور اس دن کے درمیان صرف موت کا فاصلہ ہے۔ آج جو لمحات ہم گزار رہے ہیں۔ اس کے ہر لمحہ کا انجام ہم کو آئندہ کروڑوں سال تک بھگتنا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص ایک ایسے انجام کی طرف چلا جا رہا ہے جہاں اس کے لئے یا تو دائمی عیش ہے یا دائمی عذاب۔ ہر لمحہ جو گزرتا ہے وہ ہم کو اس آخری انجام سے قریب تر کر دیتا ہے جو ہم میں سے ہر ایک کے لئے مقدر ہے۔ ہم کو زندگی کے صرف چند دن حاصل ہیں۔ ایسے چند دن جن کا انجام لامحدود مدت تک بھگتنا پڑے گا جس کا آرام بے حد خوش گوار ہے اور جس کی تکلیف بے حد دردناک۔ ہر بار جب سورج غروب ہوتا ہے تو ہماری عمر میں ایک دن اور کم کر دیتا ہے، اس عمر میں جس کے سوا آنے والے ہولناک دن کی تیاری کا اور کوئی موقع نہیں۔ ہماری زندگی کی مثال برف بیچنے والے دکان دار کی ہے جس کا اثاثہ ہر لمحہ پگھل کر کم ہوتا جا رہا ہو۔ اور جس کی کامیابی کی صورت صرف یہ ہو کہ وہ وقت گزرنے سے پہلے اپنا سامان بیچ ڈالے۔ ورنہ آخر میں اس کے پاس کچھ نہ ہوگا اور دکان سے اس کو خالی ہاتھ اٹھ کر جانا پڑے گا۔ پھر قبل اس کے کہ موت آکر ہم کو اس عالم سے جدا کر دے جہاں صرف کرنا ہے اور اس عالم میں پہنچا دے جہاں کرنا نہیں بلکہ صرف پانا ہے، ہمارے لئے ضروری ہے کہ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا صحیح مصرف سوچ لیں۔ ہم سب کو ایک روز مالک کائنات کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ کیسے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کو خدا اپنے وفادار بندوں میں شمار کرے۔ کیوں کہ وہی لوگ اس دن عزت والے ہوں گے۔ کیسے بدبخت ہیں وہ لوگ جن کو خدا رد کرے۔ کیوں کہ اس کے بعد ان کے لئے ذلت اور حسرت کی زندگی کے سوا اور کچھ نہیں۔

زلزلہ

زمین کا اندرونی حصہ نہایت گرم سیال کی شکل میں ہے جس کا مشاہدہ آتش فشاں پہاڑ سے نکلنے والے لاوا کی صورت میں ہوتا رہتا ہے۔ یہ مادہ زمین کی سطح کو متاثر کرتا ہے جس سے زمین کے اوپر زبردست گڑگڑاہٹ اور جھٹکے پیدا ہوتے ہیں —— اسی کا نام زلزلہ ہے۔

زلزلہ انسان کے اوپر قدرت کا ایسا حملہ ہے جس میں فیصلہ کا اختیار تمام تر دوسرے فریق کو ہوتا ہے۔ زلزلہ کے مقابلہ میں انسان بالکل بے بس ہے۔ یہ زلزلے ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ ہم ایک سرخ پگھلے ہوئے نہایت گرم مادہ کے اوپر آباد ہیں جس سے صرف ۵۰ کیلو میٹر کی ایک پتلی سی چٹانی تہ ہم کو الگ کرتی ہے جو زمین کی پوری جسامت کے مقابلہ میں ایسی ہی ہے جیسے سیب کے اوپر اس کا باریک چھلکا۔ ایک جغرافیہ داں کے الفاظ میں، ہمارے آباد شہروں اور نیلے سمندروں کے نیچے ایک قدرتی جہنم دہک رہا ہے۔

زلزلہ گویا چھوٹے پیمانہ کی قیامت ہے۔ جب دہشت ناک گڑگڑاہٹ کے ساتھ زمین پھٹ جاتی ہے۔ جب پکے مکانات تاش کے پتوں کے گھروندوں کی طرح گرنے لگتے ہیں۔ جب زمین کا اوپری حصہ دھنس جاتا ہے اور اندرونی حصہ اوپر آجاتا ہے۔ جب آباد ترین شہر چند لمحوں میں وحشت ناک کھنڈر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ جب انسان کی لاشیں اس طرح ڈھیر ہو جاتی ہیں جیسے مری ہوئی مچھلیاں زمین کے اوپر پڑی ہوں —— یہ زلزلہ کا وقت ہوتا ہے۔ اس وقت انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ قدرت کے مقابلہ میں کس قدر بے بس ہے۔ یہ زلزلے بالکل اچانک آتے ہیں۔ درحقیقت زلزلہ کا المیہ اس امر میں پوشیدہ ہے کہ کوئی بھی شخص یہ پیشین گوئی نہیں کر سکتا کہ زلزلہ کب اور کہاں آئے گا۔

یہ زلزلے گویا آئندہ آنے والے بڑے زلزلہ (قیامت) کی پیشگی اطلاع ہیں۔ یہ ہمیں بتاتے ہیں کہ زمین و آسمان کا مالک کس طرح اس دنیا کو ایک روز توڑ ڈالے گا اور اس کے بعد ایک نیا عالم بنائے گا۔

موت کے خوف نے ان سے زندگی کی راحتیں چھین لیں

۲۸ جولائی ۱۹۷۶ء کو شمال مشرقی چین میں زلزلہ آیا۔ چین کا تیسرا سب سے بڑا صنعتی شہر تنگشن جس کی آبادی دس لاکھ تھی، کھنڈر میں تبدیل ہو گیا۔ زلزلہ اتنا شدید تھا کہ اسکے جھٹکے جاپان اور کوریا تک محسوس کئے گئے۔

چین کی راجدھانی پکنگ زلزلہ زدہ شہر سے تقریباً ۱۰۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ تاہم لوگوں کے خوف و ہراس کا عالم یہ تھا کہ پکنگ کی ۶۰ لاکھ آبادی نے ممکنہ موت کے ڈر سے اپنے مکانات چھوڑ دیئے اور کئی راتیں سڑکوں اور پارکوں میں گزاریں جبکہ ان کے سروں پر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔

جب مادی حالات کے اندر بھی روحانی دعائیں نکلنے لگیں

حضرت موسیٰؑ پر قتل کا الزام عائد کر کے جب مصری سرداروں نے مشورہ کیا کہ انھیں ہلاک کر دیں، تو آنجناب مصر سے مدین چلے گئے۔ مدین اس زمانہ میں، خلیج عقبہ کے مشرقی اور مغربی کناروں پر واقع علاقہ کو کہا جاتا تھا جہاں بنی مدیان آباد تھے۔ یہ مقام فرعونِ مصر کی سلطنت سے باہر تھا۔ اس لئے حضرت موسیٰؑ نے مصر سے نکل کر مدین کا رخ کیا۔

قرآن پاک میں ہے کہ جب آپ خوف اور اندیشہ کی حالت میں سفر کر رہے تھے تو اللہ کو یاد کرتے ہوئے آپ کی زبان سے یہ کلمہ نکلا:

عَسٰی رَبِّیۡۤ اَنۡ یَّہۡدِیَنِیۡ سَوَآءَ السَّبِیۡلِ (قصص ۔ ۲۲) امید ہے کہ میرا رب مجھے ٹھیک راستہ کی طرف رہنمائی کرے گا۔

بعض مفسرینِ قرآن نے اس کو محض راستہ کی تلاش کے معنی میں لیا ہے۔ ایک مفسر اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یعنی ایسے راستہ پر جس سے میں بخیریت مدین پہنچ جاؤں"

یہ الفاظ اس کیفیت کی ترجمانی کے لئے بہت ناقص ہیں جو حضرت موسیٰؑ کے دل میں پیدا ہوئی تھی۔ یہ ایک مومنانہ کلمہ ہے نہ کہ عام معنوں میں محض ایک راستہ کے مسافر کی دعا۔ حضرت موسیٰؑ کو اگرچہ مادی حالات نے مصر سے نکال کر مدین کے راستہ پر ڈالا تھا، مگر بندۂ مومن کا یہ حال ہوتا ہے کہ مادی واقعات کے اندر بھی اس کی زبان سے روحانی دعائیں نکلتی ہیں۔ بظاہر وہ اسی زمین میں راستہ تلاش کر رہا ہوتا ہے مگر زمین میں راستہ کی تلاش اس کے لئے دوسری دنیا کی یاددہانی بن جاتی ہے، وہ اس کے ذہن کو آخرت کی وادیوں میں پہنچا دیتی ہے۔ اس کے قدم دنیوی منزل کی طرف چل رہے ہوتے ہیں، مگر اس کے اندر کا طوفان پکار رہا ہوتا ہے —— "خدایا! مجھے وہاں پہنچا دے جہاں میں تجھ کو پا سکوں۔ کیوں کہ انسان کی حقیقی منزل وہی ہے"

حضرت موسیٰؑ کا یہ کلمہ ایک نازک ایمانی کیفیت کا کلمہ ہے۔ اس کو سفر اور جغرافیہ کے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

جو لوگ حقیقی معنوں میں اپنے رب کو پالیں، ان کے جینے کی سطح بالکل دوسری ہو جاتی ہے۔ وہ موجودہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی آخرت کی فضاؤں میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہ آج کی لذتوں اور تلخیوں کو دیکھتے ہوئے کل کے جنت اور جہنم کو یاد کرنے لگتے ہیں۔ مومن حقیقت میں وہی ہے جو دنیا میں آخرت کے عالم کو دیکھ لے۔ جو حالتِ غیب میں رہتے ہوئے حالتِ شہود میں پہنچ جائے۔ غیر مومن پر بھی وہ دن آئے گا جب کہ وہ عالمِ آخرت کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔ مگر یہ اس وقت ہوگا جب کہ غیب و شہود کا فرق مٹ چکا ہوگا۔ جب قیامت کی چنگھاڑ سارے پردوں کو پھاڑ دے گی۔ مگر اس وقت کا دیکھنا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔ کیونکہ وہ بدلہ پانے کا وقت ہوگا نہ کہ ایمان و یقین کا ثبوت دینے کا۔

سرکس ہورہا تھا۔ تماشائیوں کو طرح طرح کے کھیل دکھائے جارہے تھے۔ اتنے میں ایک "انسان" لوگوں کے سامنے لایا گیا۔ اس نے عجیب عجیب تماشے دکھا کر لوگوں کو خوش کرنا شروع کر دیا۔ ابھی کھیل ختم نہیں ہوا تھا کہ تماشائیوں میں سے ایک شخص نے اس "انسان" کی طرف ایک کنکر پھینک دیا۔ اس کے بعد "انسان" نے ایک زوردار چھلانگ لگائی۔ وہ شاید اپنے حملہ آور تک پہنچنا چاہتا تھا۔ مگر وہ چاروں طرف لگے ہوئے مانگ سے ٹکرا گیا۔ اس کے ٹکراتے ہی اس کے چہرے کا مکھوٹا (Mask) گر گیا۔ اب معلوم ہوا کہ وہ حقیقۃً ایک جانور تھا جو انسانی بھیس بدلے ہوئے تماشا دکھا رہا تھا۔

سرکس کے اسٹیج پر یہ واقعہ شاید ایک ہی بار پیش آیا ہو۔ مگر انسانی بستیوں میں ایسے واقعات ہر روز سامنے آرہے ہیں۔ لوگ بظاہر انسان جیسے چہروں کے ساتھ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی بات ان کو غصہ دلانے والی پیش آجائے تو اچانک وہ اپنا انسانی لبادہ اتار پھینکتے ہیں۔ اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ وہ دراصل حیوان تھے۔ البتہ انھوں نے اوپر سے انسانی مکھوٹا پہن رکھا تھا۔ خلاف مزاج بات پیش آتے ہی وہ اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہو گئے۔

لاشعور (آدمی کی اصل ہستی) کو سمجھنے کا بہترین نفسیاتی وقت وہ ہوتا ہے جب کہ وہ ذہنی اختلال میں مبتلا ہو۔ اسی طرح شکایت اور اختلاف کا وقت آدمی کے دین و اخلاق کا امتحان ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ آدمی ٹھیک اسی وقت ناکام ہو جاتا ہے جب کہ اس کو سب سے زیادہ کامیابی کا ثبوت دینا چاہئے۔

دعا یا کرتب

ایک شخص حکومت کے کسی شعبہ میں جگہ حاصل کرنے کے لئے ملازمت کا فارم بھرے تو اس کا نام درخواست ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ ایسا کرے کہ اپنے گھر میں سر نیچے اور پاؤں اوپر کر کے کھڑا ہو جائے اور یہ یقین کرے کہ اسی حال میں ساتا دن رہوں گا تو مجھ کو ملازمت مل جائے گی، تو یہ کرتب ہے۔ درخواست دینا ایک بالکل معقول بات ہے۔ مگر کرتب اتنی ہی بے معنی چیز ہے۔

اسی طرح خدا سے مانگنے میں بھی ایک دعا کا طریقہ ہے اور دوسرا کرتب کا طریقہ۔ دعا یہ ہے کہ آدمی اپنے حاجات و مسائل میں خدا کی طرف رجوع کرے، اس سے روئے گڑگڑائے، اس سے حاجت روائی کی درخواست کرے۔ یہ عین مطلوب ہے۔ حدیث میں ہے کہ جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو اس کو بھی خدا سے مانگو۔

مگر کچھ لوگوں نے اسی کے ساتھ کرتب کے کچھ طریقے نکال رکھے ہیں —— فلاں لفظ اتنی بار دہرا دو تو بلا ٹل جائے گی، فلاں وقت میں فلاں عمل کرلو تو حاجات پوری ہو جائیں گی۔ فلاں نقش کاغذ پر لکھ کر اتنے دن تک باندھے رہو تو دشمن ختم ہو جائے گا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کرتب ہیں۔ دعا (اللہ کو پکارنا) جتنا بامعنی ہے، کرتب (عملیات) کے طریقے اتنے ہی بے معنی ہیں۔ پہلا عین اسلامی ہے اور دوسرا قطعاً غیر اسلامی۔

قبل اس کے کہ خدا کا سیلاب پھٹ پڑے

اعظم گڑھ شہر کے کنارے بہت بڑا باندھ ہے جو ۱۸۷۱ کے سیلاب کے بعد بنایا گیا تھا۔ ۱۹۵۵ کا سیلاب آیا تو اس نے تمام تاریخی ریکارڈ توڑ دیئے۔ شہر کی قسمت تمام تر اسی باندھ پر معلق ہوگئی۔ باندھ کے ایک طرف شہر تھا۔ دوسری طرف حد نظر تک پھیلا ہوا پانی جس کی بلندی چھتوں کے برابر ہو رہی تھی۔ بالآخر ایک مقام پر پانی نے باندھ کو توڑنا شروع کیا۔ کلکٹر نے سیکڑوں آدمی متعین کر دیئے جو رات دن باندھ کی مرمت میں لگے ہوئے تھے۔

ہر جگہ اسی کا چرچا تھا۔ ہر شخص کی زبان پر اسی کا تذکرہ تھا۔ یہاں تک کہ ۲۶ جولائی ۱۹۵۵ کی شام آگئی۔ رات کے درمیانی حصہ میں جب کہ سناٹا چھا چکا تھا۔ ایک آواز فضا کو چیرتی ہوئی پورے شہر میں گونج گئی۔ یہ ایک اعلان تھا جو کلکٹر کی طرف سے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ کیا جا رہا تھا:

"لال ڈگی کے باندھ کی مرمت کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔ باندھ ابھی ٹوٹنا چاہتا ہے۔ آپ لوگ اپنی جانوں کو بچانے کے لئے اونچی جگہوں پر چلے جائیں"

رات کے ایک بجے کا وقت تھا۔ سارا شہر جاگ اٹھا۔ عجیب سنسنی پھیل گئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے اسرافیل نے قیامت کا صور پھونک دیا ہو۔ لوگ اپنے گھروں سے نکل کر باندھ کی طرف دوڑ پڑے تاکہ اس کو بچانے کی آخری کوشش کر سکیں۔ سیکڑوں آدمیوں نے پھاوڑا اور بوریہ سنبھال لیا اور اس مقام پر مٹی ڈالنی شروع کی جہاں باندھ پھٹ رہا تھا۔ پٹرومیکس کی روشنی میں ساری رات کام ہوتا رہا۔ اگلے دن دوپہر تک مٹی ڈالی جاتی رہی۔ مگر ساری کوششیں بے کار ثابت ہوئیں۔ انجینئر نے اعلان کر دیا کہ باندھ قابو سے باہر ہو چکا ہے۔ ہماری کوئی بھی کوشش اس کو روک نہیں سکتی۔ دن کے بارہ بجے باندھ ٹوٹ گیا۔ پانی کا زبردست ریلا شہر کی طرف بہہ پڑا۔ لوگ اپنے ٹھکانوں کی طرف بھاگ رہے تھے اور پانی ان کے پیچھے سڑکوں اور گلیوں میں اس طرح دوڑ رہا تھا جیسے وہ ان کا تعاقب کر رہا ہو۔ زندگی کے تمام مسائل سمٹ کر سیلاب کے گرد جمع ہو گئے۔

یہ سیلاب جب مجھے یاد آتا ہے تو اس میں مجھے قیامت کے عظیم تر سیلاب کا نقشہ دکھائی دینے لگتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قیامت بھی اسی طرح کا ایک بہت بڑا سیلاب ہے۔ وہ جب آئے گا تو ہمارے تمام حفاظتی بند ٹوٹ جائیں گے۔ وہ اس طرح ہم کو گھیرے گا کہ پہاڑ کی چوٹیاں بھی اس کے مقابلہ میں پناہ دینے سے عاجز رہیں گی۔

آج کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ قیامت کے اس آنے والے سیلاب سے دنیا کو آگاہ کیا جائے۔ جس طرح ضلع کلکٹر نے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ اعظم گڑھ کے شہریوں کے سامنے سیلاب کا اعلان کرایا۔ اسی طرح ہم کو بھی "لاؤڈ اسپیکر" فراہم کرنا ہے تاکہ سیلاب کے آنے سے پہلے اس کی بابت لوگوں کو باخبر کر سکیں۔ خدا کے پیغمبر اسی آنے والے "سیلاب" سے لوگوں کو باخبر کرنے کے لئے آتے تھے۔ ختم نبوت کے بعد امت مسلمہ اسی کام پر مامور ہے۔ اس کی لازمی ذمہ داری ہے کہ تمام قوموں کو اس سے خبردار کرے۔ قبل اس کے کہ خدا کا وہ سیلاب پھٹ پڑے اور پھر نہ کسی کے لئے خبردار کرنے کا موقع ہو اور نہ کسی کو خبردار ہونے کا۔

ڈرو اس سے جو وقت آنے والا

کسی مسافر کی ٹرین اسٹیشن پر سامنے کھڑی ہو اور وہ اس میں سوار ہونے کے بجائے پلیٹ فارم کی بنچ پر جگہ حاصل کرنے کے لئے کش مکش کرے، تو ہر آدمی اس کو بیوقوف کہے گا۔ مگر ایک اور سفر کے معاملہ میں ساری دنیا اسی قسم کی نادانی میں مبتلا ہے اور کسی کو اس نادانی کا احساس نہیں۔ حتی کہ جو شخص "ٹرین" کو چھوڑ کر پلیٹ فارم کی بنچ پر اپنے لئے ایک کشادہ جگہ حاصل کرلیتا ہے، اس کو لوگ خوش قسمت کہتے ہیں اور عقل مند کا لقب دیتے ہیں۔

یہ دوسرا سفر موت کا سفر ہے۔ ہر روز لاکھوں آدمی مرکر ہم کو یہ سبق دیتے ہیں کہ زندگی کا اصل مسئلہ آخرت کا مسئلہ ہے، اس کی تیاری کرو۔ مگر انسان دنیا کی دلچسپیوں اور رنگینیوں میں اس قدر الجھا ہوا ہے کہ اس کو آخرت کی دنیا کے لئے تیاری کا ہوش ہی نہیں۔

قبر دوسری زندگی کا دروازہ ہے۔ ہم میں سے ہر ایک نے کسی نہ کسی شخص کے لئے اس دروازہ کو کھلتے ہوئے اور پھر اس کے اوپر اس کو بند ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ مگر ہم میں سے بہت کم لوگ ہیں جو یہ جانتے ہوں کہ خود ان کے لئے بھی یہ دروازہ ایک روز کھولا جائے گا۔ اور پھر اسی طرح بند ہوگا جس طرح وہ دوسروں کے اوپر ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے۔ آدمی کی یہ نفسیات بھی کتنی عجیب ہے کہ دوسروں کو وہ ہر روز مرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ مگر خود اس طرح زندگی گزارتا ہے گویا اس کو ہمیشہ اسی دنیا میں رہنا ہے ۔ وہ دیکھتا ہے کہ لوگ ایک ایک کر کے روزانہ خدا کے یہاں پیشی کے لئے بلائے جا رہے ہیں۔ مگر خود اپنے کو اس طرح الگ کر لیتا ہے گویا عدالت الٰہی میں حاضری کا یہ دن اس کے اپنے لئے کبھی نہیں آئے گا۔

خدا پرست ہونے کا مطلب کیا ہے

جاڑے کے موسم میں سانپ ٹھٹھرا پڑا رہتا ہے لیکن ذرا سا بھی دُم چھوئیے تو وہ فوراً پھن نکال کر کھڑا ہو جائے گا۔ یہی حال انسانوں کا ہے۔ ایک شخص بظاہر نہایت شریف اور معقول نظر آئے گا۔ لیکن اگر اس کی "انا" کو ضرب لگائیے۔ اس سے کسی معاملے میں اختلاف کر دیجئے تو اچانک وہ ایسا نامعقول بن جاتا ہے کہ یقین نہیں آتا کہ یہ وہی شخص ہے جس سے اب تک آپ واقف تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر انسان اپنے اندر خدا بننے کی ایک تمنا چھپائے ہوئے ہے۔ جب آپ اس سے عقیدت مندی کے ساتھ ملتے ہیں۔ جب اس سے اس کی پسندیدہ باتیں کرتے ہیں تو اس کی خاموش تمنا کو تسکین ملتی رہتی ہے۔ اس کا لاشعور آپ کو قدردانی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک گویا آپ اس کے خدائی کے دعوے کو تسلیم کر رہے ہیں۔ مگر جب آپ ناقد کی حیثیت سے اس کے سامنے آئیں تو اس کا ردعمل بالکل برعکس ہوتا ہے۔ اب وہ محسوس کرتا ہے کہ آپ اس کے دعوے کو چیلنج کر رہے ہیں، وہ غصہ سے بپھر اٹھتا ہے اور چاہتا ہے کہ آپ کو مٹا ڈالے جس طرح نمرود اور فرعون نے اپنے خدائی کے دعوے کا انکار کرنے والوں کو مٹا دینا چاہا تھا۔

بہت سے لوگ ہیں جو اپنی کسی تحریر میں اپنے نام کے ساتھ "خاکسار"۔ "ہیچمدان"۔ "احقر العباد" جیسے الفاظ کو لکھنا اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں جتنا تحریر کے آغاز میں بسم اللہ کو۔ لیکن اگر ان کی "انا" پر ضرب لگائیے تو ایسا معلوم ہوگا گویا انھوں نے "برعکس نہند نام زنگی کافور" کے اصول پر اپنے لئے یہ القاب تجویز کئے تھے۔ اپنے خلاف تنقید کو سن کر وہ جس ردعمل کا اظہار کرتے ہیں، اس سے ہرگز یہ معلوم نہیں ہوتا کہ فی الواقع وہ اپنے کو حقیر یا خاکسار یا کچھ نہ جاننے والا سمجھتے ہیں۔

اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ یہ کبر ہے اور خدا کے یہاں کبر کی معافی نہیں۔

لا یدخل الجنة من کان فی قلبه مثقال حبة خردل من کبر، قیل وما الکبر؟ قال: بطر الحق وغمط الناس۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جنت میں وہ شخص نہیں جائے گا جس کے اندر رائی کے دانہ کے برابر بھی کبر ہو۔ پوچھا گیا کبر کیا ہے۔ فرمایا: حق کو نظر انداز کرنا اور لوگوں کو حقیر سمجھنا۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے آزمائش کی خاطر پیدا کیا ہے۔ اس لئے اس کے اندر نفس بھی رکھ دیا ہے جو اس کو برائیوں پر اکساتا ہے۔ تاہم اسی کے ساتھ تمیز کی قوت بھی انسان کے اندر موجود ہے جو اس کو حق و ناحق بتاتی رہتی ہے۔ ایسا ہونا بالکل فطری ہے کہ کبھی کوئی ناموافق بات سن کر آدمی پر جھنجھلاہٹ اور غصہ طاری ہو جائے اور اس کی

زبان سے نامناسب الفاظ نکل جائیں۔ مگر مومن کی شان یہ ہے کہ ایسے واقعہ کے تھوڑی دیر بعد ہی اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے کئے پر شرمندہ ہوتا ہے۔ اپنے رویے کی اصلاح کا عزم کرتا ہے۔ اس کی ذات سے کسی کو نقصان پہنچ گیا ہے تو اس کی تلافی کرتا ہے۔ جس کے ساتھ نامناسب رویہ اختیار کیا تھا اس سے معافی مانگتا ہے۔ جب وہ ایسا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں نہ صرف اس کا جرم بخش دیا جاتا ہے بلکہ خود جرم کو بھی نیکی کے خانہ میں لکھ دیا جاتا ہے کیونکہ وہ اس کیلئے ایک زیادہ بڑی نیکی کے کرنے کا سبب بنا۔ مگر جو لوگ اختلاف کو عناد اور کینہ کے مقام تک پہنچا دیں۔ جو اپنی "خدائی" تسلیم نہ کرنے والے شخص سے ہمیشہ کے لئے بدگمان ہو جائیں اور جنھیں یہ توفیق نہ ملے کہ اس سے معافی مانگ کر اس کی طرف سے اپنے دل کو صاف کرلیں، وہ بدترین مجرم ہیں، وہ کسی حال میں خدا کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے خواہ دنیا میں اپنے اتفاقی حالات کی وجہ سے وہ اپنے دل کی گندگی کو چھپانے میں کامیاب ہو جائیں۔

خدا پرست ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو خدا کے آگے جھکا دے، اس کے مقابلہ میں اپنی بڑائی کے تمام احساسات کو بالکل ختم کر دے۔ یہ احساس اگرچہ خدا کے مقابلہ میں مطلوب ہے۔ مگر اس کا امتحان بندوں کے معاملات ہی میں ہوتا ہے۔ انسانوں کے ساتھ تعلقات میں جو شخص یہ ثابت کرے کہ اسکے دل میں جھکاؤ ہے۔ وہی دراصل خدا کے آگے جھکا ہوا ہے۔ اسکے برعکس انسانوں سے ٹھیس پہنچنے کے وقت جو شخص ظالم اور متکبر بن جائے، وہ خدا کے مقابلہ میں بھی ایسا ہی ہے خواہ وہ فرائض و نوافل میں کتنا ہی تواضع کا اظہار کرتا ہو۔

حدیث میں ہے کہ آدمی کبھی ایک بھوکے اور پیاسے کو نظر انداز کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں ایک معمولی آدمی کو نظر انداز کر رہا ہوں۔ حالانکہ وہ رب العالمین کو نظر انداز کر رہا ہوتا ہے۔

اسی طرح آدمی کبھی ایک پیغام کو نظر انداز کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں ایک معمولی آدمی کی بات کو نظر انداز کر رہا ہوں۔ حالاں کہ وہ رب العالمین کی بات کو نظر انداز کر رہا ہوتا ہے۔

ایسے لوگوں کی نفسیات دنیا میں تو یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے کو ہوشیار اور کامیاب سمجھتے ہیں۔ اپنے عمل پر شرمندہ ہونے کے بجائے فاتحانہ انداز سے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ مگر جب وہ مرنے کے بعد آخرت کے عالم میں کھڑے کئے جائیں گے تو انھیں دکھائی دے گا کہ ان سے زیادہ نادان اور کوئی نہ تھا۔ ان کو ایسا محسوس ہو گا گویا زمین و آسمان نے ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

اس وقت وہ جانیں گے کہ دنیا میں اپنی جس زندگی پر وہ نازاں تھے، خدا کی نظر میں اس کی کوئی قیمت نہ تھی۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی سنتِ امتحان تھی جس نے ان کو زمین میں زندگی کا موقع دے رکھا تھا۔ امتحان کی مدت ختم ہونے کے بعد ان کو اپنا وجود اس سے بھی زیادہ بے حقیقت نظر آئے گا جتنا کہ مکھی اور مچھر۔

یہ ایک خدائی منصوبہ تھا

تاکہ ظالموں اور متکبروں کا مجرم ہونا ثابت ہو جائے اور اللہ کے وفادار بندوں کو خدائی گواہ بننے کا اعزاز حاصل ہو

ہجرت کے تیسرے سال احد کا معرکہ پیش آیا۔ اس جنگ میں ابتداءً مسلمانوں کو کامیابی ہوئی، مگر بعد کو اہل ایمان کی ایک اتفاقی غلطی سے فائدہ اٹھا کر خدا کے دشمن ان کے اوپر ٹوٹ پڑے اور انھیں نقصان پہنچایا۔ اس واقعہ سے اہل ایمان کے درمیان طرح طرح کے سوالات پیدا ہونے لگے۔ انھوں نے کہا: ہم حق پر ہیں پھر یہ مصیبت کہاں سے آ گئی (آل عمران - ۱۶۵) جواب ملا کہ یہ وقتی نقصانات ہیں، ان کی پروا مت کرو۔ خدا کی نصرت حق پرستوں کے ساتھ ہے اور آخری کامیابی بہر حال انھیں کو حاصل ہوگی۔

"یہ اس واسطے ہوا تاکہ اللہ ایمان والوں کو جان لے اور تم کو ظالموں کے اوپر گواہ بنائے"

(آل عمران - ۱۴۰) ——— گویا احد کی جنگ میں مسلمانوں سے جو ایک اتفاقی غلطی ہوئی اور جس کی وجہ سے خدا کے دشمنوں کو موقع ملا کہ وہ بے گناہ مسلمانوں کے اوپر پیچھے سے چڑھ آئیں، وہ بھی خدائی منصوبہ کا ایک جزء تھا۔ اس طرح خدا ظالموں اور سرکشوں کو ننگا کرنا چاہتا تھا، ان کے ہاتھوں اہل ایمان کو زخمی کر کے ان کی درندگی اور سرکشی کا ثبوت فراہم کرنا مقصود تھا۔ اللہ چاہتا تھا کہ اس واقعہ کے ذریعہ ایک طرف ظالموں اور متکبروں کو مجرمین کے کٹہرے میں کھڑا کر دے۔ دوسری طرف اپنے وفادار بندوں کو ان کے مقابلہ میں عدالت الٰہی کا گواہ بننے کا اعزاز عطا کرے۔ یہ ایک خدائی معاملہ تھا نہ کہ محض ایک انسانی واقعہ (۳۰ جولائی ۷۷ء)

انسان صرف اچھا یا برا کریڈٹ لے رہا ہے

ایک سب سے بڑی بات جس کو انسان سب سے زیادہ بھولا رہتا ہے، یہ کہ اس دنیا میں کسی انسان کو کوئی ذاتی طاقت حاصل نہیں۔ کوئی شخص نہ کسی کو کچھ دیتا۔ نہ کوئی شخص کسی سے کچھ چھینتا۔ ہر واقعہ جو اس زمین پر ہوتا ہے وہ خدا کی اجازت سے ہوتا ہے۔ انسان کی ساری حیثیت یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں امتحان کے لئے ہے۔ ارادہ کے سوا انسان کے بس میں اور کچھ نہیں۔ واقعات اس لئے اس کے سامنے لائے جاتے ہیں کہ اس کی جانچ ہو تاکہ اس کا خدا یہ دیکھے کہ اس کا بندہ مختلف رویوں میں سے کس رویہ کا اپنے لئے انتخاب کر رہا ہے۔ واقعات کا اہتمام مالک کائنات کی طرف سے ہوتا ہے۔ انسان تو صرف اچھا یا برا کریڈٹ لے رہا ہے

چپ رہنا سیکھو، تاکہ تم فرشتوں کی سرگوشیوں کو سن سکو۔

اپنی قوتوں کو عمل میں لاؤ، تم خدا کی مدد کے مستحق ٹھہروگے۔

جس دل میں بندوں کی محبت نہ ہو، وہ خدا کی محبت سے بھی خالی ہوگا۔

لوگوں کو حقیر نہ سمجھو، ورنہ تم لوگوں کے خالق کی نظر میں حقیر ہو جاؤ گے۔

جو ارباب جاہ کی قربت ڈھونڈتا ہے، وہ خدا کی قربت سے دور ہو گیا۔

کوئی شخص تم کو پتھر مارے تو اس سے لڑنے میں وقت ضائع مت کرو،
بلکہ اپنے آپ کو اتنا اونچا اٹھاؤ کہ پتھر مارنے والے کا پتھر وہاں تک
پہنچ ہی نہ سکے۔

جو لوگ دوسروں کی شکایت کرتے ہیں وہ صرف اس بات کا اعلان
کر رہے ہیں کہ زندگی کی دوڑ میں وہ دوسروں سے پیچھے ہو گئے۔

جب خدا کے دین کو دنیا دارانہ زندگی میں ڈھال لیا جائے

اسلام کا مطلب یہ ہے کہ زندگی خدا اور آخرت کی یاد میں ڈھل جائے، یہاں بندہ اپنے رب سے روحانی سطح پر ملاقات کرتا ہے۔ مگر جب اسلام کے ماننے والوں کو زوال ہوتا ہے تو اسلام کی روح غائب ہو جاتی ہے اور صرف ان کے دنیوی پہلو باقی رہ جاتے ہیں، اسلام اپنی سطح سے اتر کر ماننے والوں کی سطح پر آجاتا ہے ـــــ نظر نہ آنے والے خدا سے خوف و محبت کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے، البتہ نظر آنے والے خداؤں (احبار و رہبان) کی تقدیس و تحمید زوروں پر شروع ہو جاتی ہے۔ خدا کے لئے تنہائیوں میں رونا اور خاموشیوں میں اس سے گڑگڑانا باقی نہیں رہتا، البتہ لاؤڈ اسپیکر کے اوپر قرآن و اسلام کے ہنگامے خوب ترقی کرتے ہیں۔ نماز لوگوں کے دلوں کو روشن نہیں کرتی، البتہ مسجدوں کی روشنیاں پورے شباب پر پہنچ جاتی ہیں۔ روزہ سے صبر اور پرہیزگاری نکل جاتی ہے، البتہ افطار و سحر کی دھوم خوب بڑھ جاتی ہے۔ عید میں شکر اور سجدہ کی روح نہیں ہوتی، البتہ کپڑے اور میلے کے تماشے خوب رونق پکڑتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ خدا کے دین کو اپنی دنیا دارانہ زندگی میں ڈھال لیا جاتا ہے

ہر آدمی ایک فیصلہ کن انجام کی طرف بڑھ رہا ہے

ہندستان کی آزادی سے بارہ سال پہلے ۱۹۳۵ میں جب آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو نے انگریزی جیل میں اپنی آپ بیتی مکمل کی تو اس کے آخر میں انھوں نے لکھا:

"میں محسوس کرتا ہوں کہ میری زندگی کا ایک باب ختم ہو گیا اور اب اس کا دوسرا باب شروع ہوگا۔ اس میں کیا ہوگا، اس کے متعلق میں کوئی قیاس نہیں کرسکتا کتابِ زندگی کے اگلے ورق سربمہر ہیں"

آٹو بیاگرفی (لندن ۱۹۵۳) صفحہ ۵۹۷

نہرو کی زندگی کے اگلے اوراق کھلے تو معلوم ہوا کہ وہ دنیا کے تیسرے سب سے بڑے ملک کے وزیر اعظم ہیں۔ انسانی آبادی کے چھٹے حصہ پر انھوں نے اپنی ساری عمر بلاشرکت حکومت کی۔ ان کا اقتدار اتنا مکمل تھا کہ اپنی وزارتی کابینہ کے طاقت ور ترین شخص سردار پٹیل سے جب ان کے اختلافات ہوئے تو ہندستان کے اس مرد آہن نے بالآخر نہرو کے آگے ہتھیار ڈال دئے اور لکھ کر دے دیا کہ اختلافی معاملات میں عملاً میں اسی رائے کا پابند رہوں گا جو آپ کی رائے ہوگی۔

اس قسم کے کامل اقتدار کے باوجود پنڈت نہرو اپنی آخری عمر میں یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ شاید حقیقت کی کچھ اور منزلیں ہیں جہاں تک ان کی رسائی نہ ہو سکی۔ جنوری ۱۹۶۴ میں مستشرقین کی بین اقوامی کانگرس نئی دہلی میں ہوئی تھی۔ اس میں ہندستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کے بارہ سو ڈیلی گیٹ شریک ہوئے۔ پنڈت نہرو نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا:

"میں ایک سیاست داں ہوں اور مجھے سوچنے کے لئے وقت کم ملتا ہے۔ پھر بھی بعض اوقات میں یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہوں کہ آخر یہ دنیا کیا ہے۔ کس لئے ہے۔ ہم کیا ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ یہ میرا یقین ہے کہ کچھ طاقتیں ہیں جو ہماری تقدیر بناتی ہیں"

(نیشنل ہیرلڈ ۷ جنوری ۱۹۶۴)

پنڈت نہرو کے انتقال کے بعد، ایک مختصر وقفہ کو چھوڑ کر، ہندستان کا اقتدار دوبارہ ان کی صاحبزادی مسز اندرا گاندھی کے ہاتھ میں آیا اور گیارہ سال دو مہینے تک اتنی شان کے ساتھ انھوں نے حکومت کی کہ لوگ کہنے لگے کہ بیٹی باپ پر بھی بازی لے گئی ہے۔ مگر بالآخر قدرت نے ان کی سیاسی کتاب کو بھی اس طرح سربمہر کر دیا کہ وہ بھی دوبارہ اسی سوال سے دوچار ہیں جس سے ان کا باپ چالیس سال پہلے دوچار تھا ——

"زندگی کیا ہے اور بالآخر آدمی کا انجام کیا ہونے والا ہے"

تاریخ کے اندر بے شمار سبق ہیں۔ ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ ہر آدمی ایک ایسی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے جہاں آدمی کی خوش فہمیاں اس کا ساتھ چھوڑ دیں گی۔ کوئی اقتدار کسی کے کام نہ آئے گا۔ وہاں فیصلہ کا سارا اختیار دوسری طاقت کے ہاتھ میں ہوگا۔ دنیا میں انسان کا انجام آخرت کے اسی انجام کا ابتدائی نمونہ ہے۔

ہر شخص جس کو زندگی کے اسٹیج پر اپنا کردار ادا کرنے کا موقع ملتا ہے، وہ انتہائی نادانی کے ساتھ اسی عمل کو دہراتا ہے جو پچھلے تجربہ میں مکمل طور پر ناکام ہو چکا ہے۔

جنت والے

امام نسائی نے انس بن مالک سے نقل کیا ہے۔ ایک بار تین دن تک مسلسل یہ ہوتا رہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی مجلس میں یہ فرماتے کہ اب تمھارے سامنے ایک ایسا شخص آنے والا ہے جو اہل جنت میں سے ہے۔ ہر بار یہ آنے والے انصار میں سے ایک شخص ہوتے، یہ دیکھ کر عبد اللہ بن عمرو بن عاص کو جستجو ہوئی کہ آخر وہ کون سا عمل کرتے ہیں جس کی بنا پر آپؐ نے ان کے بارے میں بار بار یہ بشارت سنائی ہے۔ چنانچہ وہ ایک بہانہ کر کے گئے اور تین روز تک مسلسل ان کے یہاں رات گزارتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ شاید کوئی خاص عبادت کرتے ہوں گے جس کی وجہ سے ان کو یہ مقام ملا۔ مگر ان کی عبادت اور شب گزاری میں کوئی غیر معمولی چیز ان کو دکھائی نہ دی۔ آخر انھوں نے خود ہی ان سے پوچھا کہ بھائی، آپ کون سا ایسا عمل کرتے ہیں جس کی بنا پر ہم نے رسول اللہ کی زبان سے آپ کے بارے میں یہ عظیم بشارت سنی ہے۔ انھوں نے کہا، میری عبادت کا حال تو وہی ہے جو آپ نے دیکھا البتہ ایک بات شاید اس کا سبب بنی ہو، اور وہ یہ کہ:

لا اجد فی نفسی غلا لاحد من المسلمین
ولا احسد ہ علی خیر اعطاہ اللہ تعالی

میں اپنے دل میں کسی مسلمان کے خلاف کوئی کینہ نہیں رکھتا۔ اور نہ کسی ایسی بھلائی پر جو اللہ نے اسے دی ہو، اس سے حسد کرتا ہوں۔

زندگی کیا ہے، موت کی طرف ایک سفر۔ ہر شخص دوسروں کو اپنے سامنے مرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ مگر خود اس طرح زندگی گزارتا ہے گویا اس کو کبھی موت نہیں آئے گی۔

کوئی رصدگاہ اگر کسی دن یہ دریافت کرے کہ زمین کی جذب و کشش کی قوت ختم ہو گئی ہے تو اگلے دن یہی دریافت تمام اخباروں کی شاہ سرخی ہوگی۔ کیوں کہ اس قسم کی خبر زمین کے لئے موت کے سفر کے ہم معنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین کا کرہ چھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کی طرف کھنچنا شروع ہو جائے اور چند ہفتوں کے اندر اپنے سے بارہ لاکھ گنا بڑے سورج کے الاؤ میں اس طرح جا گرے جیسے دنیا کے سب سے بڑے آتش فشاں کے اندر کوئی ایک تنکا۔

زمین کے لئے موت کے سفر کی خبر کسی دن اخبار میں چھپ جائے تو ساری دنیا میں کہرام مچ جائے گا۔ ہم میں سے ہر شخص اس قسم کے ہولناک تر سفر میں ہے۔ مگر کوئی نہیں جو اس سے چوکنا ہو اور اپنی زندگی کے آئندہ مراحل میں بربادی سے بچنے کی فکر کرے —— سب سے بڑا مسئلہ "موت" کا مسئلہ ہے۔ مگر لوگ "زندگی" کے مسائل میں اتنا الجھے ہوئے ہیں کہ کسی کو موت کے مسئلہ پر دھیان دینے کی فرصت نہیں۔

جب زندگی کا رخ آخرت کی طرف ہو جائے

اہل ایمان کی تعریف قرآن میں یہ کی گئی ہے کہ جب ان کے سامنے خدا کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل دہل اٹھتے ہیں (انفال-۲) اور جب ان کے سامنے خدا کا کوئی حکم بیان کیا جاتا ہے تو فوراً اس کے آگے سر جھکا دیتے ہیں خواہ وہ ان کی مرضی کے خلاف کیوں نہ ہو۔ (نساء-۶۵)

حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ کے سامنے بیٹھ گیا۔ پھر اس نے کہا کہ میرے پاس کچھ غلام ہیں۔ وہ میرے ساتھ خیانت کرتے ہیں اور میری نافرمانی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے میں ان کو برا بھلا کہتا ہوں اور مارتا ہوں۔ پھر ان کے معاملہ میں میرا حال کیا ہوگا۔ آپ نے جواب دیا: جب قیامت کا دن آئے گا تو ان کی خیانت اور ان کی نافرمانی کا شمار کیا جائے گا۔ پس اگر تمھاری سزا ان کے جرم کے مطابق ہوگی تو معاملہ برابر برابر ہو جائے گا اور اگر تمھاری سزا ان کے جرم سے زیادہ ہوگی تو ان کو اجازت دی جائے گی کہ اس کے بقدر تم سے بدلہ لیں۔ یہ سن کر وہ شخص چیخ پڑا اور رونے لگا۔ اور اس کے بعد کہا:

یا رسول اللہ، ما اجد لی ولھولاء خیرا من مفارقتھم، اشھدک انھم کلھم احرار (احمد، ترمذی)

اے خدا کے رسول، میرے اور ان کے درمیان جدائی سے بہتر کوئی صورت نہیں۔ میں آپ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ وہ سب آج سے آزاد ہیں۔

مومن کون ہے۔ مومن دراصل وہ ہے جو اس واقعہ کو اپنی آنکھ سے دیکھ لے کہ اسرافیل صور لئے کھڑے ہیں اور اس بات کے منتظر ہیں کہ کب خدا کا حکم ہو اور پھونک مار کر سارے عالم کو تہ وبالا کر دیں۔ کافر اور مومن کا فرق، باعتبار حقیقت، اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ کافر دنیا کی سطح پر جیتا ہے اور مومن آخرت کی سطح پر۔ ایک ظاہر حیات میں گم رہتا ہے۔ دوسرا، آخر حیات میں اپنے لئے زندگی کا راز پالیتا ہے ——

يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُونَ (روم-۷)

کسی بھی حال میں انصاف کو نہ چھوڑیئے

"ہم نے اپنے رسول نشانیاں دے کر بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو اتاری۔ تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں" (حدید ۲۵) قرآن کا یہ ارشاد بتاتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے کیا مطلوب ہے۔ وہ مطلوب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے دائرہ میں دوسروں کے ساتھ وہی رویہ اختیار کرے جو انصاف کے مطابق ہے۔ اس کا ہر عمل خدا کی شریعت کی ترازو میں تلا ہوا ہونا چاہئے۔ لینا ہو یا دینا، دونوں حالتوں میں وہ لوگوں کے حقوق کی پوری پوری ادائگی کرے چنانچہ ارشاد فرمایا:

اے ایمان والو، انصاف پر خوب قائم رہو اور اللہ کی گواہی دینے والے بنو۔ اگرچہ اپنی ہی ذات پر ہو (نساء ۱۳۵) بندۂ مومن کی اگر کسی شخص سے ان بن ہو جاتی ہے، تب بھی اس کے عادلانہ رویہ میں فرق نہیں آتا۔ خدا کا ڈر اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ہر حال میں وہی کرے جو حقیقۃً انصاف کا تقاضا ہے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ (مائدہ - ۸)

کسی کی عداوت کے باعث انصاف کو نہ چھوڑو، انصاف کرو۔ یہی بات تقویٰ سے لگتی ہوئی ہے۔

تاہم خود انصاف پر چلنا جتنا مطلوب ہے، اتنا ہی یہ بات غیر مطلوب ہے کہ آدمی دوسروں کے خلاف انصاف کا جھنڈا لے کر کھڑا ہو جائے۔ ہر شخص سے اپنی ذات کے بارے میں خدا کے یہاں پوچھ ہونی ہے اور ہر شخص کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی ذاتی زندگی میں انصاف کو اپنائے۔ وہ خواہ حاکم کی پوزیشن میں ہو یا محکوم کی، ہر حال میں دوسروں کو اس سے انصاف ملے۔

اس کے بعد اگر کسی کو نظر آتا ہے کہ اس کا بھائی، خواہ وہ فرد ہو یا جماعت، بے انصافی کی روش پر چل رہا ہے، تو ان کے لئے اس کے اندر نصیحت (خیر خواہی) کا جذبہ ابھرنا چاہئے نہ کہ ایجی ٹیشن اور محاذ آرائی کا۔ اس کو چاہئے کہ اپنے دوسرے بھائیوں کی اصلاح کے لئے اللہ سے دعا کرے۔ حکمت اور خیر خواہی کے ساتھ ان کو بھلائی کی تلقین کرے۔ ان کی اصلاح کے لئے وہی مشفقانہ طریقہ اختیار کرے جو وہ اپنی عزیز اولاد کی اصلاح کے لئے کرتا ہے۔ اس کے بجائے احتجاجی سیاست چلانا اور انصاف کا جھنڈا لے کر کھڑا ہو جانا کسی طرح صحیح نہیں۔ اس قسم کا ہر اقدام صرف بگاڑ میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ کسی بھی درجہ میں حالات کو سدھارنے والا نہیں بن سکتا۔

پٹرول کی طاقت نے مسلمانوں کو نہ صرف اقتصادی اور سیاسی سہارا دیا ہے بلکہ وہ اعلان حق اور دعوت دین کے کام میں بھی مددگار ہو رہا ہے۔ دو بلین پٹرو ڈالر (۱۸۰۰ کروڑ روپے) کے خرچ سے ۱۹۷۶ میں لندن میں جو ورلڈ آف اسلام فیسٹیول (مہرجان العالمی الاسلامی) ہوا، اس کو دیکھ کر سیکڑوں یورپی باشندے مسلمان ہو گئے۔ ایک برطانوی اخبار نے اس مہرجان کی رپورٹ دیتے ہوئے اس کو یورپ کے اوپر اسلام کا حملہ قرار دیا تھا۔ (السٹریٹڈ ویکلی ۱۸ جولائی ۱۹۷۶):

The Islamic invasion is upon us

پٹرول کی اقتصادی قوت نے آج مسلم قوموں کو نئی اہمیت دے دی ہے۔ ساری دنیا میں عربی زبان کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں جگہ جگہ اسلامی مراکز کھل رہے ہیں۔ اسلامی لٹریچر کی اشاعت کا کام بہت بڑھ گیا ہے۔ دنیا بھر میں اسلامی شخصیتوں اور اسلامی اداروں کو پٹرول کے جادو نے نئی زندگی عطا کر دی ہے۔ بین اقوامی اسلامی اجتماعات اتنی زیادہ تعداد میں ہو رہے ہیں جن کا چند سال پہلے تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ افریقہ میں نہ صرف عوام میں اسلام پھیل رہا ہے بلکہ حالیہ برسوں میں دو عیسائی حکمران اسلام قبول کر چکے ہیں ———— یہ اور اس طرح کے دوسرے اسلامی اہمیت کے واقعات جو آج ساری دنیا میں ہو رہے ہیں وہ تمام تر اس دولت کے کرشمے ہیں جو خداداد پٹرول کے ذریعہ اچانک خلیج فارس کے مسلم ملکوں کو حاصل ہو گئی ہے۔ حتی کہ حالیہ برسوں میں مسلم قوموں کو اپنے مغربی آقاؤں کے مقابلہ میں جو جرأتِ اختلاف پیدا ہوئی ہے، وہ بھی تمام تر پٹرول کی خداداد طاقت کا کرشمہ ہے، مثلاً ترکی، سعودی عرب اور پاکستان کا امریکہ کے مقابلہ میں، اور مصر کا روس کے مقابلہ میں۔

مگر ان باتوں میں ہمارے لئے بہت زیادہ خوشی کا پہلو نہیں ہے۔ کیوں کہ "انسان" کا کام "پٹرول" انجام دینے لگے تو یہ خدا کی طرف سے انسان کے خلاف عدم اعتماد کا اظہار ہے۔ جب خدا کی آواز بلند کرنے کے لئے انسانوں کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں، اس وقت دابّہ (نمل - ۸۲) زمین سے نکل کر امر حق کا اعلان کرتا ہے۔ مگر جب دابۃ ارضی کی زبان سے خدا اپنا اعلان کرانے لگے تو یہ خوشی کا نہیں غم کا وقت ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد زمین و آسمان کی بساط لپیٹ دی جاتی ہے۔ انسان سے زمین کا سرسبز کرہ چھین لیا جاتا ہے اور اس کو دھوئیں اور آگ کی دنیا کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے جہاں وہ ابدی طور پر "روتا اور دانت پیستا" رہے۔

مسیحؑ سے یروشلم کے یہودی علماء نے کہا کہ اپنے شاگردوں کو منع کر دو کہ وہ ہمارے اوپر تبلیغ نہ کیا کریں۔ مسیحؑ نے جواب دیا:

اقول لکم انہ ان سکت ھولاء فالحجارۃ تصرخ

میں تم سے کہتا ہوں کہ اگر یہ چپ ہو جائیں تو پتھر چلا اٹھیں گے

(لوقا ۱۹: ۴۰)

مطلب یہ ہے کہ خدا کے پیغام کو بہر حال بلند ہونا ہے۔ اگر وہ انسانوں کی زبان سے بلند نہیں ہوگا تو درخت اور پتھر چلا کر اسے لوگوں کو سنائیں گے۔ مگر جب درخت اور پتھر چلانے لگیں تو یہ انسانوں کے لئے موت کا وقت ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس کے بعد عمل کی مہلت ختم ہو جاتی ہے اس کے بعد وہی چیزیں باقی رہتی ہیں یا جنت یا جہنم۔ یہ امتحان کی کاپی چھین لینے کا وقت ہوتا ہے نہ کہ پرچہ حل کرنے کا۔

سورہ طٰہٰ میں ارشاد ہوا ہے کہ پچھلے لوگوں کے حالات میں تمھارے لئے سبق ہے اور قرآن کی صورت میں ایک مکمل نصیحت نامہ تمھارے لئے بھیج دیا گیا ہے۔ کھلا کھلا حق آجانے کے بعد بھی جو اس سے اعراض کرے، قیامت کے دن اس کو بہت برا بوجھ اٹھانا پڑے گا۔

اس دن جب کہ صور پھونکا جائے گا اور خدا تمام مجرموں کو اس طرح گھیر لائے گا کہ ان کی آنکھیں خوف دہشت سے پتھرائی ہوئی ہوں گی۔ اس وقت دنیا کی زندگی ان کو اتنی حقیر اور مختصر معلوم ہوگی کہ آپس میں چپکے چپکے کہیں گے: "دنیا میں مشکل سے ہم نے دس دن گزارے ہوں گے" پھر کوئی بولے گا: "نہیں، تمھاری دنیا کی زندگی تو بس ایک دن کی زندگی تھی"۔

جب قیامت آئے گی تو پہاڑوں کو خدا دھول بنا کر اڑا دے گا اور ساری زمین کو ایسا چٹیل میدان بنا دے گا کہ اس میں کہیں کوئی اونچ نیچ دکھائی نہ دے گی۔ اس دن تمام انسان پکارنے والے کی پکار پر سیدھے چلے آئیں گے۔ کوئی کسی قسم کی اکڑ نہ دکھا سکے گا۔ تمام آوازیں خدا کے آگے پست ہو جائیں گی۔ سارے لوگ خاموش ہوں گے۔ چلنے کی ہلکی پھسپھساہٹ کے سوا تم کوئی آواز نہ سنو گے۔ اس روز کوئی سفارش کسی کے لئے کارگر نہ ہوگی۔ تمام لوگوں کے سر اس حیّ و قیوم کے آگے جھک جائیں گے۔

اس دن وہ شخص ناکام و نامراد ہوگا جو کسی ظلم کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ اور جو خدا پر ایمان رکھنے والا ہو اور نیک عمل کرے، اس کے لئے کسی قسم کا کوئی خطرہ اس دن نہ ہوگا۔

ورنہ ہم اپنی قیمت کھو دیں گے

مسلمان خدا کی طرف سے اس ذمہ داری پر مقرر کئے گئے ہیں کہ وہ تمام اہل عالم کو یہ بتا دیں کہ ان کا رب ان سے حساب لینے والا ہے۔ اس تقرر نے ان کے حال اور مستقبل کو اس کار خاص کے ساتھ باندھ دیا ہے۔ خدا کی نظر میں ان کی قیمت صرف اس وقت ہے جب کہ وہ خدائی پیغام رسانی کی اس خدمت کو انجام دیں۔ اگر وہ اس کے لئے نہ اٹھیں تو خدا کے نزدیک وہ اپنی قیمت کھو دیں گے۔

اس ذمہ داری کو چھوڑنے کے بعد کوئی بھی دوسرا عمل ان سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ اس کے بعد خدا ان کو ان کے دشمنوں کے حوالے کر دے گا۔ ان کے اوپر دوسری قومیں غلبہ حاصل کریں گی، حتی کہ دوسری بنیادوں پر اٹھائی ہوئی ان کی اسلامی تحریکوں پر بھی رولر چلا دیا جائے گا۔ خود ساختہ خیالات کی بنا پر اگرچہ وہ خوش فہمیوں میں مبتلا رہیں گے۔ مگر حالات کی بے رحم زبان چیخ رہی ہوگی کہ ان کا خدا ان کو چھوڑ چکا ہے۔

اقوام عالم کے سامنے اللہ کے دین کی گواہی دینے کے لئے اگر مسلمان نہیں اٹھتے تو ان کی کوئی قیمت خدا کے نزدیک نہیں ہے، نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں —— یہود کی تاریخ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے کافی ہے

ابولہب کو یہ بات غیر اہم نظر آئی

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو جب نبوت ملی اور خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ لوگوں کے درمیان حقیقت کا اعلان کرو تو آپ صفا کی پہاڑی پر چڑھے، اس زمانہ میں کسی بڑے خطرے کے اعلان کے لئے مکہ میں اسی بلند مقام کو استعمال کیا جاتا تھا۔ آپ نے پکار کر لوگوں کو جمع کیا۔ جب لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے ایک مختصر تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا:

"لوگو آگاہ ہو جاؤ، جس طرح تم سوتے ہو، اسی طرح تم مرو گے اور جس طرح تم جاگتے ہو اسی طرح دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے۔ اس کے بعد یا ہمیشہ کے لئے جنت ہے یا ہمیشہ کے لئے جہنم"

یہ آخرت کی حقیقت کا اعلان تھا جو دنیا پرست لوگوں کو سنایا جا رہا تھا۔ مگر آپ کے چچا ابولہب کی دنیوی فکر کے لئے یہ پیغامِ آخرت اتنا غیر مانوس ثابت ہوا کہ وہ فوراً مجلس سے اٹھ گیا اور چلا کر کہا:

تبالک سائر الیوم الھذا اجمعتنا

تمہارا برا ہو۔ کیا تم نے یہی بات سنانے کے لئے ہم کو جمع کیا تھا۔

دین کو جب دنیوی سانچہ میں ڈھال کر پیش کیا جائے تو وہ بہت جلد لوگوں میں مقبول ہو جاتا ہے۔

دین آخرت طلبی کا نام ہے

مہاتما گاندھی بھی سوشلزم کو مانتے تھے، اور کمیونسٹ بھی۔ دونوں میں فرق یہ تھا کہ گاندھی جی اختیاری سوشلزم کے قائل تھے اور کمیونسٹ جبری سوشلزم کے۔ کمیونسٹوں کا سوشلزم عوام میں پھیل گیا۔ جب کہ گاندھی جی کے سوشلزم کو صرف چند ہی لوگ قبول کر سکے۔ وجہ بالکل سادہ ہے: کمیونسٹوں کا نظریہ عوام کی فکری سطح سے قریب تھا۔ اس کے برعکس گاندھی جی کا نظریہ، نسبتاً زیادہ بہتر ہونے کے باوجود، عوام کے لئے ناقابل فہم تھا۔ اس کو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے تھے جو سماجی مسائل پر زیادہ گہرائی کے ساتھ سوچتے ہوں۔

یہی صورت حال مذہب کے ساتھ بھی پیش آتی ہے۔ کوئی مذہبی تحریک عوام میں مقبول ہو رہی ہو تو اس کا لازمی مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ صداقت پر مبنی ہے۔ بالکل ممکن

ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ عوام کی فکری سطح سے قریب ہے۔
رمضان کے مہینے میں ان دکانوں پر زیادہ بھیڑ ہوتی ہے جو سحری اور افطار کے "لذیذ کھانے" فروخت کرتی ہوں۔ اس کے برعکس جو شخص روزہ کا فلسفہ بیان کر رہا ہو، اس کے حلقہ میں بہت کم آدمی دکھائی دیں گے۔ کیوں۔ اس لئے کہ لذیذ کھانے کی طلب ہر ایک میں ہوتی ہے۔ جب کہ فلسفیانہ غور و فکر سے لوگوں کے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔

جو مذہب "زردہ اور بریانی" میں ثواب کا راز بتائے، وہ بہت جلد لوگوں کی حمایت حاصل کرے گا۔ کیونکہ مذہب کی یہ قسم عوام کی فکری سطح سے انتہائی قریب ہے۔ اس کو اختیار کرنے کے لئے ان کو اپنی زندگی کا ڈھانچہ توڑنے کی ضرورت نہیں۔ جو مذہب کشف و کرامت کی داستانیں اپنے ساتھ لئے ہوئے ہو، عوام اس کی طرف دوڑ پڑیں گے کیونکہ عجوبہ پسندی ساری دنیا میں سب سے زیادہ عام انسانی صفت ہے۔ اسی طرح جو لوگ سیاسی اصطلاحوں میں مذہب کو بیان کریں یا جلسوں اور نعروں والا مذہب تقسیم کرتے ہوں وہ بہت آسانی سے لوگوں کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیں گے۔ کیوں کہ یہ سب وہی چیزیں ہیں جن سے لوگ پہلے ہی سے مانوس تھے۔

دین کی اصل آخرت ہے۔ دینی زندگی کا مطلب ہے ایسی زندگی جس میں ساری توجہ آخرت کی کامیابی اور ناکامی کی طرف لگی ہوئی ہو۔ مگر لوگ ہر زمانہ میں دنیا دارانہ مشاغل کی سطح پر ہوتے ہیں۔ اگر دین کو انکی دنیوی زندگی کے ضمیمہ کے طور پر پیش کیا جائے تو اس کو قبول کرنے میں انھیں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں دین ان کو ٹھیک اسی سطح پر مل رہا ہوتا ہے جس سطح پر وہ خود پہلے سے ہیں۔ اس کے برعکس جب دین کو آخرت طلبی کے روپ میں پیش کیا جائے جو اس کی حقیقی صورت ہے تو وہ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ لوگ اس کو اپنی فکری سطح سے ہٹا ہوا پاتے ہیں، اس لئے اسے رد کر دیتے ہیں۔

قدیم مکہ میں جن لوگوں نے نماز کا مطلب یہ بتایا کہ بیت اللہ میں جمع ہو کر تالی پیٹیں اور سیٹی بجائیں (انفال ۔ ۳۵) ان کو عوامی مقبولیت حاصل کرنے میں دیر نہیں لگی۔ جنھوں نے خدا پرستی کا کمال یہ بتایا کہ حاجیوں کو پانی پلایا جائے اور مسجد حرام کی خدمت کی جائے (توبہ ۔ ۹) ان کو بھی بہت جلد عوام الناس کی تائید حاصل ہوگئی کیونکہ یہ باتیں ان کی فکری سطح سے قریب تھیں۔ وہ اپنے مقررہ دنیوی ڈھانچہ کو توڑے بغیر اس مذہب کو اپنی زندگی میں شامل کر سکتے تھے۔ اسی طرح جن لوگوں نے مذہب کا خلاصہ یہ بتایا کہ احبار و رہبان (بزرگوں) کا دامن تھام لو (توبہ ۔ ۳۱) وہ بھی عوام میں خوب مقبول ہوئے۔ کیونکہ ان کا مذہب لوگوں کی دنیا دارانہ زندگی سے کوئی ٹکراؤ پیدا نہیں کرتا تھا۔ اس طرح وہ اپنے محبوب دنیوی مشاغل میں مصروف رہتے ہوئے یہ اطمینان کر سکتے تھے کہ انھوں نے اپنی نجات اور کامیابی کا یقینی انتظام کر لیا ہے۔

مگر مذہب کی دعوت جب پیغمبر اسلامؐ کی زبان سے بلند ہوئی تو بالکل مختلف صورت حال پیش آئی۔ یہاں جو مذہب پیش کیا جارہا تھا، وہ لوگوں کی دنیا پرستانہ زندگی کے سانچہ میں نہ تھا، بلکہ اس کو توڑ کر اپنی جگہ بنانا چاہتا تھا۔ آپ کا مذہب مکہ والوں کو آخرت کی طرف دوڑنے کا تقاضا کر رہا تھا نہ کہ دنیا کی طرف۔ اس لئے بالکل فطری تھا کہ جیسے ہی اس نے اپیل کی، لوگ اس کا انکار و استہزا کرنے لگیں۔

ایسا نہ ہو کہ خدا کا قانون ہمیں پکڑ لے

گائے بھینس پالنے والوں کے سامنے ایک مسئلہ یہ رہتا ہے کہ مویشی کے دودھ کو اس کے بچہ سے کس طرح بچائیں۔ اس کا ایک طریقہ بعض علاقوں میں یہ ہے کہ بچہ کے سر پر ایک سینگ نما دو شاخہ لکڑی باندھ دیتے ہیں جس کو کٹیلا (کانٹے والا) کہتے ہیں۔ بچہ جب دودھ پینے کے لئے جانور کے تھن کے پاس اپنا منھ لے جاتا ہے تو اس کے منھ سے پہلے اس کا کٹیلا جانور کے تھن سے ٹکراتا ہے اور جانور بدک کر ہٹ جاتا ہے۔ کٹیلا باندھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ اور اس کی ماں کا تھن، دونوں ایک دوسرے سے ملنے ہی نہیں پاتے۔

ایسا ہی کچھ معاملہ اس وقت مسلمانوں کا ہو رہا ہے۔ دوسری اقوام ان کے لئے مدعو (جس کو دعوت پہنچائی جائے) کی حیثیت رکھتی ہیں اور وہ ان کے اوپر حق کے داعی ہیں۔ مگر مسلمانوں نے عرصہ سے اپنی مدعو اقوام سے سیاسی اور معاشی لڑائی چھیڑ رکھی ہے۔ ہر جگہ وہ ان کے دنیوی اور مادی حریف بنے ہوئے ہیں۔ ٹکراؤ کی یہ سیاست ان کے ملی وجود کے اوپر ایک قسم کا کٹیلا بن گئی ہے۔ جب مسلمان اور دوسری قوموں کے افراد ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہیں تو قبل اس کے کہ وہ مسلمانوں کی اسلامی حیثیت کو جانیں، ان کا نوکدار "کٹیلا" ان سے ٹکرا جاتا ہے اور وہ ان سے متوحش ہو کر الگ ہو جاتے ہیں۔ وہ فضا بننے کی نوبت ہی نہیں آتی جس میں دوسری قومیں مسلمانوں کے دینی پیغام سے متعارف ہوں اور اس پر غیر جانب دارانہ انداز سے غور کریں۔

اگر ہم کو یقین ہے کہ آخرت آنے والی ہے اور لوگوں سے ان کے اعمال کی پوچھ ہونی ہے تو ہمارے اوپر لازم ہے کہ اس کٹیلا کو اپنے اوپر سے اتاریں۔ اگر ہم نے ایسا نہیں کیا تو سخت اندیشہ ہے کہ خدا کا قانون ہم کو پکڑ لے اور ہمارے اپنے جرائم کے ساتھ دوسری قوموں کا عذاب بھی ہمارے اوپر ڈال دیا جائے۔

آدمی اسی چیز کو کھو رہا ہے جس کو وہ سب سے زیادہ پانا چاہتا ہے

لوگوں کی دوڑ دھوپ آج کس چیز کے لئے ہے۔ کھانا، کپڑا، مکان، عزت، خوش حالی اور پُر مسرت زندگی۔ ہر شخص اپنی ساری زندگی کو انھیں چیزوں کے حصول اور ترقی میں لگائے ہوئے ہے۔

مگر صورت حال کا واقعہ بتاتا ہے کہ آدمی موجودہ دنیا میں اپنے اس مطلوب کو انتہائی عارضی مدت کے لئے حاصل کرتا ہے۔ ان چیزوں کو پانے کی اصل جگہ وہ دنیا ہے جہاں آدمی کو ہمیشہ رہنا ہے۔ لوگ اپنی ساری طاقت دنیوی مستقبل کی تعمیر میں لگائے ہوئے ہیں۔ اُخروی مستقبل کی تعمیر کی کسی کو فکر نہیں۔ زندگی کے اگلے طویل تر مرحلہ میں وہ اسی چیز کو کھو رہے ہیں جس کو وہ موجودہ عارضی دنیا میں سب سے زیادہ پانا چاہتے ہیں ــــ کیسی عجیب ہے یہ محرومی۔

بائبل کی زبان میں

تم نے بہت امید رکھی مگر تم کو تھوڑا ملا

بنی اسرائیل کے نبی حجیؔ، جن کا زمانہ چھٹی صدی قبل مسیح ہے، کی ایک کتاب موجودہ عہد نامۂ قدیم میں شامل ہے، وہ اپنی قوم کو تنبیہ کرتے ہوئے فرماتے تھا:

"تم نے بہت سا بویا پر تھوڑا کاٹا۔ تم کھاتے ہو پر آسودہ نہیں ہوتے۔ تم پیتے ہو پر پیاس نہیں بجھتی۔ تم کپڑے پہنتے ہو پر گرم نہیں ہوتے۔ اور مزدور اپنی مزدوری سوراخ دار تھیلی میں جمع کرتا ہے۔ رب الافواج فرماتا ہے کہ اپنی روش پر غور کرو۔ تم نے بہت امید رکھی اور دیکھو تھوڑا ملا۔ اور جب تم اسے اپنے گھر میں لائے تو میں نے اسے اڑا دیا"

"رب الافواج فرماتا ہے کیوں۔ اس لئے کہ میرا گھر ویران ہے۔ اور تم میں سے ہر ایک اپنے گھر کو دوڑا چلا جاتا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں ابھی خداوند کے گھر کی تعمیر کا وقت نہیں آیا۔ تب خداوند کا کلام حجی نبی کی معرفت پہنچا کہ کیا تمھارے لئے مسقف گھروں میں رہنے کا وقت ہے جب کہ یہ گھر ویران پڑا ہے۔ اب رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی روش پر غور کرو"

مسیح کی زبان سے

آسمان کی بادشاہی اس بڑے جال کی مانند ہے جو دریا میں ڈالا گیا۔ اور اس نے ہر قسم کی مچھلیاں سمیٹ لیں۔ اور جب بھر گیا تو اسے کنارے پر کھینچ لائے۔ اور بیٹھ کر اچھی اچھی تو برتنوں میں جمع کرلیں اور جو خراب تھیں پھینک دیں۔ دنیا کے آخر میں ایسا ہی ہوگا۔ فرشتے نکلیں گے اور شریروں کو راست بازوں سے جدا کردیں گے۔ اور ان کو آگ کی بھٹی میں ڈال دیں گے۔ وہاں رونا اور دانت پیسنا ہوگا۔ متی ۱۳: ۵۰-۴۷

دنیا کو کسی بتانے والے کا انتظار ہے

جولائی ۱۹۷۶ کی چھ تاریخ تھی اور شام ۶ بجے کا وقت ۔ میں شہر کی ایک سڑک سے گزر رہا تھا ۔ اتنے میں ایک اجنبی دکان دار نے آواز دے کر مجھے روکا ۔

"مرنے کے بعد کیا آدمی پھر اسی جیون میں واپس آتا ہے " اس نے پنجابی زبان میں سوال کیا ۔

" نہیں "

"پھر کہاں جاتا ہے "

" اپنے مالک کے پاس چلا جاتا ہے حساب دینے کے لئے "

"اور اس کے بعد"

" اس کے بعد نرک میں جاتا ہے یا سورگ میں "

یہ جواب سن کر بوڑھے دکان دار نے اپنی سیٹ پر پہلو بدلا اور خاموش ہو گیا ۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گیا ہے ۔ مجھے محسوس ہوا کہ اب کچھ اور بولنا اس کی سوچ میں خلل ڈالنا ہوگا ۔ میں چند منٹ تک اس کے اگلے سوال کا منتظر رہا اور اس کے بعد آگے بڑھ گیا ۔

اسی قسم کا ایک واقعہ مشہور امریکی مشنری بلی گراہم نے لکھا ہے ۔ وہ اپنی کتاب " دی سیکرٹ آف ہیپی نس " میں لکھتا ہے کہ دنیا کے ایک عظیم سیاست داں نے ایک بار اس سے کہا:

I am an old man. Life has lost all meaning. I am ready to take a fateful leap into the unknown. Young man, can you give me a ray of hope.

" میں بوڑھا ہو چکا ہوں ۔ زندگی نے اپنی تمام معنویت کھو دی ہے ۔ عنقریب میں نامعلوم دنیا کی طرف ایک فیصلہ کن چھلانگ لگانے والا ہوں ۔ اے نوجوان شخص! کیا تم مجھے امید کی کوئی کرن دے سکتے ہو ۔"

یہ موت ہر آدمی کا پیچھا کر رہی ہے ۔ بچپن اور جوانی کی عمر میں آدمی اسے بھولا رہتا ہے ۔ مگر بالآخر تقدیری فیصلہ غالب آتا ہے ۔ بڑھاپے میں جب اس کی طاقتیں گھٹ جاتی ہیں تب اسے محسوس ہوتا ہے کہ اب بہرحال کچھ دنوں کے بعد وہ مر جائے گا ۔ اس وقت وہ مجبور ہوتا ہے کہ سوچے کہ " مرنے کے بعد کیا ہونے والا ہے " ۔ اسے تلاش ہوتی ہے کہ وہ کوئی امید کی کرن پالے جو موت کے بعد آنے والے حالات میں اس کو روشنی دے سکے ۔

یہ زندگی کا اہم ترین سوال ہے ۔ اس سے باخبر کرنے کے لئے اللہ نے اپنے تمام پیغمبر بھیجے ۔ مگر آج جو لوگ پیغمبر کے وارث ہیں ۔ وہ خود بھی شاید اس حقیقت کو بھول چکے ہیں ۔ پھر ان سے کیا امید کی جائے کہ وہ دوسروں کو اس حقیقت سے باخبر کر سکیں گے ۔

موت کے بعد انسان کے ساتھ کیا پیش آتا ہے اسی کو بتانے کے لئے قرآن بھیجا گیا ہے ۔ حاملین قرآن کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ دنیا کو اس حقیقت سے باخبر کریں ۔ اگر وہ اس کام کو نہ کریں تو قیامت کے دن جب قوموں کا حساب ہوگا وہ اس بات کے مجرم قرار پائیں گے کہ ان کے پاس انسانیت کے لئے اہم ترین خبر تھی مگر انہوں نے لوگوں کو اس سے آگاہ نہ کیا ◻

دو قسم کے لوگ

زرخیز زمین میں کھیتی کرنے والے کے حصہ میں لہلہاتی ہوئی فصل آتی ہے۔ اس کے برعکس جو شخص پتھر کی چٹانوں میں دانے بکھیرے، وہ بالآخر فصل سے بھی محروم رہتا ہے اور خود اپنے بیج سے بھی۔ اسی طرح انسانی کوششوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جب کہ آدمی حق کی آواز پر دھیان نہ دے اور اپنے وقت اور قوت کو ایسی سرگرمیوں میں ضائع کر دے جن کی کوئی قیمت آئندہ آنے والی حقیقی دنیا (آخرت) کے اعتبار سے نہ ہو۔ ایسا شخص اپنی زندگی کے ابدی مرحلہ میں اس حال میں داخل ہوگا کہ دنیا میں شان دار زندگی گزارنے کے باوجود آخرت میں اس کے لئے کچھ نہ ہوگا۔ اس کے برعکس معاملہ ان لوگوں کا ہے، جنھوں نے اصل معاملہ کو سمجھا اور اپنے آپ کو نتیجہ خیز کاموں میں مشغول کیا۔ وہ سفر حیات کی آخری منزل (آخرت) میں اس حال میں داخل ہوں گے کہ وہاں وہ اپنی دنیوی سرگرمیوں کا بھرپور انجام پائیں گے:

کیا ہم تم کو بتائیں کہ وہ کون لوگ ہیں جن کا کیا ہوا سب اکارت چلا گیا۔ وہ جن کی کوششیں دنیا کی زندگی میں بھٹکتی رہیں اور وہ سمجھتے رہے کہ وہ اپنا کام خوب بنا رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کی نشانیوں اور اس سے ملنے کے منکر رہے۔ اس لئے ان کا سارا عمل ضائع ہو گیا۔ قیامت کے روز ہم ان کو کوئی وزن نہ دیں گے۔ ان کا انجام دوزخ ہے بہ سبب اس کے کہ انھوں نے انکار کیا اور میری نشانیوں کو اور میرے پیغمبروں کا مذاق بنایا۔ البتہ جو لوگ ایمان لائے اور درست کام کئے ان کی میزبانی کے لئے جنت کے باغ ہوں گے۔ وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور کبھی وہاں سے جگہ بدلنا نہ چاہیں گے (کہف، آخر)

ایک شخص نے کاروبار شروع کیا اور زبردست محنت کر کے اس میں کافی ترقی کی۔ اس کے دوست نے اس کو عید کارڈ بھیجتے ہوئے لکھا: "سلف میڈ مین کے نام جو قطب مینار کی بلندیوں کو بھی پار کر سکتا ہے"

وہ لوگ اور بھی زیادہ خوش نصیب ہیں جو ایمان و اسلام کی بلندیوں کو پار کریں۔ آخرت کے دن خدا کے فرشتے ان کو مبارکباد دیتے ہوئے کہیں گے: پچھلی زندگی میں تم نے آج کے لئے عمل کیا تھا۔ اب اس کا بے حساب انعام لو اور خدا کی جنت میں ہمیشہ کے لئے داخل ہو جاؤ۔

موت کے دوسری طرف

جنت ہے یا جہنم

یہ ہے وہ سب سے بڑی بات

جس کو ہم جانیں

اور یہ ہے وہ سب سے بڑی بات

جو ہم دوسروں کو بتائیں

ہیوی ویٹ باکسنگ کے سابق چیمپین محمد علی (۳۶) کو لیون اسپنکس (۲۴) نے ۱۵ فروری ۱۹۷۸ کو ہرادیا۔ محمد علی کے لئے یہ بے حد غیر متوقع تھا۔ کیونکہ پچھلے ۱۴ سال کی مسلسل کامیابیوں نے محمد علی کے اندر اتنا زیادہ اعتماد پیدا کر دیا تھا کہ وہ کہنے لگے تھے:

I am king of the world

میں دنیا کا بادشاہ ہوں۔

تاہم یہ امکان ہے کہ یہ شکست محمد علی کی زندگی کے لئے ایک نیا موڑ پیدا کرنے کا باعث ہو۔ تین سال پہلے محمد علی نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ کھیل کی دنیا سے ریٹائر ہو جائیں گے تاکہ "اسلام کی خدمت کریں اور اپنی قوم کی تعلیمی اور اقتصادی ترقی کے لئے کام کریں"۔

جون ۱۹۷۵ میں محمد علی کی ملاقات حاجی بی کنی حسن (کالی کٹ) سے ہوئی تھی۔ اس وقت وہ کوالالمپور میں تھے۔ حاجی حسن کی باتوں سے محمد علی بے حد متاثر ہوئے۔

"حاجی حسن نے مجھ کو اسلام کے مختلف پہلوؤں سے آگاہ کیا"، محمد علی نے کہا" اس نے حیرت انگیز طور پر میرے نقطۂ نظر کو بدل دیا۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ مذہب کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت صرف کروں"۔

مگر اس کے بعد محمد علی اپنے ارادہ پر قائم نہ رہ سکے۔ انھوں نے کھیل کے میدان میں اپنی مشغولیت کو بدستور جاری رکھا۔ تاہم موجودہ شکست نے دوبارہ ان کے ذہن کو ماضی کی طرف موڑ دیا ہے۔ ۱۷ فروری کو لندن میں اخبار نویسوں سے بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میں دوبارہ اسپنکس سے لڑوں گا اور چیمپین کا ٹائٹل اس سے چھین لوں گا۔ تاہم اگر میں ایسا نہ کر سکا تو میں سمجھوں گا کہ اب وقت آگیا ہے کہ میں اپنی زندگی کا رخ مذہب کی طرف موڑ دوں۔"

Then I would give my life to the love of God and the holy Koran and become a full-time dedicated Muslim evangelist. 'What I really want to do is convert people,' Ali went on. 'In 50 years, everyone who reads this interview will be dead and going to heaven or hell. I want them to go to heaven.'

(*The Times of India*. 18.2.1978)

پھر میں اپنی زندگی کو خدا کی محبت اور مقدس قرآن کے لئے وقف کر دوں گا۔ میں ہمہ وقتی طور پر مسلم مبلغ بن جاؤں گا۔ درحقیقت میں جو کچھ چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ میں لوگوں کو مسلمان بناؤں۔ آج جو لوگ میرے اس انٹرویو کو پڑھ رہے ہیں، ان میں سے ہر ایک پچاس برس بعد مر چکا ہوگا اور اس کے بعد یا تو جنت میں اس کا ٹھکانا ہوگا یا جہنم میں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کو جنت میں پہنچانے کی کوشش کروں

(ٹائمس آف انڈیا ۱۸ فروری ۱۹۷۸)

"جو لوگ ان سطروں کو پڑھ رہے ہیں، ان میں سے ہر شخص پچاس برس بعد مرچکا ہوگا۔ اس کے بعد اس کا ٹھکانا یا تو جنت ہے یا جہنم۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کو جنت میں پہنچانے کی کوشش کروں" ——— کیسی عجیب ہے یہ بات۔ اور اس سے بھی زیادہ عجیب یہ ہے کہ یہ بات ایک کھلاڑی کی زبان سے آج کی دنیا کو سننے کو ملی ہے۔

مسلمان کی حیثیت سے ہماری اصل ذمہ داری یہ ہے کہ ہم دنیا کو آنے والے دن کی چیتاونی دیں۔ ہر دن لاکھوں انسان زمین پر مر رہے ہیں۔ مگر ان کو نہیں معلوم کہ وہ مر کر کہاں جارہے ہیں۔ پیغمبر کے ذریعہ اللہ نے اس راز کو کھولا ہے اور پیغمبر کے بعد ہمارے اوپر یہ ذمہ داری ڈالی ہے کہ ہم اس سب سے بڑی حقیقت سے اہل عالم کو باخبر کریں۔ تاکہ لوگ زندگی کے اگلے مرحلہ میں داخل ہونے سے پہلے اس کے مسائل سے واقف ہو جائیں اور ابھی سے اس کی تیاری شروع کر دیں۔

کیسی عجیب بات ہے کہ موجودہ زمانہ میں بے شمار مسلم تحریکیں ساری دنیا میں کام کر رہی ہیں۔ مگر کوئی ایسی تحریک نہیں جو فی الواقع اس لئے اٹھی ہو کہ دنیا والوں کو اس آنے والے ہولناک دن سے آگاہ کرے۔

یاد رکھئے اللہ کی نظر میں ہماری قیمت صرف اس وقت ہے جب کہ ہم اس کا مطلوبہ کام کر رہے ہوں۔ اگر ہم اس کام کو انجام نہ دیں تو اللہ کی نظر میں ہماری کوئی قیمت نہیں۔ خدا کو نہ ہماری کراماتوں کی ضرورت ہے اور نہ ہمارے انقلابی نعروں کی۔ اس کو نہ شاندار عمارتیں درکار ہیں اور نہ جگمگاتے ہوئے پنڈال۔ اس کو تو صرف یہ مطلوب ہے کہ اس کے بندے اس سے باخبر ہو جائیں کہ ان کا رب بالآخر ان سے کیا معاملہ کرنے والا ہے۔

آدمی دن کی روشنی میں یہ سمجھ کر اپنا نظام بناتا ہے کہ تھوڑی دیر میں شام آنے والی ہے اور رات کو اس یقین کے ساتھ سوتا ہے کہ چند گھنٹوں کے بعد ضرور صبح ہوگی۔ مگر آخرت کی دنیا کا کسی کو ہوش نہیں۔ کوئی نہیں جو موت کو اس طرح دیکھ رہا ہو جس طرح دن کا ایک مسافر آنے والی شام کو دیکھتا ہے۔ اور ایسے لوگ تو معدوم کے درجے میں ہیں جو موت کے دوسری طرف جہنم کو بھڑکتا ہوا دیکھ رہے ہوں۔ ہر آدمی اس طرح زندگی گزار رہا ہے جیسے موت بھی دوسروں کے لئے ہے اور جہنم بھی دوسروں کے لیے

پھر بھی ان کے بستر کانٹوں کے بستر نہیں بنے

مشہور پلے بیک سنگر مکیش چند ماتھر (۱۹۲۳—۱۹۷۶) امریکہ کے ایک سفر میں تھے کہ اچانک انتقال کر گئے۔ ان کے حالات جو اخباروں میں آئے ہیں، ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ اردو زبان بہت اچھی جانتے تھے۔ ابتداءً وہ ہندی سے ناواقف تھے۔ بعد کو اپنے پیشہ کی ضرورت کے تحت سخت محنت کرکے ہندی زبان سیکھی۔ کیونکہ انھوں نے اپنی زندگی میں جو دس ہزار گانے ریکارڈ کرائے ہیں، ان میں سے ایک تلسی داس کی رامائن بھی ہے جس کو انھوں نے تین سال میں مکمل کیا تھا۔

۱۹۴۷ء میں ہندستان آزاد ہوا تو برادران وطن میں اس طرح کے بے شمار لوگ تھے جنھوں نے اپنے اسکولوں میں اردو پڑھی تھی۔ پنجابیوں کا سیلاب یہاں پہنچا تو اس طرح کے لوگوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ آزادی کے انقلاب کے بعد تقریباً چوتھائی صدی تک اس ملک کی عام زبان اردو ہی تھی۔ ہم نہایت آسانی کے ساتھ اردو کے ذریعے ان سب لوگوں تک خدا کا وہ پیغام پہنچا سکتے تھے جس کے پہنچانے کی لازمی ذمہ داری ہمارے سپرد کی گئی ہے۔

اب یہ لوگ اٹھتے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ دوسری نسل لے رہی ہے۔ داعی اور مدعو کے درمیان لسانی بعد بڑھتا جا رہا ہے۔ جو کام پہلے ہم اپنی مادری زبان میں کر سکتے تھے، اس کے لئے اب ہم کو دوسری زبانیں سیکھنی ہیں اور ان کے اندر مہارت پیدا کرنا ہے۔ ایک کام جو پہلے آسان تھا، مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ اس کے باوجود لوگ راتوں کو اطمینان کی نیند سوتے ہیں، ان کے بستر ان کے لئے کانٹوں کے بستر نہیں بنتے۔ شاید انھیں یاد نہیں رہا کہ ان کو مرنا ہے اور مرنے کے بعد خدا کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ جب خدا پوچھے گا کہ تم نے ہمارا پیغام ہمارے بندوں تک کیوں نہ پہنچایا تو ہم کیا جواب دیں گے۔ اور اگر ہم کو "خدا کی گواہی چھپانے" کا مجرم قرار دے دیا جائے جس کے مجرم یہودی قرار دیئے گئے تھے تو ہمارے پاس اس سے بچنے کی کیا سبیل ہوگی۔

کائنات اپنی لامحدود وسعتوں اور امکانات کے ساتھ ہر شخص کو موقع دے رہی ہے کہ وہ جتنا چاہے آگے بڑھتا چلا جائے۔ مگر کوئی شخص اپنا مقصد غلط طریقے سے حاصل کرنا چاہے تو ساری کائنات اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتی ہے۔ غلط کام کو یہ دنیا اسی طرح اگل دیتی ہے جیسے ایک نفیس ذوق کا آدمی غلط خوراک کو۔

زندگی کے ابدی مسائل کے لئے اٹھئے نہ کہ وقتی مسائل کے لئے

گھر کے اندر کوئی سانپ دکھائی دے جائے تو اچانک تمام چھوٹے بڑے اس کے خلاف ڈنڈا لے کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ جبکہ خاموش تعمیری کام کے لئے یہی ہلچل ان میں پیدا نہیں ہوتی۔ ایسا ہی کچھ حال موجودہ زمانہ میں اسلامی تحریکوں کا رہا ہے۔ یہ تحریکیں کسی مثبت اسلامی فکر کی بنیاد پر نہیں اٹھیں بلکہ محض خارجی حالات کے اثر سے پیدا ہوتی رہیں —— مغربی قوموں کی یلغار، اسرائیل کی جارحیت، فرقہ وارانہ فسادات، اقتصادی اور سیاسی نقصانات وغیرہ، بس اسی قسم کی چیزیں تھیں جن کو دیکھ کر لوگ ان کے خلاف ٹوٹ پڑے اور اس کا نام انھوں نے اسلامی تحریک رکھ دیا۔

اگرچہ ان تحریکوں میں بہت سے اختلافات بھی نظر آتے ہیں۔ کوئی متشددانہ روپ میں دکھائی دے رہی ہے کوئی فلسفیانہ روپ میں۔ کوئی قرآن اور اسلام کا نعرہ بلند کر رہی ہے۔ کوئی قوم اور ملک کا۔ کوئی اقدام پر زور دے رہی ہے کوئی تحفظ پر۔ مگر ایک چیز سب میں مشترک ہے: ان کے اندر جس چیز نے حرکت و حرارت پیدا کی، وہ بیرونی دنیا کے اتفاقی حالات تھے نہ کہ اسلام کا ابدی پیغام۔

اسلام کی نظر میں انسان کا ابدی مسئلہ صرف ایک ہے اور مسلمان ہمیشہ اسی کے لئے اٹھتا ہے۔ وہ ہے آخرت کا مسئلہ۔ انسان کو اس کے خالق نے درختوں اور جانوروں کی مانند نہیں بنایا، بلکہ ایک ذمہ دار مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا ہے۔ دنیا کی زندگی ایک امتحان ہے، آدمی جب مرتا ہے تو وہ ختم نہیں ہوجاتا بلکہ اپنے کارنامہ زندگی کا حساب دینے کے لئے مالک کائنات کے یہاں پہنچا دیا جاتا ہے، اس کے بعد اس کی ابدی زندگی شروع ہوتی ہے جو یا تو جنت ہے یا جہنم۔

اسلامی تحریک اسی سنگین مسئلہ سے انسانوں کو آگاہ کرنے کے لئے اٹھتی ہے۔ مسلمان اپنا فکر دنیوی ہنگاموں کے اثر سے نہیں بناتا بلکہ زندگی کی ابدی حقیقتوں کی روشنی میں بناتا ہے۔ مسلمان خارجی مصائب پر صبر کرتا ہے تاکہ اصل مشن سے اس کی توجہ ہٹنے نہ پائے۔ وہ ہر حال میں اسی ایک کام پر اپنی طاقتوں کو خرچ کرتا ہے۔ کیونکہ اس کو یقین ہوتا ہے کہ ہر دوسرا دروازہ اسی ایک عمل سے اس کے لئے کھلے گا۔ وہ زندگی کے ابدی مسائل کے لئے عمل کرتا ہے نہ کہ وقتی مسائل کے لئے۔ جب ابدی زندگی کے سنگین تر مسائل سامنے کھڑے ہوں تو وقتی مسائل میں اپنی قوتوں کو صرف کرنا کسی نادان ہی کا کام ہوسکتا ہے۔

امت مسلمہ کا مشن یہ ہے کہ لوگوں کو آخرت سے باخبر کرے۔ اگر وہ ان سے دنیوی مسائل کے لئے لڑائی چھیڑ دے تو وہ فضا ہی ختم ہوجاتی ہے جس میں انھیں اخروی مسائل کی طرف متوجہ کیا جا سکے۔ سیاسی اور معاشی جھگڑوں کے ساتھ جو دعوتی کام کیا جائے وہ مسخرہ پن ہے نہ کہ دعوت۔

یہ وقت ہماری طرف دوڑا چلا آرہا ہے

ہماری دنیا میں جو سب سے بڑا حادثہ پیش آرہا ہے وہ یہ کہ یہاں بسنے والے انسانوں میں سے ہر روز تقریباً چھ لاکھ آدمی مرجاتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ موت کے فرشتے کل کے لئے جن چھ لاکھ آدمیوں کی فہرست تیار کر رہے ہیں، اس میں اس زمین پر چلنے والوں میں سے کس کس کا نام ہو۔ ہم میں سے ہر شخص کو موت آنی ہے۔ مگر ہم میں سے کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس کی موت کب آئے گی۔ اور جن لوگوں کے درمیان ہم زندگی گزار رہے ہیں، ان کے متعلق بھی کچھ نہیں معلوم کہ ان میں سے کون کل اٹھالیا جائے گا۔ اور کون کل کے بعد ہمارا پیغام سننے کے لئے باقی رہے گا۔

یہ آنے والا وقت ہم میں سے ہر شخص کی طرف دوڑا چلا آرہا ہے۔ ہر زندہ انسان اس خطرے میں مبتلا ہے کہ کل اس کی موت آجائے اور اس کے بعد نہ اس کے لئے سننے کا موقع باقی رہے اور نہ ہمارے لئے سنانے کا۔ یہ صورت حال بتارہی ہے کہ کرنے کا اصل کام کیا ہے۔ کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص آخرت کی فکر کرے اور دوسرے انسانوں کو زندگی کے اس حقیقی مسئلہ سے آگاہ کرے۔ دنیا کی آبادی اگر تین ارب ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کو تین ارب کام کرنے ہیں۔ کیوں کہ آج کا ہر انسان حقیقت سے غافل ہے۔ ہر آدمی اس بات کا حاجت مند ہے کہ اس کو حقیقت کا علم پہنچایا جائے۔

موت ہماری زندگی کا خاتمہ نہیں، وہ ہماری اصل زندگی کا آغاز ہے۔ موت دراصل کسی انسان کا وہ وقت ہے جب وہ کائنات کی عدالت میں آخری فیصلے کے لئے پیش کردیا جاتا ہے۔ موت سے پہلے آدمی کو بہت سے کام نظر آتے ہیں۔ مگر موت کے بعد آدمی کے سامنے صرف ایک ہی کام ہوگا —— یہ کہ خدا کے غضب سے وہ کس طرح بچے۔ جب آدمی کے پاس بہت زیادہ وقت ہو تو وہ بہت سے کام چھیڑ دیتا ہے۔ مگر جس کو وقت کے صرف چند لمحے حاصل ہوں وہ صرف وہی کام کرتا ہے جو انتہائی ضروری ہے۔ فیصلہ کن لمحات میں کوئی شخص غیر متعلق یا غیر اہم کام میں مصروف ہونے کی حماقت نہیں کرتا۔

"ہمیں کیا کرنا ہے" اس سوال کا جواب صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہمیں اپنے آپ کو اور دوسرے بندگانِ خدا کو آگ کے عذاب سے بچانا ہے۔ قرآن نے زندگی کا جو تصور دیا ہے، اس کے مطابق زندگی کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ آدمی آخرت میں خدا کی پکڑ سے بچ سکے۔ اس آنے والے دن کی سختیوں سے اپنے آپ کو بچانا اور دوسرے انسانوں کو اس سے بچنے کی تلقین کرنا، یہی مسلمان کا اصل کام ہے۔

اللہ نے ہم کو بھیجا ہے تاکہ ہم لوگوں کو اس کی طرف بلائیں

اسلامی غلبہ سے پہلے عراق قدیم ساسانی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ ۱۴ھ میں سعد بن ابی وقاص رضی کی سرکردگی میں لشکر اسلام عراق کی طرف بڑھا۔ دوسری طرف ساسانی فوج کا سردار رستم تھا۔ جنگ سے پہلے، مختلف اسلامی سفرا رستم کے دربار میں بات چیت کے لئے گئے۔ انھیں میں سے ایک ربعی بن عامر بھی تھے۔ رستم نے ربعی بن عامر سے پوچھا: تم کو کیا چیز یہاں لے آئی ہے۔ انھوں نے جواب میں جو تقریر کی، اس کا ایک فقرہ یہ تھا:

الله ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادة العباد الى عبادة الله ومن ضيق الدنيا الى سعتها ومن جور الاديان الى عدل الاسلام فارسلنا بدينه الى خلقه لندعوهم اليه (ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، جلد ۷، صفحہ ۳۸)

اللہ نے ہم کو بھیجا ہے کہ جس کو وہ چاہے، بندوں کی عبادت سے نکال کر خدا کی عبادت کی طرف لے آئیں۔ دنیا کی تنگی سے اس کی فراخی کی طرف اور مذاہب کے ظلم سے اسلام کے عدل کی طرف لے آئیں۔ پس اس نے ہم کو اپنے دین کے ساتھ اپنی مخلوق کی طرف بھیجا ہے تاکہ ہم لوگوں کو اس کی طرف بلائیں۔

ہم کس بات کی گواہی دے رہے ہیں

مغلوں کے مقابلہ میں جب مرہٹے اور سکھ ابھرے تو مسلمان ان کے خلاف بھڑک اٹھے۔ بعد کو جب انگریز اس ملک کے اوپر قابض ہو گئے تو ان کو ہٹانے کے لئے انھوں نے ساری دنیا میں ہنگامہ مچا دیا۔ کانگرس حکومت کے تحت ان کے ساتھ جبر و امتیاز کا سلوک ہوا تو اس کو انتخابی شکست دینے کے لئے ان کے درمیان زبردست طوفان اٹھ کھڑا ہوا —— یہ ہے مسلمانان ہند کی دو سو سالہ سیاست کا خلاصہ۔ اس پوری مدت میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خوف خدا اور فکر آخرت کو دعوتی مشن بنانے پر ان کے درمیان آگ بھڑکی ہو۔ آنے والے یوم الحساب کے مسئلہ سے لوگوں کو آگاہ کرنے کے لئے وہ بے تابانہ اٹھ کھڑے ہوئے ہوں۔ سیاسی مسائل اور اقتصادی مفادات کا معاملہ ہو تو فوراً ان کے اندر عمل کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔ آخرت کے مفادات اور جنت اور جہنم کے مسائل اس سے کہیں زیادہ بڑے ہیں۔ مگر ان کی خاطر سرگرم ہونا وہ نہیں جانتے۔

مسلمان کا معاملہ عام قوموں سے مختلف ہے۔ وہ "شہداء اللہ فی الارض" ہیں۔ ان کو آخرت کے مسائل کی گواہی دینے پر مامور کیا گیا تھا۔ مگر وہ لوگوں کے سامنے دنیا کے مسائل کی گواہی دینے میں سارا زور دکھا رہے ہیں۔ یہ الٹی گواہی نبی آخر الزماں کی امت کے لئے جرم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر مسلمان اپنی اس روش سے باز نہ آئے تو اندیشہ ہے کہ وہ دنیا میں بھی رسوا ہوں گے اور آخرت میں بھی۔ اس قسم کی سرگرمیاں خدا کے غضب کو بھڑکانے والی ہیں نہ کہ اس کی رحمت و نصرت کو کھینچنے والی۔

۲۰ را پریل ۱۹۷۷ کو ہندستان کا چھٹا عام الکشن ہوا۔ مسلمانوں نے جنتا پارٹی کے ساتھ مل کر کانگرس کے خلاف ووٹ دیئے۔ جب معلوم ہوا کہ کانگرس ہار گئی ہے تو مسلمانوں نے زبردست خوشیاں منائیں عین اس وقت ۲۵ اپریل ۱۹۷۷ کو یہ مضمون لکھا گیا۔ (الرسالہ مئی ۱۹۷۷ء)

لوگ خوش ہو رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کوئی بہت بڑا قلعہ فتح کر لیا ہے۔ گویا "فتح مبین" دوبارہ نئی شکل میں واپس لوٹ آئی ہے۔ مگر میرا دل غم سے پھٹا جا رہا ہے۔ شاید میرے جیسے آدمی کے لئے اب اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ وہ جنگل میں چلا جائے۔ جنگل کے درخت کسی خدا کے بندے کے لئے زیادہ بہتر ہم نشیں ہیں۔ چڑیوں کے نغموں میں انسانوں کے قہقہوں اور تقریروں سے زیادہ بامعنی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ایک انتہائی ہولناک قسم کی بھڑکتی ہوئی آگ ہر اس شخص کا انتظار کر رہی ہے جس کی موت اس حال میں آجائے کہ اس کا خدا اس سے راضی نہ ہو۔ یہی سارے انسانوں کا اصل مسئلہ ہے اور اسی سے تمام قوموں کو آگاہ کرنے کے لئے مسلمان، اس زمین پر خدا کے گواہ بنائے گئے ہیں۔ مسلمان کی فتح یہ ہے کہ وہ صحیح معنوں میں اس حقیقت کا گواہ بن کر لوگوں کے سامنے کھڑا ہو سکے۔ اس کی شکست یہ ہے کہ وہ اپنی اس ذمہ داری کو ادا کرنے میں ناکام رہے۔

مسلمان کے کسی عمل کی قیمت صرف اس وقت ہے جب کہ اس کے رب کے نزدیک، اس کا کوئی تعلق گواہی کے نازک کام سے ثابت ہو سکے۔ اس حیثیت سے دیکھئے تو یہ سارے ہنگامے نہ صرف غیر متعلق ہیں بلکہ وہ ہمارے لئے جرم کا درجہ رکھتے ہیں۔ مسلمان کو اس دنیا میں اس لئے کھڑا کیا گیا تھا کہ وہ لوگوں کو آخرت کے عذاب و ثواب کی خبر دیں۔ مگر یہ "انقلابی" تحریکوں سے وہ لوگوں کو صرف دنیا کے عذاب و ثواب کی خبر دے رہے ہیں۔ کتاب آسمانی کے حامل گروہ کے لئے اس قسم کی سرگرمیاں بلاشبہ جرم کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ لوگوں کو مسائل آخرت کی طرف متوجہ کرنے کے بجائے مسائل دنیا کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ یہ الٹی گواہی ہے جو قیامت کے دن ہمارے لئے بہت بڑا وبال بننے والی ہے۔ اس کی سنگینی ممکن ہے دنیا کی زندگی میں سمجھ میں نہ آئے۔ مگر اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ مرنے کے بعد وہ اس تلخ حقیقت کو اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ اگرچہ اس وقت کا دیکھنا ان کے کچھ کام نہ آئے گا۔

پھر دنیوی نتائج کے اعتبار سے بھی اس قسم کے ہنگاموں کی کوئی قیمت نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی سیاسی انقلاب خواہ وہ کتنا ہی کامیاب ہو، وہ صرف اسی کے حق میں مفید بنتا ہے جس نے انقلاب سے پہلے اس کے لئے تیاری کی ہو۔ یہ درس ہم کو دو سو برس پہلے مل چکا تھا۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ لوگ آج بھی اس سے اتنا ہی بے خبر ہیں جتنا کہ وہ کبھی پہلے تھے۔ آج بھی وہ صرف "انقلاب زندہ باد" جیسے نعروں کے لئے جوش و خروش دکھاتے ہیں۔ خود اپنی تعمیر و استحکام کے لئے ان کے اندر کوئی حرکت پیدا نہیں ہوتی جو کہ قوموں کے لئے کرنے کا اصل کام ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی سیاست دنیا اور آخرت کی بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

الرسالہ مئی ۱۹۷۷ء

ہزار سال کے بعد سب مضحکہ خیز نظر آئیں گے

ماوزے تنگ (۱۹۷۶ — ۱۸۹۳) تقریباً ۳۰ سال تک ... ۸ ملین آبادی کے ایک عظیم ملک کے مختار کل رہنے کے بعد بالآخر اس دنیا سے چلے گئے۔ ۱۹۶۵ء میں انھوں نے اڈگر اسنو (Edgar Snow) کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا:

A thousand years from now, all of us — even Marx, Engels and Lenin will look rather ridiculous

اب سے ہزار سال بعد ہم لوگ، حتی کہ مارکس انجلس اور لینن سب مضحکہ خیز دکھائی دیں گے۔

یہ بات اگرچہ انھوں نے سیاسی اور اقتصادی نظریات کے پہلو سے کہی تھی، مگر موت نے شاید صرف دس سال بعد انھیں بتادیا ہوگا کہ یہ بات ایک اور معنی میں بھی صحیح ہے — موت سے پہلے آدمی اپنی ترقی کے لئے یا اپنی شخصیت کو بنانے کے لئے جو کچھ کرتا ہے وہ موت کے بعد کی زندگی میں بالکل بے معنی ہوجاتا ہے۔ اس کو اچانک معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان چیزوں کی کوئی قیمت ہی نہیں جن کو سب سے زیادہ اہم سمجھا جاتا تھا اور ان کو حاصل کرنے کے لئے اپنی ساری زندگی لگادی تھی۔

"اے نابینا صاحب، سنبھل کر قدم بڑھائیے۔ آپ جس راستہ پر چل رہے ہیں، اس میں آپ کے آگے ایک کنواں ہے۔" یہ فقرہ گرامر کے اعتبار سے بالکل صحیح ہے۔ اخلاق اور تہذیب کے معیار پر بھی پورا اترتا ہے۔ مگر یہ بظاہر صحیح فقرہ اس وقت بالکل بے معنی ہوگا جب کہ نابینا شخص کنوئیں کے عین کنارے پہنچ گیا ہو اور اندیشہ ہو کہ اس نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو وہ کنوئیں کے اندر جا گرے گا۔ ایسے نازک موقع پر دوسری تمام باتیں حذف ہوجاتی ہیں اور کہنے والا چلا اٹھتا ہے: "کنواں، کنواں"

ایسا ہی کچھ معاملہ خدائی پیغام رسانی کا ہے۔ بظاہر زندگی کے بے شمار مسائل ہیں۔ مگر ہر آدمی سب سے پہلے جس مسئلہ سے دوچار ہے، وہ موت ہے۔ موت کسی شخص کی زندگی کا وہ فیصلہ کن لمحہ ہے جب کہ اس سے عمل کی مہلت چھین لی جاتی ہے اور وہ اچانک ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں دو ہی چیزیں ہیں — جنت یا جہنم۔

موت کے معاملہ کی نزاکت اس وقت بے حد بڑھ جاتی ہے جب یہ دیکھا جائے کہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ وہ کسی بھی وقت کسی بھی شخص کے لئے آسکتی ہے۔ ایسی حالت میں ایک بتانے والے کے پاس سب سے پہلی اور سب سے بڑی بات جو لوگوں کو بتانے کے لئے ہونی چاہئے، وہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو موت کے خطرہ سے آگاہ کرے۔

یوں آتی ہے آفت، اور آخرت کی آفت سب سے بڑی ہے

جب کسی کو مال واولاد کی نعمت ملتی ہے تو وہ در اصل خدا کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس کا شکرانہ یہ ہے کہ آدمی ان کو اپنی ذاتی چیز نہ سمجھے بلکہ دوسروں کو بھی اس میں حق دار سمجھے اور کمزور طبقات کے لئے بھی اس میں حصہ لگائے۔ خدا کی نعمت پانے کے بعد "مناع للخیر" بن جانا خدا کو سخت ناپسند ہے۔ اس قسم کا فعل نہ صرف آخرت میں آدمی کے لئے بوجھ بنے گا۔ بلکہ اندیشہ ہے کہ دنیا میں بھی ملی ہوئی نعمت اس سے چھین نہ لی جائے۔

قرآن میں ایک واقعہ بیان ہوا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

"ہم نے اسی طرح ان کو آزمائش میں ڈالا ہے جس طرح ہم نے باغ والوں کو آزمائش میں ڈالا تھا۔ جب انھوں نے قسم کھائی کہ اپنے باغ کا پھل صبح سویرے ضرور توڑیں گے۔ ان کو ایسا وثوق تھا کہ انھوں نے یہ نہ کہا کہ "اگر خدا چاہے"۔ پھر رات کو جبکہ وہ ابھی سو رہے تھے، تمھارے رب کی طرف سے ایک آفت اس باغ پر پھر گئی اور اس کا حال ایسا ہو گیا جیسے روندی ہوئی فصل۔ وہ صبح کو اٹھے اور ایک دوسرے کو پکارا، اگر تم کو پھل توڑنا ہے تو سویرے اپنے کھیت پر چلو۔ پھر وہ لوگ چل پڑے۔ آپس میں چپکے چپکے کہہ رہے تھے کہ آج تمھارے باغ میں کوئی محتاج نہ آنے پائے۔ وہ یہ سمجھ کر جا رہے تھے کہ وہ اس پر قادر ہیں۔ مگر جب وہاں پہنچے اور باغ کی حالت دیکھی تو کہنے لگے "یقیناً ہم راستہ بھول گئے ہیں"۔ پھر جب حقیقت معلوم ہوئی تو بولے "ہماری قسمت پھوٹ گئی"۔

ان میں جو بہتر آدمی تھا، وہ بولا۔ میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ تم خدا کی پاکی کیوں نہیں بولتے۔ انھوں نے جواب دیا۔ واقعی پاک ہے ہمارا رب بے شک ہم ہی قصور وار ہیں۔ پھر ایک دوسرے پر ملامت کرنے لگا، انھوں نے کہا، افسوس ہمارے حال پر، بلاشبہ ہم سرکش ہو گئے تھے، بعید نہیں کہ ہمارا رب اس کے بدلے ہمیں اس سے بہتر باغ عطا کرے۔ ہم اس کی طرف رجوع کرتے ہیں ___ یوں آتی ہے آفت اور آخرت کی آفت تو سب سے بڑی ہے۔ القلم ۳۳ - ۱۷

اسلام کی دعوت کیا ہے۔ آخرت کی چیتاونی۔ یہ قبر کے اُس پار کے معاملات سے قبر کے اِس پار والوں کو باخبر کرنا ہے۔ اسلام کا داعی موت اور زندگی کے درمیان کھڑا ہوتا ہے۔ اس کو موت سے پہلے مرجانا پڑتا ہے۔ تاکہ وہ دوسری طرف کی دنیا کو دیکھے اور مُردوں کے احوال سے زندوں کو مطلع کر سکے۔

جب لوگ اندھے اور بہرے ہوجائیں

قرآن میں ارشاد ہوا ہے "زمین و آسمان میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن سے لوگ گزرتے رہتے ہیں۔ مگر ان پر دھیان نہیں دیتے" (یوسف ۱۰۵) جو بات ہم انسانی زبان میں کہنا چاہتے ہیں، وہ کائنات میں زیادہ بہتر طور پر خدائی زبان میں نشر ہورہی ہے۔ پھر خدا کی آواز کو سننے کے لئے جب لوگوں کے کان بہرے ہوں تو انسان کی آواز سے وہ کیا اثر قبول کریں گے۔

کائنات کی وسعتوں اور عظمتوں سے زیادہ کون اس بات کا سبق دے سکتا ہے کہ انسان انتہائی طور پر ایک حقیر وجود ہے۔ عجز کے سوا کوئی اور رویہ اس کے لئے درست نہیں۔ اس کے باوجود انسان گھمنڈ کرتا ہے (اسراء ـ ۳۷)

پہاڑوں کے پتھریلے سینے سے بہہ نکلنے والے پانی کے دھارے سے بڑھ کر کون اس حقیقت کو بیان کرسکتا ہے کہ تم دوسروں کے لئے سیرابی اور تراوٹ کے دریا بن جاؤ۔ مگر انسان دوسروں کے لئے پتھر سے بھی زیادہ سخت ثابت ہوتا ہے (بقرہ ـ ۷۴)

زمین کے سینہ پر کھڑے ہوئے تناور درختوں سے زیادہ بہتر طور پر کون اس حقیقت کا اعلان کرسکتا ہے کہ اپنی اجتماعی زندگی کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرو تاکہ کوئی اس کو اکھاڑ نہ سکے۔ اس کے باوجود لوگ وقتی جھاڑ جھنکاڑ کی مانند اپنی تعمیرات کھڑی کرتے ہیں اور پھر شکایت کرتے ہیں کہ فلاں نے میرے درخت کو اکھاڑ لیا (ابراہیم ـ ۲۶)

اگر لوگوں کے پاس سننے والے کان اور دیکھنے والی آنکھ ہو تو کائنات ہر آن حق و صداقت کا اعلان کررہی ہے۔ اور جب خدائی اعلان کو سننے کے لئے لوگوں کے کان بہرے ہوجائیں۔ اور خدائی نشانیوں کو دیکھنے کے لئے لوگوں کی آنکھیں اندھی ہوچکی ہوں تو کوئی انسانی آواز انھیں کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ اس کے بعد تو لوگوں کو ہوش میں لانے کے لئے قیامت کی چنگھاڑ ہی کا انتظار کرنا چاہئے۔

یوں آتی ہے آفت، اور آخرت کی آفت سب سے بڑی ہے

نار جہنم

فہرست

دیباچہ	۳	آخری وقت	۲۶
زندگی کی حقیقت	۴	آنے والا دن	۲۷
ایمانی انقلاب	۵	موت کی یاد	۲۸
آزمائش	۶	کیسی عجیب غفلت	۲۹
جاننے کی بات	۷	آدمی اکیلا ہے	۳۰
اس دن	۸	آخرت کا طوفان	۳۱
صرف کریڈٹ	۹	یہ بے خبری	۳۲
کل کو جانو	۱۰	قیامت کی چنگھاڑ	۳۳
وقت سے پہلے	۱۱	فیصلہ کا دن	۳۴
آدمی اگر جانے	۱۲	ایک ہی موقع	۳۵
آہ یہ انسان	۱۳	اصلی ہار جیت	۳۶
بے ٹھکانا	۱۴	سب سے بڑا بھونچال	۳۷
خوش فہمیاں	۱۵	موت کے کنارے	۳۸
فرشتہ یا شیطان	۱۶	بہت جلد	۳۹
حادثہ سے بچیے	۱۷	خدا کی ترازو	۴۰
موت کا سبق	۱۸	موت کے بعد	۴۱
چھوٹی بڑائی	۱۹	عدالت میں پیشی	۴۲
سب سے بڑی مجبوری	۲۰	سب سے بڑا حادثہ	۴۳
زندگی کا سفر	۲۱	آخرت کا اعلان	۴۴
عجیب محرومی	۲۲	دعوتی ذمہ داری	۴۵
خدا کا سایہ	۲۳	اس وقت کیا ہوگا	۴۶
قبر کا دروازہ	۲۴	اسلام کی روح	۴۷
بولنا بند ہو جائے گا	۲۵	بھیڑ کے درمیان سناٹا	۴۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زندگی میں سب سے زیادہ طاقت ور جذبہ خوف کا جذبہ ہے۔ خوف کا جذبہ آدمی کے فکر وعمل کی صلاحیتوں کو جتنا جگاتا ہے کوئی دوسری چیز اس کو اتنا نہیں جگاتی۔

دنیا کی تمام سرگرمیاں کسی نہ کسی خوف کا نتیجہ ہوتی ہیں ——— معاشی بدحالی کا خوف، بے عزت ہونے کا خوف، برتر طاقت کا خوف، قوی دشمن کا خوف، یا اور کوئی خوف۔ ہر آدمی کسی دیکھے یا ان دیکھے خوف کے تحت عمل کرتا ہے، خواہ وہ اس کو شعوری طور پر جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔

مگر یہ تمام چھوٹے خوف ہیں۔ اصلی خوف جس کے تحت آدمی کو متحرک ہونا چاہئے وہ صرف ایک خدا کا خوف ہے۔ خدا ہی اس قابل ہے کہ اس سے ڈرا جائے اور اس سے تمام اندیشے وابستہ کئے جائیں۔ وہ تمام سرگرمیاں باطل ہیں جو کسی دوسرے خوف کی بنیاد پر ابھری ہوں۔ اور صرف وہی سرگرمی سچی سرگرمی ہے جو اللہ کے خوف کی بنیاد پر قائم ہو۔

خدا نے تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے۔ وہی ہر چیز کا مالک ہے۔ اسی کے پاس ہر قسم کے اختیارات ہیں۔ یہ واقعہ کافی ہے کہ آدمی صرف ایک خدا سے ڈرے۔ مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ اس سے زیادہ سخت بات یہ ہے کہ خدا نے انسان کو صرف پیدا کر کے چھوڑ نہیں دیا ہے۔ وہ ہر شخص کو بالآخر اپنے پاس بلائے گا۔ اس دن وہ ہر ایک سے اس کے قول وعمل کا حساب لے گا اور ہر ایک کو اس کے کارنامۂ زندگی کے مطابق اچھا یا برا بدلہ دے گا۔

واقعہ کا یہ پہلو زندگی کے معاملہ کو بے حد سنگین بنا دیتا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ آدمی اپنے آپ کو خدا کی ماتحتی میں دے دے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو وہ سخت ترین سزا سے کسی طرح بچ نہیں سکتا۔

کرنے کا کام کیا ہے، اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ اپنے آپ کو اور دوسرے بندگان خدا کو آگ کے عذاب سے بچانے کی کوشش کی جائے۔ خدا کے پیغمبروں نے زندگی کی جو حقیقت بتائی ہے اس کے مطابق زندگی کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ آدمی آخرت میں خدا کی پکڑ سے بچ سکے۔ اس آنے والے دن کی سختیوں سے اپنے آپ کو بچانا اور دوسرے انسانوں کو اس سے بچنے کی تلقین کرنا، یہی موجودہ دنیا میں مسلمانوں کا اصل کام ہے۔ اس کے سوا جو مطلوب چیزیں ہیں وہ سب اسی کام کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہیں۔

وحیدالدین

زندگی کی حقیقت

اس کائنات کا ایک خدا ہے۔ اسی نے تمام چیزوں کو بنایا ہے۔ وہ موت کے بعد تمام انسانوں کو جمع کر کے ان سے حساب لے گا اور پھر ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق یا تو ابدی جنت میں داخل کرے گا یا ابدی جہنم میں۔ یہ انجام ہر ایک کے سامنے آنے والا ہے خواہ وہ کمزور ہو یا طاقتور۔

یہ سنگین حقیقت کسی کے دل میں اتر جائے تو اس کی زندگی کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔ وہ ان تمام چیزوں کے بارے میں بے حد حساس ہو جاتا ہے جو آدمی کو جہنم کی آگ میں پہنچانے والی ہیں۔ اور ان تمام چیزوں کا بے حد مشتاق ہو جاتا ہے جو آدمی کو جنت کے باغوں کا مستحق بنانے والی ہیں۔ وہ ہر چیز سے زیادہ اللہ سے ڈرنے لگتا ہے اور ہر چیز سے زیادہ اللہ سے محبت کرنے لگتا ہے۔

خدا اور آخرت کے بارے میں اس کی بڑھی ہوئی حساسیت اس کو بندوں کے بارے میں بھی انتہائی محتاط اور ذمہ دار بنا دیتی ہے۔ ایک انسان سے برائی کرتے ہوئے اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ اپنے آپ کو جہنم کے غار میں گرا رہا ہے۔ بندوں کے ساتھ سرکشی کا سلوک کرتے ہوئے وہ اس طرح ڈرنے لگتا ہے جیسے کہ ہر آدمی اپنے ساتھ جہنم کے فرشتوں کی فوج لئے ہوئے ہے۔ اپنے صاحب معاملہ افراد سے بے انصافی کرنا اس کو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس نے اپنے آپ کو آگ کے گڑھے میں دھکیل دیا ہے۔ اب کوئی انسان اس کی نظر میں صرف ایک انسان نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ایک ایسا وجود ہوتا ہے جس کے پیچھے خود خدا اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ کھڑا ہوا ہو۔

ایمانی انقلاب

خدا سب سے بڑی طاقت ہے۔ اس کی پکڑ بہت بڑی ہے اور اس کی سزا بھی بہت بڑی ۔ایسے خدا پر ایمان لانا کوئی سادہ واقعہ نہیں۔ خدا پر ایمان جب کسی کی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو اس کی پوری شخصیت کو ہلا دیتا ہے۔

آدمی شیر کو کھلا ہوا دیکھتا ہے تو اس کی شخصیت ہل جاتی ہے۔اس سے کہیں زیادہ ہلچل آدمی کے اندر اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ وہ خدا کو پالے۔ خدا پر ایمان لانا خدا کو پانے کا اقرار کرنا ہے۔جب کوئی شخص حقیقی معنوں میں خدا کو پاتا ہے تو خدا اس کے لئے وہ حقیقت بن جاتا ہے جس پر وہ سب سے زیادہ یقین کرے، خدا اس کے لئے وہ طاقت بن جاتا ہے جس سے وہ سب سے زیادہ ڈرے۔

ایمان وہ ہے جو آدمی کی زندگی میں بھونچال بن کر داخل ہو۔جو قیامت کے زلزلہ سے پہلے آدمی کے لئے زلزلہ بن جائے۔

اس قسم کا ایمان جب کسی کو ملتا ہے تو اس کے پورے وجود پر خدا کا ڈر چھا جاتا ہے۔ اس کے لئے ہر معاملہ خدا کا معاملہ بن جاتا ہے۔کسی چھوٹے کو بے عزت کرنے سے وہ اس طرح کانپتا ہے گویا وہ مالک کائنات کے سفیر کو بے عزت کر رہا ہے۔ کسی بڑے کی خوشامد کرتے ہوئے اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ خدا کی غیرت کو چیلنج کر رہا ہے۔حق واضح ہونے کے بعد اس کو نظر انداز کرنا اس کے نزدیک ایسا بن جاتا ہے جیسے کوئی شخص جنت اور جہنم کو اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھے، پھر بھی جنت کے باغوں کو چھوڑ کر جہنم کی آگ میں کود پڑے۔

آزمائش

آدمی کا معاملہ جب کسی سے پڑتا ہے تو اس کو وہ بس ایک انسان کا معاملہ سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فوراً سرکشی اور بے انصافی پر اتر آتا ہے۔ اگر وہ جانے کہ ہر معاملہ خدا کا معاملہ ہے تو وہ کبھی سرکش نہ بنے، وہ کبھی بے انصافی کا طریقہ اختیار نہ کرے۔

دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب خدا کی اجازت اور اس کے منصوبہ کے تحت ہو رہا ہے۔ اس کے پیچھے خدا کی حکمتِ امتحان کام کر رہی ہے۔ ہر واقعہ جو پیش آتا ہے وہ اس لئے پیش آتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے متعلق افراد کو آزمایا جائے۔ حالات میں ڈال کر ہر ایک کو دیکھا جائے کہ کون کیا تھا اور کون کیا نہیں تھا۔

کسی واقعہ کے دوران یہ دیکھنا مقصود ہوتا ہے کہ آدمی اپنے پڑوسی اور اپنے صاحب معاملہ کو ستاتا ہے یا انصاف کے مطابق اس کا حق ادا کرتا ہے۔ کوئی واقعہ اس لئے پیش آتا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ لوگ اپنے کو جس ترازو سے تولتے ہیں اسی سے دوسرے کو بھی تول رہے ہیں یا اپنے اور دوسرے کے لئے انھوں نے الگ الگ باٹ بنا رکھے ہیں۔ کسی واقعہ کا مقصد یہ جانچنا ہوتا ہے کہ کون آدمی مفاد اور مصلحت کو اہمیت دیتا ہے اور وہ کون ہے جو مفاد اور مصلحت کو نظرانداز کر کے سچائی کی طرف دوڑ پڑتا ہے۔

یہی وہ مواقع ہیں جو آدمی کے ابدی مستقبل کا فیصلہ کرتے ہیں۔ ان مواقع پر درست رویہ اختیار کر کے ایک شخص جنت کا مستحق بن جاتا ہے اور دوسرا شخص غلط رویہ اختیار کر کے اپنے کو جہنم میں گرا لیتا ہے۔

جاننے کی بات

موجودہ دنیا میں آدمی اپنے کو آزاد سمجھ رہا ہے۔ وہ نڈر ہو کر جو چاہے بولتا ہے اور جو چاہے کرتا ہے۔ اگر کسی کو کچھ مال ہاتھ آگیا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ میرا مستقبل محفوظ ہے۔ کسی کو کوئی اقتدار حاصل ہے تو وہ اپنے اقتدار کو اس طرح استعمال کرتا ہے جیسے اس کا اقتدار کبھی چھننے والا نہیں۔ ہر آدمی پُر اعتماد چہرہ لئے ہوئے ہے۔ ہر آدمی ہنستے ہوئے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہاں تک کہ اچانک موت کا بگل بج جاتا ہے۔ خدا کے فرشتے آتے ہیں اور اس کو موجودہ دنیا سے نکال کر ایک مجبور انسان کی طرح اگلی دنیا میں پہنچا دیتے ہیں۔

یہی ہر آدمی کا معاملہ ہے۔ جب یہ بھیانک لمحہ آتا ہے تو آدمی اپنے اندازہ کے بالکل خلاف صورت حال کو دیکھ کر دہشت زدہ ہو جاتا ہے۔ اچانک اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ سب کچھ محض دھوکا تھا جس کو اس نے اپنی غفلت سے سب سے بڑی حقیقت سمجھ لیا تھا۔

وہ کہہ اٹھتا ہے کہ میں نے اپنے کو آزاد سمجھا تھا مگر میں تو بالکل بے اختیار نکلا۔ میں اپنے کو مال و جائداد والا پا رہا تھا مگر میں تو بالکل خالی ہاتھ تھا۔ میرا خیال تھا کہ میرے پاس طاقت ہے مگر میں تو خدا کی اس دنیا میں مکھی اور مچھر سے بھی زیادہ بے زور تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ میرے ساتھ بہت سے لوگ ہیں مگر یہاں تو کوئی ایک بھی میرا ساتھی اور مددگار نہیں۔

آہ وہ انسان جو اسی بات کو نہیں جانتا جس کو اسے سب سے زیادہ جاننا چاہئے۔

اُس دن

آج کی دنیا میں آدمی کھاتا پیتا ہے۔ گھر بناتا ہے۔ عہدے اور ترقیاں حاصل کرتا ہے۔ وہ جس بات کو چاہتا ہے اسے مانتا ہے اور جس بات کو چاہتا ہے اسے رد کر دیتا ہے۔ وہ آزاد ہے کہ جو چاہے بولے، وہ آزاد ہے کہ جو چاہے کرے اور جس رخ پر چاہے اپنی زندگی کا سفر شروع کر دے۔

یہ صورت حال آدمی کو دھوکے میں ڈالے ہوئے ہے۔ وہ اپنی موجودہ حیثیت کو مستقل حیثیت سمجھ بیٹھا ہے۔ حالانکہ اس کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ حالت امتحان میں ہے اور یہاں جو کچھ اسے ملا ہوا ہے وہ صرف وقتی طور پر ملا ہوا ہے۔ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب یہ تمام حیثیتیں اور سامان اس سے چھن جائے گا۔ حتیٰ کہ لباس بھی اتار لیا جائے گا جو آدمی کے اثاثہ کی آخری چیز ہوتا ہے۔ وہ اچانک اپنے آپ کو اس حال میں پائے گا کہ وہ ایک بے زور مجرم کی طرح مالک کائنات کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔

اس دن ساری اونچ نیچ مٹ جائے گی۔ خوف و دہشت سے لوگوں کی زبانیں بند ہو چکی ہوں گی۔ آدمی کے اپنے وجود کے سوا ہر چیز اس کا ساتھ چھوڑ دے گی۔ کسی کے لئے یہ موقع نہ ہوگا کہ بے انصافی کر کے بھی کامیاب ہو اور حق کو نظر انداز کر کے بھی حق کا ٹھیکیدار بنا رہے۔

اس آنے والے دن کو جو شخص آج دیکھ لے وہی کامیاب ہے۔ جو شخص اسے کل دیکھے گا اُس کے لئے اس کے سوا کوئی انجام نہیں کہ وہ ہمیشہ کے لئے رسوا ہو کر آگ کا عذاب سہتا رہے۔

صرف کریڈٹ

اس دنیا میں کسی آدمی کو کوئی ذاتی طاقت حاصل نہیں۔ کوئی شخص نہ کسی کو کچھ دیتا، نہ کوئی شخص کسی سے کچھ چھینتا۔ ہر واقعہ جو اس زمین پر ہوتا ہے وہ خدا کی اجازت سے ہوتا ہے۔ انسان کی ساری حیثیت یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں امتحان کے لئے ہے۔ اور یہ امتحان بھی صرف ارادہ کی حد تک ہے۔ ارادہ کے سوا انسان کے بس میں اور کچھ نہیں۔

بظاہر سب کچھ اسباب کے اعتبار سے ہو رہا ہے۔ مگر اسباب کی حیثیت ظاہری پردہ سے زیادہ نہیں۔ اس دنیا میں کسی واقعہ کو ظہور میں لانے کے لئے اسباب و علل کی اتنی زیادہ کڑیاں درکار ہیں جن کی فراہمی کسی انسان کے بس میں نہیں۔ یہ حقیقۃً خدا ہے جو اپنے فرشتوں کے ذریعہ یہ تمام کڑیاں فراہم کرتا ہے۔

جو واقعات ہوتے ہیں وہ اس لئے آدمی کے سامنے لائے جاتے ہیں کہ اس کی جانچ ہو، تاکہ اس کا خدا یہ دیکھے کہ اس کا بندہ مختلف رویوں میں سے کس رویہ کا اپنے لئے انتخاب کرتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک صورت حال میں ڈال کر دیکھا جاتا ہے کہ آدمی نے اپنی زبان حق کے لئے کھولی یا ناحق کے لئے۔ کبھی ایک واقعہ کے درمیان یہ دیکھنا مقصود ہوتا ہے کہ آدمی انصاف کا رویہ اختیار کرتا ہے یا بے انصافی کا۔ کبھی ایک واقعہ کے ذریعہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ آدمی اپنے عہد پر قائم رہتا ہے یا عہد سے پھر جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ واقعات کا اہتمام خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ انسان تو صرف اچھا یا برا کریڈٹ لے رہا ہے۔

کل کو جانو

یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی کو کسی نہ کسی دائرہ میں اختیار و اقتدار دیا جاتا ہے۔ کسی کے اختیار کا دائرہ بڑا ہے اور کسی کے اختیار کا دائرہ چھوٹا۔ مگر عجیب بات ہے کہ ہر آدمی اپنے دائرۂ اختیار میں وہی کچھ بن جاتا ہے جو دوسرا شخص اپنے دائرۂ اختیار میں بنا ہوا ہے۔ ظاہر کے اعتبار سے لوگوں میں خواہ کتنا ہی فرق ہو، حقیقت کے اعتبار سے ان میں کوئی فرق نہیں۔

ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ دوسرے کی کاٹ میں لگا ہوا ہے۔ ہر شخص دوسرے کی نفی پر اپنا اثبات کرنا چاہتا ہے۔ ہر شخص اپنی حیثیت کا غلط اندازہ کر کے یہ سمجھتا ہے کہ اگر اس نے دوسرے کو اس کے مقام سے ہٹا دیا تو اس کا خالی مقام اسے مل جائے گا۔ وہ بھول جاتا ہے کہ جو چیز اس کا انتظار کر رہی ہے وہ کسی کا خالی مقام نہیں بلکہ خود اس کی اپنی قبر ہے۔ دوسرے شخص کو قبر میں پہنچانے والا خود اپنی قبر میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ دوسرے کی بربادی کا خواب دیکھنے والا بالآخر اپنے آپ کو خود اپنی بربادی کے کنارے کھڑا ہوا پاتا ہے۔

ہر آدمی جو آج اپنے کو کامیاب سمجھتا ہے وہ کل اپنے کو ناکام دیکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہر روز ہو رہا ہے۔ مگر کوئی شخص آج کے بعد آنے والے کل کو نہیں دیکھتا۔ ہر شخص اپنے آج کو جاننے کا ماہر ہے، کسی کو اپنے آنے والے کل کی خبر نہیں۔

اپنے آج کو جاننے والو، اپنے کل کو جانو۔ کیونکہ آخر کار تم جس چیز سے دوچار ہونے والے ہو وہ تمہارا کل ہے نہ کہ تمہارا آج۔

وقت سے پہلے

یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ یہاں ہر آدمی اپنا اپنا امتحان دے رہا ہے، وہ چاہے تو درست عمل کر کے امتحان میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اور اگر وہ غافل رہے تو ناکامی کے انجام سے دوچار ہونے کے لئے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ناکامی کا انجام اپنے آپ ہر آدمی کی طرف دوڑا چلا آرہا ہے، خواہ وہ اس کو کتنا ہی زیادہ ناپسند کرتا ہو۔

اس معاملہ میں آدمی کی مثال برف بیچنے والے دکان دار کی سی ہے۔ برف ہر آن پگھلتا رہتا ہے۔ اس لئے برف کے دکان دار کی کامیابی اس میں ہے کہ وہ برف کے پگھلنے سے پہلے اپنی برف کو قیمت میں تبدیل کرلے۔ اگر اس نے دیر کی تو آخر کار اس کے پاس کچھ نہ ہوگا جس سے وہ اپنی تجارت کر سکے۔ وہ اپنا اصل بھی کھو چکا ہوگا اور اسی کے ساتھ اپنا نفع بھی۔

یہی معاملہ انسانی زندگی کا بھی ہے۔ انسان عمر گزرنے کے ساتھ تیزی سے ایک سخت انجام کی طرف چلا جا رہا ہے۔ اس انجام کا آنا یقینی ہے۔ اس سے بچنے کی صورت صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ ـــــ اس وقت کے آنے سے پہلے اپنی زندگی کا صحیح استعمال تلاش کرلیا جائے۔

برف کا کامیاب تاجر وہ ہے جو برف کے پگھلنے سے پہلے اپنی برف کو بیچ ڈالے۔ اسی طرح کامیاب انسان وہ ہے جو اپنی عمر کے تمام ہونے سے پہلے اپنی عمر کو صحیح کاموں میں استعمال کرلے۔ جو آخرت کا مرحلہ سامنے آنے سے پہلے آخرت کے لئے تیاری کرلے۔

آدمی اگر جانے

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں جس طرح ہدایت کے مواقع رکھے گئے ہیں اسی طرح گمراہی کے راستے بھی کھلے ہوئے ہیں۔ ہر آدمی آزاد ہے کہ وہ جس رخ پر چاہے چلے۔ وہ مواقع کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔ اپنی قوتوں کو جس کام میں چاہے لگائے۔ مگر یہ سب محض وقتی ہے نہ کہ مستقل۔

یہاں جو شخص حق کی آواز کو رد کرنا چاہے اس کو باسانی ایسے خوبصورت الفاظ مل جاتے ہیں جن کو بول کر وہ اپنے آپ کو جھوٹے یقین میں مبتلا کرلے۔ یہاں دین کی سچی دعوت کو نظر انداز کرکے بھی آدمی ایسے در و دیوار پالیتا ہے جس کے سایہ میں وہ پناہ لے سکے۔ یہاں خدا کی پکار کی طرف سے اپنے کانوں کو بند کرکے بھی ایسی چٹانیں مل جاتی ہیں جو کسی کو یہ تسکین دے سکیں کہ اس نے اپنے لئے ایک مضبوط سہارا دریافت کرلیا۔ مگر جب پردہ ہٹے گا تو یہ چیزیں اتنی بے معنی ثابت ہوں گی جیسے ان کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

جب قیامت کی چنگھاڑ بلند ہوگی اور کائنات کا مالک اپنے جلال کے ساتھ ظاہر ہوگا تو آدمی اتنا بے بس ہوگا کہ اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوگا کہ ان تمام باتوں کو مان لے جن کو ماننے کے لئے وہ پہلے تیار نہ ہوتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ آدمی اگر آنے والے دن کی ہولناکی کو جانے تو اس کی چلتی ہوئی زبان بند ہوجائے جس کے الفاظ کا ذخیرہ آج کسی طرح ختم ہونے والا نظر نہیں آتا۔ اس کے اٹھے ہوئے ہاتھ رک جائیں جس کو اخلاق اور انسانیت کا ہر وعظ روکنے میں ناکام ثابت ہو رہا ہے۔

آہ یہ انسان

آج ہر آدمی بے ہوش نظر آتا ہے۔ ہر آدمی اپنے آپ میں اس طرح گم ہے جیسے اس کے اوپر کوئی اور طاقت نہیں۔ حالانکہ موت ہر روز بتارہی ہے کہ آدمی ایک ایسی حقیقت سے دوچار ہے جس کے مقابلہ میں کسی کا کچھ بس نہیں چلتا۔ انسان کتنا زیادہ مجبور ہے مگر وہ اپنے آپ کو کتنا زیادہ با اختیار سمجھتا ہے۔

آدمی وعدہ کرتا ہے مگر اس کے بعد اس کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کے اوپر کسی کا ایک حق آتا ہے مگر وہ اس کو ادا نہیں کرتا۔ آدمی کے سامنے ایک سچائی آتی ہے مگر وہ اس کا اعتراف نہیں کرتا۔ وہ دوسرے کے اوپر یک طرفہ الزام لگاتا ہے اور اپنی غلطی ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ چھوٹوں کو نظر انداز کر کے بڑوں کا استقبال کرتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کو اصول کے تابع کرنے کے بجائے خواہشات کے تابع کرتا ہے۔ وہ زور آور سے دبتا ہے اور بے زور کو ستاتا ہے۔ وہ خدا کو مرکز توجہ بنانے کے بجائے خود اپنی ذات کو مرکز توجہ بناتا ہے۔ وہ جنت کے اشتیاق اور جہنم کے اندیشہ میں جینے کے بجائے دنیا کے اشتیاق اور دنیا کے اندیشوں میں جیتا ہے۔

آدمی یہ سب کچھ کرتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ اپنی اس روش سے وہ اپنے آپ کو جہنم کے قریب لے جارہا ہے اور اپنے آپ کو جنت کے لئے نااہل ثابت کر رہا ہے۔ آہ وہ انسان جس کو اسی چیز کا شوق نہیں جس کا اسے سب سے زیادہ شوق کرنا چاہئے۔ آہ وہ انسان جو اسی چیز سے سب سے زیادہ بے خوف ہے جس سے اسے سب سے زیادہ خوف کرنے کی ضرورت ہے۔

بے ٹھکانا

کسی آدمی کے جہنمی ہونے کے لئے یہ بات کافی ہے کہ وہ حق کے سامنے نہ دبے اور طاقت کے سامنے دب جائے۔ شرافت اور معقولیت اس کو متاثر نہ کر سکے مگر جب ڈنڈے کا خطرہ ہو تو فوراً اپنا سر جھکا دے۔

خدا آخرت میں اپنی ذات کمال کے ساتھ ظاہر ہوگا۔ مگر دنیا میں وہ دلیل کے روپ میں لوگوں کے سامنے آتا ہے۔ دنیا میں جب ایک شخص سچی دلیل کے آگے جھکتا ہے تو دراصل وہ خدا کے آگے جھکتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے آخرت میں جنت کے باغات ہیں۔ اس کے برعکس جب ایک شخص سچی دلیل کے آگے نہیں جھکتا تو وہ دراصل خدا کے آگے نہیں جھکتا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو باغی اور سرکش قرار دے کر جہنم کی آگ میں ڈالے جائیں گے۔

کمزور آدمی کی زبان سے سچی بات سن کر جب ایک شخص اس کو نہیں مانتا تو وہ مطمئن رہتا ہے کہ میرا اس سے کچھ بگڑنے والا نہیں۔ وہ بھول جاتا ہے کہ اس نے کسی کمزور کی بات کا انکار نہیں کیا ہے بلکہ خدا کی بات کا انکار کیا ہے، یہ خود خدا کو نظر انداز کرنا ہے اور جو شخص خدا کو نظر انداز کر دے اس کو ساری کائنات نظر انداز کر دیتی ہے۔ اس کے بعد اس زمین و آسمان کے اندر اس کا کوئی ٹھکانا نہیں۔

وہ دن آنے والا ہے جب دلیل والے بے دلیل ہو جائیں گے۔ جب ٹھکانا رکھنے والے بالکل بے ٹھکانا نظر آئیں گے۔ جب مضبوط سہارے والے لوگ ایک تنکا بھی نہ پائیں گے جس کے سہارے وہ اپنے آپ کو کھڑا کر سکیں

خوش فہمیاں

آدمی دوسروں کو دکھ پہنچا کر اپنی خوشیوں کا محل تعمیر کرنے میں لگا ہوا ہے۔ وہ اپنے پڑوسیوں کو ستاتا ہے اور دور کے لوگوں میں خوش نام ہونے کی تدبیریں کر رہا ہے۔ وہ اپنے ذاتی معاملات میں بے انصافی کرکے باہر کی دنیا میں انصاف کا علم بردار بنا ہوا ہے۔ وہ اپنے خلاف ایک لفظ سننے کے لئے تیار نہیں مگر دوسروں کے خلاف سب کچھ کہنے اور کرنے کے لئے وہ اپنے آپ کو خدائی فوجدار سمجھتا ہے۔ اسے اپنی غلطیوں کی خبر نہیں مگر وہ دوسروں کی غلطیاں جاننے کا ماہر بنا ہوا ہے۔

مگر خدا کا انعام ان لوگوں کو ملتا ہے جو اپنے متعلقین کے حقوق ادا کریں۔ جو اپنے پڑوسیوں کو اپنے شر سے بچائیں۔ جو اپنے اہل معاملہ کے ساتھ انصاف کریں۔ جو خود پسندی کے بجائے خدا پسندی کو اپنی زندگی کا طریقہ بنائیں۔ جو لوگوں سے حق اور عدل کی بنیاد پر معاملہ کریں نہ کہ اکڑ اور خود غرضی کی بنیاد پر۔ جو حق کے آگے جھک جائیں چاہے وہ ان کے خلاف ہو۔ جو اپنی انا کو خدا کے حوالے کر دیں اور خدا کی دنیا میں بے انا بن کر رہنے پر راضی ہو جائیں۔

لوگ جہنمی انگاروں میں کودتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ خوبصورت پھولوں سے کھیل رہے ہیں۔ وہ دوزخ کے راستوں میں دوڑ رہے ہیں اور خوش ہیں کہ بہت جلد وہ جنت کے باغوں میں پہنچنے والے ہیں۔ آہ وہ قافلہ جس کے پاس جھوٹی خوش فہمیوں کے سوا اور کوئی سرمایہ نہیں۔ آہ وہ لوگ جو خدا کی دنیا میں اپنے لئے ایک ایسی دنیا بنانا چاہتے ہیں جس کی خدا نے اجازت نہیں دی۔

فرشتہ یا شیطان

خدا کے وفادار بندوں کے مشیر فرشتے ہوتے ہیں اور خدا کے باغی بندوں کے مشیر شیطان۔ اپنی بول چال میں اور زندگی کے معاملات میں کوئی آدمی جو انداز اختیار کرتا ہے اسی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کون آدمی کس کو اپنا مشیر بنائے ہوئے ہے۔

جو آدمی اختلاف کے وقت تواضع اختیار کرے اور جب کوئی حق اس کے سامنے پیش کیا جائے تو حق کے سامنے جھک جائے وہ فرشتوں کا ساتھی ہے۔ ایسا آدمی اپنے عمل سے اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ اس کو یہ توفیق ملی ہے کہ خدا کے فرشتے اس کے مشیر بنیں۔ کیونکہ یہ فرشتوں کی صفت ہے کہ وہ گھمنڈ نہیں کرتے۔ وہ کسی جھجھک کے بغیر حق کا فوراً اعتراف کر لیتے ہیں۔

اس کے برعکس وہ لوگ جو اختلاف کے وقت ظلم اور بے انصافی پر اتر آئیں اور متکبرانہ طریقہ اختیار کریں وہ اپنے عمل سے یہ ثابت کر رہے ہیں کہ وہ شیطان کے ساتھی ہیں۔ انھوں نے شیطان کو اپنا مشیر بنا رکھا ہے۔ کیوں کہ قرآن میں گھمنڈ اور سرکشی کو شیطان کی صفت بتایا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ موت اور آخرت کے معاملات سے بے خبری ہے جس نے لوگوں کو سرکشی اور بے انصافی کے لئے جری بنا دیا ہے۔ اگر لوگوں کو معلوم ہو کہ کیسا ہیبت ناک دن ان کی طرف دوڑا چلا آرہا ہے تو ان کے چلتے ہوئے قدم رک جائیں اور ان کے پاس بولنے کے لئے الفاظ نہ رہیں۔ جھوٹی تاویلیں کرنے کے بجائے وہ فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کریں۔

جب خدا ظاہر ہوگا

خدا کو جب ایک شخص پاتا ہے تو ٹھیک اسی وقت وہ اس حقیقت کو بھی پالیتا ہے کہ خدا نے اس کو اور اس کائنات کو عبث نہیں بنایا ہے۔ جس کائنات کا بنانے اور چلانے والا ایک طاقت ور اور باخبر خدا ہو وہاں یہ ناممکن ہے کہ اتنا بڑا کائناتی کارخانہ یوں ہی خاموش کھڑا رہے اور کبھی اس کی معنویت ظاہر نہ ہو۔

اس طرح آدمی کا ایمان اس کو اس یقین تک پہنچاتا ہے کہ ضرور ہے کہ ایک دن ایسا آئے جب کہ وہ خدا لوگوں کے سامنے ظاہر ہوجائے جو کائنات کے تمام واقعات کے پیچھے کام کر رہا ہے۔ پھر یہی یقین اس کو یہ بھی بتاتا ہے کہ کائنات کے خالق و مالک کا ظہور اس طرح کا غیر متعلق ظہور نہیں ہوگا جیسے تاریک رات کے بعد روشن سورج نکلتا ہے۔ یہ ایک باشعور اور طاقت ور مالک کا ظہور ہوگا۔ خداوند کائنات کا ظہور کائنات کے لئے عدالت کے ہم معنی بن جائے گا۔ خدا کے ظاہر ہوتے ہی اس کے تمام سرکش اور خود پرست بندے خدا کی دنیا میں بالکل بے قیمت ہوجائیں گے۔ وہ اس دن مکھی اور مچھر سے بھی زیادہ حقیر نہ دکھائی دیں گے۔ دوسری طرف اس کے خدا پرست اور وفادار بندے اچانک سرفرازی کا مقام حاصل کر لیں گے۔

خدا کا غیب میں ہونا خدا کے سرکش بندوں کو اچھل کود کے مواقع دئے ہوئے ہے۔ خدا کا ظاہر ہونا خدا کے وفادار بندوں کے لئے سرفرازی کا دن بن جائے گا۔ اس کے بعد ایک نئی، زیادہ بہتر اور مکمل دنیا شروع ہوگی جہاں سرکش لوگ ابدی طور پر جہنم میں ڈال دئے جائیں گے اور وفادار لوگ ابدی طور پر خوشیوں اور لذتوں کی جنت میں زندگی گزاریں گے۔

موت کا سبق

آدمی زندگی چاہتا ہے مگر بہت جلد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں صرف موت اس کا استقبال کرنے کے لئے کھڑی ہوئی ہے۔ عین اس وقت جب کہ وہ اپنی ترقی کے عروج پر پہنچ چکا ہوتا ہے، موت اس کے اور اس کی کامیابیوں کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔ آدمی مجبور ہوتا ہے کہ ایک ایسی دنیا میں داخل ہو جائے جس کے لئے اس نے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔

انسان اپنی عظمت کا محل تعمیر کرتا ہے مگر موت کا طوفان اس کو تنکوں کی طرح اڑا کر یہ سبق دیتا ہے کہ انسان کو اس دنیا میں کوئی قدرت حاصل نہیں۔ انسان کہتا ہے کہ میں اپنا مالک ہوں مگر تقدیر اس کو کچل کر اسے بتاتی ہے کہ تیرا مالک کوئی اور ہے۔ انسان موجودہ دنیا میں اپنی آرزوؤں کا باغ اگانا چاہتا ہے مگر موت اس کے منصوبہ کو برباد کر کے یہ سبق دیتی ہے کہ اپنے لئے دوسری دنیا تلاش کرو کیونکہ موجودہ دنیا میں تمھاری آرزوؤں کی تکمیل ممکن نہیں۔

موت ہماری زندگی کی سب سے بڑی معلم ہے۔ موت ہر آدمی کو ایک ایسے سوال کے بارے میں سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے جس کے جواب میں زندگی کا تمام راز چھپا ہوا ہے۔ موت ہم کو بتاتی ہے کہ ہم اپنے مالک آپ نہیں ہیں۔ موت ہم کو بتاتی ہے کہ موجودہ دنیا میں ہماری زندگی محض عارضی زندگی ہے۔ موت ہم کو بتاتی ہے کہ موجودہ دنیا وہ مقام نہیں جہاں ہم اپنی تمناؤں کو حاصل کر سکیں۔ موت ہم کو جینا سکھاتی ہے۔ موت ہم کو بتاتی ہے کہ حقیقی کامیابی کو حاصل کرنے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے۔

جھوٹی بڑائی

کسی شخص نے اپنی دنیا کی زندگی کو کامیاب بنالیا ہو تو اکثر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس کی آخرت بھی ضرور کامیاب ہوگی۔ حالانکہ دونوں میں کوئی لازمی تعلق نہیں۔

دنیا کی بڑائی بڑائی نہیں۔ وہ صرف امتحان کی غرض سے ہے۔ کسی کو اچھے حالات ملیں یا کسی کو برے حالات، دونوں امتحان کے لئے ہیں۔ یہ آدمی کی جانچ کے پرچے ہیں نہ کہ اس کے عمل کا انجام۔

دوسروں کے مقابلہ میں آپ کو کوئی بڑائی مل جائے۔ یا عزت حاصل ہو جائے تو اپنے مقابلہ میں دوسروں کو حقیر نہ سمجھئے۔ کیوں کہ بڑے اور چھوٹے دونوں آخر کار برابر ہو جانے والے ہیں۔ موت دونوں کو بالکل ایک سطح پر پہنچادے گی۔ اس کے بعد بڑائی اس کے لئے ہوگی جس کو خدا بڑا بنائے، اور چھوٹا وہ ہوگا جو خدا کے نزدیک چھوٹا قرار پائے۔

دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ یہاں آدمی حق کا جھوٹا لبادہ اوڑھ کر اپنے کو اونچے مقام پر بٹھالیتا ہے۔ مگر بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب کہ پردہ ہٹے اور ہر آدمی اپنی اصل صورت میں سامنے آجائے۔ اس وقت کتنے عزت والے ذلت کے گڑھے میں پڑے ہوئے دکھائی دیں گے۔ کتنے انصاف اور انسانیت کا نعرہ لگانے والے انصاف اور انسانیت کے قاتل قرار دئے جائیں گے۔ کتنے بہادری کا ٹائٹل لینے والے بزدلی کی کالک سے روسیاہ ہو رہے ہوں گے۔ کتنے سچائی پر فدا ہونے والے اس حال میں نظر آئیں گے گویا سچائی سے ان کا کوئی تعلق ہی نہ تھا۔

سب سے بڑی مجبوری

غریب آدمی کو یہ حسرت ہوتی ہے کہ اس کے پاس عمدہ مکان نہیں۔ مگر دوسری طرف ان لوگوں کا حال بھی بہت زیادہ مختلف نہیں جن کو ایک غریب آدمی رشک کی نظروں سے دیکھتا ہے۔ دولت مند آدمی کے لئے پیسہ ہونا اس سے زیادہ بڑے مسئلے پیدا کرتا ہے جو غریب آدمی کو پیسہ نہ ہونے کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ ایک بڑا آدمی جس کے گرد انسانوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہو، اندر سے اتنا بے چین ہوتا ہے کہ رات کو گولی کھائے بغیر اسے نیند نہیں آتی۔ اس دنیا میں ہر آدمی دکھی ہے، کوئی ایک صورت میں اور کوئی دوسری صورت میں۔

بالفرض کوئی آدمی خوشیوں کا خزانہ اپنے پاس جمع کرے تو وہ بھی بس صبح سے شام تک کے لئے ہوگا۔ اس کے بعد اچانک موت کا بے رحم فرشتہ آئے گا اور اس کو اس طرح پکڑ لے گا کہ نہ اس کی دولت اس کو بچا سکے گی اور نہ اس کی فوج۔ ہوائی جہاز کے مسافر پر بھی موت اسی طرح قابو پالیتی ہے جس طرح ایک پیدل چلنے والے پر۔ وہ عالی شان محلوں میں بھی اسی طرح فاتحانہ داخل ہوجاتی ہے جس طرح ایک معمولی مکان میں۔ موت آدمی کی سب سے بڑی مجبوری ہے۔

موت آدمی کو یاد دلاتی ہے کہ وہ آج سے اوپر اٹھ کر سوچے۔ وہ کامیابی کو زندگی کے اُس پار تلاش کرے۔ کامیاب وہ ہے جو موت سے یہ سبق لے لے۔ جو شخص یہ سبق لینے سے محروم رہے اس کی خوشیوں کے چراغ بہت جلد بجھ جائیں گے۔ وہ اپنے کو ایک ایسے بھیانک اندھیرے میں پائے گا جہاں وہ ہمیشہ ٹھوکریں کھاتا رہے اور کبھی اس سے نکل نہ سکے۔

زندگی کا سفر

ہر آدمی امیدوں اور تمناؤں کی ایک دنیا اپنے ذہن میں لئے ہوئے ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی امیدوں کی دنیا کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ میں اپنے خوابوں والے کل کی طرف چلا جا رہا ہوں۔ مگر اس کی موت اسے آکر بتاتی ہے کہ وہ اپنی تمناؤں والی دنیا کی طرف نہیں بلکہ خدا کی دنیا کی طرف بڑھ رہا تھا، وہ دنیا کی منزل کے بجائے آخرت کی منزل کی طرف چلا جا رہا تھا۔ آدمی کہاں جا رہا ہے اور کہاں پہنچ رہا ہے۔ مگر کسی کو اس کی خبر نہیں۔

آدمی اپنے بچوں کے مستقبل کی خاطر اپنا سب کچھ لگا دیتا ہے مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے بچوں کے مستقبل کو دیکھ کر خوش ہو وہ خود اپنے اس مستقبل کی طرف ہانک دیا جاتا ہے جس کے لئے اس نے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ آدمی اپنے آرام کے لئے ایک مکان کھڑا کرتا ہے مگر ابھی وہ وقت نہیں آتا کہ وہ اپنے پسندیدہ مکان میں چین کے ساتھ رہے کہ موت اس کے اور اس کے مکان کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔ آدمی کماتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ میں عزت و ترقی کی بلندیوں پر اپنے کو بٹھانے جا رہا ہوں مگر بہت جلد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ آنے والا دن اس کے لئے جس چیز کا انتظار کر رہا تھا وہ ایک سنسان قبر تھی نہ کہ عزت و ترقی کی رونقیں۔

آدمی اپنے وقتی عیش کو کھونا نہیں چاہتا اس لئے وہ کھلی کھلی حقیقتوں کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اگر وہ جانے کہ اس کا وقتی عیش بالآخر ابدی عذاب میں تبدیل ہونے والا ہے۔ تو اچانک اس کی زندگی کچھ سے کچھ ہو جائے۔

عجیب محرومی

لوگوں کی دوڑ دھوپ آج کس چیز کے لئے ہے ـــــ کھانا، کپڑا، مکان، عزت، دولت اور خوشیوں کی زندگی کے لئے۔ ہر شخص اپنی ساری طاقت بس انھیں چیزوں کے پانے میں لگائے ہوئے ہے۔ سب کی توجہ انھیں چیزوں کی طرف ہے۔ انھیں کے ملنے سے لوگ خوش ہوتے ہیں اور انھیں کے نہ ملنے سے ناخوش۔

مگر موت کا واقعہ بتاتا ہے کہ یہ خوشیاں موجودہ دنیا میں آدمی کے لئے مقدر نہیں۔ یہاں اگر کوئی شخص ان تمام چیزوں کو پالے تب بھی وہ بے حد عارضی مدت کے لئے انھیں پاتا ہے۔ پچاس سال کی جدوجہد کے بعد جب آدمی اپنی ترقیوں کے کنارے پہنچتا ہے تو عین اس وقت موت آجاتی ہے اور اچانک اس کی تمام ترقیوں کو باطل کر دیتی ہے۔

یہ صورت حال بتاتی ہے کہ موجودہ دنیا ان چیزوں کے پانے کی اصل جگہ نہیں۔ ان کو پانے کی جگہ حقیقۃً موت کے بعد آنے والی دنیا ہے جہاں آدمی کو ہمیشہ رہنا ہے۔ لوگ اپنی ساری قوتوں کو دنیا کے مستقبل کو بنانے میں لگائے ہوئے ہیں، آخرت کے مستقبل کو بنانے کی کسی کو فکر نہیں۔ موجودہ عارضی دنیا میں لوگ سب سے زیادہ جس چیز کے طالب ہیں اسی سے وہ زندگی کے اگلے طویل تر مرحلہ میں سب سے زیادہ غافل ہو گئے ہیں۔

آدمی اسی چیز کو کھو رہا ہے جس کو وہ سب سے زیادہ پانا چاہتا ہے۔ محرومی کی یہ قسم بھی کیسی عجیب ہے۔

خدا کا سایہ

وہ وقت کیسا عجیب ہوگا جب لوگوں کو معلوم ہوگا کہ عمل کے نام پر دنیا میں وہ جو کچھ کرتے رہے وہ بے عملی کی بدترین شکل تھی۔ لوگ اپنے آپ کو اوپر اٹھا کر فخر کرتے رہے حالانکہ ان کے لئے فخر کی بات یہ تھی کہ وہ خدا کی اس دنیا میں اپنے آپ کو جھکا دیں۔ وہ اپنی غلطیوں کی تاویل کو کامیابی سمجھتے رہے حالانکہ ان کی کامیابی یہ تھی کہ وہ اپنی غلطیوں کا اعتراف کرلیں۔ ان کو زبان اس لئے دی گئی تھی کہ اس کو اللہ کی تعریف میں استعمال کریں مگر وہ اپنی زبان کو انسانوں کی تعریف میں استعمال کرتے رہے۔ ان کے اندر خوف و محبت کے جذبات اس لئے رکھے گئے تھے کہ وہ ان کو اپنے رب کے لئے وقف کر دیں۔ مگر وہ دوسری چیزوں کو اپنے خوف و محبت کے جذبات کا مرکز بنائے رہے۔ انھوں نے مال جمع کرنے کو سب سے بڑی چیز سمجھا حالانکہ ان کے لئے سب سے بڑی چیز یہ تھی کہ وہ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں دے کر بے مال ہو جائیں۔ ان کا اصلی کمال یہ تھا کہ وہ کمزوروں کا لحاظ کریں مگر وہ کمزوروں کو نظر انداز کر کے طاقت وروں کا استقبال کرتے رہے۔ ان کے لئے زیادہ بہتر یہ تھا کہ معانی کے خاموش سمندر میں غوطہ لگائیں مگر وہ شور و غل کے ہنگامے کھڑے کرنے میں مشغول رہے۔ ان کی ترقی کا راز یہ تھا کہ وہ اپنی ذات کا احتساب کرنے والے بنیں مگر وہ دوسروں کا احتساب کرنے میں لگے رہے۔

ہر آدمی نے اپنی خوش خیالیوں کی ایک دنیا بنا رکھی ہے اور اپنے آپ کو اس کے اندر پا کر مطمئن ہے۔ مگر قیامت ایسے تمام گھروندوں کو توڑ دے گی۔ اس وقت صرف وہ شخص محفوظ ہوگا جو خدا کے گھر میں پناہ پکڑے ہوئے تھا، جس نے اپنے لئے خدا کا سایہ حاصل کر لیا تھا۔

قبر کا دروازہ

قبر دوسری زندگی کا دروازہ ہے۔ اس دروازہ کے ذریعہ آدمی آج کی دنیا سے نکل کر کل کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص جو آج قبر کے اِس پار ہے وہ کل اپنے آپ کو قبر کے اُس پار پائے گا۔ ہر شخص جو زندہ ہے وہ موت کے مقابلے میں اس طرح شکست کھانے والا ہے کہ کوئی نہ ہوگا جو اس کو بچا سکے۔ مگر اس سب سے بڑی حقیقت کو انسان سب سے زیادہ بھولا ہوا ہے۔

ہم میں سے ہر ایک نے یہ منظر دیکھا ہے کہ کسی شخص کے لئے یہ دروازہ کھلا اور پھر ہمیشہ کے لئے اس کے اوپر بند ہو گیا۔ مگر ہم میں سے بہت کم لوگ ہیں جو یہ جانتے ہوں کہ خود ان کے لئے بھی یہ دروازہ ایک دن کھولا جائے گا اور پھر اسی طرح ان کے اوپر بند کیا جائے گا جس طرح وہ دوسروں کے اوپر ہمیشہ کے لئے بند ہو چکا ہے۔

آدمی کی یہ نفسیات بھی کیسی عجیب ہے کہ دوسروں کو وہ ہر روز مرتے ہوئے دیکھتا ہے مگر خود اس طرح زندگی گزارتا ہے گویا اس کو ہمیشہ اسی دنیا میں رہنا ہے۔ اس کے اپنے لئے موت کا وقت کبھی آنے والا نہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ لوگ ایک ایک کر کے روزانہ خدا کے یہاں پیشی کے لئے بلائے جا رہے ہیں۔ مگر خود اپنے کو اس طرح الگ کر لیتا ہے گویا عدالت الٰہی میں حاضری کا یہ دن اس کے اپنے لئے کبھی نہیں آئے گا۔

ہم میں سے ہر شخص زندگی کے مقابلہ میں موت سے زیادہ قریب ہے۔ یہ احساس اگر زندہ ہو تو آدمی ہر موت کو اپنی موت سمجھے۔ وہ دوسرے کا جنازہ دیکھے تو اس کو ایسا معلوم ہو گویا خود اس کی لاش اٹھا کر قبر کی طرف لے جائی جا رہی ہے۔

بولنا بند ہو جائے گا

ہر آدمی جو زندہ ہے وہ ایک روز مرے گا۔ ہر آدمی جو دیکھتا ہے اور بولتا ہے۔ یقیناً ایک دن اس کی آنکھ بے نور ہو گی اور اس کا بولنا بند ہو جائے گا۔ ہر آدمی پر وہ وقت آنا ہے جب کہ وہ موت کے دروازے پر کھڑا کر دیا جائے۔ اس وقت اس کے پیچھے دنیا ہو گی اور اس کے آگے آخرت۔ وہ ایک ایسی دنیا کو چھوڑ رہا ہو گا جہاں وہ دوبارہ کبھی نہیں آئے گا اور ایک ایسی دنیا میں داخل ہو رہا ہو گا جس سے اس کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہو گا۔ وہ اپنے عمل کے مقام سے ہٹا کر وہاں ڈال دیا جائے گا جہاں وہ اپنے عمل کا ابدی انجام بھگتتا رہے۔

ہم زندگی کے مقابلہ میں موت سے زیادہ قریب ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں۔ حالانکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ مرے ہوئے ہیں۔ وہ موت جس کا کوئی وقت مقرر نہ ہو، وہ گویا ہر وقت آرہی ہے۔ ایسی موت کے لئے یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ وہ آچکی ہے، بجائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ وہ آنے والی ہے۔

ہر آدمی زندگی سے موت کی طرف سفر کر رہا ہے۔ کسی کا سفر دنیا کی خاطر ہے اور کسی کا آخرت کی خاطر۔ کوئی سامنے کی چیزوں میں جی رہا ہے اور کوئی چھپی ہوئی چیزوں میں۔ موجودہ دنیا میں دونوں بظاہر یکساں نظر آتے ہیں۔ مگر موت کے بعد آنے والی منزل کے اعتبار سے دونوں کا حال یکساں نہیں۔ جو شخص خدا اور آخرت میں جی رہا ہے وہ اپنے کو بچا رہا ہے اور جو دنیا کی دلچسپیوں اور اپنے نفس کی خواہشوں میں جی رہا ہے وہی وہ شخص ہے جو ہلاک ہوا۔

آخری وقت

ہر آدمی کا ایک آخری وقت مقرر ہے۔ کسی پر سوتے ہوئے وہ وقت آجاتا ہے، کوئی راہ چلتے پکڑ لیا جاتا ہے اور کوئی بستر پر بیمار ہو کر مرتا ہے۔ یہ وقت بہر حال ہر ایک پر آنا ہے، خواہ وہ ایک صورت میں آئے یا دوسری صورت میں۔

موت کا یہ واقعہ بھی کیسا عجیب ہے۔ ایک جیتی جاگتی زندگی اچانک بجھ جاتی ہے۔ ایک ہنستا ہوا چہرہ لمحہ بھر میں اس طرح ختم ہو جاتا ہے جیسے کہ وہ مٹی سے بھی زیادہ بے قیمت تھا۔ حوصلوں اور تمناؤں سے بھری ہوئی ایک روح دفعۃً اس طرح منظر عام سے ہٹا دی جاتی ہے جیسے اس کے حوصلوں اور تمناؤں کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔

زندگی کس قدر با معنی ہے، مگر اس کا انجام اس کو کس قدر بے معنی بنا دیتا ہے۔ آدمی بظاہر کتنا آزاد ہے، مگر موت کے سامنے وہ کتنا مجبور نظر آتا ہے۔ انسان اپنی خواہشوں اور تمناؤں کو کتنا زیادہ عزیز رکھتا ہے، مگر قدرت کا فیصلہ اس کی خواہشوں اور تمناؤں کو کتنی بے رحمی کے ساتھ کچل دیتا ہے۔

آدمی اگر صرف اپنی موت کو یاد رکھے تو وہ کبھی سرکشی نہ کرے۔ بہتر زندگی کا واحد راز یہ ہے کہ ہر آدمی اپنی حد کے اندر رہنے پر راضی ہو جائے، اور موت بلاشبہ اس حقیقت کی سب سے بڑی معلم ہے۔

موت آدمی کو بتاتی ہے کہ وہ کسی کو حقیر نہ سمجھے۔ کیونکہ وہ وقت آنے والا ہے جب کہ وہ خود سب سے زیادہ حقیر ہوگا۔ موت آدمی کو یاد دلاتی ہے کہ وہ کسی کو نہ دبائے۔ کیونکہ بہت جلد وہ خود ہزاروں من مٹی کے نیچے دبا ہوا ہوگا۔

آنے والا دن

موت ایک قسم کی گرفتاری ہے۔ موت وہ دن ہے جب کہ فرشتے کسی آدمی کو پکڑ کر اس کے مالک کے پاس پہنچا دیتے ہیں۔

گرفتاری کا یہ دن ہر شخص کی طرف تیزی سے دوڑا چلا آرہا ہے۔ مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ دوسروں کی گرفتاری کو تو خوب جانتے ہیں مگر خود اپنی گرفتاری کی انھیں خبر نہیں۔ وہ دوسروں کے پکڑے جانے کا بہت چرچا کرتے ہیں۔ مگر اپنے لئے آنے والے اس دن کو یاد نہیں کرتے جب کہ خدا کے فرشتے بے رحمی کے ساتھ انھیں پکڑ کر مالک کائنات کی عدالت میں پہنچا دیں گے۔

آدمی دوسروں کی کمیوں کو جاننے کا ماہر بنا ہوا ہے، حالانکہ جاننے والا وہ ہے جو اپنی کمیوں کو جانتا ہو۔ آدمی لفظی جواب دے کر اپنے کو محفوظ سمجھ لیتا ہے، حالانکہ محفوظ وہ ہے جو اپنی غلطیوں کا اعتراف کرلے۔

خدا کی گرفتاری کا دن تمام ہولناک دنوں سے زیادہ ہولناک ہے۔ اس کا اگر واقعی احساس ہو جائے تو آدمی کی پوری زندگی بدل جائے۔ وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے آخرت کے عالم میں پہنچ جائے۔ وہ خدائی انصاف کے اس ترازو پر آج ہی اپنے کو کھڑا کرلے جس پر دوسرے لوگ مرنے کے بعد کھڑے کئے جانے والے ہیں۔

آدمی اگر خدا کی پکڑ سے ڈرتا ہو تو ہر گرفتاری کو وہ اپنی گرفتاری سمجھے۔ دوسرے کے ہاتھ میں ہتھکڑی لگتی ہوئی دیکھے تو اس کو ایسا محسوس ہو گویا خود اس کو باندھ کر کائنات کی عدالت میں لے جایا جا رہا ہے۔

موت کی یاد

آج لوگوں کے پاس الفاظ ہیں جن کو وہ بے تکان دہرار ہے ہیں۔مگر ایک وقت آنے والا ہے جب کہ ان کے الفاظ چھن چکے ہوں گے۔ وہاں کوئی سننے والا نہ ہوگا جو اُن کی باتوں کو سنے، کوئی پریس نہ ہوگا جو ان کی چیزوں کو چھاپے، کوئی لاؤڈ اسپیکر نہ ہوگا جو ان کے الفاظ کو فضا میں بکھیرے۔ ان کی خوش خیالیوں کا محل گر چکا ہوگا۔ وہ حسرت اور مایوسی کے عالم میں چاروں طرف دیکھیں گے اور کچھ نہ کر سکیں گے۔

آدمی اگر صرف موت کو یاد کرے تو اس کے لئے وہ تمام چیزیں بالکل بے حقیقت ہو جائیں جن کی خاطر وہ ظلم اور بے انصافی کرتا ہے اور اپنے لئے جہنم کی آگ میں جلنے کا خطرہ مول لیتا ہے۔جس مال کو آدمی اپنا سب کچھ سمجھتا ہے وہ اس کو برت نہیں پاتا کہ موت آجاتی ہے اور اس کو اس کے کمائے ہوئے مال سے جدا کر دیتی ہے۔ اگر آدمی اس حقیقت کو یاد رکھے تو وہ مال کے پیچھے اپنے کو دیوانہ نہ بنائے۔آدمی کو کسی سے شکایت ہوتی ہے، وہ اس کو مٹانے میں لگ جاتا ہے۔مگر ابھی وہ اپنے تخریبی منصوبہ کو پورا نہیں کر پاتا کہ موت اس کے اور اس کے دشمن کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔ اگر یہ حقیقت آدمی کے ذہن میں تازہ ہو تو وہ کبھی کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرے۔ کبھی کسی کو بے عزت کرنے کا منصوبہ نہ بنائے۔

ایسا گھر جو کل کے دن جل جانے والا ہو اس کو کوئی نہیں خریدتا۔ایسا شہر جو اگلے لمحہ بھونچال کی زد میں آنے والا ہو اس میں کوئی آباد نہیں ہوتا۔مگر عجیب بات ہے کہ موت کے عظیم تر بھونچال کے معاملہ میں ہر آدمی یہی غلطی کر رہا ہے۔

کیسی عجیب غفلت

آدمی جب بوڑھا ہوتا ہے تو وہ بالکل نئے تجربہ سے دوچار ہوتا ہے۔ زندگی اب اس کے لئے اپنی تمام معنویت کھو دیتی ہے۔ اس کو نظر آتا ہے کہ جلد ہی وہ ایک نامعلوم دنیا کی طرف چھلانگ لگانے والا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کوئی ہو جو اس فیصلہ کن لمحہ میں اس کو امید کی کرن دے سکے۔ مگر موت اچانک اس کو اس طرح اپنے قبضہ میں کر لیتی ہے کہ اس کے لئے اس نے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ آدمی ہر قسم کی آزادی سے محروم کر کے مجبوری اور بے بسی کی دنیا میں ڈال دیا جاتا ہے۔

یہ موت ہر آدمی کا پیچھا کر رہی ہے۔ بچپن اور جوانی میں آدمی اسے بھولا رہتا ہے۔ مگر آخر کار تقدیر کا فیصلہ غالب آتا ہے۔ بڑھاپے میں جب کہ وہ کسی کام کے قابل نہیں ہوتا اس کی موت اچانک اس کو ایک ایسی دنیا میں پہنچا دیتی ہے جہاں اس کے لئے اندھیروں میں بھٹکنے کے سوا اور کچھ نہیں۔

آدمی دن کی روشنی میں یہ سمجھ کر اپنا نظام بناتا ہے کہ کچھ دیر کے بعد رات کا اندھیرا چھا جانے والا ہے اور رات کو اس یقین کے ساتھ سوتا ہے کہ چند گھنٹوں کے بعد دوبارہ صبح کی روشنی چاروں طرف پھیل جائے گی۔ مگر آخرت کی دنیا کا کسی کو ہوش نہیں۔ کوئی نہیں جو آنے والی موت کو اس طرح دیکھے جس طرح دن کا ایک مسافر شام کو دیکھتا ہے۔ اور ایسے لوگ تو شاید معدوم کے درجہ میں ہیں جو موت کے دوسری طرف جہنم کو بھڑکتا ہوا دیکھ رہے ہوں۔ ہر آدمی اس طرح زندگی گزار رہا ہے جیسے موت بھی دوسروں کے لئے ہے اور جہنم بھی دوسروں کے لئے۔

آدمی اکیلا ہے

موت یہ ثابت کرتی ہے کہ ہر آدمی اکیلا ہے۔ دنیا میں آدمی دوسروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہر آدمی ایک خاندان میں شامل ہوتا ہے۔ ہر آدمی اپنے کو کسی نہ کسی مجموعہ سے وابستہ کئے رہتا ہے۔

مگر موت انتہائی بے رحمی کے ساتھ آدمی کو ہر چیز سے الگ کر دیتی ہے۔ موت آدمی کو اس کے ساتھیوں سے جدا کر کے اس کو تنہا کھڑا کر دیتی ہے۔ موت اس حقیقت کو یاد دلاتی ہے کہ آدمی اکیلا ہے۔ کوئی اس کا ساتھی اور مددگار نہیں۔

یہ تجربہ ہر روز اور ہر مقام پر ہوتا ہے۔ آدمی اپنے سامنے دیکھتا ہے کہ ایک آدمی اپنے خاندان اور اپنے گروہ میں جی رہا تھا۔ اس کے بعد موت آئی اور اس نے اس کو کھینچ کر ایک ایسے گڑھے میں پہنچا دیا جہاں نہ کوئی اس کے دائیں ہوتا اور نہ کوئی اس کے بائیں۔ کیسا عجیب اور کیسا شدید ہے یہ تجربہ۔ مگر کوئی نہیں جو اس تجربہ کو دیکھ کر سبق لے۔

دنیا کی زندگی میں ہر موقع پر بہت سے ساتھی اس کی مدد کے لئے کھڑے ہونے والے تھے۔ مگر موت کے بعد کی زندگی میں وہ تنہا اپنی قبر کو بساتا ہے۔ وہ فرشتوں سے مقابلہ کے لئے اکیلا ہوتا ہے۔ وہ خدا کے سامنے اس طرح پہنچتا ہے کہ اس کے آگے پیچھے کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔

انسان اپنے کو بہت کچھ سمجھتا ہے، مگر انسان بے کچھ ہے۔ موت اس لئے آتی ہے کہ وہ آدمی کو اُس کی اِس حقیقت سے آخری حد تک باخبر کر دے۔

آخرت کا طوفان

ہماری موجودہ دنیا اور آخرت کی دنیا کے درمیان موت کی غیر یقینی دیوار حائل ہے۔ ہر آن یہ اندیشہ ہے کہ موت اس دیوار کو توڑ دے اور اس کے بعد آخرت کے سنگین حقائق ایک بے پناہ سیلاب کی طرح ہمارے اوپر پھٹ پڑیں۔ اس وقت کوئی زور اور کوئی لفظی بازیگری کام نہ آئے گی۔ آدمی بالکل بے سہارا ہوکر اپنے مالک کے سامنے کھڑا ہوگا۔ وہ تمام لوگ تباہی کے دائمی جہنم میں ڈال دئے جائیں گے جو دنیا کی خوش نمائیوں میں اس طرح گم تھے کہ کوئی نصیحت کی بات سننے کے لئے تیار ہی نہ ہوتے تھے۔ صرف وہ شخص بچے گا جس نے مالک کائنات کے سامنے حساب کے لئے پیش ہونے سے پہلے خود اپنا حساب کرلیا ہوگا۔

سب سے زیادہ غافل وہ ہے جو آنے والے دن سے غافل ہے، اس کی غفلت اس کو بچانے والی ثابت نہ ہوگی۔ سب سے زیادہ بے سہارا وہ ہے جو دنیوی اسباب کو اپنا سہارا سمجھے ہوئے ہے حالاں کہ یہ سہارے آخرت میں مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ کمزور ثابت ہوں گے۔

بہت سے دیوار اٹھانے والے اپنی دیوار کو گرا رہے ہیں۔ بہت سے لوگ جو اپنے کو دوسروں سے بڑا سمجھ رہے ہیں وہ دوسروں کے پیروں تلے روندے جائیں گے۔ یہ اس دن ہوگا جب آخرت کا طوفان تمام عالم کو زیر و زبر کردے گا۔ اس وقت خدا اپنے فرشتوں کے ساتھ ظاہر ہوگا۔ اس وقت سارے آدمیوں سے پوچھا جائے گا کہ انھوں نے اپنے پیچھے کیا چھوڑا اور اپنے آگے کے لئے کیا روانہ کیا۔

یہ بے خبری

آج لوگوں کے لئے سب سے آسان کام بولنا ہے اور سب سے مشکل کام چپ رہنا۔ مگر بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب کہ بولنا اتنا سنگین کام معلوم ہوگا کہ لوگ سوچیں گے کہ کاش وہ ساری عمر اپنی زبان کو بند رکھتے، کاش انھوں نے اپنے ہونٹوں کو سی لیا ہوتا۔ کاش وہ الفاظ رکھنے کے باوجود بے الفاظ ہوجاتے۔

آدمی کے وجود میں زبان سب سے زیادہ فتنہ کی چیز ہے مگر آدمی اپنی زبان ہی کا سب سے زیادہ غلط استعمال کرتا ہے۔ زبان حق کے اعتراف کے لئے ہے مگر آدمی اپنی زبان کو حق کے انکار کے لئے استعمال کرتا ہے۔ زبان اس لئے ہے کہ آدمی اس سے بھلائی کے الفاظ بولے مگر وہ اپنی زبان سے برائی کے الفاظ نکالتا ہے۔ جب کسی سے معاملہ پڑتا ہے تو آدمی ایک جواب دے کر مطمئن ہوجاتا ہے۔ اگر اس کو احساس ہو کہ آخری جواب کسی انسان کو نہیں بلکہ خدا کو دینا ہے تو وہ بولنے کے بجائے چپ رہنا پسند کرے۔ وقار کو بچانے کے بجائے وقار کو کھودینا اس کی نظر میں زیادہ محبوب ہوجائے۔

اس قسم کی تمام باتوں کی وجہ یہ ہے کہ آدمی نے غلط طور پر اپنے آپ کو اپنا مالک سمجھ لیا ہے، اس کو یاد نہیں کہ بہت جلد اس کا خالق و مالک ظاہر ہوگا اور اس کو گرفتار کرکے بے بسی کے گڑھے میں پھینک دے گا۔

اگر لوگوں کو معلوم ہو کہ کل ان کا کیا انجام ہونے والا ہے تو ان کا آج ان کے لئے بے لذت ہوجائے۔ ان کی ڈھٹائی اچانک عاجزی میں تبدیل ہوجائے۔ یہ صرف آنے والے کل سے بے خبری ہے جس نے لوگوں کے آج کو ان کے لئے لذیذ بنا رکھا ہے۔

قیامت کی چنگھاڑ

جو لوگ واقعی معنوں میں اپنے رب کو پالیں وہ ایک اور ہی انسان بن جاتے ہیں۔ بظاہر وہ عام آدمیوں کی طرح ہوتے ہیں مگر ان کا اندرونی انسان بالکل دوسرا انسان ہو جاتا ہے۔ ان کی جینے کی سطح عام انسانوں سے مختلف ہو جاتی ہے۔

ایسے لوگ موجودہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی آخرت کی فضاؤں میں پہنچ جاتے ہیں۔ دنیا کی ہر چیز ان کے لئے آخرت کا آئینہ بن جاتی ہے۔ آج کی رونقوں میں انھیں جنت کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ آج کی تلخیاں ان کو جہنم کی یاد دلانے والی بن جاتی ہیں۔ وہ دنیا میں آخرت کو دیکھ لیتے ہیں، وہ زندگی میں موت کا پیغام سن لیتے ہیں۔

مومن حقیقت میں وہی ہے جو دنیا میں آخرت کے عالم کو دیکھ لے۔ جو حالت غیب میں رہتے ہوئے حالت شہود میں پہنچ جائے۔ غیر مومن پر بھی وہ دن آئے گا جب کہ وہ آخرت کی دنیا کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔ مگر یہ دیکھنا اس وقت ہوگا جب کہ قیامت کی چنگھاڑ ظاہری پردوں کو پھاڑ دے گی۔ جب غیب اور شہود کا فرق مٹ جائے گا۔ مگر اس وقت کا دیکھنا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔ کیوں کہ وہ بدلہ پانے کا وقت ہوگا نہ کہ ایمان و یقین کا ثبوت دینے کا۔

قیامت کا فرشتہ صور لئے کھڑا ہے کہ کب حکم ہو اور پھونک مار کر سارے عالم کو تہ و بالا کر دے۔ یہ بے حد ہولناک وقت ہوگا۔ اس وقت آدمی بولنا چاہے گا مگر وہ بول نہ سکے گا۔ وہ چلنا چاہے گا مگر اس کے پاؤں چلنے کی طاقت کھو چکے ہوں گے۔

فیصلہ کا دن

وہ دن آنے والا ہے جب تمام اگلے پچھلے پیدا ہونے والے خدا کے پاس اس حال میں جمع کئے جائیں گے کہ ایک مالک کائنات کے سوا سب کی آوازیں پست ہوں گی۔ اس دن صرف سچائی میں وزن ہوگا، اس کے سوا تمام چیزیں اپنا وزن کھو چکی ہوں گی۔ یہ فیصلہ کا دن ہوگا۔

ہمارے اور اس دن کے درمیان صرف موت کا فاصلہ ہے۔ ہم میں سے ہر شخص ایک ایسے انجام کی طرف چلا جارہا ہے جہاں اس کے لئے یا تو دائمی عیش ہے یا دائمی عذاب۔ ہر لمحہ جو گزرتا ہے وہ ہم کو اس آخری انجام سے قریب تر کردیتا ہے جو ہم میں سے ہر ایک کے لئے مقدر ہے۔ ہر بار جب سورج ڈوبتا ہے تو وہ ہماری عمر میں ایک دن اور کم کردیتا ہے، اس عمر میں جس کے سوا آنے والے ہولناک دن کی تیاری کا اور کوئی موقع نہیں۔ ہم کو زندگی کے صرف چند دن حاصل ہیں، ایسے چند دن جن کا انجام لامحدود مدت تک بھگتنا پڑے گا۔ جس کا آرام بے حد خوش گوار ہے اور جس کی تکلیف بے حد دردناک۔

قبل اس کے کہ موت آکر ہم کو اس عالم سے جدا کردے جہاں صرف کرنا ہے اور اس عالم میں پہنچادے جہاں کرنا نہیں صرف پانا ہے، ہمارے لئے ضروری ہے ہم اپنی زندگی کا احتساب کرلیں۔ ہم سب کو ایک روز مالک کائنات کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ کیسے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کو خدا اپنے وفادار بندوں میں شمار کرے۔ کیوں کہ وہی لوگ اس دن عزت والے ہوں گے۔ کیسے بدبخت ہیں وہ لوگ جن کو خدا رد کردے۔ کیوں کہ اس کے بعد ان کے لئے رسوائی اور عذاب کے سوا اور کچھ نہیں۔

ایک ہی موقع

انسان ایک ابدی مخلوق ہے۔ اس کی عمر کا تھوڑا سا حصہ موجودہ دنیا میں گزرتا ہے اور بقیہ تمام حصہ آخرت کی دنیا میں جو مرنے کے بعد سامنے آنے والی ہے۔ موجودہ دنیا عمل کرنے کی جگہ ہے اور اگلی دنیا اپنے عمل کا انجام پانے کی جگہ۔

آخرت کی دنیا کے لئے کوئی شخص جو کچھ کر سکتا ہے اسی موجودہ دنیا میں کر سکتا ہے۔ اس کے بعد کرنا نہیں، صرف بھگتنا ہے۔ موجودہ زندگی کا عرصہ بہت کم ہے۔ کتنے لوگ ہیں جن کو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا مگر آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ اسی طرح جو لوگ آج ہم کو دیکھ رہے ہیں، ایک وقت آئے گا کہ ہم ان کے دیکھنے کے لئے اس دنیا میں موجود نہ ہوں گے۔ ہم اپنی عمر پوری کر کے اپنے رب کے پاس جا چکے ہوں گے۔

موجودہ زندگی وہ پہلا اور آخری لمحہ ہے جب کہ انسان اپنے ابدی مستقبل کی تعمیر کے لئے کچھ کر سکتا ہے۔ نہ اس سے پہلے ایسا کوئی موقع انسان کو ملا تھا اور نہ اس کے بعد ایسا کوئی موقع انسان کو ملے گا۔ ہم ایک ایسے امتحان سے گزر رہے ہیں جس کا ایک لازمی نتیجہ سامنے آنے والا ہے۔ اور بہت جلد ہم ایک ایسے لازمی نتیجہ سے دوچار ہوں گے جس سے بچنے کی ہمارے پاس کوئی سبیل نہیں۔

یاد رکھئے، زندگی کا ہر لمحہ جو آپ صرف کر رہے ہیں آخری طور پر صرف کر رہے ہیں۔ کیونکہ وہ دوبارہ آپ کے لئے واپس آنے والا نہیں۔ ہمارے لئے صرف ایک ہی موقع ہے، ہم خواہ اس کو استعمال کریں یا اس کو ضائع کر دیں۔ یہ دنیا ہم کو صرف ایک بار دی گئی ہے، خواہ یہاں ہم اپنے لئے جنت کی فصل اگائیں یا جہنم کی۔

اصلی ہار جیت

دنیا میں کوئی کامیاب نظر آتا ہے اور کوئی ناکام۔ اس بنا پر لوگ اسی دنیا کو ہار جیت کی جگہ سمجھنے لگتے ہیں۔ ان کا ذہن یہ ہو جاتا ہے کہ اسی دنیا کی جنّت ہے اور اسی دنیا کی دوزخ دوزخ۔

مگر یہ محض دھوکا ہے۔ ہار جیت تو دراصل وہ ہے جو اگلی زندگی میں سامنے آنے والی ہے۔ وہ لوگ جو دنیا میں اپنے کو کامیاب سمجھتے ہیں جب پردہ ہٹے گا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ اصل حقیقت تو کچھ اور تھی۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ کون گھاٹے میں رہا اور کون نفع کما لے گیا۔ کس نے دھوکا کھایا اور کون ہوشیار نکلا۔ کون مقابلہ کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا اور کون آگے بڑھنے والا ثابت ہوا۔ کس نے اپنی صلاحیتوں کو نتیجہ خیز کام میں لگایا اور کون تھا جس نے اپنی قوتوں کو وقتی تماشوں میں ضائع کر دیا۔ کس نے عزت پائی اور کون رسوا اور ذلیل ہو کر رہ گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہار اس کی ہے جو آخرت میں ہارا۔ اور جیت اس کی ہے جو آخرت کے دن جیتا۔ وہ لوگ جو مصلحت پرستی اور موقع شناسی کی مہارت دکھا کر آج کی دنیا میں عزت اور ترقی حاصل کر رہے ہیں، کل کی دنیا میں ان کی یہ مہارتیں بالکل بے کار ثابت ہوں گی۔ مرنے کے بعد جب وہ آخرت کے عالم میں پہنچیں گے تو وہاں کے حالات میں عزت کی جگہ لینے کے لئے وہ اسی طرح اپنے آپ کو نااہل پائیں گے جس طرح ایک قدیم طرز کا دستکار آدمی روایتی ماحول میں باکمال نظر آتا ہے۔ لیکن اگر وہ جدید طرز کے ٹیکنکل معاشرہ میں پہنچ جائے تو وہاں وہ بالکل بے قیمت ہو جائے گا۔

سب سے بڑا بھونچال

بھونچال خدا کی ایک نشانی ہے۔ بھونچال جب آتا ہے تو وہ تمام دنیوی بھروسوں کو باطل ثابت کر دیتا ہے۔ بھونچال کے لئے پکے محل اور کچی جھونپڑیوں میں کوئی فرق نہیں۔ طاقت ور اور کمزور دونوں اس کے نزدیک یکساں ہیں۔ وہ بے سہارا لوگوں کو بھی اسی طرح تہس نہس کر دیتا ہے جس طرح ان لوگوں کو جو مضبوط سہارا پکڑے ہوئے ہیں۔

بھونچال پیشگی طور پر یہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں بالآخر ہر ایک کے لئے کیا ہونے والا ہے۔ بھونچال ایک قسم کی چھوٹی قیامت ہے جو بڑی قیامت کا پتہ دیتی ہے۔ جب ہولناک گڑگڑاہٹ لوگوں کے اوسان خطا کر دیتی ہے۔ جب مکانات تاش کے پتوں کی طرح گرنے لگتے ہیں۔ جب زمین کا نچلا حصہ اوپر آجاتا ہے اور جو اوپر تھا وہ نیچے دفن ہو جاتا ہے۔ اس وقت انسان جان لیتا ہے کہ وہ قدرت کی طاقتوں کے آگے بالکل بے بس ہے۔ اس کے لئے صرف یہ مقدر ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے اپنی بربادی کا تماشہ دیکھے اور اس کو روکنے کے لئے کچھ نہ کر سکے۔

قیامت کا بھونچال موجودہ بھونچال سے بے حساب گنا زیادہ ہوگا۔ اس وقت سارے سہارے ٹوٹ جائیں گے۔ ہر آدمی اپنی ہوشیاری بھول جائے گا۔ عظمت کے تمام منارے اس طرح گر چکے ہوں گے کہ ان کا کہیں وجود نہ ہوگا۔ اس دن وہی سہارے والا ہوگا جس نے موجودہ چیزوں کو بے سہارا سمجھا تھا۔ اس دن وہی کامیاب ہوگا جس نے اس وقت خدا کو اپنایا تھا جب سارے لوگ خدا کو بھول کر دوسری چھتریوں کے نیچے پناہ لئے ہوئے تھے۔

موت کے کنارے

ہر آدمی چل رہا ہے۔ ہر آدمی کا چلنا موت پر ختم ہوتا ہے۔ موت کسی کے لئے جنت کا دروازہ ہے اور کسی کے لئے جہنم کا دروازہ۔ وہ آدمی بڑا خوش قسمت ہے جس کی موت اس حال میں آئے کہ وہ اپنے کو جنت کے دروازے پر کھڑا ہوا پائے۔ کیونکہ اس کے بعد وہ ایسی دنیا میں ہوگا جہاں ابدی خوشیاں ہیں۔ اس کے بعد اس کے لئے نہ کوئی رنج ہے اور نہ کوئی ڈر۔ اس کے برعکس جس آدمی کی موت اس کو جہنم کے دروازہ پر پہنچائے اس کی بدبختی کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ کیونکہ اس کے بعد وہ اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں گھرا ہوا پائے گا جہاں کھرب ہا کھرب سال سے بھی زیادہ مدت تک اس کو اس طرح رہنا ہوگا کہ وہاں اس کے لئے آگ اور دھوئیں کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

کل کی جنت میں اس آدمی کو داخلہ ملے گا جو آج خدا کی بڑائی کو مان کر اس کے آگے جھک جائے۔ جو آج حق پسند اور خیر خواہ بن کر دوسرے انسانوں کے درمیان رہے۔

جہنم ان بدنصیب انسانوں کا قید خانہ ہے جو دنیا میں خدا کی بڑائی کو نہ مانیں۔ جو اپنے معاملات میں بے انصافی کو چھوڑنا گوارا نہ کریں۔ جن سے خدا کے بندوں کو ظلم اور گھمنڈ کا تجربہ ہو نہ کہ تواضع اور انصاف کا۔

جنت اس شخص کے لئے ہے جو آج کی دنیا میں جنتی انسانوں کی طرح رہے۔ اور جہنم اس کے لئے ہے جو آج کی دنیا میں جنتی انسان بن کر رہنے پر راضی نہ ہو۔

بہت جلد

دولت، عزت، اولاد اور اقتدار وہ چیزیں ہیں جن کو آدمی سب سے زیادہ چاہتا ہے۔ وہ ان کو حاصل کرنے کے لئے اپنا سب کچھ لگا دیتا ہے۔ مگر موت کا واقعہ بتاتا ہے کہ اس دنیا میں کسی کے لئے اپنی خواہشوں کی تکمیل ممکن نہیں۔ اس دنیا میں آدمی ان چیزوں کو نہیں پا سکتا جن کو وہ سب سے زیادہ پانا چاہتا ہے۔

آدمی اگر یہ سوچے کہ کسی چیز کو پانے کا کیا فائدہ جب کہ چند ہی روز بعد اس کو چھوڑ کر چلا جانا ہے تو اس کے اندر قناعت آجائے اور دنیا کی تمام لوٹ کھسوٹ ختم ہو جائے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہاں پانے اور نہ پانے میں بہت زیادہ فرق نہیں۔ جو پانا اگلے دن کھونا بننے والا ہو اس پانے کی کیا قیمت ہے۔ آدمی اپنی ساری کوشش خرچ کر کے جو چیز حاصل کرتا ہے وہ صرف اس لئے ہوتی ہے کہ اگلے لمحہ وہ اسے کھو دے۔ ہر زندگی بالآخر موت سے دوچار ہونے والی ہے۔ ہر وہ محبوب چیز جس کو آدمی اپنے گرد و پیش جمع کرتا ہے اس کو چھوڑ کر وہ دنیا سے اس طرح چلا جاتا ہے کہ پھر کبھی اس کی طرف نہیں لوٹتا۔

آدمی آج میں جیتا ہے، وہ کل کو بھولا ہوا ہے۔ آدمی دوسرے کا گھر اجاڑ کر اپنا گھر بناتا ہے حالاں کہ اگلے دن وہ قبر میں داخل ہونے والا ہے۔ آدمی دوسرے کے اوپر جھوٹے مقدمے چلا کر اس کو انسانی عدالت میں لے جاتا ہے حالانکہ فرشتے خود اس کو خدا کی عدالت میں لے جانے کے لئے اس کے پاس کھڑے ہوئے ہیں۔ آدمی دوسرے کو نظرانداز کر کے اپنی عظمت کے گنبد میں خوش ہوتا ہے حالانکہ بہت جلد اس کا گنبد اس طرح ڈھ جانے والا ہے کہ اس کی ایک اینٹ بھی دیکھنے کے لئے باقی نہ رہے۔

خدا کی ترازو

امتحان کی اس دنیا میں ہر ایک کے لئے آزادی ہے۔ یہاں یہ ممکن ہے کہ ایک شخص اپنے پڑوسی کو ستائے اس کے باوجود اس کو دینداری کے اسٹیج پر بیٹھنے کے لئے نمایاں جگہ ملی ہوئی ہو۔ ایک شخص اپنی لیڈری کے لئے سرگرم ہو پھر بھی وہ مجاہد حق کے نام سے شہرت پائے۔ ایک شخص اپنے اہل معاملہ سے بے انصافی کا طریقہ اختیار کرے اس کے باوجود امن و انصاف کے نام پر ہونے والے اجلاس میں اس کو صدارت کے لئے بلایا جائے۔ ایک شخص کی تنہائیاں اللہ کی یاد سے خالی ہوں مگر عوامی مقامات پر وہ اللہ کا جھنڈا اٹھانے والا سمجھا جاتا ہو۔ ایک شخص کے اندر مظلوم کی حمایت کا کوئی جذبہ نہ ہو پھر بھی اخبارات کی سرخیوں میں اس کو مظلوموں کے حامی کی حیثیت سے نمایاں کیا جا رہا ہو۔ ایک شخص صرف قول کا کارنامہ دکھا رہا ہو، پھر بھی کریڈٹ دینے والے اس کو عمل کا کریڈٹ دے رہے ہوں۔

ہر آدمی کی اصل حقیقت خدا کے علم میں ہے مگر دنیا میں وہ لوگوں کی حقیقت کو چھپائے ہوئے ہے۔ آخرت میں وہ ہر ایک کی حقیقت کھول دے گا۔ وہ وقت آنے والا ہے جب کہ خدا کی ترازو کھڑی ہو اور ہر آدمی کو تول کر دیکھا جائے کہ کون کیا تھا اور کون کیا نہیں تھا۔ اس وقت کا آنا مقدر ہے۔ کوئی شخص نہ اس کو ٹال سکتا اور نہ کوئی شخص اپنے آپ کو اس سے بچا سکتا۔ کامیاب صرف وہ ہے جو آج ہی اپنے کو خدا کی ترازو میں کھڑا کرے۔ کیونکہ جو شخص کل خدا کی ترازو میں کھڑا کیا جائے اس کے لئے بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

موت کے بعد

ہر شخص کے اوپر وہ دن آنے والا ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو موت کے دروازہ پر کھڑا ہوا پائے گا۔ اس کے پیچھے وہ دنیا ہوگی جس کو وہ چھوڑ چکا، جس میں اب وہ واپس نہیں جا سکتا۔ اور سامنے وہ عالم ہوگا جس میں اب اسے داخل ہونا ہے، جس میں داخلہ سے وہ اپنے آپ کو روک نہیں سکتا۔

فیصلہ کا یہ دن ہر آدمی کی طرف دوڑا چلا آرہا ہے۔ اس دن ہر آدمی اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہو جائے گا خواہ اس نے اپنے اوپر کتنے ہی زیادہ پردے ڈال رکھے ہوں، خواہ اس نے اپنے آپ کو کیسے ہی خوبصورت الفاظ میں چھپا رکھا ہو۔

موجودہ دنیا میں یہ ممکن ہے کہ ایک خود پرست آدمی اپنے آپ کو خدا پرست کے روپ میں ظاہر کرے۔ ایک شخص کو اپنے جاہ و مرتبہ سے دل چسپی ہو مگر لوگوں کے سامنے وہ اپنے کو اس انداز میں پیش کرے گویا وہ حق کا سب سے بڑا علم بردار ہے۔ ایک شخص کا یہ حال ہو کہ ذاتی مصلحتیں اور ذاتی مفادات اس کی سرگرمیوں کا مرکز و محور ہوں مگر اپنی تقریر و تحریر سے وہ لوگوں پر ایسا جادو کرے کہ لوگ اس کو حق کا سب سے بڑا نمائندہ سمجھنے لگیں۔

مگر موت انسانی زندگی کا وہ واقعہ ہے جو اس قسم کی تمام چیزوں کو باطل کر دینے والا ہے۔ موت کے بعد آدمی جس دنیا میں پہنچتا ہے وہاں اچانک اس قسم کے تمام لبادے اس کے اوپر سے اتر جاتے ہیں۔ وہ اپنی اصلی اور حقیقی صورت میں سامنے آجاتا ہے، اپنے لئے بھی اور دوسرے انسانوں کے لئے بھی۔

عدالت میں پیشی

موت ہماری زندگی کا خاتمہ نہیں، وہ ہماری اصل زندگی کا آغاز ہے۔ موت دراصل کسی انسان کا وہ وقت ہے جب وہ مالک کائنات کی عدالت میں آخری فیصلہ کے لئے پیش کر دیا جاتا ہے۔

موت سے پہلے آدمی کو بہت سے کام نظر آتے ہیں۔ مگر موت کے بعد آدمی کے سامنے صرف ایک ہی کام ہوگا ——— یہ کہ خدا کے غضب سے وہ کس طرح بچے۔ جب آدمی کے پاس بہت زیادہ وقت ہو تو وہ بہت سے کام چھیڑ دیتا ہے۔ مگر جس شخص کو وقت کے صرف چند لمحے حاصل ہوں وہ صرف وہی کام کرتا ہے جو انتہائی ضروری ہے۔ فیصلہ کن لمحات میں کوئی شخص غیر متعلق یا غیر اہم کام میں مصروف ہونے کی حماقت نہیں کرتا۔

موت کے معاملہ کی نزاکت اس وقت بہت بڑھ جاتی ہے جب یہ دیکھا جائے کہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ وہ کسی بھی وقت کسی بھی شخص کے لئے آسکتی ہے۔ ایسی حالت میں ایک بتانے والے کے پاس سب سے پہلی اور سب سے بڑی بات جو لوگوں کو بتانے کے لئے ہونی چاہئے وہ یہ ہے کہ وہ لوگوں کو موت کے خطرے سے آگاہ کرے۔ وہ کل سے پہلے لوگوں کو کل کے بارے میں خبردار کر دے۔

اسلام کی دعوت کیا ہے، آخرت کی چیتاونی۔ یہ قبر کے اُس پار کے معاملات سے قبر کے اِس پار والوں کو باخبر کرنا ہے۔ اسلام کا داعی موت اور زندگی کے درمیان کھڑا ہوتا ہے۔ اس کو موت سے پہلے مرجانا پڑتا ہے تاکہ وہ دوسری طرف کی دنیا کو دیکھے اور مُردوں کے احوال سے زندوں کو باخبر کر سکے۔

سب سے بڑا حادثہ

ہماری دنیا میں جو سب سے بڑا حادثہ پیش آرہا ہے وہ یہ کہ یہاں بسنے والے انسانوں میں سے تقریباً دس لاکھ آدمی ہر روز مر جاتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ موت کے فرشتے کل کے لئے جن دس لاکھ آدمیوں کی فہرست تیار کر رہے ہیں اس میں اس زمین پر چلنے والوں میں سے کس کس کا نام ہو۔ ہم میں سے ہر شخص کو موت آنی ہے۔ مگر ہم میں سے کوئی شخص نہیں جانتا کہ اس کی موت کب آئے گی اور جن لوگوں کے درمیان ہم زندگی گزار رہے ہیں ان کے متعلق بھی کچھ نہیں معلوم کہ ان میں سے کون کل اٹھالیا جائے گا اور کون کل کے بعد سننے اور دیکھنے کے لئے باقی رہے گا۔

یہ آنے والا وقت ہم میں سے ہر شخص کی طرف دوڑا چلا آرہا ہے۔ ہر زندہ انسان اس خطرہ میں مبتلا ہے کہ کل اس کی موت آجائے اور اس کے بعد نہ اس کے لئے سننے کا موقع باقی رہے اور نہ ہمارے لئے سنانے کا۔

یہ صورت حال بتارہی ہے کہ کرنے کا اصل کام کیا ہے۔ کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص آخرت کی فکر کرے اور دوسرے انسانوں کو زندگی کے اس حقیقی مسئلہ سے آگاہ کرے۔ دنیا کی آبادی اگر چار ارب ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کو چار ارب کام کرنے ہیں۔ کیوں کہ آج کا ہر آدمی حقیقت سے غافل ہے، ہر آدمی اس کا محتاج ہے کہ اس کو حقیقت کا علم پہنچایا جائے۔ کوئی بڑا طوفان ٹوٹنے والا ہو تو چھوٹی باتیں بھول جاتی ہیں۔ موت بلاشبہ سب سے بڑا طوفان ہے۔ اگر آدمی کو اس کا احساس ہو تو وہ سب سے زیادہ موت کے بارے میں سوچے اور سب سے زیادہ موت کے بارے میں چرچا کرے۔

آخرت کا اعلان

مسلمان خدا کی طرف سے اس ذمہ داری پر مقرر کئے گئے ہیں کہ وہ دنیا کی تمام قوموں کو بتا دیں کہ قیامت کا ایک دن آنے والا ہے جب کہ ان کا رب ان سے ان کا حساب لے گا اور پھر ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق انعام یا سزا دے گا۔ اس تقرر نے ان کے حال اور مستقبل کو تمام تر اس کام کے ساتھ باندھ دیا ہے۔ ان کی قیمت صرف اس وقت ہے جب کہ وہ خدائی پیغام رسانی کی اس خدمت کو انجام دیں۔ اگر وہ اس کے لئے نہ اٹھیں تو خدا کے نزدیک وہ اپنی قیمت کھودیں گے۔

اس کام کو چھوڑنے کے بعد کوئی بھی دوسری چیز ان سے قبول نہ کی جائے گی خواہ بظاہر وہ دین وملت ہی کا کوئی کام کیوں نہ ہو۔ اس ذمہ داری سے غافل ہونے کے بعد خدا ان کو ان کے دشمنوں کے حوالے کردے گا۔ ان کے اوپر دوسری قومیں غلبہ حاصل کریں گی۔ حتیٰ کہ دوسری بنیادوں پر اٹھائی ہوئی ان کی اسلامی سرگرمیوں پر بھی رولر چلا دیا جائے گا۔ خودساختہ خیالات کے تحت اگرچہ وہ خوش فہمیوں میں بتلا رہیں گے۔ مگر حالات کی بے رحم زبان چیخ کر کہہ رہی ہوگی کہ ان کا خدا ان کو چھوڑ چکا ہے۔

دنیا کی قوموں کے سامنے آخرت کا اعلان کرنے کے لئے اگر مسلمان نہیں اٹھتے تو ان کی کوئی قیمت خدا کے نزدیک نہیں ہے، نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ یہود کی تاریخ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ آدمی کی قیمت اس ذمہ داری کے اعتبار سے ہوتی ہے جس کی ادائگی پر اس کو مامور کیا گیا ہے۔ پھر مسلمان جب اپنی ذمہ داری ہی کو ادا نہ کریں تو اس کے بعد ان کی قیمت ان کے مالک کے نزدیک کیا ہوگی۔

دعوتی ذمہ داری

دنیا کا سیلاب اس لئے آتا ہے کہ وہ ہم کو قیامت کے زیادہ بڑے سیلاب کا نقشہ دکھائے۔ حقیقت یہ ہے کہ قیامت اسی طرح کا ایک بہت بڑا سیلاب ہے جیسا سیلاب ہر سال ہماری زمین پر آتا ہے اور بستیوں اور آبادیوں کو تہس نہس کر دیتا ہے۔ یہ آنے والا سیلاب جب آئے گا تو ہمارے تمام حفاظتی بند ٹوٹ جائیں گے۔ وہ ہم کو اس طرح گھیرے گا کہ پہاڑ کی چوٹیاں بھی اس کے مقابلہ میں ہم کو پناہ دینے سے عاجز رہیں گی۔

دنیا کے سیلاب میں وہی شخص بچتا ہے جس نے اس کے آنے سے پہلے اپنے لئے کشتیاں بنالی ہوں، اسی طرح آخرت کے سیلاب میں صرف وہ شخص بچے گا جس نے اپنے آپ کو خدا کے حوالے کر دیا ہو۔ جو خدا کی کشتی میں سوار ہو گیا ہو۔

آج دنیا کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ قیامت کے آنے والے اس سیلاب سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے۔ خدا نے اپنے پیغمبر اسی لئے بھیجے تاکہ وہ دنیا والوں کو اس آنے والے سیلاب سے خبردار کریں۔ تاکہ موت کے بعد جب خدا لوگوں کو پکڑے تو کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ہو کہ ہم کو ایک ایسے معاملہ کے لئے پکڑا جا رہا ہے جس کے بارے میں ہمیں اس سے پہلے کچھ بتایا نہیں گیا تھا۔

اب کوئی نبی آنے والا نہیں مگر یہ کام بدستور اپنی جگہ باقی ہے۔ ختم نبوت کے بعد امت مسلمہ اسی خاص کام پر مامور ہے۔ اس کی لازمی ذمہ داری ہے کہ وہ تمام قوموں کو اس سے باخبر کرے، قبل اس کے کہ خدا کا وہ سیلاب پھٹ پڑے اور پھر نہ کسی کے لئے خبردار کرنے کا موقع ہو اور نہ کسی کے لئے خبردار ہونے کا۔

اس وقت کیا ہوگا

وہ وقت کیسا عجیب ہوگا جب خدا کی عدالت قائم ہوگی۔ کسی کے لئے ڈھٹائی اور انکار کا موقع نہ ہوگا۔ وہ شخص جس کو دنیا میں لوگوں نے بے قیمت سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا وہی خدا کی نظر میں سب سے زیادہ قیمت والا قرار پائے گا۔ جس کو لوگوں نے اپنے درمیان سب سے کمزور سمجھ لیا تھا وہی اس وقت خدا کے حکم سے وہ شخص ہوگا جس کی گواہی پر لوگوں کے لئے جنت اور جہنم کا فیصلہ کیا جائے۔

اس وقت ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جو دنیا میں بہت بولنے والے تھے مگر وہاں اپنے آپ کو گونگا پائیں گے۔ جو دنیا میں عزت اور طاقت والے سمجھے جاتے تھے مگر وہاں اپنے آپ کو بالکل بے زور دیکھنے پر مجبور ہوں گے۔ جب ان کا ظاہری پردہ اتارا جائے گا اور پھر دیکھنے والے دیکھیں گے کہ دین کا لبادہ پہننے والے دین سے کس قدر خالی تھے۔ جب کتنی سفیدیاں کالی نظر آئیں گی اور کتنی رونقیں بے رونق ہو چکی ہوں گی۔

موجودہ دنیا میں لوگ مصنوعی غلافوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ کسی کے لئے خوبصورت الفاظ اس کی اندرونی حالت کا پردہ بنے ہوئے ہیں اور کسی کو اس کی مادی رونقیں اپنے جلو میں چھپائے ہوئے ہیں۔ مگر آخرت میں لوگوں کے الفاظ بھی ان سے چھن جائیں گے اور ان کی مادی رونقیں بھی۔ اس وقت ہر آدمی اپنی اصلی صورت میں سامنے آجائے گا۔ کیسا سخت ہوگا وہ دن۔ اگر آج لوگوں کو اس کا اندازہ ہو جائے تو ان کے الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو جائے۔ کسی چیز میں ان کے لئے لذت باقی نہ رہے۔ دنیا کی عزت بھی ان کو اتنی ہی بے معنی معلوم ہو جتنی دنیا کی بے عزتی۔

اسلام کی روح

مومن کون ہے۔ مومن وہ ہے جو اس واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ اسرافیل صور لئے کھڑے ہیں اور اس بات کے منتظر ہیں کہ کب خدا کا حکم ہو اور پھونک مار کر سارے عالم کو تہ و بالا کر دیں۔ کافر اور مومن کا فرق حقیقۃً اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ کافر دنیا کی سطح پر جیتا ہے اور مومن آخرت کی سطح پر۔ ایک ظاہر حیات میں گم رہتا ہے۔ دوسرا آخر حیات میں اپنے لئے زندگی کا راز پالیتا ہے۔

اسلام کا مطلب یہ ہے کہ زندگی خدا اور آخرت کی یاد میں ڈھل جائے۔ یہاں بندہ اپنے رب سے روحانی سطح پر ملاقات کرتا ہے۔ مگر جب اسلام کے ماننے والوں کو زوال ہوتا ہے تو اسلام کی روح غائب ہو جاتی ہے اور صرف اس کے ظاہری پہلو باقی رہ جاتے ہیں۔ اسلام اپنی سطح سے اتر کر ماننے والوں کی سطح پر آجاتا ہے۔

اب نظر نہ آنے والے خدا سے تعلق کمزور ہو جاتا ہے البتہ نظر آنے والے خداؤں کا چرچا خوب شروع ہو جاتا ہے۔ خدا کے لئے تنہائیوں میں رونا باقی نہیں رہتا البتہ اسلام کے نام پر ہنگامے خوب ترقی کرتے ہیں۔ نماز لوگوں کی روح کو پُر رونق نہیں بناتی البتہ مسجدوں کی رونقیں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ روزہ سے پرہیزگاری کا جذبہ نکل جاتا ہے البتہ افطار و سحر کی دھوم خوب دکھائی دیتی ہے۔ عید میں عبدیت کی روح نہیں ہوتی البتہ تماشے کی چیزیں خوب رونق پکڑتی ہیں۔ رسول لوگوں کے لئے زندگی کا رہنما نہیں ہوتا، البتہ رسول کے نام پر جشن اور جلسہ جلوس کی بہاریں شباب پر نظر آتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ خدا کے دین کو اپنی دنیا دارانہ زندگی میں ڈھال لیا جاتا ہے۔

بھیڑ کے درمیان سناٹا

دین جب قومی روایت بن جائے تو ایک نیا عجیب و غریب منظر سامنے آتا ہے۔ دین کے نام پر طرح طرح کی ظاہری دھوم بہت بڑھ جاتی ہے مگر اصل دین اتنا نایاب ہوتا ہے کہ ڈھونڈنے سے بھی کہیں نہیں ملتا۔

یہی حال آج ملت کا ہو رہا ہے۔ نمازیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے مگر اللہ کے ڈر سے جھکنے والے نظر نہیں آتے۔ دین کی خاطر بولنے والے بہت ہیں مگر دین کی خاطر چپ ہو جانے والا کوئی نہیں۔ ملت کو بربادی سے بچانے کے لئے ہر شخص مجاہد بنا ہوا ہے مگر فرد کو بربادی سے بچانے کے لئے کوئی بے قرار نہیں ہوتا۔ اپنی حق پرستی کو جاننے کا ماہر ہر ایک ہے مگر دوسرے کی حق پرستی کو جاننے کی ضرورت کسی کو محسوس نہیں ہوتی۔ چوک پر خدا پرستی کا مظاہرہ کرنے والوں کی ہر طرف بھیڑ لگی ہوئی ہے مگر تنہائیوں میں خدا پرست بننے سے کسی کو دلچسپی نہیں۔ خدا کے دین کو ساری دنیا میں غالب کرنے کا چیمپین ہر آدمی بنا ہوا ہے مگر خدا کے دین کو اپنی زندگی میں غالب کرنے کی فرصت کسی کو نہیں۔ اچھے الفاظ کا بھنڈار ہر ایک کے پاس موجود ہے۔ مگر اچھے عمل کا خزانہ کسی کے پاس نہیں۔ جنت کی کنجیوں کے گچھے ہر ایک کے پاس ہیں مگر جہنم کے اندیشے سے تڑپنے کی ضرورت کوئی محسوس نہیں کرتا۔ دنیوی رونقوں والے اسلام کی طرف ہر شخص دوڑ رہا ہے مگر اس اسلام سے کسی کو دلچسپی نہیں جو زندگی میں آخرت کا زلزلہ پیدا کر دے۔

انسانوں کی بھیڑ کے درمیان سناٹے کا یہ عالم شاید آسمان نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔

آخری سفر

بھیڑ کے درمیان سناٹا

دنیا میں جب قومی روایت بن جائے تو ایک نیا عجیب و غریب منظر سامنے آتا ہے۔ دین کے نام پر طرح طرح کی ظاہری دھوم بہت بڑھ جاتی ہے مگر اصل دین اتنا نایاب ہوتا ہے، کہ ڈھونڈھنے سے بھی کہیں نہیں ملتا۔

یہی حال آج ملت کا ہو [illegible] ہے مگر اللہ کے ذکر سے جھکنے والے نظر نہیں آتے [illegible] دین کی خاطر چپ ہو جانے والا کوئی نہیں [illegible] بربادی [illegible] ہر شخص مجاہد بنا ہوا ہے مگر خود اپنی بربادی سے بچانے کے لئے کوئی بے قرار نہیں ہوتا۔ اپنی حق پرستی کو جتانے کا ماہر ہر ایک ہے مگر دوسرے کی حق پرستی کو جاننے کی ضرورت کسی کو محسوس نہیں ہوتی۔ چوک پر خدا پرستی کا مظاہرہ کرنے والوں کی ہر طرف بھیڑ لگی ہوئی ہے مگر تنہائیوں میں خدا پرست بننے سے کسی کو دلچسپی نہیں۔ خدا کے دین کو ساری دنیا میں نافذ کرنے کا مجاہد ہر آدمی بنا ہوا ہے مگر خدا کے دین کو اپنی زندگی پر غالب کرنے کی فرصت کسی کو نہیں۔ اچھے الفاظ کا ذخیرہ ہر ایک کے پاس موجود ہے۔ مگر اچھے عمل کا خزانہ کسی کے پاس نہیں۔ جنت کی کنجیوں کے گچھے ہر ایک کے پاس ہیں مگر جہنم کے اندیشے سے تڑپنے کی ضرورت کوئی محسوس نہیں کرتا۔ دنیوی رونقوں والے اسلام کی طرف ہر شخص دوڑتا ہے مگر اس اسلام سے کسی کو دلچسپی نہیں جو زندگی میں آخرت کا زلزلہ پیدا کر دے۔

انسانوں کی بھیڑ کے درمیان سناٹے کا یہ عالم شاید آسمان نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔

۲۵واں گھنٹہ

ایک فرانسیسی مصنف نے ایک کتاب شائع کی ہے۔ اس کا نام ہے ۲۵واں گھنٹہ :

25th Hour

اس کتاب میں مصنف نے دنیا کی موجودہ حالت کا جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے دکھایا ہے کہ دنیا دو دھڑوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو مٹانے کی ایسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں جس کا آخری نتیجہ صرف انسانیت کی مجموعی ہلاکت ہو۔ ہتھیاروں کی اندھادھند ریس نے دنیا کو خطرناک ہتھیاروں کا گدام بنادیا ہے۔ مسلسل جنگی تیاریوں نے دنیا کو اپنی بربادی کے آخری کنارے پہنچا دیا ہے۔

مصنف لکھتا ہے کہ ہمارا ۲۴واں گھنٹہ ختم ہوچکا ہے 24th hour is past اب پچیسواں گھنٹہ (خاتمہ کا گھنٹہ) شروع ہونے والا ہے۔

مصنف نے جو بات "انسانی جنگ" کے بارہ میں کہی ہے وہ "خدائی قیامت" کے بارہ میں زیادہ صحیح ہے۔ خدا نے موجودہ دنیا کو محدود مدت کے لئے امتحان کے واسطے پیدا کیا ہے۔ یہ مدت صرف خدا کے علم میں ہے، وہ ہم کو تعین کے ساتھ معلوم نہیں۔ کسی بھی لمحہ خدا اس مدت کے خاتمہ کا اعلان کرسکتا ہے۔ اور اس کے بعد دنیا اور اس کا سارا تمدن عظیم زلزلہ کے ذریعہ تباہ ہوجائے گا۔ اور اس کے بعد ایک نئی ابدی اور کامل دنیا تخلیق کی جائے گی۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو موجودہ زمین پر ہمارا ہر لمحہ گویا آخری لمحہ ہے۔ اگر ہم اپنی صبح میں ہیں تو اندیشہ ہے کہ ہم شام نہ کرسکیں۔ اگر ہم اپنی شام میں ہیں تو اندیشہ ہے کہ ہمیں دوبارہ صبح دیکھنے کو نہ ملے۔

موجودہ دنیا میں ہمارا ہر لمحہ آخری لمحہ ہے۔ ہر وقت یہ امکان ہے کہ انسانیت اپنی مہلت عمر پوری کرچکی ہو۔ انسان اپنے "۲۴ویں گھنٹے" کو ختم کرکے ۲۵ویں فیصلہ کن گھنٹے میں داخل ہوجائے۔

لوگ نیوکلیر جنگ کے خطرہ سے ڈر رہے ہیں۔ حالاں کہ انھیں خدا کی طرف سے قیامت کا صور پھونکا جانے سے ڈرنا چاہئے۔ کیوں کہ نیوکلیر جنگ کا ہونا یقینی نہیں۔ مگر قیامت کا آنا یقینی بھی ہے اور اس کا انجام ابدی بھی۔

موت کے دروازہ پر

موت کا مرحلہ سب سے زیادہ یقینی مرحلہ ہے جس سے آدمی کو لازماً گزرنا ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ کسی کو زندگی نہ ملے۔ مگر جس کو زندگی ملی اس کے لئے موت کا آنا لازمی ہے۔ ہر آدمی جو زندہ ہے وہ ایک روز مرے گا۔ ہر آدمی جو دیکھتا اور بولتا ہے یقیناً ایک روز اس کی آنکھ بے نور ہوگی اور اس کا بولنا بند ہوجائے گا۔ ہر آدمی پر وہ وقت آنا ہے جب کہ وہ موت کے دروازہ پر کھڑا کر دیا جائے۔ اس وقت اس کے پیچھے دنیا ہوگی اور اس کے آگے آخرت۔ وہ ایک ایسی دنیا کو چھوڑ رہا ہوگا جہاں وہ دوبارہ کبھی نہیں آئے گا اور ایک ایسی دنیا میں داخل ہو رہا ہوگا جس سے اس کو کبھی نکلنا نصیب نہ ہوگا۔ وہ اپنے عمل کے میدان سے ہٹا کر وہاں ڈال دیا جائے گا جہاں وہ اپنے عمل کا ابدی انجام بھگتتا رہے۔

زندگی ایک بے اعتبار چیز ہے، جب کہ موت بالکل یقینی ہے۔ ہم زندہ صرف اس لئے ہیں کہ ابھی ہم مرے نہیں ہیں اور موت وہ چیز ہے جس کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ ہم ہر لمحہ موت کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہم زندگی کے مقابلہ میں موت سے زیادہ قریب ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں حالاں کہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ مرے ہوئے ہیں۔ وہ موت جس کا وقت مقرر نہ ہو، جو ابھی اگلے لمحہ آسکتی ہو وہ گویا ہر وقت آرہی ہے اس کے متعلق یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ آچکی ہے، بجائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ وہ آنے والی ہے۔ اسی لئے حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ اپنے آپ کو قبر والوں میں شمار کرو (عد نفسک من اھل القبور)

موت ہر چیز کو باطل کر دیتی ہے، وہ ہماری زندگی کا سب سے زیادہ بھیانک واقعہ ہے۔ تاہم موت اگر صرف زندگی کا خاتمہ ہوتی تو وہ زیادہ بھیانک نہیں تھی۔ موت کا مطلب اگر صرف یہ ہوتا کہ اب آئندہ کے لئے اس انسان کا وجود نہ رہے گا جو چلتا تھا اور جو دیکھتا اور سنتا تھا تو اپنی ساری ہولناکیوں کے باوجود یہ صرف ایک وقتی حادثہ تھا نہ کہ کوئی مستقل مسئلہ۔ مگر اصل مشکل یہ ہے کہ موت ہماری زندگی کا خاتمہ نہیں۔ وہ ایک نئی اور ابدی زندگی کا آغاز ہے۔ موت کا مطلب اپنے ابدی انجام کی دنیا میں داخل ہونا ہے۔

ہر آدمی زندگی سے موت کی طرف سفر کر رہا ہے۔ کسی کا سفر دنیا کی خاطر ہے اور کسی کا آخرت کی خاطر۔ کوئی سامنے کی چیزوں میں جی رہا ہے کوئی چھپی ہوئی چیزوں میں۔ کوئی اپنی خواہش اور انا کی تسکین کے لئے دوڑ دھوپ کر رہا ہے اور کسی کو خدا کے خوف اور خدا کی محبت نے بے چین کر رکھا ہے۔ دونوں قسم کے لوگ شام کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی تھکان کو مٹائیں اور اگلے دن دوبارہ صبح کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی پسند کی دنیا میں دوبارہ سرگرم ہوجائیں۔ موجودہ دنیا میں دونوں بظاہر یکساں نظر آتے ہیں۔ مگر موت کے بعد آنے والی منزل کے اعتبار سے دونوں کا حال یکساں نہیں۔ جو شخص خدا اور آخرت میں جی رہا ہے وہ اپنے کو بچا رہا ہے اور جو شخص دنیا کی دلچسپیوں اور اپنے نفس کی خواہشوں میں جی رہا ہے وہ اپنے کو ہلاک کر رہا ہے۔

ہم خدا کے ملک میں ہیں

ایک امریکی خاتون سیاحت کی غرض سے روس گئیں۔ وہاں انھوں نے دیکھا کہ ہر جگہ کمیونسٹ پارٹی کے چیف کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ یہ بات انھیں پسند نہیں آئی۔ ایک موقع پر وہ کچھ روسیوں سے اس پر تنقید کرنے لگیں۔ خاتون کے ساتھی نے ان کے کان میں چپکے سے کہا "میڈم آپ اس وقت روس میں ہیں، امریکہ میں نہیں ہیں"

آدمی اپنے ملک میں اپنی مرضی کے مطابق رہ سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ کسی غیر ملک میں جائے تو وہاں اس کو دوسرے ملک کے نظام کی پابندی کرنی پڑے گی۔ اگر وہ وہاں کے نظام کی خلاف ورزی کرے تو وہ مجرم قرار پائے گا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ وسیع تر معنوں میں دنیا کا ہے۔ انسان ایک ایسی دنیا میں پیدا ہوتا ہے جس کو اس نے خود نہیں بنایا ہے۔ یہ مکمل طور پر خدا کی بنائی ہوئی دنیا ہے۔ گویا انسان یہاں اپنے ملک میں نہیں ہے بلکہ خدا کے ملک میں ہے۔

ایسی حالت میں انسان کی کامیابی کا واحد راستہ یہ ہے کہ وہ خدا کی اسکیم کو جانے اور اس اسکیم کے مطابق اس دنیا میں رہے۔ اگر وہ یہاں خدا کی اسکیم کے خلاف رہے گا تو وہ باغی قرار پائے گا اور اس قابل ٹھہرے گا کہ خدا اس کو سخت سزا دے کر ہمیشہ کے لئے اپنی تمام نعمتوں سے محروم کردے۔

دنیا میں خدا کی مرضی کے مطابق رہنے کا طریقہ کیا ہے، یہی وہ سوال ہے جس کا جواب دینے کے لئے خدا نے اپنے پیغمبر کھڑے کئے۔ پیغمبروں نے انسان کی قابل فہم زبان میں کھول کھول کر بتایا کہ انسان سے خدا کو کیا مطلوب ہے۔ اور خدا کی وہ اسکیم کیا ہے جس کی انسان کو پابندی کرنی چاہئے۔

قرآن اسی پیغمبرانہ ہدایت کا مستند مجموعہ ہے۔ جو شخص یہ چاہتا ہو کہ خدا اس کو اپنے وفادار بندوں میں شمار کرے اور اس کو اپنی ابدی نعمتوں میں حصہ دار بنائے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ قرآن کو پڑھے اور اس کو اپنی زندگی کا رہنما بنالے۔

جو شخص ایسا نہیں کرے گا اس کا انجام شدید تر شکل میں وہی ہوگا جو روس میں امریکہ نوازوں کا ہوتا ہے یا امریکہ میں روس نوازوں کا۔

موت کا مرحلہ

موت کا لمحہ تمام قابل قیاس اور ناقابل قیاس لمحات سے زیادہ شدید ہے۔ ہر دوسری مصیبت جس کے لئے آدمی پریشان ہوتا ہے۔ اس مصیبت کے مقابلہ میں ہیچ ہے جو موت کی صورت میں اس کے سامنے آنے والی ہے۔

موت زندگی کے سخت ترین مرحلہ کی طرف سفر ہے۔ یہ کامل بے اختیاری، کامل بے سروسامانی اور کامل بے مددگاری کے مرحلہ میں داخل ہونا ہے۔ دنیا کی ہر تکلیف کی ایک حد ہوتی ہے، موت ہم کو ایک ایسی دنیا میں داخل کر دیتی ہے جس کی تکلیفوں اور مصیبتوں کی کوئی حد نہیں ہوتی۔

موجودہ دنیا میں بھی آدمی باعتبار حقیقت اسی حال میں ہے۔ انسان اپنی ذات کے اعتبار سے اتنا کمزور ہے کہ وہ معمولی ناخوشگواری کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک سوئی کا چبھنا، ایک دن کی بھوک پیاس، چند دن کے لئے نیند نہ آنا بھی اس کے پورے وجود کو تڑپا دیتا ہے۔ تاہم موجودہ دنیا میں اس کو اس کی ضرورت کے مطابق تمام چیزیں حاصل ہیں اس لئے وہ اپنی بے چارگی کو بھولا رہتا ہے۔ وہ اپنی حقیقت سے ناآشنا رہتا ہے۔

اگر آدمی سے موجودہ دنیا چھین لی جائے۔ جہاں پانی اور غذا ہے، جہاں ہوا اور روشنی ہے، جہاں فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے تمدن بنانے کے امکانات ہیں۔ اگر موجودہ دنیا آدمی سے چھین لی جائے تو خلا کے کسی دوسرے مقام پر وہ اپنے لئے اس قسم کی ایک اور دنیا کی تخلیق نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد اس کا انجام اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ وہ اندھیرے میں بھٹکتا رہے۔

دنیا میں آدمی پر مصیبت پڑتی ہے تو وہ آہ واویلا کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ آنے والے دن کو جانے تو وہ کہے گا کہ خدایا جو کچھ بیت رہا ہے اس سے کہیں زیادہ سخت ہے وہ جو بیتنے والا ہے۔ دنیا میں آدمی کو عزت اور آرام حاصل ہو تو وہ فخر اور گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر وہ آنے والے لمحات کو جانے تو وہ کہہ اٹھے گا کہ خدایا اس عزت اور آرام کی کوئی حیثیت نہیں، اگر آنے والے طویل تر مرحلہ میں وہ باقی نہ رہے۔

موت ہماری زندگی کا خاتمہ نہیں، وہ ایک نئے مرحلۂ حیات کا آغاز ہے۔ یہ نیا مرحلہ کسی کے لئے تمام مصیبتوں سے زیادہ بڑی مصیبت کا غار ہوگا اور کسی کے لئے تمام راحتوں سے زیادہ بڑی راحت کا دروازہ۔

کیسا عجیب

کرناٹک کے گورنر مسٹر گووند نرائن کی لڑکی نندنی کی عمر ابھی صرف ۳۰ سال تھی کہ ۱۶ ستمبر ۱۹۸۱ کو نئی دہلی میں اس کا انتقال ہوگیا۔ ایک ہنستی ہوئی زندگی اچانک خاموش ہوگئی۔

نندنی بہت ذہین اور تندرست تھی۔ اس کی تعلیم خالص انگریزی طرز پر ہوئی۔ اس کے بعد اس نے امریکہ سے جرنلزم (صحافت) کی ڈگری حاصل کی۔ وہ ہندستان ٹائمس میں سینیئر رپورٹر تھی۔ اپنی مختلف خصوصیات کی وجہ سے نندنی اپنے اخباری ساتھیوں کے درمیان بہت مقبول تھی۔ اس کے ایک ساتھی کے الفاظ میں نندنی کی زندگی کا نظریہ یہ تھا:

She loved life to the full and wanted to live it to the full

وہ زندگی سے آخری حد تک پیار کرتی تھی اور زندگی کے ساتھ آخری حد تک رہنا چاہتی تھی۔

نندنی کی وفات پر اس کے ساتھی رپورٹروں نے ایک یادداشت (ہندستان ٹائمس ۱۷ ستمبر ۱۹۸۱) شائع کی ہے۔ اس یادداشت کے خاتمہ پر وہ لکھتے ہیں ——— نندنی کی موت اس حقیقت کی ایک بے رحم یاد دہانی ہے کہ ہر آدمی کا ایک بے حد مقرر وقت ہے:

It is a cruel reminder of the fact that there is a deadline for everyone.

کیسی عجیب بات ہے۔ ایک جیتی جاگتی زندگی اچانک بجھ جاتی ہے۔ ایک ہنستا ہوا چہرہ ایک لمحہ میں اس طرح ختم ہوجاتا ہے جیسے کہ وہ مٹی سے بھی زیادہ بے قیمت تھا۔ حوصلوں اور تمناؤں سے بھری ہوئی ایک روح دفعۃً اس طرح منظر سے ہٹادی جاتی ہے جیسے اس کے حوصلوں اور تمناؤں کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔

زندگی کس قدر بامعنی ہے۔ مگر اس کا انجام اس کو کس قدر بے معنی بنا دیتا ہے۔ آدمی بظاہر کتنا آزاد ہے مگر موت کے سامنے وہ کتنا مجبور نظر آتا ہے۔ انسان اپنی خواہشوں اور تمناؤں کو کتنا زیادہ عزیز رکھتا ہے، مگر قدرت کا فیصلہ اس کی خواہشوں اور تمناؤں کو کتنی بے رحمی سے کچل دیتا ہے۔

آدمی اگر صرف اپنی موت کو یاد رکھے تو وہ کبھی سرکشی نہ کرے۔ کامیاب اجتماعی زندگی کا واحد راز یہ ہے کہ آدمی اپنی حد کے اندر رہنے پر راضی ہوجائے اور موت بلاشبہ اس حقیقت کی سب سے بہتر معلم ہے۔

ساٹھ کیلو میٹر

جابر حسین ایک ریلوے گارڈ تھے ۔ ان کی ملازمت کی مدت پوری ہو چکی تھی ۔ ۱۷ جولائی ۱۹۸۱ کو وہ اندور ۔ بلاسپور اکسپریس لے کر روانہ ہوئے ۔ یہ گارڈ کی حیثیت سے ان کا آخری سفر تھا ۔ کیونکہ اگلے دن ۱۸ جولائی سے وہ ریٹائر ہونے والے تھے ۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے اپنی زندگی کا پورا نقشہ بنا رکھا تھا ۔ ان کا خیال تھا کہ اب وہ اپنے اس نقشہ کو زیر عمل لانے کے کنارے پہنچ چکے ہیں ۔ ریلوے گارڈ کی حیثیت سے اپنی ڈیوٹی کے آخری سفر پر روانہ ہوتے ہوئے انہوں نے اپنے دوستوں سے کہا " کل سے میری دوسری زندگی شروع ہو گی "۔

یہ سفر جابر حسین کے لئے واقعی آخری سفر تھا اور اس کے بعد ہی ان کی دوسری زندگی شروع ہو گئی ۔ مگر اس معنی میں نہیں جس میں کہ انہوں نے سمجھا تھا بلکہ کسی اور معنی میں ۔ ان کی اکسپرس ٹرین اپنی منزل سے ساٹھ کیلو میٹر کے فاصلہ پر تھی کہ پیچھے سے آنے والی ایک مال گاڑی ان کی ٹرین سے ٹکرا گئی ۔ گارڈ کا ڈبہ چکنا چور ہو گیا ۔ جابر حسین فوراً ہلاک ہو گئے ۔ ایک ریلوے افسر نے اس حادثہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا :

Sixty kilometres more and it would have been the end of his official journey.

جابر حسین نے اگر ۶۰ کیلو میٹر اور طے کر لیا ہوتا تو ریلوے ملازم کی حیثیت سے ان کا سفر پورا ہو جاتا (انڈین اکسپریس ۱۸ جولائی ۱۹۸۱)

یہی اس دنیا میں ہر آدمی کا حال ہے ۔ ہر آدمی اپنی زندگی کو لمبی تصور کئے ہوئے ہے ۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا سفر "۶۰ کیلو میٹر" کے بعد پورا ہو گا ۔ مگر موت کا فرشتہ اس کو ۶۰ کیلو میٹر سے پہلے ہی پکڑ لیتا ہے ۔ ہر آدمی موجودہ دنیا میں "اپنی کل" کی تعمیر کا ایک نقشہ لئے ہوئے ہے ۔ مگر اچانک موت آ کر اس کو بتاتی ہے کہ اس کی "کل" اس دنیا میں شروع نہیں ہوتی جہاں ۱۷ جولائی کے بعد ۱۸ جولائی اور ۱۸ جولائی کے بعد ۱۹ جولائی کی تاریخیں آتی ہیں ۔ بلکہ اس کی کل اس ابدی دنیا میں شروع ہوتی ہے جہاں دنیا کے کیلنڈر لپیٹ کر رکھ دئے جاتے ہیں ۔ آدمی جہاں اپنے سفر کو ختم سمجھ رہا ہے وہیں سے اس کے حقیقی سفر کا آغاز ہوتا ہے ۔

زندگی کا سفر

مصطفیٰ رشید شروانی مشہور مجاہد آزادی اور صنعت کار اور ممبر راجیہ سبھا، ٹرین کے ذریعہ الٰہ آباد سے دہلی جا رہے تھے۔ گورنر کشمیر مسٹر بی کے نہرو بھی انھیں کے کمپارٹمنٹ میں تھے۔ ٹرین غازی آباد پہنچی تھی کہ مصطفیٰ رشید شروانی پر دل کا سخت دورہ پڑا۔ قبل اس کے کہ انھیں کوئی طبی امداد پہنچے، فوراً ہی ٹرین میں ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ ۸ اپریل ۱۹۸۱ کا واقعہ ہے۔ انتقال کے وقت مرحوم کی عمر ۵۹ سال تھی۔

اس طرح کے واقعات مختلف شکلوں میں ہر روز ہوتے ہیں۔ ہر دن بے شمار زندہ لوگ موت کے دروازہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ہر روز لاکھوں آدمیوں کے ساتھ یہ واقعہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقام سے نکل کر کسی "دہلی" کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ مگر درمیان ہی میں ان کو خدا کے فرشتے پکڑ لیتے ہیں اور ان کو "دہلی" کے بجائے آخرت کی منزل پر پہنچا دیتے ہیں۔

ہر آدمی امیدوں اور تمناؤں کی ایک دنیا اپنے ذہن میں لئے ہوئے ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی امیدوں کی دنیا کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ میں اپنے خوابوں والے "کل" کی طرف چلا جا رہا ہوں۔ مگر بہت جلد اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمناؤں والی دنیا کے بجائے خدا کی دنیا کی طرف بڑھ رہا تھا، وہ دنیا کی منزل کی طرف نہیں بلکہ آخرت کی منزل کی طرف چلا جا رہا تھا۔ آدمی کہاں جا رہا ہے اور کہاں پہنچ رہا ہے، مگر کسی کو اس کی خبر نہیں۔

آدمی اپنے بچوں کے مستقبل کی خاطر اپنا سب کچھ لگا دیتا ہے مگر قبل اس کے کہ وہ اپنے بچوں کے مستقبل کو دیکھ کر خوش ہو وہ خود اپنے اس مستقبل کی طرف ہانک دیا جاتا ہے جس کے لئے اس نے کوئی تیاری نہیں کی تھی۔ آدمی اپنے آرام کے لئے ایک شان دار مکان کھڑا کرتا ہے مگر ابھی وہ وقت نہیں آتا کہ وہ اپنے خوابوں کے مکان میں سکھ چین کے ساتھ رہے کہ موت اس کے اور اس کے مکان کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔ آدمی اپنی معاش کو بڑھاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں عزت و ترقی کی بلندیوں پر اپنے کو بٹھانے جا رہا ہوں مگر بہت جلد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ آنے والا دن اس کے لئے جس چیز کا انتظار کر رہا تھا وہ ایک سنسان قبر تھی نہ کہ عزت و ترقی کی رونقیں۔

خدا ہر دن کسی "دہلی" کے مسافر کو "قبر" میں پہنچا رہا ہے۔ مگر آدمی ان واقعات سے سبق نہیں لیتا۔ اس کے باوجود ہر آدمی یہی سمجھتا ہے کہ وہ "دہلی" کی طرف چلا جا رہا ہے۔ قبر کی منزل اس کے لئے کبھی آنے والی نہیں۔

موت کے آگے

فرانس کے لوئی یازدہم (۱۴۲۳-۱۴۸۳) نے ساٹھ سال تک بادشاہ کی حیثیت سے زندگی گزاری۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ آخر عمر میں وہ ایک بند قلعہ میں رہنے لگا جہاں بہت کم لوگوں کو داخلہ کی اجازت تھی۔ قلعہ کے چاروں طرف گہری خندق کھود دی گئی تھی تاکہ کوئی اس کے قریب نہ پہنچ سکے۔ قلعہ کی دیواروں پر ہر وقت چالیس تیر انداز بیٹھے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ چالیس گھوڑسوار دن رات اس کے چاروں طرف گشت کرتے رہتے تھے۔ بادشاہ کا حکم تھا کہ جو بھی بلا اجازت قلعہ کے اندر آنے کی کوشش کرے اس کو پکڑ کر اسی وقت قتل کر دیا جائے۔ قلعہ کے اندر بادشاہ کے لئے ہر قسم کا عیش وعشرت کا سامان مہیا کیا گیا تھا تاکہ بادشاہ کا دل کبھی غمگین نہ ہونے پائے۔

لوئی یازدہم کو زندہ رہنے کا اتنا شوق تھا کہ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ موت کا لفظ اس کے سامنے ہرگز نہ بولا جائے۔ ایک ماہر ڈاکٹر ہر آن بادشاہ کی خدمت میں حاضر رہتا تھا۔ اس ڈاکٹر کو دس ہزار سنہری کراون ماہوار دئے جاتے تھے۔ اس وقت یورپ کے کسی میدان جنگ میں چالیس سال کام کرکے بھی ایک فوجی افسر اتنی تنخواہ حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

تاہم ان میں سے کوئی چیز بادشاہ کو بڑھاپے اور کمزوری سے نہ بچا سکی۔ آخر میں وہ اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ مشکل سے وہ کھانے کی کوئی چیز اٹھا کر اپنے منہ میں ڈال سکتا تھا۔ اس کے باوجود اس کی جینے کی خواہش وہم کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ اس کو کسی نے بتایا کہ کچھوے پانچ سو سال تک جیتے ہیں اور وہ زندگی بخش خواص کے مالک ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس نے کچھ لوگوں کو تین بحری جہاز دیکر جرمنی اور اٹلی روانہ کیا تاکہ وہاں سے اس کے لئے بحری کچھوے لے آئیں۔ یہ کچھوے اس کے قریب ایک بڑے حوض میں رکھے گئے تاکہ اس کو زندگی کا فیضان عطا کر سکیں۔

آخر کار لوئی پر فالج کا حملہ ہوا اور ۳۰ اگست ۱۴۸۳ کو موت نے اس پر قابو پا لیا۔ بالآخر اس کو معلوم ہو گیا کہ کوئی شخص موت کو نہیں جیت سکتا۔ اس کی زبان سے جو آخری الفاظ مرنے سے پہلے نکلے وہ یہ تھے:

میں اتنا بیمار تو نہیں ہوں جتنا آپ لوگ خیال کرتے ہیں۔

تاہم اس کی تمام کوششیں بے کار ہو گئیں۔ ۳۰ اگست ۱۴۸۳ کو وہ مر گیا۔ آخر کار بادشاہ فرانس کو معلوم ہو گیا کہ کوئی شخص موت کو جیت نہیں سکتا۔

روپیہ سے راکھ تک

گھنشیام داس برلا (۱۹۸۳-۱۸۹۴) ہندستان کے مشہور ترین صنعت کار تھے۔ ان کی اعلیٰ کامیابی کا راز ان کی بے حد با اصول زندگی تھی۔ انھوں نے ۱۲ سال کی عمر میں معمولی کاروبار سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ پھر وہ عظیم ترقی تک پہنچے آج ان کا خاندان ہندستان کا واحد سب سے بڑا کاروباری خاندان ہے۔

مسٹر برلا کا معمول تھا کہ صبح ۵ بجے اٹھتے اور شام ۹ بجے تک مسلسل کام میں مشغول رہتے۔ ان کی زندگی انتہائی سادہ تھی۔ وہ شراب کے بجائے کافی پیتے تھے۔ دو کھانے کے درمیان پانی کے سوا اور کچھ نہیں لیتے تھے۔ اکثر اپنا کھانا خود اپنے ہاتھ سے پکاتے۔

مسٹر برلا روزانہ صبح کو ٹہلنے کے لئے نکلتے تھے۔ اس معمول میں کوئی فرق نہیں آتا تھا، خواہ وہ ہندستان میں ہوں یا ہندستان کے باہر۔ ۱۱ جون ۱۹۸۳ کو وہ لندن میں تھے۔ وہ حسب معمول صبح کے ناشتہ کے بعد ریجنٹ اسٹریٹ پر ٹہلنے کے لئے نکلے۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد انھیں تکلیف محسوس ہوئی۔ انھوں نے اپنے دو مددگاروں کو بتایا جو اس وقت ان کے ساتھ تھے۔ وہ انھیں فوراً گھر واپس لائے۔ گھر آتے ہی وہ بے ہوش ہوگئے۔ اس کے بعد انھیں لندن کے مڈل سکس اسپتال پہنچایا گیا۔ اسپتال میں انھیں تھوڑی دیر کے لئے ہوش آیا۔ وہاں انھوں نے کہا —— ڈاکٹر، مجھے کیا تکلیف ہے۔

What is wrong with me, Doctor ?

ڈاکٹروں نے کہا۔ ہم پانچ منٹ میں معائنہ کرکے بتاتے ہیں۔ مگر قبل اس کے کہ ڈاکٹروں کا معائنہ مکمل ہو ان کا انتقال ہوچکا تھا۔ مسٹر برلا کی وصیت تھی کہ جہاں میرا انتقال ہو وہیں میرے آخری مراسم ادا کئے جائیں۔ چنانچہ مسٹر برلا کی لاش کو لندن میں بجلی کے ذریعہ جلا دیا گیا۔ اور ان کی راکھ ہندستان لاکر یہاں کی ندیوں میں بہادی گئی۔ مسٹر برلا کی اسکول میں تعلیم نہیں ہوئی۔ تاہم بعد کو انھوں نے ذاتی محنت سے اپنے اندر لیاقت پیدا کی۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف بنے۔ ان کی ایک کتاب کا ہندی نام ہے —— روپیہ کی کہانی۔

مسٹر برلا نے "روپیہ کی کہانی" لکھی، حالانکہ بالآخر وہ خود "راکھ کی کہانی" بننے والے تھے۔ یہی ہر آدمی کا معاملہ ہے۔ ہر آدمی اپنی کامیابی کی داستان لکھ رہا ہے۔ حالانکہ آخر کار وہ جہاں پہنچنے والا ہے وہ مکمل بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

جب سفر ختم ہوگا

ایکسپرس ٹرین لمبا سفر طے کرنے کے بعد منزل پر پہنچ رہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف ظاہر ہونے والے آثار بتا رہے تھے کہ آخری اسٹیشن قریب آگیا ہے۔ ٹرین کے سیکڑوں مسافروں میں نئی زندگی پیدا ہوگئی تھی۔ کوئی بستر باندھ رہا تھا۔ کوئی کپڑے بدل رہا تھا۔ کوئی اشتیاق بھری نظروں سے کھڑکی کے باہر دیکھ رہا تھا۔ ہر ایک کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی، ہر ایک آنے والے پُر مسرت لمحہ کا منتظر تھا جبکہ وہ ٹرین سے اتر کر اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائے۔

اچانک زور کا دھماکا ہوا۔ ایکسپرس ٹرین یارڈ میں کھڑی ہوئی دوسری ٹرین سے ٹکرا گئی۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آیا اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں ——— خوشیاں اچانک غم میں تبدیل ہوگئیں۔ زندگیاں موت کی آغوش میں سو گئیں، امیدوں کے محل کی ایک ایک اینٹ بکھر گئی۔ ایک کہانی جس کا اختتام بظاہر طربیہ (Comedy) پر ہو رہا تھا، اپنے آخری نقطہ پر پہنچ کر اچانک المیہ (Tragedy) میں تبدیل ہوگیا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ زندگی کا ہے۔ آدمی بے شمار کوششوں کے بعد پُر اعتماد معاشی زندگی بناتا ہے۔ وہ اپنے حوصلوں کو ایک بنے ہوئے گھر کی صورت میں تعمیر کرتا ہے۔ وہ اپنے لئے ایک کامیاب زندگی کا مینار کھڑا کرتا ہے۔ مگر عین اس وقت اس کی موت آجاتی ہے۔ اپنے گھر کو سونا چھوڑ کر وہ قبر میں لیٹ جاتا ہے۔ اس کا چکنا جسم مٹی اور کیڑے کی نذر ہو جاتا ہے۔ اس کی کوششوں کا حاصل اس سے اس طرح جدا ہو جاتا ہے جیسے آدمی اور اس کے درمیان کبھی کوئی تعلق ہی نہ تھا۔

"کوٹھی" کا خواب دیکھنے والا مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ "قبر" میں داخل ہو، وہ قبر کے راستہ سے گزر کر حشر کے میدان میں پہنچ جائے۔ یہ دوسری دنیا اس کی آرزوؤں کی دنیا سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ یہاں وہ اتنا مفلس ہوتا ہے کہ اس کے جسم پر کپڑا بھی نہیں ہوتا۔ اس کی ساری کمائی اس سے جدا ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھی اس سے بچھڑ جاتے ہیں۔ اس کا زور اس سے رخصت ہو جاتا ہے۔ ان چیزوں میں سے کوئی چیز وہاں اس کا ساتھ دینے کے لئے موجود نہیں ہوتی جن کے بل پر وہ دنیا میں گھمنڈ کر رہا تھا۔

آہ وہ سفر بھی کیسا عجیب ہے جو عین اختتام پر پہنچ کر حادثہ کا شکار ہو جائے۔

قبر نہیں دروازہ

"حافظ جی کے لڑکے کا انتقال ہوگیا ہے۔ جنازہ کی نماز تیار ہے۔ میں آپ کو بلانے کے لئے آیا ہوں"۔ یہ سنتے ہی میں نے کتاب بند کی اور وضو کر کے ان کے ساتھ روانہ ہوگیا۔

قبرستان پہنچا تو وہاں میرے سوا تھوڑے سے آدمی اور کھڑے تھے۔ گنا تو چھوٹے بڑے سترہ آدمی تھے جن میں میت کے گھر کے افراد بھی شامل تھے۔ مجھے ایک مہینہ پہلے کی بات یاد آئی جب کہ سیٹھ فضل علی کے ایک رشتہ دار کا جنازہ اسی قبرستان میں آیا تھا اور قبرستان کے خصوصی حصہ میں دفن ہوا تھا۔ اس دن آدمیوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ شمار کرنا مشکل تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا بستی کی تمام مسلم آبادی نکل آئی ہے۔

میرے پہنچنے کے چند منٹ بعد محلہ کے امام صاحب نماز جنازہ کے لئے کھڑے ہوگئے۔ میں نے بھی صف میں شامل ہو کر نیت باندھ لی مگر امام صاحب نے اتنی تیزی سے نماز پڑھائی کہ میں کوئی دعا بھی پوری نہ پڑھ سکا۔ بس جلدی جلدی چار بار اللہ اکبر کی آواز آئی اور تھوڑی دیر بعد انھوں نے سلام پھیر دیا۔ لوگ اپنے جوتے پہن کر اطمینان کے ساتھ اس طرح کھڑے ہوگئے گویا "نماز جنازہ" کے نام سے جو کام انھیں کرنا تھا اس کو انھوں نے پوری طرح انجام دے دیا ہے۔

قبر قریب ہی تھی۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ابھی کھودی جارہی ہے۔ لوگ دو دو چار چار کر کے اِدھر اُدھر کھڑے ہوگئے۔ کوئی فرقہ وارانہ مظالم کی داستان سنانے لگا۔ کسی نے موسم کی سختی کا ذکر چھیڑ دیا۔ کوئی بازار بھاؤ کے متعلق اپنی معلومات پیش کرنے لگا۔ غرض اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہوگئیں۔

میں قبر کے سامنے خاموش کھڑا تھا۔ میرے ذہن میں وہ آیتیں اور حدیثیں گھوم رہی تھیں جن میں قیامت، حشر، جنت، دوزخ وغیرہ کے حالات بتائے گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا قبر ایک کھلا ہوا دروازہ ہے جس کے سامنے کھڑے ہو کر میں دوسری دنیا کے مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ میرا دل بے قرار ہوگیا۔ میری زبان سے نکلا "زندگی کا اصل مسئلہ وہ نہیں ہے جس میں لوگ الجھے ہوئے ہیں۔ بلکہ اصل مسئلہ وہ ہے جو موت کے بعد سامنے آنے والا ہے۔ کاش لوگوں کو معلوم ہوتا کہ وہ اس وقت کس واقعہ کے درمیان کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ ایک شخص کی عارضی دنیا سے حقیقی دنیا کی طرف روانگی کی تقریب ہے۔ یہ قبر جو ہمارے سامنے کھودی جارہی ہے، یہ قبر نہیں ہے بلکہ یہ ایک دروازہ ہے جو ایک شخص کو دوسری دنیا میں داخل کرنے کے لئے کھولا گیا ہے۔ جانے والا ابھی اس دروازہ میں داخل ہو کر اُس پار چلا جائے گا۔

جب بھی کوئی شخص مرتا ہے تو یہ ایک خاص وقت ہوتا ہے۔ اس وقت گویا تھوڑی دیر کے لئے اس دنیا کا دروازہ کھولا جاتا ہے جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے۔ اگر دیکھنے والی آنکھ ہو تو اس کھلے ہوئے دروازہ سے دوسری دنیا کی جھلک صاف دیکھی جاسکتی ہے جہاں ہم میں سے ہر شخص کو ایک روز جانا ہے۔ مگر آج کی دنیا کے مناظر نے لوگوں کی نگاہوں کو اس قدر الجھا رکھا ہے کہ عین دروازہ پر کھڑے ہو کر بھی انھیں اس پار کی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی۔ وہ حقیقت کے انتہائی قریب پہنچ کر بھی حقیقت سے بے خبر رہ جاتے ہیں

گڑھے میں پاؤں

مسٹر پی۔وی۔ وینکیٹیشورن ایک سرکاری ادارہ میں چیف مارکٹنگ منیجر تھے۔ ۲۹ مئی ۱۹۸۲ کی شام کو انھوں نے دہلی کے گوپالا ٹاور میں ایک میٹنگ میں شرکت کی۔ آٹھویں منزل پر اپنی میٹنگ سے فارغ ہو کر وہ دفتر سے باہر نکلے تو بجلی فیل ہو چکی تھی، وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ لفٹ تک آئے۔ انھوں نے دیکھا کہ اس کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ وہ سمجھے کہ لفٹ آگئی ہے حالاں کہ لفٹ ابھی اوپر نویں منزل پر تھی۔ مسٹر وینکیٹیشور لفٹ کے دروازے کی طرف لپکے۔ اس وقت وہ میٹنگ کے فیصلوں سے اتنا خوش تھے کہ وہ صورت حال کی نزاکت کا اندازہ نہ کر سکے۔ انھوں نے اپنا ایک پاؤں لفٹ کے اندر ڈال دیا۔ مگر وہاں خالی تھا۔ وہ اچانک آٹھویں منزل سے زمین پر آ گرے۔ ان کا ذاتی ڈاکٹر ان کے ساتھ تھا مگر وہ صرف یہ خدمت انجام دے سکا کہ نیچے اتر کر ان کی لاش کو دیکھے اور ان کے مردہ ہونے کا اعلان کرے۔ موت کے وقت ان کی عمر اکیاون سال تھی (ہندستان ٹائمس ۳۰ مئی ۱۹۸۲)

مسٹر وینکیٹیشور ایک نہایت کامیاب افسر تھے۔ حال میں ایک سرکاری جرنل میں ان کے بارے میں یہ الفاظ چھپے تھے ——— ایک بہادر کارکن، ایک مستعد اور اختراعی منتظم، جس کے اندر میں آگ لگی ہوئی ہو اور جس کے دماغ میں نظریات کا خزانہ ہو، ایک ہوشیار جنرل:

A thoroughbred professional and a dashing innovative manager with fire in his belly and ideas in his mind, an astute general

دنیا کے اعتبار سے مسٹر وینکیٹیشور کا کیس ایک انوکھا کیس ہے۔ مگر آخرت کے اعتبار سے ہر آدمی یہی فعل انجام دے رہا ہے، ہر آدمی عقل مندی اور کامیابی کے جوش میں ایسی جگہ اپنا پاؤں رکھ رہا ہے جو اس کو سیدھے آخرت کے گڑھے میں گرا دینے والا ہے ——— کسی کو بے عزت کرنے والے الفاظ بولنا، کسی کو ستانے کے لئے اقدام کرنا، کسی کے خلاف ضد اور انتقام کے تحت کارروائی کرنا، کسی کے ساتھ ظلم اور بے انصافی برتنا۔ کسی کو ناحق اپنے زور وطاقت کا نشانہ بنانا، کسی کا بے دلیل مذاق اڑانا، یہ سب گویا "آٹھویں منزل" کے خالی مقام پر پاؤں رکھنا ہے۔ ایسا ہر اقدام آدمی کو تباہی کے نچلے گڑھے میں پہنچا دیتا ہے۔ اس کے بعد نہ اس کے ساتھی اس کو بچانے والے ثابت ہو سکتے ہیں نہ اس کی خوش فہمیاں ——— ہر آدمی گڑھے میں پاؤں رکھ رہا ہے۔ اگرچہ بطور خود وہ سمجھتا ہے کہ وہ محفوظ تختہ پر اپنا قدم جمائے ہوئے ہے۔

انسان کا المیہ

ڈاکٹر اتم پرکاش (۱۹۸۲ - ۱۹۲۸) ہندستان کے ایک نامور سرجن تھے۔ وہ آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں شعبہ سرجری کے ہڈ تھے۔ ڈاکٹر پرکاش کو پدم بھوشن کا انعام ملا تھا۔ سرجری کی عالمی کانگرس ۱۷ فروری کو دہلی میں ہونے والی تھی جس کی صدارت کی کرسی ان کا انتظار کر رہی تھی۔ مگر ۱۴ فروری کو ان پر دل کا دورہ پڑا اور اسپتال پہنچتے پہنچتے ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۵۴ سال تھی۔

سرجری پر ہونے والی ورلڈ کانگرس کی کامیابی ان کے ذاتی وقار کو بہت زیادہ بڑھا دیتی۔ اس بنا پر وہ اس کے معاملات میں غیر معمولی دل چسپی لے رہے تھے۔ انھوں نے راشٹرپتی سنجیوا ریڈی کو آمادہ کر لیا تھا کہ وہ کانگرس کا افتتاح کریں۔ مگر جب سارے انتظامات مکمل ہو چکے تو راشٹرپتی بھون سکریٹریٹ سے بتایا گیا کہ راشٹرپتی ان کے اجلاس میں صرف اس وقت شرکت کر سکیں گے جب کہ مرکزی وزیر صحت بھی وہاں موجود ہوں۔ پروٹوکول (آداب شاہی) کے مطابق ایسا ہونا ضروری ہے۔

اس سے پہلے ڈاکٹر پرکاش کے منصوبہ میں وزیر صحت کو بلانا شامل نہ تھا۔ مگر اب ضروری ہو گیا کہ وزیر صحت کو بھی شرکت اجلاس کی دعوت دی جائے۔ ڈاکٹر پرکاش نے وزیر صحت کے دفتر کا طواف شروع کیا۔ مگر اب یہاں دوہری رکاوٹ حائل تھی۔ وزیر صحت اجلاس میں شرکت پر راضی نہ ہو سکے۔ ایک ایسے اجلاس میں شرکت کرنا ان کی عزت نفس کے خلاف تھا جس کے اولین پروگرام میں ان کو شامل نہ کیا گیا ہو۔ یہ صدمات ڈاکٹر اتم پرکاش کے لئے اتنے سخت ثابت ہوئے کہ اجلاس کے تین دن پہلے ان پر دل کا سخت دورہ پڑا اور اسی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ کوئی شخص اپنے وقت سے پہلے نہیں مرتا۔ مگر ایک اخباری مبصر (ہندستان ٹائمس ۱۶ فروری ۱۹۸۲) کے یہ الفاظ بالکل درست ہیں کہ موت کے طویل سفر پر روانہ ہونے سے پہلے وہ دہلی کے سب سے زیادہ پریشان آدمی تھے:

He was the most worried man in town before he took the long road

آج آدمی وقار کے کھونے کو بھی برداشت نہیں کر پاتا۔ پھر آنے والی دنیا میں آدمی کا کیا حال ہوگا۔ جب اس کو بھوک اور پیاس لگے گی مگر وہاں کھانا نہ ہوگا جس کو وہ کھائے اور پانی نہ ہوگا جس سے وہ اپنی پیاس بجھائے۔ وہ تیز دھوپ میں جل رہا ہوگا مگر اس کے لئے کوئی سایہ نہ ہوگا جس کے نیچے وہ پناہ لے۔ عذاب اس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہوگا مگر وہاں کوئی مددگار نہ ہوگا جو اس کی مدد کو پہنچے۔ آہ وہ انسان جو کنکری کی چوٹ کو برداشت نہیں کر پاتا حالانکہ اس کے اوپر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ کر گرنے والا ہے۔

چھوڑنے کے لئے

برطانی دورِ حکومت میں ہندستان کا دار السلطنت کلکتہ تھا۔ ۱۹۱۱ میں برطانیہ نے یہ فیصلہ کیا کہ دار السلطنت کو کلکتہ سے دہلی منتقل کر دیا جائے۔ انگریز ماہر تعمیرات سر ایڈون لیوٹنس (۱۹۴۴-۱۸۶۹) نے نئے دار السلطنت کا نقشہ بنایا۔ ۱۹۱۳ میں پرانی دہلی کے جنوب میں رائے سینا پہاڑیوں کے علاقہ میں تعمیرات شروع ہوئیں۔ بالآخر وہ عالی شان آبادی وجود میں آئی جس کو نئی دہلی کہا جاتا ہے۔

یہ زمانہ وہ تھا جب کہ ساری دنیا میں ایک نئی سیاسی لہر آچکی تھی۔ یہ قومی تحریکوں کی لہر تھی۔ سیاسی افکار کی دنیا میں نئے انقلابات نے نوآبادیاتی نظام کا جواز ختم کر دیا تھا۔ ہندستان میں آزادی کی تحریک تیزی سے جڑ پکڑ رہی تھی۔ بظاہر یہ بات کھل چکی تھی کہ ہندستان میں برطانیہ کی حکومت اب زیادہ دیر تک باقی رہنے والی نہیں۔

نئی دہلی کی تعمیر کے بعد اسی زمانہ میں فرانس کے ایک لیڈر نے ہندستان کا دورہ کیا۔ جب وہ نئی دہلی آئے اور یہاں نیا تعمیر شدہ عظیم دار السلطنت دیکھا تو انھوں نے اس پر اظہار رائے کرتے ہوئے کہا: ـــــــ انھوں نے کیسی شاندار دنیا بنائی ہے، صرف اس لئے کہ وہ اسے چھوڑ دیں:

What a magnificent world they built to leave

یہ کہانی صرف برطانیہ کی کہانی نہیں ہے بلکہ تمام انسانوں کی کہانی ہے۔ یہاں ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ آرزوؤں اور تمناؤں کو لئے ہوئے دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ اپنی تمام قوتوں کا استعمال کرکے وہ اپنا ایک "شاندار گھر" بناتا ہے۔ مگر عین اس وقت جب کہ اس کی آرزوؤں کا گھر بن کر مکمل ہوتا ہے، اچانک موت کا فرشتہ آجاتا ہے اور اس کو اس کی محنتوں سے بنائی ہوئی دنیا سے جدا کرکے وہاں پہنچا دیتا ہے جس کو آرتھر کوئسلر نے نامعلوم ملک Unknown Country کا نام دیا ہے۔

زندگی کی کہانی اگر اتنی ہی ہو تو وہ کیسی عجیب و دردناک کہانی ہے۔ مگر جس طرح دنیا کی ہر چیز اپنے جوڑے کے ساتھ مکمل ہوتی ہے۔ اسی طرح موجودہ دنیا کا بھی ایک تکمیلی جوڑا ہے۔ اور وہ جوڑا آخرت ہے۔ جو شخص آخرت کو بھولا ہوا ہے اس کی زندگی یقیناً صرف ایک المیہ ہے۔ مگر جو شخص امکان آخرت سے فائدہ اٹھائے اور موجودہ دنیا کے مواقع کو اگلی دنیا کی تعمیر میں صرف کرے۔ اس کے لئے موجودہ دنیا ایک نئی زیادہ کامیاب زندگی کا قیمتی زینہ بن جائے گی۔

آخرت کے بغیر انسان کی زندگی صرف ایک المیہ ہے۔ مگر آخرت کو ملانے کے بعد وہ ایک طربیہ میں بدل جاتی ہے۔

موت کا سبق

ایک مجرم کو بتایا گیا کہ عدالت اس کے خلاف فیصلہ کر چکی ہے اور کل صبح اس کو پھانسی دے دی جائے گی۔ پھانسی اگرچہ کل کے دن ہونے والی تھی مگر آج ہی اس کا یہ حال ہوا گویا اس کو پھانسی دی جا چکی ہو۔ زندگی اس کے لئے بے قیمت ہو گئی۔ اس کا ہنسنا اور بولنا ختم ہو گیا۔ اس کے ہاتھ جو دوسروں کے خلاف اٹھتے تھے، اب اس قابل نہ رہے کہ کسی کے خلاف اٹھیں۔ اس کے پاؤں جو ہر طرف دوڑنے کے لئے آزاد تھے، اب ان میں یہ طاقت بھی نہ رہی کہ وہ کہیں بھاگنے کی کوشش کریں۔

موت بتاتی ہے کہ یہی معاملہ ہر ایک کا ہے۔ ہر آدمی جو آج زندہ نظر آتا ہے، کل کے دن اسے "پھانسی" کے تختہ پر لٹکنا ہے۔ مگر ہر آدمی اس سے بے خبر ہے۔ ہر ایک اپنے آج میں گم ہے، کسی کو اپنے کل کا احساس نہیں۔ یہاں ہر آدمی "مجرم" ہے مگر بہت کم لوگ ہیں جو اپنے مجرم ہونے کو جانتے ہوں۔

آدمی زمین پر چلتا پھرتا ہے۔ وہ دیکھتا اور سنتا ہے۔ وہ اپنے مال اور اپنے ساتھیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آتا ہے۔ اس سے پوچھے بغیر اچانک اس کی موت آجاتی ہے۔ اس کے چلتے ہوئے قدم رک جاتے ہیں۔ اس کی دیکھنے والی آنکھیں بے نور ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنی ہر چیز سے جدا ہو کر قبر کی تنہائی میں چلا جاتا ہے۔

موت کا یہ واقعہ آدمی کی حقیقت کو بتا رہا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ آدمی اختیار سے بے اختیاری کی طرف جا رہا ہے۔ وہ اجالے سے اندھیرے کی طرف جا رہا ہے۔ وہ سب کچھ سے بے کچھ کی طرف جا رہا ہے۔ موت سے پہلے وہ اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے جہاں وہ اپنے ارادہ کا آپ مالک ہے۔ موت کے بعد وہ ایک ایسی دنیا میں چلا جاتا ہے جہاں وہ کسی اور کی ماتحتی قبول کرنے پر مجبور ہوگا۔

آدمی اگر اس حقیقت کو یاد رکھے تو اس کی زندگی بالکل بدل جائے۔ کسی پر قابو پا کر اسے ستانا اس کو مضحکہ خیز معلوم ہو۔ کیونکہ جو شخص خود کل دوسرے کے قابو میں جانے والا ہے وہ کسی کو ستا کر کیا پائے گا۔ اپنے کو بڑا سمجھنے پر اسے شرم آئے گی۔ کیونکہ جو بڑائی بالآخر چھن جانے والی ہو اس کی کیا حقیقت۔

موت کا حملہ

سکندر اعظم (۳۲۳ - ۳۵۶ ق م) یونانی بادشاہ فلپ کا لڑکا تھا۔ اس نے تخت ملنے کے بعد دس سال کی مدت میں اس زمانہ کی معلوم دنیا کا بیشتر حصہ فتح کر ڈالا۔ مصر کا شہر اسکندریہ اس کے فتح مصر کی یادگار کے طور پر اب بھی موجود ہے۔ مگر بالآخر اس کا انجام کیا ہوا۔ وہ عراق کے قدیم شہر بابل کے ایک محل میں اسی طرح بے بسی کے ساتھ مر گیا جس طرح ایک غریب اور کمزور آدمی اپنی جھونپڑی میں مرتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں جو چاہا وہ پایا اور پھر سب کچھ پا کر خالی ہاتھ اس دنیا سے چلا گیا۔ اس کی وسیع سلطنت اس کے مرنے کے بعد اس کے تین فوجی سرداروں میں تقسیم ہو گئی، کیونکہ اس کا واحد بیٹا اس کی زندگی ہی میں قتل کیا جا چکا تھا۔

سکندر کی عظمت کا یہ حال تھا کہ جولیس سیزر ایک بار اسپین میں سکندر کے مجسمہ کے سامنے سے گزرا تو اس کو دیکھ کر وہ بے اختیار رونے لگا۔ اس نے کہا کہ سکندر نے جو فاتحانہ کارنامے دس برس کی مدت میں انجام دئے اس کا دسواں حصہ بھی میں اب تک انجام نہ دے سکا۔

سکندر مخالفت کو بالکل برداشت نہیں کرتا تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ مخالفت شروع ہوتے ہی اس کو فوراً کچل دینا چاہئے۔ کہا جاتا ہے کہ سکندر کی غیر معمولی فتوحات کا باعث اس کی برق رفتاری تھی۔ اچانک پہنچ کر دشمن کو دبوچ لینے کی صلاحیت اس کے اندر دنیا کے تمام جنرلوں سے زیادہ تھی، مگر موت اس سے بھی زیادہ تیز رفتار ثابت ہوئی۔ ۱۳ جون ۳۲۳ ق م کو جب موت اس کے اوپر حملہ آور ہوئی تو اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو بالکل بے بسی کے ساتھ موت کے حوالے کر دے۔

موت اس لئے آتی ہے کہ وہ انسان کو بتائے کہ وہ خدا کے آگے کس قدر بے بس ہے۔ آدمی ہر روز اپنے چاروں طرف موت کے واقعات کو دیکھتا ہے مگر وہ اس سے کوئی سبق نہیں لیتا۔ وہ زندگی کی اس سب سے بڑی حقیقت کو بھولا رہتا ہے، یہاں تک کہ موت آ کر اس سے خود اس مہلت کو چھین لیتی ہے کہ وہ سوچے اور اس سے سبق لے۔ موت آدمی کے لئے سب سے بڑا سبق ہے، مگر موت سے آدمی سب سے کم جو چیز لے رہا ہے وہ یہی ہے۔

آنے والا طوفان

۱۱ اگست ۱۹۷۹ کو موروی (گجرات) میں اچانک ایک سیلاب آیا جس نے پوری بستی کو تہس نہس کر دیا۔ بستی کے کنارے ایک بڑا بند تھا۔ غیر معمولی بارش سے اس کا پانی بہت اونچا ہوگیا۔ یہاں تک کہ اس نے بند کو توڑ ڈالا۔ ایک مشاہد کے الفاظ میں "تقریباً ۲۰ فٹ اونچی پانی کی دیوار" اتنی تیزی کے ساتھ بستی کے اندر داخل ہوئی کہ کوئی اس سے بچ نہ سکتا تھا۔ چند گھنٹوں کے اندر پانی کا یہ طوفان بستی کی تمام چیزوں کو برباد کرکے نکل گیا۔ اندازہ ہے کہ تقریباً ۲۵ ہزار آدمی اس اچانک سیلاب میں مرگئے۔ جب کہ بستی کی کل آبادی تقریباً ۴۰ ہزار تھی۔ بربادی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ دیگر چندوں کے علاوہ صرف مرکزی حکومت نے فوری امداد کے طور پر پانچ کرور روپے حکومت گجرات کو دئے ہیں۔

ایک انگریزی اخبار کے نامہ نگار ارن کمار نے جو چشم دید رپورٹ (ہندستان ٹائمس ۱۹ اگست ۱۹۷۹) شائع کی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ بچے ہیں ان میں سے ہر شخص کے پاس بتانے کے لئے ایک پُر درد کہانی ہے۔ ان کو جو صدمہ اور تکلیف پہنچی ہے اس کے احساس سے وہ ابھی تک نکل نہیں سکے ہیں، کچھ کا حال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی گویائی کھو دی ہے۔ وہ بالکل سراسیمہ اور ہکا بکا دکھائی دیتے ہیں:

Some have lost their speech and look absolutely dazed and blank.

ایک اور خبر میں بتایا گیا ہے کہ ایک تباہ حال زمیں دار کو اس وقت حیرت ناک خوشی ہوئی جب سرکاری ذمے داروں نے اس کو ۱۸ ہزار روپے نقد اور ۲۲۵ گرام سونے کے زیورات یہ کہہ کر دئے کہ یہ تمھارے گھر کے اندر سے دستیاب ہوئے ہیں (ہندستان ٹائمس ۲۰ اگست ۱۹۷۹)

اس طرح کے واقعات جو زمین پر روزانہ ہوتے رہتے ہیں، وہ اس لئے ہوتے ہیں تاکہ آدمی آخرت کے دن کو یاد کرے۔ آخرت کا عظیم تر سیلاب بھی بالکل اچانک آئے گا۔ بہت سے لوگ اس دن اس طرح برباد ہوں گے کہ ان کے الفاظ کے ذخیرے تک ختم ہو جائیں گے جو دنیا میں ہر آدمی کو نہایت وافر مقدار میں حاصل ہیں۔ ان کی چلتی ہوئی زبانیں بند ہو جائیں گی۔ وہ سراسیمہ نظروں سے اپنی ہولناک بربادی کو دیکھیں گے اور کچھ بول نہ سکیں گے۔ دوسری طرف کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جن کو یہ خوش خبری دی جائے گی کہ ہلاکت اور بربادی کے عمومی طوفان نے تم کو کچھ نقصان نہیں پہنچایا۔ تمھارا بہترین اثاثہ اللہ کے مزید انعام کے ساتھ آج تمھارے حوالے کیا جائے گا۔ ایک ہی سیلاب کچھ لوگوں کو جہنم میں دھکیل دے گا اور کچھ لوگوں کے لئے وہ جنت کی ابدی خوشیوں میں داخلہ کا دن بن جائے گا۔ "سیلاب" سے پہلے آدمی کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی ہر ظالمانہ روش کو درست ثابت کرنے کے لئے شان دار الفاظ پالیتا ہے۔ مگر "سیلاب" کی ہولناکی کو دیکھتے ہی اس کا سارا زور ختم ہو جائے گا، اور ایسا معلوم ہوگا گویا اس کے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں جن سے وہ اپنی روش کی صفائی پیش کر سکے۔

اس وقت کیا ہوگا

بخاری نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا کہ مجھے قرآن کا کوئی حصہ پڑھ کر سناؤ (اقراء علی) میں نے کہا، اے خدا کے رسول میں آپ کو قرآن سناؤں اور وہ آپ کے اوپر اترا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں، مجھے پسند ہے کہ میں قرآن کو اپنے سوا دوسرے سے سنوں۔ میں نے سورہ نساء پڑھنی شروع کی۔ یہاں تک کہ میں اس آیت پر پہنچا: فکیف اذا جئنا من کل امۃ بشہید وجئنا بک علی ھؤلاء شہیدا (پھر کیا ہوگا جب ہم ہر قوم سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور ان لوگوں پر تم کو گواہ بنا کر لائیں گے) آپ نے فرمایا، بس کرو۔ میں نے دیکھا تو آپ کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری تھے (فاذا عیناہ تذرفان)

وہ وقت کیسا عجیب ہوگا جب خدا کی عدالت قائم ہوگی۔ کسی کے لئے ڈھٹائی اور انکار کا موقع نہ ہوگا۔ وہی شخص جس کو دنیا میں لوگوں نے بے قیمت سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا اسی کو خدا کی طرف سے اس خاص بندہ کی حیثیت سے سامنے لایا جائے گا جس کو خدا نے اپنی طرف سے لوگوں کو آنے والے دن سے باخبر کرنے کے لئے چنا تھا۔ جس کو لوگوں نے اپنے درمیان سب سے کمزور آدمی سمجھ لیا تھا وہی اس وقت خدا کے حکم سے وہ شخص ہوگا جس کی گواہی پر لوگوں کے لئے جنت اور جہنم کا فیصلہ کیا جائے۔

ان لوگوں کا اس وقت کیا حال ہوگا جو دنیا میں بہت بولنے والے تھے مگر وہاں اپنے آپ کو گونگا پائیں گے۔ جو دنیا میں عزت اور طاقت والے سمجھے جاتے تھے وہاں اپنے آپ کو بالکل بے زور دیکھنے پر مجبور ہوں گے۔ جب ان کا ظاہری پردہ اتار اجائے گا اور لوگ دیکھیں گے کہ دین کا لبادہ پہننے والے دین سے بالکل خالی تھے۔ جب کتنی سفیدیاں کالی نظر آئیں گی اور کتنی رونقیں اتنی قبیح ہو جائیں گی کہ لوگ اس کی طرف نظر کرنے سے بھی گھبرائیں گے۔

موجودہ دنیا میں لوگ مصنوعی غلافوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ کسی کے لئے خوبصورت الفاظ اس کی اندرونی حالت کا پردہ بنے ہوئے ہیں اور کسی کے لئے اس کی مادی رونقیں۔ مگر آخرت میں لوگوں کے الفاظ بھی ان سے چھن جائیں گے اور ان کی مادی رونقیں بھی۔ اس وقت ہر آدمی اپنی اصلی صورت میں سامنے آجائے گا۔ کیسا سخت ہوگا وہ دن۔ اگر آج لوگوں کو اس کا اندازہ ہو جائے تو ان کے الفاظ کی شدت ختم ہو جائے، کسی چیز میں ان کے لئے لذت باقی نہ رہے۔ دنیا کی عزت بھی ان کو اتنی ہی بے معنی معلوم ہو جتنا دنیا کی بے عزتی۔

دنیا کی حقیقت

مسٹر آر۔ این پانڈے (۳۵ سال) ہندستانی فوج میں سکنڈ لفٹننٹ تھے۔ وہ ۱۲ نومبر ۱۹۸۳ کو جموں توی اکسپریس پر سوار ہوئے۔ ٹرین آگے بڑھی تو انھیں احساس ہوا کہ وہ غلط ٹرین پر سوار ہو گئے ہیں۔ انھیں دراصل آنچل اکسپریس پر سوار ہونا چاہئے تھا۔ جب اوکھلا کا اسٹیشن آیا تو وہ فرسٹ کلاس کا دروازہ کھول کر باہر کود پڑے۔ ٹرین اس وقت پوری رفتار میں تھی۔ وہ پہیہ کے نیچے آگئے اور اسی وقت کٹ کر مر گئے (ہندستان ٹائمس ۱۳ نومبر ۱۹۸۳)

یہ واقعہ موجودہ دنیا میں انسان کی بےبسی کی ایک تصویر ہے۔ انسان ٹرین بناتا ہے جب وہ اس پر بیٹھتا ہے تو وہ اس کو لے کر دوڑتی ہے اور منزل پر پہنچا دیتی ہے۔ مگر اسی ٹرین کے مقابلہ میں انسان اتنا کمزور ہے کہ اس کے پہیہ کے نیچے آنے کے بعد وہ اس کی زد سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا۔

ایک کامیاب انسان ہے۔ وہ ایک بہت بڑے مکان میں رہتا ہے جو اس کی خوش حال زندگی کی علامت ہے۔ اس کے گھر کے سامنے موٹر کار کھڑی ہوئی ہے جو اس کی شان میں اضافہ کرتی ہے۔ وہ ایک کارخانہ کا مالک ہے جو اس کی دولت اور ترقی کا سرچشمہ ہے۔ اس کے بےشمار ساتھی ہیں جو اس کی قوت و شوکت کا زندہ ثبوت ہیں۔

یہ وہ چیزیں ہیں جن سے آدمی کی دنیوی ترقی کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ تمام چیزیں سمیٹ کر اوپر سے آدمی کے سر پر گرائی جائیں تو وہ اس کی بربادی کا ذریعہ بن جائیں گی۔ یہ گویا ایک بہت بڑا ملبہ ہوگا جو آدمی کے اوپر پٹک دیا گیا اور اس کے نیچے دب کر اس کا وجود فنا ہو گیا۔

اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ دنیوی ترقی کی حقیقت کیا ہے۔ دنیا کی تمام ترقیاں اسی وقت تک ترقیاں نظر آتی ہیں جب تک وہ فریب کے روپ میں ہوں۔ جیسے ہی وہ اپنے اصلی روپ میں آئیں وہ صرف بربادی کا ڈھیر بن جاتی ہیں۔ یہ ترقیاں اپنے آخری انجام کے اعتبار سے کسی کے لئے قبرستان تو بن سکتی ہیں مگر وہ کسی کے لئے کامیابی کا شاندار محل نہیں بن سکتیں۔

لذتیں جنت میں لذت ہیں اور دنیا میں صرف فریب لذت۔ انسان کی غلطی یہ ہے کہ جو چیز جنت میں ملنے والی ہے اس کو وہ موجودہ دنیا ہی میں پانا چاہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے آدمی یہاں بھی محروم رہتا ہے اور وہاں بھی۔

کل کو جانیے

ضیاء الرحمن (۱۹۸۱-۱۹۳۶) سابق صدر بنگلہ دیش ڈھاکہ سے چاٹگام گئے۔ وہاں وہ ۳۰ مئی ۱۹۸۱ کو سرکاری ریسٹ ہاؤس میں آرام کر رہے تھے کہ رات کے وقت ان پر حملہ کر کے انھیں ہلاک کر دیا گیا۔ ان کو ہلاک کرنے والا بنگلہ دیش کا ایک فوجی افسر میجر جنرل منظور تھا۔ میجر جنرل منظور نے یہ گمان کیا تھا کہ صدر ضیاء الرحمن کو اقتدار سے ہٹانے کے بعد وہ بنگلہ دیش کی حکومت پر قبضہ کر لیں گے۔ مگر ان کا اندازہ غلط نکلا۔ فوج کے ایک دستہ کے سوا عام فوجیوں نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ صرف دو دن بعد ۲ جون ۱۹۸۱ کو مخالف فوجیوں نے انھیں گولی مار کر ہلاک کر دیا۔

جنرل منظور کا جو انجام ہوا وہی اس دنیا میں ہر آدمی کا انجام ہو رہا ہے۔ کسی کا بظاہر فوج کی گولی کے ذریعہ ہوتا ہے اور کوئی فرشتوں کے ذریعہ موت کے انجام تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ مگر کوئی اس سے سبق نہیں لیتا۔ کوئی "جنرل منظور" یہ نہیں سوچتا کہ اپنے حریف کو قتل کرنے کے اگلے ہی دن وہ بھی قتل کر دیا جائے گا۔ دوسرے کو موت کے گڑھے میں گرانے کے بعد وہ خود بھی لازمی طور پر موت کے گڑھے میں دھکیل دیا جائے گا۔

یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی کو کسی نہ کسی دائرہ میں اقتدار دیا جاتا ہے۔ کسی کے اختیار کا دائرہ بڑا ہے اور کسی کا دائرہ چھوٹا۔ مگر عجیب بات ہے کہ ہر آدمی اپنے دائرہ میں وہی بن جاتا ہے جو دوسرا اپنے دائرہ میں بنا ہوا ہے۔ یہاں ہر شخص "جنرل منظور" ہے۔ ہر شخص دوسرے کی کاٹ میں لگا ہوا ہے۔ ہر شخص دوسرے کی نفی پر اپنا اثبات کرنا چاہتا ہے۔ ہر شخص اپنی حیثیت کا غلط اندازہ کر کے سمجھتا ہے کہ اگر اس نے دوسرے کو اس کے مقام سے ہٹا دیا تو اس کا خالی مقام اسے مل جائے گا۔ وہ بھول جاتا ہے کہ جو چیز اس کا انتظار کر رہی ہے وہ کسی کا خالی مقام نہیں بلکہ خود اس کی اپنی قبر ہے۔

ہر شخص جو آج اپنے کو کامیاب سمجھتا ہے وہ کل اپنے کو ناکام دیکھنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہر روز ہو رہا ہے۔ مگر کوئی بھی شخص آج کے بعد آنے والے کل کو نہیں دیکھتا۔ ہر شخص اپنے "آج" کو جاننے کا ماہر ہے، کسی کو اپنے "کل" کی خبر نہیں۔

اپنے آج کو جاننے والو، اپنے کل کو جانو۔ کیونکہ بالآخر تم جس سے دوچار ہونے والے ہو وہ تمھارا کل ہے نہ کہ تمھارا آج۔

بے خبر انسان

آئیوری کوسٹ مغربی افریقہ کا ایک ساحلی ملک ہے۔ یہاں بجلی افراط کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ گھروں اور دکانوں کی جگمگاہٹ کی وجہ سے اس کو افریقہ کا شوکیس کہا جاتا تھا (ٹائمس آف انڈیا ۴ جنوری ۱۹۸۴)

دسمبر ۱۹۸۳ میں اچانک وہ ایسا ملک بن گیا جہاں لوگ عالی شان ہوٹلوں میں موم بتی کی روشنی میں کھانا کھائیں اور گھروں اور دفتروں کو بھی موم بتی سے روشن کریں۔ آئیوری کوسٹ میں ۹۲ فی صد پن بجلی کا رواج تھا۔ مگر بارش رک جانے کی بنا پر ڈیم سوکھ گئے اور اکثر ٹربائن کا چلنا بند ہوگیا۔ چنانچہ بجلی کی کٹوتی کا یہ عالم ہوا کہ بعض اوقات مسلسل ۱۸ گھنٹے تک بجلی غائب رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صنعتی پیداوار گھٹ کر ۳۵ فی صد رہ گئی۔ کمپیوٹر، الکٹرک ٹائپ رائٹر، ریفریجریٹر، اور اکثر بجلی سے چلنے والی چیزیں بند رہنے لگیں۔

بہت سے بڑے بڑے تاجروں نے اس اندیشہ سے دفتر جانا چھوڑ دیا کہ کہیں وہ لفٹ میں اٹک کر نہ رہ جائیں۔ ایک تاجر نے اپنا حال بتاتے ہوئے نیویارک ٹائمز کے نمائندہ سے کہا کہ سالہا سال سے میرا یہ حال تھا کہ میں اپنے ایر کنڈیشنڈ مکان سے ایر کنڈیشنڈ کار میں اور پھر ایر کنڈیشنڈ دفتر میں جاتا تھا۔ میں نے کبھی یہ جانا ہی نہیں کہ حقیقۃً آئیوری کوسٹ کتنا زیادہ گرم ہے:

> For years, I had gone from my air-conditioned villa to my air-conditioned car to my air-conditioned office. I never realised just how hot it really is here.

افریقہ جیسے گرم ملک میں ایر کنڈیشنڈ ماحول میں رہنے والا تاجر گویا ایک مصنوعی دنیا میں رہ رہا تھا۔ جب بجلی نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اس وقت اس کو معلوم ہوا کہ اصل صورت حال اس کے برعکس تھی جس کو وہ اپنے ذہن میں بطور خود فرض کئے ہوئے تھا۔

یہی حال زیادہ بڑے پیمانے پر تمام انسانوں کا ہے۔ انسان موجودہ دنیا میں اپنے آپ کو آزاد پاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے وہ اس کی ملکیت ہے۔ جب انسان کی موت آئے گی اس وقت اچانک اس کو معلوم ہوگا کہ یہ محض فریب تھا ــــــ اس نے امتحان کی آزادی کو استحقاق کی آزادی سمجھ لیا تھا۔ اس نے خدا کے اثاثہ کو اپنا اثاثہ فرض کر لیا تھا۔ وہ اپنے اعمال کے لئے خدا کے یہاں جواب دہ تھا مگر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگیا کہ وہ خواہ کچھ بھی کرے کوئی اس سے پوچھ گچھ کرنے والا نہیں۔

آخری منزل

ایورسٹ دنیا کی سب سے اونچی چوٹی ہے۔ ہمالیہ کی یہ مشہور چوٹی سطح سمندر سے ۲۹۰۲۸ فٹ (۸۸۴۸ میٹر) بلند ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلا قابلِ ذکر شخص جس نے اس بلند چوٹی پر اپنا قدم رکھنے کی سنجیدہ کوشش کی وہ ایک انگریز موریس ولسن (Maurice Wilson) تھا۔ اس نے ۱۹۳۴ میں اس کے اوپر چڑھائی کی۔ مگر جس چیز کو اس نے اپنی زندگی کا کلائمکس سمجھا تھا وہ اس کے لئے انٹی کلائمکس (Anti-climax) بن گیا۔

موریس ولسن پہلی جنگ عظیم میں ایک سپاہی تھا۔ اس کو دنیا کی "آخری بلندی" پر پہنچنے کا اتنا زیادہ شوق تھا کہ اس نے اپنے خاندان کی کامیاب تجارت کو اس کے اوپر قربان کر دیا۔ اس نے اپنا تمام سرمایہ خرچ کر کے ذاتی طور پر ایک سکنڈ ہینڈ ہوائی جہاز خریدا۔ وہ انگلستان سے ہندوستان تک چھ ہزار میل کا سفر طے کر کے پورنیہ میں اترا۔ اس کو اپنا ہوائی جہاز آگے لے جانے کی اجازت نہیں ملی۔ چنانچہ اس نے اپنا جہاز فروخت کر دیا۔ اس کے بعد اس نے دارجیلنگ اور تبت کے راستے سے ایورسٹ کی طرف سفر شروع کر دیا۔

آخر میں اس کے پاس ایک چھوٹا خیمہ، کچھ چاول، ایک خود کار کیمرہ اور چند دوسری چیزیں باقی رہ گئیں۔ تاہم وہ اوپر چڑھتا رہا۔ وہ کامیابی کے ساتھ ۱۹۵۰۰ فٹ کی بلندی تک چڑھ گیا۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۴ کو اس کی ۳۶ ویں برتھ ڈے تھی۔ اس کا منصوبہ تھا کہ وہ اپنی زندگی کے اس تاریخی دن کو ایورسٹ کی چوٹی پر کھڑا ہو۔ اس نے اپنی ڈائری میں چند دن پہلے یہ الفاظ لکھے:

> Only 13000 feet more to go. I have the distinct feeling that I'll reach the summit on April 21

صرف تیرہ ہزار فیٹ جانا اور باقی ہے۔ مجھے یہ واضح احساس ہو رہا ہے کہ میں ۲۱ اپریل (۱۹۳۴) کو چوٹی پر پہنچ جاؤں گا۔

ان پر فخر سطروں کو لکھنے کے بعد ہمالیہ کا سخت طوفان اور موسم کی شدت اس کی راہ میں رکاوٹ بن گئے۔ وہ مجبور ہو گیا کہ پیچھے لوٹے۔ چنانچہ وہ اتر کر اپنے نچلے ٹھکانہ پر آگیا۔ مگر اس کے بعد اس کو دوبارہ اوپر چڑھنا نصیب نہ ہوا۔ اس کے بعد اس کے ساتھ کیا

پیش آیا، اس کا حال کسی کو معلوم نہیں۔ ایک سال بعد تن زنگ نار گے اوپر چڑھ رہا تھا کہ اس کو ایک مقام پر موریس ولسن کی لاش ملی اور اسی کے ساتھ اس کی ڈائری بھی۔ جس کا آخری اندراج وہ جملہ تھا جس کو ہم نے اوپر نقل کیا ہے۔

موریس ولسن ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی پر خود کار کیمرہ کے ذریعہ اپنی تصویر کھینچنا چاہتا تھا اس کو امید تھی کہ کیمرہ کی آنکھ اس کو فتح کی چوٹی پر دیکھے گی۔ جب یہ تاریخ آئی تو وہاں نہ کوئی ولسن تھا جو اپنی فتح و کامیابی کو دیکھ کر خوش ہو، اور نہ کوئی کیمرہ تھا جو اس کی فتح و کامیابی کے واقعہ کو ریکارڈ کرے۔

یہ کہانی بدلی ہوئی صورت میں ہر آدمی کی کہانی ہے۔ ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ وہ کامیابی کی چوٹی پر پہنچنے کی طرف آگے بڑھ رہا ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہاں ہر آدمی صرف ایک ایسی منزل کی جانب چلا جا رہا ہے جہاں موت کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں جو اس کا استقبال کرنے کیلئے موجود ہو ___

موجودہ دنیا میں کچھ لوگ وہ ہیں جو دنیوی کامیابیوں کی صرف تمنا کرتے رہتے ہیں۔ اور بالآخر اس طرح مر جاتے ہیں کہ انہوں نے اپنی خوابوں کی دنیا کی طرف سفر بھی شروع نہیں کیا تھا۔

دوسرے لوگ وہ ہیں جو اپنی زندگی میں، کم یا زیادہ، ان خواہشوں کو پا لیتے ہیں۔ مگر پانے والے بھی ان چیزوں سے اتنا ہی دور رہتے ہیں جتنا کہ نہ پانے والے۔ کیونکہ ان کو پا لینے کے بعد آدمی پر کھلتا ہے کہ اس کو وہ طاقت اور مواقع حاصل نہیں جو ان چیزوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے ضروری ہیں۔ اس دنیا میں پانے والا بھی اتنا ہی محروم ہے جتنا نہ پانے والا۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس حقیقت کو جانتے ہوں۔

انسان کتنا زیادہ محروم ہے۔ مگر وہ اپنے آپ کو کتنا زیادہ پانے والا سمجھتا ہے۔ زندگی کس قدر غیر یقینی ہے مگر آدمی اس کو کس قدر یقینی سمجھ لیتا ہے۔ آدمی صرف نامعلوم کل کے راستہ پر جا رہا ہے مگر وہ گمان کر لیتا ہے کہ وہ معلوم آج میں اپنی کامیاب دنیا تعمیر کر رہا ہے۔

کتنے بے خبر ہیں وہ لوگ جو اپنے کو جاننے والا سمجھتے ہیں۔ کیسے ناکام ہیں وہ لوگ جن کا نام کامیاب انسانوں کی فہرست میں سب سے آگے لکھا ہوا ہے۔

موت کے دوسری طرف

سکندر اعظم نے بڑی بڑی فتوحات کیں۔ مگر جب آخر وقت آیا تو اس نے کہا: میں دنیا کو فتح کرنا چاہتا تھا۔ مگر موت نے مجھ کو فتح کر لیا۔ افسوس کہ مجھ کو زندگی کا ذرہ سکون بھی حاصل نہ ہو سکا جو ایک معمولی آدمی کو حاصل ہوتا ہے۔ نپولین بوناپارٹ کے آخری احساسات یہ تھے: مایوسی میرے نزدیک جرم تھی مگر آج مجھ سے زیادہ مایوس انسان دنیا میں کوئی نہیں۔ میں دو چیزوں کا بھوکا تھا۔ ایک حکومت، دوسرے محبت۔ حکومت مجھے ملی مگر وہ میرا ساتھ نہ دے سکی۔ محبت کو میں نے بہت تلاش کیا مگر میں نے اسے کبھی نہیں پایا۔ انسان کی زندگی اگر یہی ہے جو مجھ کو ملی تو یقیناً انسانی زندگی ایک بے معنی چیز ہے۔ کیوں کہ اس کا انجام مایوسی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ ہارون الرشید ایک بہت بڑی سلطنت کا حکمراں تھا۔ مگر آخر عمر میں اس نے کہا: میں نے ساری عمر غم غلط کرنے کی کوشش کی، پھر بھی میں غم غلط نہ کر سکا۔ میں نے بے حد غم اور فکر کی زندگی گزاری ہے۔ زندگی کا کوئی دن ایسا نہیں جو میں نے بے فکری کے ساتھ گزارا ہو۔ اب میں موت کے کنارے ہوں۔ جلد ہی قبر میرے جسم کو نگل لے گی۔ یہی ہر انسان کا آخری انجام ہے۔ مگر ہر انسان اپنے انجام سے غافل رہتا ہے۔ خلیفہ منصور عباسی کی موت کا وقت آیا تو اس نے کہا: اگر میں کچھ دن اور زندہ رہتا تو اس حکومت کو آگ لگا دیتا جس نے مجھے بار بار سچائی سے ہٹا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک نیکی اس ساری حکومت سے بہتر ہے۔ مگر یہ بات مجھ کو اس وقت معلوم ہوئی جب موت نے مجھے اپنے چنگل میں لے لیا۔

دنیا کے اکثر کامیاب ترین انسانوں نے اس احساس کے ساتھ جان دی ہے کہ وہ دنیا کے ناکام ترین انسان تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ موت کے قریب پہنچ کر آدمی پر جو کچھ گزرتا ہے اگر وہی اس پر موت سے پہلے گزر جائے تو اس کی زندگی بالکل بدل جائے۔ ہر آدمی جب موت کے کنارے کھڑا ہوتا ہے تو اس کی وہ تمام رونقیں راکھ کے ڈھیر سے بھی زیادہ بے حقیقت معلوم ہوتی ہیں جن میں وہ اس قدر گم تھا کہ کسی اور چیز کے بارے میں سوچنے کی اسے فرصت ہی نہ ملی۔ اس کے پیچھے ایک ایسی دنیا ہوتی ہے جس کو وہ کھو چکا اور آگے ایک ایسی دنیا ہوتی ہے جس کے لئے اس نے کچھ نہیں کیا۔

موت جب سر پر آ جائے اس وقت موت کو یاد کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ موت کو یاد کرنے کا وقت اس سے پہلے ہے۔ جب آدمی اس قابل ہوتا ہے کہ وہ دوسروں پر ظلم کرے اور اپنی ظالمانہ کارروائیوں کو عین انصاف کہے اس وقت وہ کچھ سوچنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ اس وقت وہ اپنی انا کی تسکین کے لئے وہ سب کچھ کر ڈالتا ہے جو اس کو نہیں کرنا چاہئے۔ مگر جب اس کی طاقت ختم ہو جاتی ہے، جب اس کے الفاظ جواب دینے لگتے ہیں، جب اس کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ موت کے بے رحم فرشتہ کے قبضہ میں ہے اس وقت اس کو اپنی غلطیاں یاد آتی ہیں۔ حالاں کہ یاد آنے کا وقت وہ تھا جب کہ وہ غلطیاں کر رہا تھا۔ اور کسی نصیحت کی پروا کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔

پانچ سکنڈ کا فاصلہ

۳ جون ۱۹۷۹ کو راقم الحروف میرٹھ میں تھا۔ شام کا وقت تھا۔ میں اور مولانا شکیل احمد قاسمی صدر بازار کی سڑک پر ایک ساتھ جا رہے تھے۔

اس کے بعد اچانک ایک واقعہ ہوا۔ ہمارے سامنے ایک مکان کے آگے کا حصہ دھماکہ کے ساتھ گر پڑا۔ اینٹ اور پتھر سڑک پر ڈھیر ہوگئے۔ اس وقت ہم دونوں جائے حادثہ سے بمشکل پانچ سکنڈ کی مسافت پر تھے۔ اگر ہم پانچ سکنڈ آگے ہوتے یا مکان پانچ سکنڈ بعد گرتا تو یقیناً ہم دونوں اس کی زد میں آجاتے۔ ہمارا سفر شاید درمیان ہی میں ختم ہو جاتا جس کی منزل ہم نے بہت آگے سمجھ رکھی تھی۔

میں نے سوچا۔ آدمی اور اس کی موت کے درمیان صرف پانچ سکنڈ کا فاصلہ ہے۔ کسی بھی آدمی کے لئے ہر آن یہ اندیشہ ہے کہ اس کا پانچ سکنڈ کا سفر پورا ہو جائے اور اچانک وہ اپنے آپ کو دوسری دنیا میں پائے۔

آدمی اگر اچھی طرح اس بات کو جان لے کہ اس کے اور موت کے درمیان صرف پانچ سکنڈ کا فاصلہ ہے تو اس کی دنیا بالکل بدل جائے۔ وہ ایک اور ہی قسم کا انسان بن جائے۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے آخرت میں جینے لگے۔

زندگی کا راز یہ ہے کہ آدمی اس بات کو جان لے کہ وہ ہر وقت موت کے کنارے کھڑا ہوا ہے۔ ایسی موت جس کے مابعد آدمی، حدیث کے الفاظ میں، یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ میں داخل ہو جاتا ہے، یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھے میں جا گرتا ہے۔ آدمی کا ہر قدم اس کو دو انتہائی انجام میں سے کسی ایک انجام کے قریب پہنچا رہا ہے۔ مگر انسان اتنا بے حس بنا ہوا ہے کہ اس کو اس کی خبر نہیں۔

لوگ جھوٹی خدا پرستی پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ آخرت میں صرف حقیقی خدا پرستی کسی شخص کے کام آئے گی۔ حقیقی خدا پرستی یہ ہے کہ آدمی اس طرح اللہ سے ڈرنے لگے کہ وہ اس کے ذہن پر چھا جائے، وہ اس کے صبح و شام کا نگراں بن جائے۔ وہ جو کچھ کرے یہ سمجھ کر کرے کہ وہ خدا کے سامنے ایسا کر رہا ہے۔ اس کو دنیا سے زیادہ آخرت کی فکر ستانے لگے۔

کیسی عجیب محرومی

آپ کسی شخص کو ایک ڈالر دیں اور اس سے کہیں کہ آگے اسی قسم کے ایک کرور سکے پڑے ہوئے ہیں۔ اگر تم تیزی سے جاؤ تو اس پورے ذخیرہ کو حاصل کر سکتے ہو۔ ایسا آدمی ڈالر دیکھ کر کیا کرے گا۔ وہ ایک کو بھول کر ایک کرور کی طرف دوڑ پڑے گا۔

ایسا ہی کچھ معاملہ دنیا اور آخرت کا ہے۔ موجودہ دنیا آخرت کا تعارف ہے۔ یہاں آدمی ان نعمتوں اور لذتوں کی ابتدائی پہچان حاصل کرتا ہے جس کو خدا نے کامل طور پر آخرت میں مہیا کر رکھا ہے۔ یہ اس لئے ہے تاکہ آدمی جزء سے کل کو سمجھے۔ وہ قطرہ کو دیکھ کر سمندر کا اندازہ کرے۔

اگر آدمی کو دنیا کی صحیح معرفت حاصل ہو تو اس کے لئے دنیا مذکورہ ایک ڈالر کی مانند ہو جائے گی۔ وہ چھوٹی لذت کو چھوڑ کر بڑی لذت کی طرف بھاگے گا۔ وہ دنیا کو بھ[illegible]ر آخرت کی طرف دوڑ پڑے گا۔ اس کے برعکس جو شخص دنیا کی صحیح نوعیت کو نہ سمجھے وہ موجودہ دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے گا۔ وہ آخرت کو بھول کر اسی دنیا کی چیزوں میں ہمہ تن مشغول ہو جائے گا۔

سورج اس لئے ہے کہ وہ آخرت کی روشنیوں سے بھری زندگی سے انسان کو متعارف کرے۔ مگر انسان سورج کو دیکھ کر یہ کرتا ہے کہ وہ خود سورج ہی کو اپنا معبود بنا لیتا ہے۔ پھولوں اور درختوں کا حسن اس لئے ہے کہ وہ آدمی کو آخرت کے حسن کی یاد دلائے۔ مگر انسان پھولوں اور درختوں کو آخری چیز سمجھ کر انھیں کے درمیان اپنی مستقل جنت بنانے لگتا ہے۔ دنیا کی لذتیں اس لئے ہیں کہ انسان کو ہمہ تن آخرت کا مشتاق بنا دیں مگر انسان انھیں لذتوں میں ایسا کھوتا ہے کہ اس کو آخرت کی یاد بھی نہیں آتی۔

جو شخص موجودہ دنیا کی دلفریبیوں میں گم ہو جائے اس نے اپنی آخرت کو کھو دیا۔ ایسا شخص آخرت میں پہنچے گا تو وہاں کی ابدی نعمتوں کو دیکھ کر اس کا یہ حال ہوگا گویا اس کا سینہ حسرت و یاس کا قبرستان بن چکا ہے۔ وہ کہے گا کہ میں بھی کیسا نادان تھا۔ میں نے چھوٹے عیش کی خاطر حقیقی عیش کو کھو دیا۔ میں نے جھوٹی لذت کے پیچھے حقیقی لذت گنوا دی۔ میں نے جھوٹی آزادی سے فریب کھا کر اپنے آپ کو حقیقی آزادی سے محروم کر لیا۔

آخرت تک جانا ہے

مولانا اشرف علی تھانوی ایک بار ٹرین سے سفر کر رہے تھے۔ ان کو اعظم گڑھ جانا تھا۔ ایک ریلوے گارڈ جوان کا معتقد تھا اسٹیشن پر ان سے ملنے کے لئے آیا۔ اتنے میں ایک دیہاتی آدمی بھی آگیا۔ اس نے گنے کا ایک گٹھا تحفہ کے طور پر مولانا کو پیش کیا۔ مولانا نے قبول کرلیا اور اپنے ساتھی سے کہا کہ ان گنوں کا وزن کرا کے ان کو بک کروالو۔ گارڈ نے کہا: بک کروانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس ٹرین سے جو گارڈ جا رہا ہے میں اس سے کہہ دیتا ہوں۔ وہ خیال رکھے گا۔ مولانا نے کہا کہ تمہارا گارڈ تو اسی ٹرین تک ساتھ رہے گا اور مجھے آگے جانا ہے۔ گارڈ نے سمجھا کہ مولانا کو آگے کسی اسٹیشن پر یہ ٹرین بدل کر دوسری ٹرین پکڑنا ہے۔ اس نے کہا: کوئی ہرج نہیں۔ میں گارڈ کو بتا دیتا ہوں وہ آگے والے گارڈ سے بھی کہہ دے گا اور آپ کو کوئی زحمت نہ ہوگی۔ مولانا نے کہا: مجھے اس سے بھی آگے جانا ہے۔ گارڈ نے حیرت سے پوچھا: آخر آپ کہاں تک جائیں گے۔ ابھی تو آپ نے فرمایا تھا کہ آپ اعظم گڑھ جا رہے ہیں۔ مولانا نے کسی قدر خاموشی کے بعد کہا: مجھے آخرت تک جانا ہے۔ وہاں تک کون سا گارڈ میرے ساتھ جائے گا"

یہ معاملہ محض ریل کے سفر کا نہیں بلکہ تمام معاملات کا ہے۔ آدمی کا ہر معاملہ آخرت کا معاملہ ہے۔ دنیا میں کوئی "گارڈ" وقتی طور پر آپ کا ساتھ دے سکتا ہے۔ مگر آخرت کی منزل پر پہنچ کر کوئی گارڈ ساتھ دینے والا نہیں۔ جس کا ذہن یہ ہو کہ مجھے آخرت تک جانا ہے وہ ہر اس چیز کو بے قیمت سمجھے گا جو آخرت میں بے قیمت ہو جانے والی ہو، خواہ آج وہ کتنی ہی قیمتی نظر آئے۔ اسی طرح وہ ہر اس چیز کو وزن دینے پر مجبور رہتا ہے جو آخرت میں باوزن ثابت ہونے والی ہو، خواہ آج کی دنیا میں بظاہر وہ کتنی ہی بے وزن دکھائی دے۔

آدمی حق کا انکار کرنے کے لئے آج خوبصورت الفاظ پالیتا ہے۔ مگر آخرت میں اس کو معلوم ہوگا کہ وہ اس کا ساتھ چھوڑ کر پیچھے رہ گئے۔ آدمی طاقت کے بل پر بے انصافی کرتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ مظلوم اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ مگر آخرت میں وہ دیکھے گا کہ اس کی طاقت پیچھے کی دنیا میں رہ گئی ہے، آخرت میں وہ اس کا ساتھ دینے کے لئے موجود نہیں ہے۔ آدمی کے ساز و سامان اس کو دھوکا دیتے ہیں اور وہ اپنے گھمنڈ کا مینار کھڑا کرتا ہے۔ مگر آخرت میں وہ پائے گا کہ اس کے وہ ساز و سامان اس سے بہت دور ہو چکے ہیں جن کے اوپر وہ گھمنڈ کیا کرتا تھا۔

مومن اور غیر مومن کا فرق ایک لفظ میں یہ ہے کہ غیر مومن یہ سمجھ کر زندگی گزارتا ہے کہ اس کو اسی دنیا میں رہنا ہے۔ اور مومن اس نفسیات کے ساتھ جیتا ہے کہ اس کو آخرت تک جانا ہے۔ نفسیات کا یہ فرق دونوں کی زندگیوں میں اتنا زیادہ عملی فرق پیدا کر دیتا ہے کہ ایک جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے اور دوسرا جنت کا۔

زندگی کا اسٹیج

حیدر آباد کا واقعہ ہے۔ ۲۱ ستمبر ۱۹۸۱ کو مسٹر بی کے راما ریڈی (۹۰ سال) اور ان کی ۸۰ سالہ بیوی پھولا بائی رات کے وقت اپنے گھر واقع بنجارہ ہلز میں سو رہے تھے۔ ان کے علاوہ ان کے گھر میں اس وقت صرف ان کا ملازم رامیا (۵۰ سال) تھا۔ رامیا نے عین نیند کی حالت میں کلہاڑی سے بوڑھے میاں بیوی پر حملہ کیا اور نہایت بے دردی کے ساتھ دونوں کو مار ڈالا۔ اس کے بعد رامیا نے بکس سے تقریباً ایک لاکھ روپے کے ہیرے اور زیورات نکالے اور رات کی تاریکی میں گھر سے باہر نکل گیا۔

راستہ چلتے ہوئے وہ ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں پولس کے دو آدمی رات کی ڈیوٹی میں پہرہ دے رہے تھے۔ ان کو شبہ ہوا چنانچہ انھوں نے رامیا کو پکڑ لیا۔ پوچھ گچھ اور ڈرانے دھمکانے کے بعد اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا اور چرایا ہوا مال پولس کے حوالے کر دیا۔ دونوں پولس کے آدمیوں نے رامیا کو اور اس سے برآمد شدہ مال کو لے جا کر تھانہ میں جمع کر دیا۔ ان کا نام شیخ محبوب اور ایس ایم رشید بتایا گیا ہے۔

محکمہ پولس کے افسران کے علم میں یہ واقعہ آیا تو وہ شیخ محبوب اور ایس ایم رشید کی کارکردگی اور دیانت داری سے بہت خوش ہوئے اس کے بعد دونوں کو نقد انعامات دئے گئے اور اسی کے ساتھ دونوں کو ترقی بھی دے دی گئی۔ شیخ محبوب کو اسٹیشن آفیسر کے عہدہ پر متعین کر دیا گیا اور ایس ایم رشید کو ہیڈ کانسٹبل بنا دیا گیا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح ایک واقعہ بیک وقت دو آدمیوں کے لئے دو معنی کا حامل ہوتا ہے۔ ایک واقعہ پیش آتا ہے مگر اسی ایک واقعہ سے ایک شخص کو کریڈٹ دیا جاتا ہے اور دوسرے شخص کو ڈسکریڈٹ کیا جاتا ہے۔ ایک شخص کو قاتل ثابت کر کے مجرم کے خانہ میں ڈال دیا جاتا ہے اور دوسرے شخص کو ایماندار اور فرض شناس ظاہر کر کے انعام کا مستحق بنا دیا جاتا ہے۔

دنیا میں جتنے واقعات پیش آتے ہیں سب کی نوعیت یہی ہے۔ یہاں کسی کے پاس کوئی اختیار نہیں۔ یہاں کوئی شخص کسی کو نہ فائدہ پہنچا سکتا اور نہ نقصان۔ نہ کوئی کسی کو زندگی دے سکتا اور نہ موت۔ تاہم یہ سارے واقعات یہاں ایک یا دوسرے کے ہاتھ سے پیش آتے ہیں۔ دنیا ایک قسم کا خدائی اسٹیج ہے۔ یہاں مختلف حالات پیدا کر کے خدا ہر ایک کو یہ موقع دیتا ہے کہ اس کے اندر جو کچھ ہے اس کو وہ علی الاعلان ظاہر کر دے۔ جو شخص مجرمانہ ذہن لئے ہوئے ہے وہ اپنے موافق حالات پا کر جرم کرے اور خدا کے قانون کے مطابق سزا کا مستحق ہو۔ جو شخص اپنے اندر حق پرستی کا ذہن لئے ہوئے ہے وہ اپنے موافق حالات میں حق اور انصاف کا معاملہ کرے تاکہ وہ خدا کے یہاں انعام اور قدر افزائی کے لائق ٹھہرے۔

سننے والا سن رہا ہے

امریکہ کے خفیہ محکمہ (N.S.A.) کے ایک سابق افسر نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے (The Puzzle Palace) ۔ اس کتاب میں اس کے مصنف نے بڑے دلچسپ انکشافات کئے ہیں۔ ان میں سے ایک کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ امریکہ سے بھیجے جانے والے ٹیلی فون ٹیلکس اور تار کے پیغامات کی تعداد ہر روز ایک ملین سے زیادہ ہوتی ہے۔ جدید نظام کے مطابق یہ پیغامات پہلے ورجینیا کے زمینی اسٹیشن (Earth Station) پر موصول ہوتے ہیں۔ وہاں سے وہ مصنوعی سیارہ کی طرف بھیجے جاتے ہیں جو ۲۳۰۰۰ میل اوپر زمین کے چاروں طرف گھوم رہے ہیں۔ یہ سارا عمل فی الفور ایک سکنڈ سے بھی کم وقفہ میں انجام پاتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مشینی پیغام جو امریکہ سے باہر جاتا ہے یا امریکہ کے اندر آتا ہے وہ اصل مخاطب تک پہنچنے سے پہلے امریکی حکومت تک پہنچتا ہے۔ چنانچہ امریکہ کا خفیہ محکمہ جن لوگوں کے پیغامات کو جاننا چاہتا ہے، ان کا نمبر وہ زمینی اسٹیشن کے دفتر میں دیدیتا ہے۔ یہاں مذکورہ افراد کی گفتگوئیں اور پیغامات خودکار آلات کے ذریعہ ریکارڈ ہوتے رہتے ہیں۔ گویا آپ اگر واشنگٹن سے دہلی کے لئے ٹیلی فون کریں تو آپ کے منہ سے جو الفاظ نکلیں گے، قبل اس کے کہ آپ کا مخاطب ان کو سنے، امریکہ کی حکومت ان کو سن چکی ہوگی۔

ٹائمس آف انڈیا (۱۹ دسمبر ۱۹۸۲) کے امریکی نامہ نگار نے اس کی رپورٹ دیتے ہوئے اس کا عنوان قائم کیا ہے۔ ہوشیار! ممکن ہے کہ امریکہ آپ کی بات سن رہا ہو۔

Careful, Uncle Sam may be listening.

اس قسم کے واقعات خدا کی نشانی ہیں۔ وہ اس لئے ہو رہے ہیں تاکہ آدمی اپنی زبان کو احتیاط کے ساتھ استعمال کرے۔ آدمی دوسرے آدمی سے ایک غلط بات کہتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ میں صرف ایک آدمی سے کہہ رہا ہوں مگر آدمی کو جاننا چاہئے کہ اس کی بات اس کے مخاطب سے پہلے خدا تک پہنچ رہی ہے۔ مذکورہ واقعہ زبانِ حال سے کہہ رہا ہے — اے انسان، ہوشیار رہ، کیونکہ تیری ہر بات کو خدا سن رہا ہے۔

فیصلہ کے دن

انڈین اکسپریس (بنگلور) کی اشاعت مورخہ ۹ ستمبر ۱۹۸۳ کی ایک خبر کا عنوان ہے چمک دار چیز سونا نہیں ! Glitter is not gold

خبر میں بتایا گیا ہے کہ مس سبل ڈی سلوا (Miss Sybil D'Silva) جو بنگلور میں آرٹیلری روڈ پر رہتی ہیں، وہ اپنے گھر پر تھیں کہ تقریباً ۴۵ سال کی ایک عورت ان کے پاس آئی۔ اس کی گود میں چھ مہینہ کا ایک بچہ تھا۔ عورت نے مس ڈی سلوا سے کہا کہ اس کا شوہر بہت زیادہ بیمار ہے اور اس کے علاج کے لئے فوری طور پر ۵ ہزار روپیہ کی ضرورت ہے۔ عورت نے سونے کا ایک ہار اپنی جیب سے نکالا اور کہا کہ میں آپ سے بھیک نہیں مانگ رہی ہوں۔ میں صرف اس سونے کے ہار کو بیچنا چاہتی ہوں۔ اگرچہ یہ ہار مجھے بہت عزیز ہے مگر شوہر کی صحت اس سے زیادہ عزیز ہے۔ اس ہار کی قیمت بازار میں دس ہزار روپے سے کم نہیں ہے۔ میں اپنی ضرورت کی بنا پر آپ کو صرف ۵ ہزار میں دے دوں گی۔

مس ڈی سلوا نے ہار لینے سے انکار کیا لیکن عورت اپنی مجبوری بیان کرتی رہی۔ یہاں تک کہ اس نے مس ڈی سلوا کو متاثر کر لیا۔ انھوں نے روپیہ دے کر ہار خرید لیا۔

اگلے دن مس ڈی سلوا بنگلور کی کمرشل اسٹریٹ پر گئیں اور وہاں ایک سنار کو انھوں نے وہ ہار دکھایا۔ سنار نے وہ ہار لے کر اپنی کسوٹی پر جانچا۔ کسوٹی پر جانچنے کے بعد ہار کی حقیقت کھل گئی۔ مس ڈی سلوا نے بنگلور پولیس کو یہ کہانی سناتے ہوئے کہا کہ سنار نے مجھے بتایا کہ یہ تو پیتل ہے۔

He told me it was brass

یہی آخرت کا معاملہ بھی ہے۔ موجودہ دنیا میں ہر آدمی اپنے کئے پر مگن ہے۔ ہر آدمی اپنے کام کو سونا سمجھتا ہے۔ مگر کوئی سونا اسی وقت سونا ہے جب کہ وہ سنار کی کسوٹی پر بھی سونا ثابت ہو۔ آخرت میں خدا ہر آدمی کے عمل کو اپنی کسوٹی پر جانچے گا۔ جس کا عمل وہاں کی جانچ میں سونا ثابت ہو اسی کے عمل کی قیمت ہے، اور جس کے عمل کے بارے میں یہ کہہ دیا جائے کہ یہ تو پیتل تھا، اس کا سونا اس کے لئے صرف رسوائی اور بربادی کی علامت ہوگا۔ جس چیز کو آدمی آج اتنا قیمتی سمجھے ہوئے ہے کہ وہ اس کو کسی طرح چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، اس دن وہ اس سے اتنا بیزار ہوگا کہ وہ چاہے گا کہ کوئی ایسی صورت ہو کہ اس کے اور اس کے عمل کے درمیان جدائی ہو جائے مگر اس دن جدائی نہ ہو سکے گی۔ جس چیز کو وہ فخر کی چیز سمجھے ہوئے تھا، اس دن وہ اس کے لئے صرف ذلت اور رسوائی کی چیز بن جائے گی۔

آہ یہ انسان

تقریباً ایک درجن انڈے سامنے رکھے ہوئے تھے۔ بظاہر سب انڈے تھے۔ سب اوپر سے دیکھنے میں اچھے لگتے تھے۔ مگر جب توڑا گیا تو ایک کے بعد ایک سب خراب نکلتے چلے گئے۔ آخر میں یہ معلوم ہوا کہ ان میں کوئی ایک بھی اچھا نہ تھا۔ سارے انڈے اندر سے خراب انڈے تھے اگرچہ بظاہر اوپر سے اچھے نظر آتے تھے۔

ایسا ہی کچھ حال آجکل انسانوں کا ہو رہا ہے۔ بظاہر دیکھنے میں ہر آدمی آدمی ہے۔ وہ عمدہ کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ وہ خوبصورت باتیں کرتا ہے۔ اوپر سے ہر آدمی اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ ہر آدمی کے پاس اپنے کارناموں کی نہ ختم ہونے والی داستانیں ہیں۔ مگر جب تجربہ کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اندر سے کچھ اور تھا۔ اوپر کے خوبصورت خول کے اندر ایک انتہائی بدعملیت اور بالکل مختلف قسم کا انسان چھپا ہوا تھا۔

جب کسی سے لین دین ہوتا ہے، جب کوئی واقعی معاملہ پڑتا ہے، جب شکایت اور تلخی کا کوئی موقع سامنے آتا ہے، جب کسی کے مفاد اور مصلحت پر ضرب پڑتی ہے تو اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ اندر کا اصلی انسان وہ نہ تھا جو اوپر سے دکھائی دے رہا تھا۔ خوبصورت کپڑوں کے اندر جو چیز چھپی ہوئی ہے وہ گندگی کے سوا اور کچھ نہیں۔ خود غرضی، سطحیت، ظاہرداری، فخر، حسد، غرور، موقع پرستی، تعصب، استحصال، یہی وہ چیزیں ہیں جو لوگ اپنے خوبصورت جسموں کے اندر چھپائے ہوئے ہیں۔ ہر آدمی بظاہر اچھا انڈا ہے۔ مگر توڑنے کے بعد ہر آدمی خراب انڈا ہے۔

یہی آج کی انسانی دنیا ہے۔ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو آج کی دنیا میں صرف دو چیزیں نظر آتی ہیں۔ دکھ کی آہیں، یا ظلم کے قہقہے۔ کچھ لوگ بے انصافیوں کا شکار ہو کر آہیں بھر رہے ہیں۔ کچھ لوگ اپنے حیوانی ارادوں کی تکمیل کر کے فتح کے قہقہے لگا رہے ہیں۔ کچھ لوگ بے شعوری کے گڑھے میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور کچھ لوگ بے حسی کے گڑھے میں۔

مگر یہ صورت باقی رہنے والی نہیں۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب کہ انسان اپنے آپ کو ایک اور دنیا میں پائے گا۔ ایک ایسی دنیا جہاں فیصلہ کا سارا اختیار خدا کو ہو گا نہ کہ انسان کو۔

شکار کرنے والے

کرنل جے پال نے اپنی شکاری یادداشتوں پر ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام ہے عظیم شکار:

Great Hunt, Lt. Col. Jaipal, Carlton Press, New York 1982

جم کاربٹ (Jim Corbett) ایک شکاری تھا، وہ شیر کو گولی مار کر ہلاک کرنے سے خاص دل چسپی رکھتا تھا، تاہم اپنے اس قاتلانہ فعل کے لئے اس کے پاس ایک خوبصورت توجیہ تھی۔ "میں گاؤں والوں کو مردم خور شیروں سے بچانے کے لئے ان کا شکار کرتا ہوں" اسی طرح اکثر شکاریوں کے پاس اپنے وحشیانہ کھیل کی خوبصورت تاویلات موجود ہوتی ہیں۔ مگر کرنل جے پال کو اس قسم کی فرضی توجیہات تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ انھوں نے صفائی کے ساتھ اس بات کو تسلیم کر لیا ہے جس کو دوسرے لوگ صفائی کے ساتھ تسلیم نہیں کرتے۔

کرنل جے پال کے لئے گھڑیال کو مارنا ایک پسندیدہ کھیل تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ وہ منظر بڑا دلچسپ ہوتا تھا جب کہ میں گھڑیال کے پیچھے رینگ کر چلتا۔ پھر کبھی گھڑیال چھپ سے پانی میں کود پڑتا۔ اور جب اس کو گولی لگتی تو وہ عجیب طریقے سے اپنی دم پٹکتا اور اپنا منھ کھول دیتا یہ سب چیزیں مجھ کو بڑی عجیب قسم کی پُر جوش مسرت دیتی تھیں۔

All this gave me quite a lot of thrills

انسان کے مزاج میں یہ بات داخل ہے کہ وہ دوسرے کی گھات میں لگے۔ وہ دوسرے کو ستانے کے منصوبے بنائے اور جب دوسرے کو ستانے میں کامیاب ہو جائے تو اپنی کامیابی پر خوشی کے قہقہے لگائے۔ یہی مزاج انسان کے امتحان کا اصل پرچہ ہے۔ جو اپنے اس مزاج سے مغلوب ہو کر اپنے بھائی کا شکار کرنے لگے وہ جہنمی ہے اور جو شخص اپنے اس مزاج پر قابو پالے اور دنیا میں اس طرح رہے کہ وہ دوسرے انسانوں کے لئے رحمت بنا ہوا ہو وہی وہ شخص ہے جس کے لئے آخرت میں جنت کے دروازے کھولے جائیں گے۔

یہ سونے والے

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے نہیں دیکھا کہ جہنم جیسی چیز سے بھاگنے والا سو گیا ہو اور میں نے نہیں دیکھا کہ جنت جیسی چیز کو چاہنے والا سو گیا ہو (ما رأیت مثل النار نام هاربها و ما رأیت مثل الجنة نام طالبها)

جہنم کا عذاب کتنا ہولناک ہے۔ مگر آدمی اس سے غافل ہے۔ جنت کی نعمتیں کتنی لذیذ ہیں مگر آدمی کو اس کا کوئی شوق نہیں۔ یقیناً یہ زمین پر ہونے والے تمام واقعات میں سب سے زیادہ عجیب ہے۔

لوگ سو رہے ہیں تاکہ اس وقت جاگیں جب کہ جہنمی آگ کے شعلے ان کے لئے سونے کو ناممکن بنا دیں۔ لوگ غافل ہیں تاکہ اس وقت ہوشیار ہوں جب کہ محرومی اور رسوائی ان کے اوپر اس طرح ٹوٹ پڑے کہ ان کے لئے اس سے بھاگنے کا کوئی راستہ نہ ہو۔

آج ہر آدمی بے ہوش نظر آتا ہے۔ ہر آدمی اپنے آپ میں اس طرح گم ہے جیسے اس کے اوپر کوئی اور طاقت نہیں۔ حالاں کہ موت ہر روز بتا رہی ہے کہ آدمی ایک ایسی حقیقت سے دوچار ہے جس کے مقابلہ میں کسی کا کچھ بس نہیں چلتا۔ انسان کتنا زیادہ مجبور ہے مگر وہ اپنے آپ کو کتنا زیادہ با اختیار سمجھتا ہے۔

آدمی وعدہ کرتا ہے مگر اس کے بعد اس کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کے اوپر کسی کا ایک حق آتا ہے مگر وہ اس کو ادا نہیں کرتا۔ آدمی کے سامنے ایک سچائی آتی ہے مگر وہ اس کا اعتراف نہیں کرتا۔ وہ دوسرے کے اوپر یک طرفہ الزام لگاتا ہے اور اپنی غلطی ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ وہ چھوٹوں کو نظر انداز کر کے بڑوں کا استقبال کرتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کو اصول کے تابع کرنے کے بجائے خواہشات کے تابع کرتا ہے۔ وہ زور آور سے دبتا ہے اور بے زور کو ستاتا ہے۔ وہ خدا کو مرکز توجہ بنانے کے بجائے خود اپنی ذات کو اپنا مرکز توجہ بناتا ہے۔ وہ جنت کے اشتیاق اور جہنم کے اندیشوں میں جینے کے بجائے دنیا کے اشتیاق اور دنیا کے اندیشوں میں جیتا ہے۔

آدمی یہ سب کچھ کرتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ اپنی اس روش سے اپنے آپ کو جہنم کے قریب لے جا رہا ہے اور اپنے آپ کو جنت کے لئے نااہل ثابت کر رہا ہے۔

آہ وہ انسان جس کو اسی چیز کا شوق نہیں جس کا اسے سب سے زیادہ شوق ہونا چاہئے۔ آہ وہ انسان جو اسی چیز سے سب سے زیادہ بے خوف ہے جس سے اس کو سب سے زیادہ خوف کرنا چاہئے۔

اس دن کیا ہوگا

خدا ہر چیز کا مالک ہے۔ دنیا میں کسی کو جو کچھ ملتا ہے خدا کے دیے سے ملتا ہے۔ خدا کے سوا کسی کے پاس کوئی چیز ہی نہیں جو وہ کسی کو دے سکے۔ ایسی حالت میں اگر کچھ لوگ ایسا کریں کہ ایک شخص کو جائز طور پر ملی ہوئی چیز کو اس سے چھیننے لگیں تو گویا وہ خدا کے دئے کو چھین رہے ہیں، وہ خدا کے منصوبہ کو باطل کرنا چاہتے ہیں۔

دنیا میں ایک شخص کو مکان ملے مگر کچھ لوگ اس کو بے گھر کرنے کی سازشیں کریں۔ اس کی معاش کا جائز انتظام ہو مگر لوگ اس کی معاشیات کو تباہ کرنے پر اتر آئیں۔ اس کو عزت کی زندگی حاصل ہو مگر لوگ اس کو بے عزت کرنے کی کارروائیاں کریں۔ وہ سکون و عافیت کے ساتھ اپنے ماحول میں رہ رہا ہو مگر لوگ اس کو جھوٹے مقدمات میں الجھا کر اس کے سکون کو غارت کرنے لگیں۔ ایسا ہر واقعہ خدا کے انتظام میں مداخلت ہے۔ یہ بے اختیار مخلوق کا ایسے خالق سے لڑنا ہے جو تنہا اور مکمل طور پر ہر قسم کا اختیار رکھتا ہے۔

ایسے واقعات کا مطلب یہ ہے کہ — خدا نے چاہا مگر بندوں نے نہ چاہا۔ خدا نے اپنے فیصلہ کے تحت تقسیم رزق کا ایک انتظام کیا مگر بندے اس تقسیم کو ماننے پر راضی نہ ہوئے۔ خدا کے مقابلہ میں بندوں کی یہ سرکشی موجودہ دنیا میں بظاہر کامیاب نظر آتی ہے۔ مگر یہ کامیابی صرف اس لئے ہے کہ موجودہ دنیا میں لوگوں کو امتحان کی آزادی حاصل ہے، جیسے ہی امتحان کی مدت ختم ہوگی، آدمی اپنے آپ کو اتنا بے زور پائے گا کہ اس کے پاس الفاظ بھی نہ ہوں گے کہ وہ کسی کے خلاف بولے، اس کے پاس دل بھی نہ ہوگا کہ کسی کو ملیا میٹ کرنے کا منصوبہ بنائے۔

موجودہ دنیا میں انسان کو آزادی حاصل ہے۔ یہاں کسی کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ خدا کے چاہے کو باطل کرے، وہ خدا کے تقسیم رزق کو کھنڈت کرنے کی کوشش کرے۔ مگر ایسے لوگوں کا حال اس وقت کیا ہوگا جب امتحان کی موجودہ آزادی ختم ہو چکی ہوگی۔ جب وہی ہوگا جو خدا چاہے اور وہ نہ ہو سکے گا جو خدا نہ چاہے، اس روز خدا کہے گا — میں دیتا ہوں جس کو چاہوں، اب جس کو کرنا ہے میرے چاہے کو باطل کرے۔

کل کو یاد رکھیے

لارڈ کرزن ۱۸۹۸ میں ہندوستان کے وائسرائے ہو کر انگلستان سے یہاں آئے۔ ان کے دو لڑکیاں تھیں۔ تیسری پیدائش کے وقت لارڈ کرزن اور لیڈی کرزن کی بہت خواہش تھی کہ ان کے یہاں لڑکا پیدا ہو۔ دونوں بڑی امیدوں کے ساتھ آنے والے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ مگر تیسری بار بھی مارچ ۱۹۰۴ میں ان کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی۔ اس وقت ان کا قیام نالدرا میں تھا اس مناسبت سے انھوں نے اپنی لڑکی کا نام الکزنڈر نالدرا کرزن رکھا۔ لارڈ کرزن نے اس زمانہ میں اپنی بیوی کے نام جو خطوط لکھے ان میں سے ایک خط وہ ہے جو انھوں نے شملہ سے لندن بھیجا تھا۔ اس خط میں انھوں نے اپنی بیوی کو تسکین دلانے کی کوشش کی۔ ان کے خط کا ایک جملہ یہ تھا: لڑکا یا لڑکی کا کیا فائدہ جب کہ ہم دونوں اس دنیا سے جا چکے ہوں گے۔

After all what does sex matter after we are both of us gone.

لارڈ کرزن کا یہ جملہ محض اپنی مایوس نفسیات کو چھپانے کی ایک کوشش تھی۔ لیکن یہی بات اگر آدمی کے اندر شعوری طور پر پیدا ہو جائے تو دنیا کا آدھا مسئلہ حل ہو جائے۔ دولت، اولاد، اقتدار، یہی وہ چیزیں ہیں جن کو آدمی سب سے زیادہ چاہتا ہے اور ان کو حاصل کرنے کے لئے سب کچھ کر ڈالتا ہے۔ اگر آدمی یہ سوچ لے کہ کسی چیز کو پانے کا کیا فائدہ جب کہ چند ہی روز بعد اس کو چھوڑ کر چلا جانا ہے تو لوگوں کے اندر قناعت آجائے، اور دنیا کا تمام ظلم و فساد ختم ہو جائے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہاں پانے اور نہ پانے میں بہت زیادہ فرق نہیں۔ جو پانا اگلے روز کھونا بننے والا ہو اس پانے کی کیا قیمت ہے۔ آدمی اپنی ساری کوشش خرچ کر کے جو چیز حاصل کرتا ہے وہ صرف اس لئے ہوتی ہے کہ اگلے لمحہ وہ اس کو کھو دے۔ ہر زندگی بالآخر موت سے دوچار ہونے والی ہے، ہر وہ محبوب چیز جس کو آدمی اپنے گرد و پیش جمع کرتا ہے اس کو چھوڑ کر وہ اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے چلا جانے والا ہے۔

آدمی "آج" میں جیتا ہے، وہ "کل" کو بالکل بھولا ہوا ہے۔ آدمی دوسرے کا گھر اجاڑ کر اپنا گھر بناتا ہے حالاں کہ اگلے دن وہ قبر میں جانے والا ہے۔ آدمی دوسرے کے اوپر جھوٹے مقدمے چلا کر اس کو انسانی عدالت میں لے جاتا ہے حالانکہ فرشتے خود اس کو خدا کی عدالت میں لے جانے کے لئے کھڑے ہوئے ہیں۔ آدمی دوسرے کو نظر انداز کر کے اپنی عظمت کے گنبد میں خوش ہوتا ہے حالاں کہ بہت جلد اس کا گنبد اس طرح ڈھ جانے والا ہے کہ اس کی ایک اینٹ بھی باقی نہ رہے۔

جہنم کا خطرہ

خدا نے انسان کو اس کی بناوٹ کے اعتبار سے جنتی نفسیات کے ساتھ پیدا کیا۔ اس کے بعد اس کو موجودہ دنیا میں ڈال دیا جہاں ایسے حالات ہیں جو آدمی کے اندر جہنمی نفسیات کو ابھارتے ہیں۔ اب جو شخص اسفل سافلین میں رہتے ہوئے اپنے کو احسن تقویم کی سطح پر لے جائے، بالفاظ دیگر جہنمی نفسیات کو ابھارنے والے ماحول میں دوبارہ اپنے اندر چھپی ہوئی جنتی نفسیات کو بیدار کرے، تو وہی وہ شخص ہے جو مرنے کے بعد اللہ کے پڑوس میں اور اس کی نعمتوں میں جگہ پائے گا۔ باقی لوگ دھوئیں اور آگ کی دنیا میں عذاب سہنے کے لئے چھوڑ دئے جائیں گے (التین)

موجودہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ اس لئے اس کو اسی ڈھنگ پر بنایا گیا ہے کہ یہاں بار بار آدمی کے لئے آزمائشی حالات پیدا ہوں۔ یہاں نفع اور نقصان کے معاملات ہیں جو آدمی کے اندر حرص، طمع اور خود غرضی کے احساسات ابھارتے ہیں۔ یہاں سطحی دل چسپیاں ہیں جو آدمی کو شہوت پرستی، نشہ باری اور لذتیت کی طرف لے جاتی ہیں۔ یہاں ایک آدمی اور دوسرے آدمی کا مقابلہ پیش آتا ہے جس کی وجہ سے آدمی کے اندر خود پرستی اور انانیت کا شیطان جاگتا ہے۔ یہاں مفادات کا ٹکراؤ ہے جس کی وجہ سے غصہ، نفرت اور کمینہ پن کے جذبات بھڑکتے ہیں۔ یہی موجودہ دنیا کا "اسفل سافلین" ہونا ہے۔ آدمی کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس سے اوپر اٹھائے اور اپنے کو "احسن تقویم" کی سطح پر لے جائے جو باعتبار پیدائش اس کی حقیقی سطح ہے۔

ایک پھل اندر سے اچھا ہے یا خراب، اس کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب کہ اسے توڑا جائے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ کوئی انسان جنتی نفسیات میں جی رہا ہے یا جہنمی نفسیات میں، اس کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب کہ اس کی ہستی کو توڑا جائے۔ جب آدمی کے ساتھ کسی قسم کی ناموافق صورت حال پیش آتی ہے تو اس وقت اس کی ہستی ٹوٹ جاتی ہے۔ ایسے موقع پر آدمی جو رد عمل ظاہر کرتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنتی تقویم کی سطح پر تھا یا جہنمی تقویم کی سطح پر۔ جب دو آدمیوں کے درمیان روپیہ یا جائداد کا جھگڑا کھڑا ہوتا ہے۔ جب دو صاحب معاملہ افراد کے درمیان کوئی کھٹ پٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ جب دو الگ الگ خیال رکھنے والوں کے درمیان رائے کا اختلاف ہو جاتا ہے۔ جب ایک منصب کے دو دعویداروں کے درمیان ٹکراؤ شروع ہو جاتا ہے تو یہی وہ مواقع ہوتے ہیں جب کہ یہ پتہ چلتا ہے کہ آدمی حقیقت کے اعتبار سے کیا ہے۔ ایسے مواقع پر جو شخص نفرت، خود غرضی، بے انصافی اور انانیت کا مظاہرہ کرے وہ اپنے اس عمل سے ثابت کرتا ہے کہ وہ جہنمی نفسیات میں جی رہا تھا، وہ ابلیس اور شیطان کا پڑوسی تھا۔ اس کے برعکس جس شخص کا رد عمل ان مواقع پر محبت، بے غرضی، انصاف پسندی اور تواضع کی صورت میں ظاہر ہو وہ ثابت کر رہا ہے کہ وہ جنتی نفسیات میں جی رہا ہے، اس کے روز و شب خدا اور اس کے فرشتوں کے پڑوس میں گزرتے ہیں۔ جو شخص دنیا میں شیطان کا پڑوسی ہے، آخرت میں بھی اس کو شیطان ہی کا پڑوس حاصل ہوگا اور جو شخص دنیا میں خدا اور فرشتوں کا پڑوسی ہے، وہ آخرت میں بھی خدا اور فرشتوں کے پڑوس میں رہے گا۔

جب موت ہر چیز کو باطل کر دے گی

وہ وقت کیسا عجیب ہوگا جب لوگوں کو معلوم ہوگا کہ عمل کے نام پر دنیا میں وہ جو کچھ کرتے رہے وہ بے عملی کی بدترین شکل تھی لوگ دنیا میں اپنے آپ کو اوپر اٹھا کر فخر کرتے رہے حالاں کہ ان کے لئے قابل فخر بات یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے حکم کے آگے جھکا دیں۔ وہ اپنی غلطیوں کی توجیہہ و تاویل کو کامیابی سمجھتے رہے حالاں کہ ان کی کامیابی یہ تھی کہ وہ اپنی غلطیوں کا کھلے دل سے اعتراف کرلیں۔ ان کو الفاظ اس لئے دئے گئے تھے کہ ان کو اللہ کی تعریف میں استعمال کریں۔ مگر وہ اپنے الفاظ کے ذخیرہ کو انسان کی تعریف میں خرچ کرتے رہے۔ ان کے اندر خوف و محبت کے نازک جذبات اس لئے رکھے گئے تھے کہ وہ ان کو خدا کے لئے وقف کردیں۔ مگر وہ دوسری چیزوں کو اپنے خوف و محبت کے جذبات کا مرکز بناتے رہے۔ انھوں نے مال جمع کرنے کو سب سے بڑی چیز سمجھا حالاں کہ ان کے لئے سب سے بڑی چیز یہ تھی کہ وہ اپنے مال کو اللہ کی راہ میں دے کر بے مال ہوجائیں۔ ان کا اصلی کمال یہ تھا کہ وہ کمزوروں کا لحاظ کریں مگر وہ کمزوروں کو نظر انداز کرکے طاقت وروں کا استقبال کرتے رہے۔ ان کے لئے زیادہ بہتر یہ تھا کہ معانی کے خاموش سمندر میں غوطہ لگائیں مگر وہ شور و غل کے ہنگامے کھڑے کرنے میں مشغول رہے۔ ان کی ترقی کا راز یہ تھا کہ وہ اپنی ذات کا احتساب کرنے والے بنیں مگر وہ دوسروں کا احتساب کرنے میں مصروف رہے۔ ان سے یہ مطلوب تھا کہ دنیا کا مال یا دنیا کی عزت پائیں تو اس کو بے حقیقت سمجھیں اور اس سے بے رغبتی کا ثبوت دیں مگر اسی کو وہ سب سے بڑی چیز سمجھ بیٹھے۔

آج کی دنیا میں لوگ دوسروں کے ظلم کا اعلان کرنے کے بہادر بنے ہوئے ہیں، اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب ان کو معلوم ہوگا کہ اصل بہادری یہ تھی کہ وہ خود اپنے ظلم کو جاننے کے بہادر بنیں۔ لوگ کسی نہ کسی غیر خدا کا دامن تھام کر سمجھ رہے ہیں کہ انھوں نے اپنے لئے مضبوط پناہ حاصل کرلی، اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب ان کو معلوم ہوگا کہ خدا کے سوا کوئی نہ تھا جو کسی کے لئے پناہ بن سکے۔ لوگ الفاظ بول کر اپنے کو بری الذمہ سمجھ رہے ہیں۔ اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب ان کو معلوم ہوگا کہ یہ صرف حقائق تھے جو کسی کو بری الذمہ کرسکتے تھے۔ لوگ دنیا کے اسباب کو اکھٹا کرکے مطمئن ہیں کہ جو کچھ ان کو پانا تھا وہ انھوں نے پالیا، اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب موت ان کی ہر چیز کو باطل کر دے گی اور ان کو معلوم ہوگا کہ انھوں نے کچھ بھی نہیں پایا تھا۔ لوگ دوسروں کی غلطیوں کی فہرست مرتب کر رہے ہیں، اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب فرشتے خود ان کی غلطیوں کی فہرست ان کے سامنے پیش کریں گے۔ لوگ زندگی کو اصل مسئلہ سمجھے ہوئے ہیں۔ اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب ان کو معلوم ہوگا کہ ان کا اصل مسئلہ موت تھا نہ کہ دنیا کی چند روزہ زندگی۔ لوگ اپنے خود ساختہ معیار کے مطابق پاکر اپنے کو برحق سمجھ رہے ہیں، اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب ان کو معلوم ہوگا کہ حق پر صرف وہ تھا جو اللہ کے مقرر کئے ہوئے معیار کے مطابق تھا۔ لوگ استقبال کرنے والوں کی بھیڑ پاکر اپنے کو خوش قسمت سمجھ رہے ہیں، اس وقت لوگوں کا کیا حال ہوگا جب ان کو معلوم ہوگا کہ خوش قسمت صرف وہ تھا جس کے استقبال کے لئے اللہ اور اس کے فرشتے اس کا انتظار کر رہے تھے ——— ہر آدمی نے اپنی خوش خیالیوں کی ایک دنیا بنا رکھی ہے اور اپنے آپ کو اس کے اندر پاکر مطمئن ہے۔ مگر قیامت ایسے تمام گھروندوں کو توڑ دے گی۔ اس وقت صرف وہ شخص محفوظ ہوگا جو خدا کے "گھر" میں پناہ پکڑے ہوئے تھا، جس نے اپنے لئے خدا کا سایہ حاصل کرلیا تھا۔

یہ جہنمی قافلے

" ہر آدمی جنت کی تلاش میں ہے مگر ہر آدمی اپنی جنت کو دوزخ میں تلاش کر رہا ہے"۔ میری زبان سے بے ساختہ نکلا۔ "لوگ کانٹوں میں پھول کو ڈھونڈ رہے ہیں، وہ اپنی زندگی کو کھنڈر کر رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بہت جلد ان کے لئے ایک شاندار محل کھڑا ہونے والا ہے"۔

ہر آدمی اپنی زندگی کو سنوارنے میں لگا ہوا ہے۔ کوئی تجارت اور ملازمت کے میدان میں محنت کر رہا ہے۔ کوئی قیادت کے میدان میں اپنا نام اونچا کرنے کے لئے سرگرم ہے۔ کسی کا دماغ خوبصورت الفاظ کا کارخانہ بنا ہوا ہے تاکہ وہ عوام کی بھیڑ کو زیادہ سے زیادہ اپنے گرد جمع کر سکے۔ ہر آدمی اپنے ذہن میں اپنے مستقبل کا ایک سہانا خواب لئے ہوئے ہے اور ہر آدمی اپنے خواب کو واقعہ بنانے میں رات دن مصروف ہے۔ مگر لوگوں سے قریب ہو کر ان کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اپنے خوابوں کی دنیا کو حاصل کرنے کے لئے لوگوں کے پاس عمل غیر صالح کے سوا کوئی سرمایہ نہیں۔

آدمی اپنے رشتہ داروں کے حقوق سے بے پروا ہو کر اپنے بچوں کا مستقبل بنانا چاہتا ہے۔ وہ اپنے پڑوسیوں کو دکھ پہنچا کر دور کے لوگوں میں خوش نام ہونے کی تدبیریں کر رہا ہے۔ وہ اپنے ذاتی معاملات میں بے انصافی کر کے باہر کی دنیا میں انصاف کا علم بردار بنا ہوا ہے۔ وہ اپنے خلاف ایک لفظ سننے کے لئے تیار نہیں مگر دوسروں کے خلاف سب کچھ کہنے اور کرنے کے لئے وہ اپنے آپ کو خدائی فوجدار سمجھتا ہے۔

خدا نے اپنی دنیا میں انسان کے لئے وہ سب کچھ رکھا ہے جو وہ چاہتا ہے، بلکہ اس سے زیادہ بھی۔ مگر خدا کی دنیا میں ہر اچھی چیز کو پانے کا ذریعہ اچھا عمل ہے —— خدا کا انعام ان لوگوں کو ملتا ہے جو اپنے متعلقین کے حقوق ادا کریں۔ جو اپنے پڑوسیوں کو اپنے شر سے بچائیں۔ جو اپنے اہل معاملہ کے ساتھ انصاف کریں۔ جو خود پسندی کے بجائے خدا پسندی کے اوپر اپنی زندگیوں کو اٹھائیں۔ جو لوگوں سے حق اور عدل کی بنیاد پر معاملہ کریں نہ کہ اکڑ اور خود غرضی کی بنیاد پر۔ جو حق کے آگے جھک جائیں چاہے وہ ان کے خلاف کیوں نہ ہو۔ جو اپنی انا کو خدا کے حوالے کر دیں اور خدا کی دنیا میں بے انا بن کر رہنے پر راضی ہو جائیں۔

لوگ جہنمی انگاروں میں کودتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ خوبصورت پھولوں سے کھیل رہے ہیں۔ وہ دوزخ کے راستوں میں دوڑ رہے ہیں اور خوش ہیں کہ بہت جلد وہ جنت کے باغوں میں پہنچنے والے ہیں۔ آہ وہ قافلہ جس کے پاس جھوٹی خوش فہمی کے سوا اور کوئی سرمایہ نہیں۔ آہ وہ لوگ جو خدا کی دنیا میں اپنے لئے ایک ایسی دنیا بنانا چاہتے ہیں جس کی خدا نے اجازت نہیں دی۔

خدا سے ڈرو

آج کوئی بستی ایسی نہیں ہے جہاں ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر ظلم نہ کر رہا ہو۔ آج مسلمان اپنے بھائی کو ستانے کے لئے سب سے زیادہ شیر بنا ہوا ہے۔ مگر لوگ کس آدمی کو ستاتے ہیں۔ اس آدمی کو جو ان کی نظر میں کمزور ہو۔ جو داداگیری کرنا نہ جانتا ہو، جس نے اپنے آگے پیچھے ساتھیوں کی فوج نہ جمع کر رکھی ہو، جو پولس اور کچہری سے دور رہنا چاہتا ہو۔ لوگ بے زوروں کے لئے بہادر ہیں اور جو شخص لوگوں کو زور آور دکھائی دیتا ہو اس کے لئے کوئی بہادر نہیں۔

مگر یہ اندھے پن کی آنکھ سے دیکھنا ہے۔ اگر ان کے پاس دیکھنے والی آنکھ ہو تو وہ سب سے زیادہ اس سے ڈریں جس کو وہ بے زور سمجھتے ہیں۔ کیونکہ جو شخص بے زور ہے اس کے پیچھے خدا کھڑا ہوا ہے۔

دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ آزمائش کے منصوبہ کے تحت ہو رہا ہے۔ خدا کو جانچ کر ہر شخص کے بارے میں جاننا ہے کہ ان میں سے کون ہے جو اللہ سے ڈرنے والا ہے اور وہ کون ہے جو اللہ سے بے خوف ہے۔ اس کی جانچ کیسے ہو۔ اس کی جانچ ان اشخاص کی سطح پر نہیں ہو سکتی جو اپنی زور آوری کی وجہ سے لوگوں کو مرعوب کئے رہتے ہیں، جن کی طاقت دیکھ کر لوگوں کو ان پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ان کے خلاف اگر لوگ برائی نہ کریں تو یہ ان کی اپنی طاقت سے ڈرنے کی وجہ سے ہوگا نہ کہ خدا کے ڈر کی وجہ سے۔

مگر ایک شخص ہے جس کے پاس ان چیزوں میں سے کوئی چیز نہیں جو لوگوں کو مرعوب اور خوف زدہ کرتی ہے۔ اس کو ستانے سے اگر کوئی شخص بچتا ہے تو اس کی وجہ یقیناً اخلاقی ہوگی نہ کہ مادی۔ خدا کچھ افراد کو بے زور اور بے حیثیت بنا کر لوگوں کے درمیان رکھتا ہے اور پھر ان کو دیکھتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ جو شخص کمزور آدمی کے ساتھ بے انصافی کرنے سے ڈرا وہ گویا خدا سے ڈرا، اس کا ٹھکانا جنت ہوگا۔ جو شخص کمزور آدمی کے ساتھ بے انصافی کرنے سے نہیں ڈرا وہ گویا خدا سے نہیں ڈرا، ایسا شخص جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں دھکیل دیا جائے گا۔

ہر آدمی بری زندگی گزار کر مر جاتا ہے تاکہ موت کے بعد اور زیادہ بری زندگی کی طرف دھکیل دیا جائے!

جب حقیقت کھلے گی

دنیا میں کچھ لوگ وہ ہیں جن کے دل خدا کے آگے جھکے ہوئے نہیں ہیں۔ وہ دکھاوے کے لئے خدا کو سجدہ کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا حال آخرت میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہاں جب کہا جائے گا کہ اپنے رب کو سجدہ کرو تو وہ وہاں سجدہ نہ کر سکیں گے (قرآن ۶۸ - ۴۲)

سجدہ محض ایک وقتی اور رسمی نوعیت کا جسمانی فعل نہیں۔ وہ اپنے آپ کو حقیقت اعلیٰ کے آگے جھکانا ہے، وہ اپنی پوری زندگی کو حق و صداقت کے تابع بنا دینا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس آیت میں محدود معنوں میں صرف "سجدہ" کا ذکر نہیں ہے بلکہ یہ آیت پوری زندگی کے بارہ میں ایک اہم حقیقت کو بتا رہی ہے۔

موجودہ دنیا میں ہر شخص اور ہر قوم کا یہ حال ہے کہ ان کے دل سچائی کے آگے جھکے ہوئے نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو حق کے تابع نہیں بنایا ہے۔ مگر ظاہری رویہ میں ہر ایک یہ دکھا رہا ہے کہ وہ حق پر قائم ہے۔ ہر ایک اپنی زبان سے ایسے الفاظ بول رہا ہے گویا کہ اس کا کیس انصاف کا کیس ہے نہ کہ ظلم اور استغلال کا کیس۔

مگر اس قسم کی دھاندلی صرف موجودہ امتحانی دنیا میں ممکن ہے۔ آخرت کے آتے ہی پوری صورت حال بالکل بدل جائے گی۔ بازار میں کھوٹے سکے چل سکتے ہیں مگر بنک میں کھوٹے سکے نہیں چلتے۔ اسی طرح آخرت میں اس کا امکان ختم ہو جائے گا کہ کوئی جھوٹی بات کو سچے الفاظ میں بیان کرے۔ کوئی بے انصافی کے عمل کو انصاف کا عمل ثابت کرے۔

آخرت میں یہ ہوگا کہ الفاظ جھوٹے معانی کو قبول کرنے سے انکار کر دیں گے۔ کسی کے لئے یہ ممکن نہ ہوگا کہ وہ ظلم کو انصاف بتائے اور باطل کو حق کے لباس میں پیش کرے۔ اس وقت ظاہر اور باطن کا فرق ختم ہو جائے گا۔ آدمی کی زبان وہی بول سکے گی جو اس کے دل میں ہے۔ اس دن ہر آدمی عین اس روپ میں دکھائی دے گا جو باعتبار حقیقت تھا نہ کہ اس روپ میں جو وہ مصنوعی طور پر دوسروں کے سامنے ظاہر کر رہا تھا۔

لوگ انسان کے سامنے اپنے آپ کو حق بجانب دکھا کر مطمئن ہیں کہ وہ حق بجانب ثابت ہو گئے۔ حالانکہ حق بجانب وہ ہے جو خدا کے سامنے حق بجانب ثابت ہو۔ اور وہاں کا حال یہ ہے کہ وہاں صرف حق حق ثابت ہوگا اور جو باطل ہے وہ وہاں صرف باطل ہو کر رہ جائے گا۔

نازک سوال

آرتھر کوئسلر موت کی طرف سفر کو نامعلوم ملک (Unknown Country) کی طرف سفر کہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موت ہماری زندگی کا سب سے عجیب اور پر اسرار واقعہ ہے۔ ہر آدمی متجسس ہوتا ہے کہ یہ معلوم کرے کہ مرکر وہ کہاں پہنچنے والا ہے۔

امریکہ کے مشہور مشنری ڈاکٹر بلی گرہم کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے مسرت کا راز (The Secret of Happiness) اس کتاب میں بلی گرہم نے لکھا ہے کہ ایک بار مجھے دنیا کے ایک بہت بڑے لیڈر کا ارجنٹ پیغام ملا۔ پیغام میں کہا گیا تھا کہ فوراً مجھ سے ملاقات کرو۔

میں روانہ ہو کر مذکورہ لیڈر کے یہاں پہنچا۔ جب میں لیڈر سے اس کے دفتر میں ملا تو وہ فوراً مجھے الگ کمرہ میں لے گیا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بڑے موثر لہجہ میں کہا :

I am an old man. Life has lost all meaning. I
am ready to take a fateful leap into the Unknown.
Young man, can you give me a ray of hope.

میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ زندگی نے اپنی تمام معنویت کھو دی ہے۔ عنقریب میں نامعلوم دنیا کی طرف ایک فیصلہ کن چھلانگ لگانے والا ہوں۔ اے نوجوان شخص، کیا تم مجھے امید کی کوئی کرن دے سکتے ہو۔

موت ہر آدمی کا پیچھا کر رہی ہے۔ بچپن اور جوانی کی عمر میں آدمی اسے بھولا رہتا ہے۔ مگر بالآخر تقدیر کا فیصلہ غالب آتا ہے۔ بڑھاپے میں جب اس کی طاقتیں گھٹ جاتی ہیں۔ تب اسے محسوس ہوتا ہے کہ اب میں بہر حال جلد ہی مر جاؤں گا۔ اس وقت وہ مجبور ہوتا ہے کہ سوچے کہ "موت کے بعد کیا ہونے والا ہے" اسے تلاش ہوتی ہے کہ وہ کوئی امید کی کرن پالے جو موت کے بعد آنے والے حالات میں اس کی زندگی کو تابناک کر سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کے پیغمبر اسی امید کی روشنی کو دینے کے لئے آئے۔ پیغمبروں نے انسان کو بتایا کہ موت کے بعد ایک اور دنیا ہے جو ابدی بھی ہے اور معیاری بھی۔ موت کے بعد کی اس کامل دنیا میں اس کو داخلہ ملے گا جو موت سے پہلے کی دنیا میں صالح اعمال سے اس کا استحقاق ثابت کرے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن میں ان لفظوں میں اشارہ کیا گیا ہے :

...and God calls to the home of peace.

اور خدا امن کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔ (واللہ یدعوا الی دار السلام، یونس ۲۵)

آج بونا کل کاٹنا

گھنشیام داس برلا (۱۹۸۳-۱۸۹۴) راجستھان کے ایک گاؤں پلانی میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ ایک معمولی آدمی تھے اور کلکتہ میں جوٹ کے دلال کے طور پر کام کرتے تھے۔ چودہ سال کی عمر میں مسٹر برلا بھی کلکتہ چلے گئے اور وہاں اپنے باپ کے کام میں مدد کرنے لگے۔

مسٹر برلا کو ایک روز کلکتہ کے کسی تجارتی دفتر کی عمارت میں اوپر کی منزل پر جانا تھا۔ وہ جب لفٹ میں سوار ہونے لگے تو انھیں روک دیا گیا۔ کیوں کہ یہ لفٹ صرف انگریز افسروں کے استعمال کے لئے تھی۔ جب وہ سیڑھیوں پر چڑھ کر اوپر پہنچے تو وہاں بھی ان کو کرسی پر بیٹھنے کی اجازت نہیں ملی۔ ان کو ایک بنچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا جو چپراسیوں کے لئے مخصوص تھی۔ تاہم نوجوان برلا اس بنچ پر نہیں بیٹھے اور کام ہونے تک برابر کھڑے رہے۔

انگریزی دور میں مذکورہ بالا قسم کے تجربات نے مسٹر برلا کے اندر قومی آزادی کے خیالات پیدا کر دئے۔ وہ تحریک آزادی میں مہاتما گاندھی کے ساتھی بن گئے۔ یہ وہ دور تھا جب کہ سرمایہ دار طبقہ کانگرس کے قریب آنے سے گھبراتا تھا۔ مگر مسٹر برلا نہایت دور بین اور حوصلہ مند آدمی تھے۔ انھوں نے ۱۹۴۷ سے پہلے کی کانگرس میں ۱۹۴۷ کے بعد کی کانگرس کی جھلک دیکھ لی۔ انھوں نے قومی تحریک کے دور کے ہندستان میں آزادی کے دور کے ہندستان کا مشاہدہ کر لیا۔ انھوں نے اس راز کو پالیا کہ آج کے "لیڈر" کل کے "وزیر" ہوں گے، آج اگر وہ ان لیڈروں کی مدد کریں تو کل وہ ان سے زبردست فائدے حاصل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے آزادی کی تحریک کی باقاعدہ مالی مدد شروع کر دی۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۴۷ تک وہ اس سلسلے میں گاندھی جی کو اور کانگرس پارٹی کو تقریباً ۲۰ کروڑ روپے دے چکے تھے۔

آزادی کے بعد مسٹر برلا کو اس کا زبردست فائدہ حاصل ہوا۔ نئی حکومت کی طرف سے ان کو ہر قسم کی غیر معمولی سہولتیں ملنا شروع ہو گئیں۔ انھوں نے اتنی تیزی سے ترقی کی کہ آزاد ہندستان کے سب سے بڑے صنعت کار بن گئے۔ آج برلا کا خاندان ہندستان کا سب سے زیادہ دولت مند خاندان سمجھا جاتا ہے۔

جو آدمی آج بوتا ہے وہی آدمی کل کاٹتا ہے۔ یہ بات آج کی دنیا کے لئے بھی صحیح ہے اور یہی کل کی دنیا کے لئے بھی۔

موت کے کنارے

آج وہ بے وقت مجھ سے ملنے آگیا تھا اور بہت کم میرے پاس ٹھہرا۔ خلاف معمول اس نے چائے بھی قبول نہیں کی۔ "مجھے بہت جلد گھر پہنچنا ہے۔ وہاں میری بیوی میرا انتظار کر رہی ہوگی" اس نے کہا اور اپنا اسکوٹر اسٹارٹ کر کے تیزی سے روانہ ہوگیا۔ اس کی واپسی کو بمشکل آدھ گھنٹہ ہوا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس کی بیوی گھبرائی ہوئی آواز میں بول رہی تھی "آپ کے دوست کا ۔ ۔ ۔" اس نے کہا۔ بظاہر اس کا جملہ ادھورا تھا۔ مگر اس کے رونے کی آواز نے اس کو پورا کر دیا۔ میں ٹیلی فون بند کر کے فوراً اس کے گھر کی طرف بھاگا۔ معلوم ہوا کہ اس کا انتقال ہو چکا ہے۔ مجھ سے رخصت ہو کر وہ اپنے گھر پہنچا۔ ابھی سیڑھیوں ہی پر تھا کہ لڑھک کر گر پڑا۔ لوگ اٹھا کر اندر لے گئے۔ فوراً ڈاکٹر بلایا گیا مگر ڈاکٹر نے آکر صرف یہ خبر دی کہ وہ اس دنیا سے جا چکا ہے۔

اسکوٹر پر سوار ہو کر وہ میرے یہاں سے روانہ ہوا تو بظاہر وہ اپنے گھر جا رہا تھا۔ مگر حقیقۃً وہ موت کی طرف جا رہا تھا۔ یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں۔ اس طرح کے واقعات ہر روز اور ہر جگہ پیش آرہے ہیں۔ ۲۶ مئی ۱۹۷۹ کو امریکہ کا ایک بڑا جیٹ جہاز جس میں ۲۷۱ مسافر سوار تھے، اوہرے (O'Hare) ہوائی اڈے سے اڑا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ زمین پر گر گیا۔ جہاز سمیت سارے مسافر جل کر راکھ ہو گئے۔ یہ معاملہ چند انسانوں کا نہیں بلکہ یہی معاملہ تمام انسانوں کا ہے۔ سارے انسان جو زمین پر چلتے اور دوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ سب موت کی منزل کی طرف جا رہے ہیں۔ ہر آدمی سب سے زیادہ جس چیز کے قریب ہے وہ موت ہے۔ ہر آدمی موت کے کنارے کھڑا ہوا ہے۔ ہر آدمی ہر آن اس خطرہ میں مبتلا ہے کہ اس کا آخری وقت آجائے اور وہ اچانک اس دنیا سے اٹھا کر اگلی دنیا میں پہنچا دیا جائے، جہاں سے کسی کو واپس نہیں آنا ہے۔ جہاں آدمی کے لئے یا تو جنت ہے یا جہنم۔

ایک اندھا آدمی چلتے چلتے کنویں کے کنارے پہنچ جائے تو ہر آدمی جانتا ہے کہ اس وقت سب سے بڑا کام یہ ہے کہ اس کو کنویں کے خطرہ سے آگاہ کیا جائے۔ حتیٰ کہ ایسے نازک موقع پر آدمی قبلہ وکعبہ کی زبان اور نحو وصرف کے قواعد تک بھول جاتا ہے اور بے اختیار پکار اٹھتا ہے "کنواں کنواں"۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ ساری انسانیت اس سے بھی زیادہ خطرناک "کنویں" کے کنارے کھڑی ہوئی ہے۔ مگر ہر آدمی دوسرے دوسرے کاموں میں لگا ہوا ہے۔ کوئی شخص "کنواں کنواں" پکارنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ حتیٰ کہ اگر کوئی دیوانہ اس قسم کی پکار بلند کرے تو لوگوں کی طرف سے جواب ملتا ہے ——— "یہ شخص قوم کو بزدلی کی نیند سلانا چاہتا ہے، وہ جہاد کے جذبہ کو ختم کر رہا ہے، وہ حقیقی مسائل سے لوگوں کو ہٹا دینا چاہتا ہے، وہ زندگی کا پیغام بر نہیں بلکہ موت کا داعی ہے۔ وہ مایوسی اور بے ہمتی کا سبق دے رہا ہے۔"

لوگ کنویں کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ محفوظ مکان میں ہیں۔ لوگ موت کی طرف بڑھ رہے ہیں مگر خوش ہیں کہ وہ زندگی کا سفر طے کر رہے ہیں۔

آنے والا دن

موجودہ دنیا میں جب کوئی آدمی خدا کو مانتا ہے تو وہ دلیل کی بنیاد پر خدا کو مانتا ہے۔ آخرت میں جو لوگ خدا کو مانیں گے وہ خدا کے زور و قوت کی بنیاد پر خدا کو مانیں گے۔ گویا موجودہ دنیا میں دلیل خدا کی نمائندہ ہے۔ اس کے برعکس آخرت میں یہ ہوگا کہ خدا خود اپنی ذات کمال کے ساتھ اپنے آپ کو منوانے کے لئے انسان کے سامنے ظاہر ہو جائے گا۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ حقیقت میں خدا کو ماننے والا کون ہے اور اس کو نہ ماننے والا کون۔ خدا کو ماننے والا وہ ہے جو معقولیت کے وزن کو مانے۔ جو حق کے آگے اس وقت جھک جائے جب کہ اس کے ساتھ لفظی دلیل کے سوا کوئی اور زور شامل نہ ہو۔ اس کے برعکس جس کا یہ حال ہو کہ کوئی بات محض اپنی سچائی کی بنا پر اس کو متاثر نہ کر سکے، وہ کسی سچائی کو صرف اس وقت مانے جب کہ وہ کسی وجہ سے اس کو ماننے کے لئے مجبور ہو گیا ہو۔ جس سچائی کے ساتھ ایسا کوئی دباؤ موجود نہ ہو وہ اس کو ماننے کے لئے بھی تیار نہ ہوتا ہو، ایسا آدمی خدا کو ماننے والا نہیں ہے۔ اس کا معبود ظاہری طاقت ہے نہ کہ غیبی خدا۔

خدا اپنے ماننے کا ثبوت غیب کی سطح پر دے رہا ہے اور لوگ اس کو ماننے کا ثبوت شہود کی سطح پر دینا چاہتے ہیں۔ خدا چاہتا ہے کہ آدمی حق کے آگے جھک جائے مگر آدمی صرف طاقت کے آگے جھکنے کے لئے تیار ہوتا ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ آدمی محض خدا کے خوف کی بنا پر انصاف کے طریقہ کو اپنائے۔ مگر انسان صرف اس وقت انصاف کرنے پر راضی ہوتا ہے جب کہ وہ اس کے لئے مجبور ہو گیا ہو۔ جہاں مجبوری نہ ہو وہاں وہ فوراً سرکشی کرنے لگتا ہے۔

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں آدمی کو موقع ہے کہ وہ اپنی حقیقت کو چھپالے۔ مگر قیامت ہر آدمی کو برہنہ کر دے گی۔ اس وقت بہت سے خدا پرست غیر خدا پرستوں کی صف میں نظر آئیں گے، بہت سے حق کو ماننے والے حق کو نہ ماننے کے مجرم قرار دئے جائیں گے۔ بہت سے لوگ جو جنت کا الاٹمنٹ لئے ہوئے ہیں وہ اپنے کو جہنم کے دروازے پر کھڑا ہوا پائیں گے۔

انسان کتنا زیادہ بے ڈر بنا ہوا ہے، حالانکہ کتنا زیادہ ڈر کا لمحہ اس کے لئے آنے والا ہے۔

سب سے بڑی خبر

ایک ایم سی نوجوان دہلی میں سرکاری ملازم ہیں۔ ان سے میری پرانی ملاقات ہے۔ ایک روز میں کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا، رات کو واپس آیا تو گھر والوں نے بتایا کہ آج مذکورہ نوجوان کئی بار آپ سے ملنے کے لئے آچکے ہیں۔ ابھی باتیں ہو رہی تھیں کہ گھنٹی بجی۔ دروازہ کھولا گیا تو مذکورہ نوجوان تیسری بار مجھ سے ملنے کے لئے دروازے پر موجود تھے۔ مجھ کو دیکھتے ہی وہ مسکرا کر بولے "آج میں آپ کو ایک خوش خبری دینے آیا ہوں"۔ اس کے بعد انھوں نے بتایا کہ میرا پروموشن ہوگیا ہے اور اب میری تنخواہ میں سو روپیہ ماہوار کا اضافہ ہو جائے گا۔

میں نے سوچا کہ آدمی کے پاس اگر کوئی اہم خبر ہو تو وہ اس کو چھپانے پر قادر نہیں ہو سکتا۔ اہم خبر کو آدمی بتا کر رہتا ہے۔ بلکہ وہ ڈھونڈتا ہے کہ کوئی ملے تاکہ وہ اس کو بتا سکے۔ کسی نے نئی کار خریدی ہو یا نیا مکان بنایا ہو تو اس کا چرچا کئے بغیر وہ رہ نہیں سکتا۔ کسی مجلس میں اگر اس کی کار یا اس کا مکان موضوع گفتگو نہ ہو تو وہ کسی نہ کسی طرح موضوع کو بدل کر ایسے رخ پر لاتا ہے کہ وہ اپنی نئی کار اور نئے مکان کی خبر لوگوں کو دے سکے۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ کوئی بھی انسان ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی اہم خبر کو دوسروں کو سنانے کے لئے بے قرار نہ رہتا ہو۔

آج بے شمار آوازیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ہر ایک کے پاس کوئی نہ کوئی پیغام ہے جس کو وہ دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ مگر سنانے والوں کی بھیڑ میں کوئی آخرت کی خبر سنانے والا نہیں۔ کوئی جنت اور جہنم سے آگاہ کرنے والا نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بولنے اور لکھنے والوں کے پاس آخرت کی خبر ہی نہیں۔ ہر ایک کے پاس دنیا کی کوئی نہ کوئی خبر ہے۔ آخرت کی خبر کسی کے پاس موجود ہی نہیں۔ اگر کسی کے پاس آخرت کی خبر ہوتی تو وہ اس کو سنائے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ بلکہ آخرت کی غیر معمولی اہمیت کی بنا پر اس کا یہ حال ہوتا کہ اس کے لئے کوئی دوسری خبر، خبر نہ ہوتی جس کو سنانے کے لئے وہ لوگوں کے سامنے کھڑا ہو۔ وہ اپنی ساری طاقت اور سارا وقت بس آخرت کی خبر سنانے میں لگا دیتا، جہنم سے ڈرانے اور جنت کی خوش خبری دینے کے سوا کوئی کام اس کو کام نظر نہ آتا۔

اگر یہ معلوم ہو کہ اگلے چند لمحہ کے بعد بھونچال آنے والا ہے یا آتش فشاں پھٹنے والا ہے تو ہر آدمی اسی کا تذکرہ کرنے میں مشغول ہوگا۔ ہر دوسری بات کو بھول کر لوگ آنے والے ہولناک لمحہ پر بات کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔ مگر تقریر کرنے والے تقریریں کر رہے ہیں اور مضامین لکھنے والے مضامین لکھ رہے ہیں مگر یہ سب چیزیں قیامت کے تذکرہ سے اس طرح خالی ہوتی ہیں جیسے کہ لوگوں کو آنے والے ہولناک دن کی خبر ہی نہیں۔

آدمی اکثر اپنے گرد وپیش کے مسائل میں الجھا رہتا ہے، ذاتی یا قومی قسم کے معاشی اور سیاسی اور سماجی واقعات جن کا وہ اپنے آس پاس تجربہ کرتا ہے وہ انھیں کو واقعہ سمجھتا ہے اور انھیں کے چرچے میں مشغول رہتا ہے۔ مگر سب سے بڑا مسئلہ قیامت کا مسئلہ ہے۔ قیامت ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے مگر وہ ہونے والے واقعات میں سب سے بڑا واقعہ ہے، وہ تمام واقعات سے زیادہ اس قابل ہے کہ اس کا چرچا کیا جائے۔

ایک پکار

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو دعوت حق کی ذمہ داری سونپی گئی تو آپ نے مکہ کے باشندوں کو صفا پہاڑی کے پاس جمع کیا اور فرمایا کہ اے لوگو، جس طرح تم سوتے ہو اسی طرح تم مرو گے۔ اور جس طرح تم جاگتے ہو اسی طرح تم دوبارہ اٹھائے جاؤ گے۔ اس کے بعد یا تو ابدی جنت ہے یا ابدی جہنم یہ سن کر ابولہب نے کہا، تمہارا برا ہو، کیا تم نے ہم کو اسی لئے بلایا تھا (تبالك، اما جمعتنا الا لهذا)

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب مدینہ کے سردار بن کر مدینہ میں داخل ہوئے تو اس وقت بھی آپ نے اسی قسم کی تقریر فرمائی۔ اس وقت بھی آپ کے پاس کہنے کی جو سب سے بڑی بات تھی وہ یہ تھی کہ اے لوگو اپنے آپ کو آگ کے عذاب سے بچاؤ، خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ کیوں نہ ہو (اتقوا النار ولو بشق تمرة)

اسلامی مرکز کا مقصد اسی پیغمبرانہ دعوت کو زندہ کرنا ہے۔ لوگ مسائل زندگی کے لئے اٹھے ہیں۔ ہم مسائل موت کے لئے اٹھے ہیں۔ کیا کوئی ہے جو اس مشن میں ہمارا ساتھ دے۔ لوگوں کو جنگ اور فساد کے شعلے دکھائی دیتے ہیں۔ کیا کوئی ہے جس کو جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلے دکھائی دیتے ہوں تاکہ وہ ہمارا ساتھ دے کر دنیا والوں کو جہنم کے شعلوں سے ڈرائے۔

لوگوں کو شہروں کی رونقیں دکھائی دیتی ہیں۔ ہم ان انسانوں کی تلاش میں نکلے ہیں جن کو قبرستان کے ویرانے دکھائی دیں۔ ایسے انسانوں سے دنیا پٹی ہوئی ہے جن کو یہ محرومی بیتاب کئے ہوئے ہے کہ ان کو کسی ادارہ میں داخلہ نہیں ملا۔ ہم کو وہ انسان درکار ہیں جن کو یہ غم بدحواس کردے کہ کہیں وہ جنت کے داخلہ سے محروم نہ ہو جائیں۔ لوگ دنیا کی بربادی کا ماتم کر رہے ہیں۔ ہم ان انسانوں کو ڈھونڈ رہے ہیں جو آخرت کی بربادی کے اندیشے میں دیوانے ہو چکے ہوں۔

خدا کی دنیا میں آج سب کچھ ہو رہا ہے۔ مگر وہی ایک کام نہیں ہو رہا ہے جو خدا کو سب سے زیادہ مطلوب ہے۔ یعنی آنے والے ہولناک دن سے لوگوں کو آگاہ کرنا۔ اگر انسان اس پکار کے لئے نہ اٹھیں تو اسرافیل کا صور اسے پکارے گا۔ مگر آہ، وہ وقت جاگنے کا نہیں ہوگا۔ وہ ہلاکت کا اعلان ہوگا نہ کہ آگاہی کا الارم۔

باغِ جنّت

فہرست

دیباچہ	۳	دو قسم کی روحیں	۲۶
خدا کو ماننا	۴	شکر کا جذبہ	۲۷
خدا کو پانے والے	۵	اللہ والے	۲۸
خدا کا پڑوسی	۶	مانگنے والا پاتا ہے	۲۹
رزق کا دسترخوان	۷	جنت کے شہری	۳۰
جنت قربت الٰہی کا نام ہے	۸	عبدیت کا مقام	۳۱
جنت سب سے بڑا عطیہ ہے	۹	درخت کا سبق	۳۲
جنتی نگاہ	۱۰	جنت کی وراثت	۳۳
عبادت کرنے والے	۱۱	آخرت میں جینے والے	۳۴
کامل دنیا	۱۲	جنتی عمل	۳۵
اندھیرے کے بعد اجالا	۱۳	جنت کس کا حصہ ہے	۳۶
تاریکی ختم ہوگی	۱۴	جنتی کون	۳۷
تمناؤں کی دنیا	۱۵	قیمت نہ دینا	۳۸
کھونے والا پاتا ہے	۱۶	جنتی اعمال	۳۹
جب خدا ظاہر ہوگا	۱۷	جنت کا مسافر	۴۰
آفاقی دین	۱۸	جنتی اخلاقیات	۴۱
اسلامی زندگی	۱۹	جنت والے	۴۲
مومن خدا کی انڈسٹری ہے	۲۰	جب آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی	۴۳
عمل یا اعتراف	۲۱	جنت کا پھول	۴۴
صبر کا سفر	۲۲	ربانی اوصاف	۴۵
خدا کا درخت	۲۳	خدا کے لئے جھکنے والے	۴۶
جنت کی وراثت	۲۴	جنتی کردار	۴۷
جنتیوں کا انتخاب	۲۵	داعی خدا کا نمائندہ	۴۸

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خدا نے اپنی پسند کی ایک دنیا بنائی اور اس کا نام جنت رکھا۔ یہ جنت ابدی خوشیوں اور راحتوں کی دنیا ہے۔ وہاں نہ دکھ ہے اور نہ شور وغل۔ نہ رنج ہے اور نہ حادثہ۔ وہ ہر قسم کی کلفتوں سے آزاد دنیا ہے۔ ہر قسم کی نعمتیں وہاں بے حساب مقدار میں اکٹھا کی گئی ہیں۔ وہاں آدمی نہ مرے گا اور نہ کبھی اکتائے گا اور نہ کبھی کسی طرح کے غم سے دوچار ہوگا۔

یہی وہ دنیا ہے جس کی طلب ہر شخص کی فطرت میں موجود ہے۔ ہر آدمی ایک نادیدہ جنت کی تلاش میں ہے۔ مگر یہ لامحدود جنت کوئی شخص موجودہ محدود دنیا میں نہیں پاسکتا۔ خدا نے اس جنت کو موت کے بعد آنے والی دنیا میں رکھ دیا ہے۔

تاہم یہ جنت اپنے آپ کسی کو نہیں مل جائے گی۔ یہ صرف اس خوش نصیب آدمی کا حصہ ہے جو موجودہ زندگی میں جنت والے عمل کرے۔ خدا نے ہماری زندگی کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ ہماری زندگی کا مختصر حصہ موجودہ دنیا میں ہے اور اس کا بقیہ تمام حصہ موت کے بعد آنے والی دنیا میں ——— موجودہ دنیا کو خدا نے عمل کی جگہ بنایا ہے اور بعد کی دنیا کو عمل کا بدلہ پانے کی جگہ۔

امتحان کی مصلحت کی بنا پر موجودہ دنیا میں آدمی کو اختیار دے دیا گیا ہے۔ وہ آزاد ہے کہ جو چاہے کرے۔ مگر یہ آزادی برائے آزمائش ہے نہ کہ برائے انعام۔ جو آدمی وقتی آزادی کی بنا پر غلط فہمی میں نہ پڑے اور اپنے آپ کو حقیقتِ حال کے مطابق بنائے وہ جنت میں بسایا جائے گا۔ اور جو شخص آزادی پاکر سرکشی کرے اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔

اس کائنات میں سارا اختیار حقیقۃً صرف ایک خدا کو حاصل ہے۔ وہی ہر چیز کا مالک ہے۔ ہر آدمی ہر لمحہ اس کی مٹھی میں ہے۔ جو آدمی اس حقیقتِ واقعہ کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے ارادہ سے اپنے آپ کو خدا کے آگے ڈال دے وہ جنت کا مستحق بنا۔ اور جو شخص حقیقت واقعہ سے انحراف کر کے خود ساختہ طریقوں پر چلے وہ خدا کی نظر میں مجرم ہے۔ آخرت کی نعمتوں میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔

وحید الدین ۱۹ دسمبر ۱۹۸۱

خدا کو ماننا

خدا ہر قسم کی خوبیوں کا خزانہ ہے۔ اس کی قدرت کہیں روشنی کی صورت میں ظاہر ہو رہی ہے اور کہیں حرارت کی صورت میں۔ کہیں وہ مادہ کو ہریالی میں تبدیل کر رہا ہے اور کہیں پانی کی روانی میں۔ کہیں وہ رنگ کی صورت میں اپنا جلوہ دکھا رہا ہے اور کہیں مزہ اور خوشبو کی صورت میں۔ کہیں اس کی قدرت سے حرکت کے کرشمے ظاہر ہو رہے ہیں اور کہیں کشش کے کرشمے۔

ایسے کمالات والے خدا کو پانا ایک خشک عقیدہ کو پانا نہیں ہو سکتا۔ ایسے خدا کو پانا یہ ہے کہ آدمی کی روح ایک اتھاہ روشنی سے جگمگا اٹھے۔ وہ اس کے قلب کے لئے لطف و لذت بن جائے۔ آدمی ایک اچھا پھل کھاتا ہے تو باغ باغ ہو جاتا ہے۔ وہ ایک لطیف نغمہ سنتا ہے تو ہمہ تن وجد میں آجاتا ہے۔ پھر خدا جو ساری خوبیوں کا سرچشمہ ہے اس کا پانا کیا کسی کو بے قرار نہیں کرے گا۔

خدا کو پانا یہ ہے کہ وہ ایک خوشبو ہو جس سے آدمی کا شامہ معطر ہو جائے۔ وہ ایک مزہ ہو جس سے اس کا ذائقہ لطف پائے۔ وہ ایک حسن ہو جو اس کی بصارت کو ایک حیرتناک نظارہ میں محو کر دے۔ وہ ایک ترنم ہو جو اس کے سامعہ کو ایسی لذت دے جس سے وہ کبھی سیر نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جس خدا نے یہ تمام خوبیاں پیدا کی ہیں وہ خود ان خوبیوں کا سب سے بڑا خزانہ ہے۔ کسی کو خدا کی قربت ملنا دراصل اس کا جنت میں پہنچ جانا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص رنگ اور خوشبو کے ابدی چمنستان میں جا بسے۔ جیسے وہ ایک پیکر نور کے پڑوس میں پہنچ جائے۔

خداکو پانے والے

خدا کا بندہ وہ ہے جس نے خدا کو ان عظمتوں کے ساتھ پایا ہو جس کے اثرات اس ہیجان خیز کیفیت میں ڈھل جاتے ہیں جس کو خدا کی یاد کہا گیا ہے۔ جو خدا کو اس طرح دیکھ لے کہ اس کی ہیبت سے اس کا دل دہل اٹھے اور اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ خدا کو پانے والا وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرے اور سب سے زیادہ خدا سے محبت کرے۔ جس کا یہ حال ہو کہ صرف ایک خدا اس کی تمام توجہات کا مرکز بن جائے۔

ایسا آدمی قرآن کو پڑھتا ہے تو اس کی روح پکار اٹھتی ہے کہ خدایا یہ تیرا کتنا بڑا احسان ہے کہ تو نے میری ہدایت کا ایسا انتظام کیا ورنہ میں جہالت کے اندھیروں میں بھٹکتا رہتا۔ وہ رسول کی سنت کو دیکھتا ہے تو اس کا وجود اِس دریافت سے سرشار ہو جاتا ہے کہ یہ خدا کا کیسا غیر معمولی انتظام ہے کہ اس نے پیغمبر کی زندگی میں ہدایت کا بے داغ نمونہ قائم کیا اور پھر تاریخ میں اس کو روشنی کے ابدی مینار کی صورت میں محفوظ کر دیا۔ جب وہ سجدہ کرتے ہوئے اپنا سر زمین پر رکھتا ہے تو اس کو یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ اس کے رب نے اس کو اپنی رحمت کے آغوش میں لے لیا ہے۔ جب وہ کوئی غذا اپنی حلق کے نیچے اتارتا ہے تو اس کی پوری ہستی میں اس احسان مندی کی لہر دوڑ جاتی ہے کہ کیسا عجیب ہے وہ خدا جس نے میرے جسم کی پرورش کے لئے ایسی مکمل غذا کا اہتمام کیا۔ جب وہ پانی پیتا ہے تو اس کی آنکھوں سے ایک اور جھرنا بہہ پڑتا ہے اور وہ بے اختیار ہو کر کہہ اٹھتا ہے کہ خدایا اگر تو مجھے سیراب نہ کرے تو میں سیراب ہونے والا نہیں، اگر تو مجھے پانی نہ دے تو کہیں سے مجھ کو پانی ملنے والا نہیں۔

خدا کا پڑوسی

خدا کو پانے والا دنیا کی زندگی ہی میں خدا کا پڑوسی بن جاتا ہے۔ اس کی روح خدا کے نور میں نہا اٹھتی ہے۔ پھولوں کی صحبت آدمی کو لطیف کیفیات سے بھر دیتی ہے پھر کیسے ممکن ہے کہ آدمی اپنے رب کو پائے اور پھر بھی اس کے اندر ربانی کیفیات پیدا نہ ہوں۔

بہت سے لوگ اپنے کو خدا کے قریب سمجھتے ہیں حالانکہ وہ انتہائی حد تک خدا سے دور ہوتے ہیں۔ وہ خدا کی باتیں کرتے ہیں مگر ان کا پورا وجود گواہی دے رہا ہوتا ہے کہ ابھی انھوں نے خدا کو پہچانا ہی نہیں۔

وہ خدا کا نام لیتے ہیں مگر ان کے منھ میں خدائی مٹھاس کی شکر نہیں گھلتی۔ وہ خدا کو پانے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر خدا کے چمنستان کی کوئی خوشبو ان کے مشام کو معطر نہیں کرتی۔ وہ خدا کے نام پر دھوم مچاتے ہیں مگر خدا کے نورانی سمندر میں نہانے کا کوئی نشان ان کے جسم پر ظاہر نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ خدا کی جنتیں ان کے لئے مخصوص ہو چکی ہیں مگر جنت کے باغ کا کوئی جھونکا ان کے وجود کو نہیں چھوتا۔

کیسا عجیب ہوگا وہ خدا جس کی یاد دل و دماغ کی دنیا میں کوئی اہتزاز پیدا نہ کرے۔ کیسی عجیب ہوگی وہ جنت جس میں داخلہ کا ٹکٹ آدمی اپنی جیبوں میں لئے پھرتا ہو مگر جنت کا باسی ہونے کی کوئی جھلک اس کے رفتار و گفتار سے نمایاں نہ ہو۔ کیسے عجیب ہوں گے وہ آخرت والے جن کے لئے آخرت کی ابدی وراثت لکھی جا چکی ہو مگر ان کی ساری دلچسپیاں بدستور اسی عارضی دنیا کی چیزوں میں اٹکی ہوئی ہوں۔

آہ وہ لوگ جو خدا کو پانے کا دعویٰ کرتے ہیں، حالانکہ ابھی تک انھوں نے خدا کو پایا ہی نہیں۔

رزق کا دستر خوان

کائنات مومن کے لئے رزق روحانی کا دستر خوان ہے، ویسے ہی جیسے جنت اس کے لئے رزق مادی کا دستر خوان ہوگی۔ ہوا کے لطیف جھونکے جب اس کے جسم کو چھوتے ہیں تو اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لمس خداوندی کا کوئی حصہ اس کو مل رہا ہے۔ دریاؤں کی روانی میں اس کو رحمت حق کا جوش ابلتا ہوا نظر آتا ہے۔ چڑیوں کے چہچہے جب اس کے کانوں میں رس گھولتے ہیں تو اس کے دل کے تاروں پر ربانی نغمے جاگ اٹھتے ہیں۔ جس آدمی کو ایمان کی نظر حاصل ہو جاتی ہے اس کو دنیا کی ہر چیز میں خدا کی جھلکیاں دکھائی دینے لگتی ہیں۔

درخت معمولی لکڑی کا ڈھانچہ ہے۔ مگر اس کے اوپر بے حد حسین پھول اگتے ہیں۔ وہ بظاہر ایک سوکھی لکڑی کی مانند، اس سے بھی زیادہ ایک سوکھی زمین پر کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک خاموش انقلاب آتا ہے۔ اس کی شاخوں پر نہایت خوبصورت پھول کھل اٹھتے ہیں۔ لکڑی کی شاخیں رنگین پھولوں سے ڈھک جاتی ہیں۔

ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ کوئی بندہ اس کو دیکھ کر کہہ اٹھے کہ خدایا، میں بھی ایک لکڑی ہوں، تو چاہے تو میرے اوپر حسین پھول کھلا دے۔ میں ایک ٹھنٹھ ہوں، تو چاہے تو مجھ کو سرسبز و شاداب کر دے۔ میں ایک بے معنی وجود ہوں، تو چاہے تو میری زندگی کو معنویت سے بھر دے۔ میں جہنم کے کنارے کھڑا ہوں تو چاہے تو مجھ کو جنت میں داخل کر دے۔ میں تجھ سے دور ہوں تو چاہے تو لپک کر مجھ کو اپنے آغوش میں اٹھا لے۔

جنت قربت الٰہی کا نام ہے

آخرت میں خدا کی جنت کو وہی شخص پائے گا جس نے دنیا میں خدا کو پالیا ہو۔ خدا کو پانے والا وہ ہے جس نے چھپے ہونے کے باوجود اس کو یقین کی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جس نے اپنے سینہ کی دھڑکنوں میں اس کو بولتے ہوئے سنا ہے۔ جس نے خدا کی کتاب کو اس طرح پڑھا ہے گویا وہ خود اپنے اندر رکھے ہوئے صحیفۂ فطرت کو اپنی زبان سے دہرا رہا ہے۔

خدا کو پانے والا وہ ہے جس کی مردہ روح کو خدا کے ایمان سے زندگی ملی ہو۔ خدا کی یاد جس کے دل کے زنگ کو دور کرنے والی بن جائے۔ خدا جس کے لئے ایک نور بن گیا ہو جس کی روشنی میں وہ چلتا ہو۔ جس کا یہ حال ہو کہ خدا کا ذکر سن کر اس کا دل دہل اٹھے۔ وہ اپنے آنسوؤں سے خدا کا استقبال کرتا ہو۔ اس کی پوری شخصیت خدا کے آگے ہمہ تن سجدہ میں گر پڑی ہو۔

جو شخص خدا سے قریب ہے وہی جنت سے بھی قریب ہے۔ خدا کی قربت کا آغاز اسی موجودہ دنیا سے شروع ہو جاتا ہے اور اس کی تکمیل آخرت میں ہوتی ہے۔ جب آدمی قربت خداوندی کا تجربہ کرتا ہے تو اس کو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ ایک ان دیکھی حقیقت کو کامل یقین کے ساتھ دیکھ رہا ہے۔ ایک بعید ترین چیز سے انتہائی طور پر قریب ہے۔ کسی مخاطب کی موجودگی کے بغیر کامیاب ترین گفتگو میں معروف ہے۔ ایک سب سے زیادہ پُرہیبت وجود کے لئے اپنے اندر سب سے زیادہ محبت کے جذبات پا رہا ہے۔ ایک چیز جس کو بظاہر کسی بھی واسطہ کے ذریعہ پایا نہیں جا سکتا، کسی واسطہ کے بغیر وہ عین اس کے نزدیک پہنچ گیا ہے۔

جنت سب سے بڑا عطیہ

زمین و آسمان کی تمام چیزیں خدا کو سجدہ کر رہی ہیں۔ مگر ایک انسان جب سجدہ کرتے ہوئے اپنا سر زمین پر رکھتا ہے تو یہ تمام عالم کائنات کا سب سے زیادہ عجیب واقعہ ہوتا ہے۔ کیونکہ دوسری چیزیں مجبورانہ سجدہ کر رہی ہیں، جب کہ انسان شعور اور ارادہ کے تحت اپنا سر خدا کے آگے جھکا دیتا ہے

انسان کے ذریعہ اس کائنات میں اختیاری محکومی کا واقعہ وجود میں آتا ہے جس سے بڑا کوئی دوسرا واقعہ نہیں۔ یہی انسان کی اصل قیمت ہے۔ انسان وہ نادر مخلوق ہے جو اس کائنات میں شعورِ قدرت کے مقابلہ میں شعورِ عجز کی دوسری انتہا بناتا ہے۔ وہ کائنات کے صفحہ پر "ہے" کے مقابلہ میں "نہیں" کا مضمون تحریر کرتا ہے۔ وہ خداوندی انا کے مقابلہ میں اپنے بے انا ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ وہ ہر قسم کا اختیار رکھتے ہوئے اپنے آپ کو خدا کے آگے بے اختیار کر لیتا ہے۔ وہ زبان رکھتے ہوئے خدا کی خاطر اس طرح چپ ہو جاتا ہے جیسے اس کے منھ میں زبان ہی نہیں۔

ایک شخص کا موحد بننا اس آسمان کے نیچے ظاہر ہونے والے تمام واقعات میں سب سے بڑا واقعہ ہے جس کا انعام کوئی سب سے بڑی چیز ہی ہو سکتی ہے۔ اسی سب سے بڑی چیز کا نام جنت ہے۔ جنت کسی کے عمل کی قیمت نہیں، جنت کسی بندے کے لئے خدا کی یہ بخشش ہے کہ اس کے بندے نے اپنے رب کو وہ چیز پیش کر دی جو کائنات میں کسی اور نے پیش نہ کی تھی، اس لئے خدا نے بھی اس کو وہ چیز دے دی جو اس نے کسی دوسری مخلوق کو نہیں دیا تھا۔

جنتی نگاہ

خدا نے جو کچھ پیدا کیا ہے وہ اتنا حیرت ناک ہے کہ اس کو دیکھ کر آدمی خالق کی کاریگری میں کھو جائے۔ تخلیق کے کمالات میں ہر طرف خالق کا چہرہ جھلک رہا ہے۔ مگر ہمارے چاروں طرف جو دنیا ہے اس کو ہم بچپن سے دیکھتے دیکھتے عادی ہو جاتے ہیں۔ اس سے ہم اتنا مانوس ہو جاتے ہیں کہ اس کے انوکھے پن کا ہم کو احساس نہیں ہوتا۔ پانی، درخت، چڑیا، غرض جو کچھ بھی ہماری دنیا میں ہے سب کا سب بے حد عجیب ہے، ہر چیز خالق کا آئینہ ہے۔ مگر عادی ہونے کی وجہ سے ہم اس کے عجوبہ پن کو محسوس نہیں کر پاتے۔

مگر یہی انسان کا امتحان ہے۔ اس کو معمولی چیزوں میں غیر معمولی جھلک دیکھنا ہے۔ اگر آدمی اس دنیا کو استعجاب کی نظر سے دیکھ سکے تو ہر جگہ اس کو خدا کی موجودگی کا تجربہ ہوگا۔ وہ زمین پر اس طرح رہے گا جیسے کہ وہ خدا کے پڑوس میں ہو، جیسے کہ وہ خدا کی نظروں کے سامنے ہو۔

موجودہ دنیا میں انسان کی سب سے بڑی یافت یہ ہے کہ وہ خدا کو دیکھنے لگے، وہ اپنے پاس خدا کی موجودگی کو محسوس کرلے۔ اگر آدمی کے اندر جنتی نظر پیدا ہو جائے تو سورج کی کرنوں میں اس کو خدا کا نور جگمگاتا ہوا دکھائی دے گا۔ ہرے بھرے درختوں کے حسین منظر میں وہ خدا کا روپ جھلکتا ہوا پائے گا۔ ہواؤں کے لطیف جھونکے میں اس کو لمس ربانی کا تجربہ ہوگا۔ اپنی ہتھیلی اور پیشانی کو زمین پر رکھتے ہوئے اس کو ایسا محسوس ہوگا گویا اس نے اپنا وجود اپنے رب کے قدموں میں ڈال دیا ہے۔ خدا ہر جگہ موجود ہے مگر اس کو وہی خوش قسمت آدمی دیکھتا ہے جس کے اندر خدا کو دیکھنے والی جنتی نگاہ پیدا ہو جائے۔

عبادت کرنے والے

ایک شخص کو کسی سے محبت ہو تو محبت کرنے والے ہی کے ساتھ یہ واقعہ پیش آئے گا کہ اس کی یاد سے اس کا دل بھر آئے۔ اس کے برعکس جس کو اس آدمی سے کوئی لگاؤ نہ ہو وہ صرف وقتی تدبیر سے اس کی خاطر رونے والا نہیں بن سکتا۔

ایک شخص لوگوں کے درمیان تواضع کا طریقہ اختیار کرتا ہے اور دوسرا شخص ڈھٹائی کا۔ ایک شخص معاملات میں انصاف کرتا ہے اور دوسرا بے انصافی سے پیش آتا ہے۔ ایک عاجزانہ نفسیات کے ساتھ جی رہا ہے اور دوسرا متکبرانہ نفسیات کے ساتھ۔ ایک شخص اعتراف کو اپنا طریقہ بنائے ہوئے ہے اور دوسرا ہٹ دھرمی کو۔ تو ایسی حالت میں یہ ناممکن ہے کہ دونوں کی عبادت یکساں ہو۔ ان میں صرف پہلا شخص ہے جس کی عبادت خشوع کی عبادت بنے گی۔ دوسرا شخص خواہ کتنا ہی چاہے یہ ناممکن ہے کہ وقتی طور پر عباداتی صورت بنا کر وہ اپنی عبادت کو خشوع کی عبادت بنا لے۔ خشوع کی عبادت دراصل خاشعانہ زندگی کا ایک نتیجہ ہے۔ جو شخص اپنی زندگی میں خاشع نہ بنا ہو وہ کبھی خشوع کی عبادت نہیں کر سکتا۔

خدا کی عبادت کرنے والے خدا کی جنتوں میں جائیں گے۔ مگر اس عبادت کی توفیق اس کو ملتی ہے جو عبادت کے مخصوص اوقات کے علاوہ بھی خدا کا عابد بنا ہوا ہو نہ کہ وہ جو صرف وقتی طور پر عبادت کی صورت بنا لے۔ جنت ایک حقیقی جگہ ہے جو خصوصی اہتمام کے ساتھ حقیقی عبادت گزاروں کے لئے بنائی گئی ہے۔ حقیقی جنت ان لوگوں کو نہیں مل سکتی جو صرف جھوٹی عبادت کا سرمایہ لے کر خدا کے یہاں پہنچے ہوں۔

کامل دنیا

دنیا انتہائی لذیذ ہے مگر اس کی لذتیں چند لمحے سے زیادہ باقی نہیں رہتیں۔
دنیا بے پناہ حد تک حسین ہے مگر اس کو دیکھنے والی آنکھ بہت جلد بے نور ہو جاتی ہے۔ دنیا میں عزت اور خوشی حاصل کرنا انسان کو کتنا زیادہ مرغوب ہے مگر دنیا کی عزت اور خوشی آدمی ابھی پوری طرح حاصل نہیں کر پاتا کہ اس پر زوال کا قانون جاری ہو جاتا ہے۔ دنیا میں وہ سب کچھ ہے جس کو انسان چاہتا ہے مگر اس سب کچھ کو حاصل کرنا انسان کے لئے ممکن نہیں، حتیٰ کہ اس خوش قسمت انسان کے لئے بھی نہیں جو بظاہر سب کچھ حاصل کر چکا ہو۔ ہر آدمی کچھ ایسی محدودیتوں میں گھرا ہوا ہے کہ وہ پاکر بھی نہیں پاتا۔ کامیاب ہونے کے بعد بھی خوشیوں کا چمن اس کے لئے نہیں اگتا۔

انسان ایک کامل وجود ہے مگر اس کا المیہ یہ ہے کہ اس کو کامل دنیا حاصل نہیں۔ انسان کی زندگی اس وقت تک بے معنی ہے جب تک اس کو ایک ایسی دنیا نہ ملے جو ہر قسم کی محدودیت اور ناموافق حالات سے پاک ہو۔

خدا نے یہ کامل دنیا جنت کی صورت میں بنائی ہے۔ مگر یہ دنیا کسی کو اپنے آپ نہیں مل سکتی۔ اس آنے والی مکمل دنیا کی قیمت موجودہ نامکمل دنیا ہے۔ جو شخص اپنی موجودہ دنیا کو آنے والی دنیا کے لئے قربان کر سکے وہی آنے والی جنتی دنیا کو پائے گا۔ جو شخص اس قربانی کے لئے تیار نہ ہو وہ بھی اگرچہ موت کے بعد ابدی دنیا میں داخل ہوگا، مگر اس کے لئے یہ ابدی دنیا حسرتوں اور مایوسیوں کی دنیا ہوگی نہ کہ خوشیوں اور لذتوں کی دنیا۔

اندھیرے کے بعد اجالا

ہر رات کے بعد صبح آتی ہے۔ جو چیزیں اندھیرے میں چھپی ہوئی تھیں وہ دن کی روشنی میں لوگوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ یہ آج کی ایک مثال ہے جو کل کے بارے میں لوگوں کو بتا رہی ہے۔

جب آخرت کا سورج طلوع ہوگا تو وہ تاریکی کے ان پردوں کو پھاڑ دے گا جو آج لوگوں کی اصل حیثیت کو چھپائے ہوئے ہیں۔ اس وقت ہر آدمی اپنی اصل صورت میں دکھائی دینے لگے گا۔ اس وقت صاف نظر آئے گا کہ کون شخص اندر سے جانور تھا اور بظاہر انسانی صورت میں چل رہا تھا۔ کون شخص ناحق پر تھا اگرچہ وہ خوبصورت الفاظ بول کر اپنے کو حق پرست ثابت کئے ہوئے تھا۔ کون شخص اللہ کے سوا دوسروں کی پرستش میں مبتلا تھا اگرچہ زبان سے وہ اللہ کا نام لیتے ہوئے نہیں تھکتا تھا۔

اس کے بعد کچھ اور اشخاص ہوں گے جن کی حقیقت آخرت کے دن کھل کر سامنے آئے گی۔ لوگ دیکھیں گے کہ ایک شخص جس کو انھوں نے اس کے معمولی حالات کی بنا پر غیر اہم سمجھ لیا تھا وہ اپنے اندر اہمیت کا پہاڑ لئے ہوئے تھا۔ ایک شخص جس کو دنیا کی پر رونق مجلسوں میں عزت کی جگہ نہیں ملتی تھی وہ فرشتوں کی زیادہ باعزت مجالس میں اپنے صبح و شام گزار رہا تھا۔ ایک شخص جس کو وقت کے بڑوں نے اپنے نزدیک رد کر دیا تھا وہی وہ شخص تھا جس کو خدا کی طرف سے مقبولیت کی سند ملی ہوئی تھی۔ ایک شخص جس کو دنیا کے لوگ بے دین قرار دے کر حقارت کے خانہ میں ڈالے ہوئے تھے اس کا نام خدا کے یہاں دین داروں کی فہرست میں سب سے اوپر لکھا ہوا تھا۔

تاریکی ختم ہوگی

کائنات ایک انتہائی بامعنی کارخانہ ہے۔ کائنات کسی ایسی چیز کو قبول نہیں کرتی جو اس کے مزاج کے خلاف ہو، جو اس کی تخلیقی اسکیم کے مطابق نہ ہو۔ مگر کائنات کے سب سے زیادہ سرسبز اور قیمتی حصہ پر انسان ظلم و فساد جاری کئے ہوئے ہے۔ حق کے نام پر حق کو قتل کیا جا رہا ہے اور کائنات اپنی تمام معنویت کے باوجود خاموش کھڑی ہوئی ہے۔ وہ زمین پر سب کچھ ہوتے ہوئے دیکھتی ہے مگر اس کے بارے میں اپنا کوئی بیان نہیں دیتی۔ وہ سچ کو سچ نہیں کہتی اور جھوٹ کے جھوٹ ہونے کا اعلان نہیں کرتی۔

کیا کائنات کے اندر تضاد ہے۔ کیا یہ ایک گونگی کائنات ہے۔ جس کائنات کے پاس سریلے نغمے بکھیرنے والی چڑیاں ہوں کیا اس کے پاس حق کا اعلان کرنے والی زبان نہیں۔ جواب یہ ہے کہ یقیناً ہے۔ مگر خدا نے اس کو قیامت تک خاموش رہنے کا حکم دے رکھا ہے۔ جیسے ہی صور پھونکا جائے گا تمام زبانوں کی مہریں ٹوٹ جائیں گی۔ اس وقت ساری کائنات ایک عظیم ریکارڈ بن جائے گی اور پھر خدا کے گواہ کی حیثیت سے وہ سب کچھ بتائے گی جو حق اور عدل کے مطابق اسے بتانا چاہئے۔ اس وقت لوگوں کو معلوم ہوگا کہ جس کائنات کے پاس رات کو دن بنانے والا سورج موجود تھا اس کے پاس یہ بھی انتظام تھا کہ تاریکی میں چھپے ہوئے اعمال کو اجالے میں لا سکے۔

اس دن خدا کے سرکش بندے اپنی سرکشی کی ابدی سزا بھگتنے کے لئے جہنم کی آگ میں ڈال دئے جائیں گے اور خدا کے نیک بندے خدا کی رحمتوں کے سایہ میں جنت میں داخل کئے جائیں گے جہاں وہ عزت اور آرام کی ابدی زندگی کا لطف اٹھاتے رہیں گے۔

تمناؤں کی دنیا

خدا نے انسان کو ایک ایسی مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا جس کے اندر بہت سی خواہشیں اور لذتیں چھپی ہوئی ہیں۔ دنیا میں ان خواہشوں اور لذتوں کی تکمیل کا سامان بھی موجود ہے۔ مگر انسان جب انھیں پورا کرنا چاہتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ انھیں پورا نہیں کر سکتا۔ کہیں انسان کی عمر اس کی خواہشوں اور لذتوں کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے اور کہیں اس کی محدودیت۔ کہیں اس کی کوئی کمزوری رکاوٹ بن جاتی ہے اور کہیں کوئی ناخوش گوار اتفاق۔

کیا انسان کا مقدر صرف یہ ہے کہ وہ طرح طرح کی خواہشیں لے کر دنیا میں آئے اور پھر یہ حسرت لے کر دنیا سے چلا جائے کہ وہ اپنی خواہشوں کو حاصل نہ کر سکا۔ نہیں، بلکہ خدا نے جنت کی صورت میں اس کی خواہشوں اور لذتوں کی تکمیل کا ابدی سامان مہیا کر رکھا ہے۔ موت کے بعد آدمی ایک اور زیادہ کامل زندگی پالیتا ہے، وہ ایک ایسی دنیا میں دوبارہ آنکھ کھولتا ہے جو ہر قسم کی کمیوں سے پاک ہے۔ یہاں وہ سب کچھ بے حساب مقدار میں موجود ہے جس کو انسان نے موجودہ دنیا میں چاہا مگر وہ ان کو اپنے لئے حاصل نہ کر سکا۔

موت کے بعد کی یہ جنت ان خوش نصیب لوگوں کے لئے ہے جو موت سے پہلے جنتی عمل کا ثبوت دیں جو اپنے اونچے کردار سے اس کا استحقاق ثابت کریں۔ تمناؤں کی زندگی جس کو آدمی موجودہ دنیا میں نہ پا سکا اس کو وہ آخرت کی دنیا میں پائے گا۔ مگر یہ زندگی اسی کو ملے گی جو موجودہ دنیا میں اس کی قیمت ادا کر چکا ہو۔

کھونے والا پاتا ہے

خوشیوں سے بھری ہوئی زندگی انسان کا سب سے بڑا خواب ہے۔ ہر آدمی اس تمنا کو لے کر پیدا ہوتا ہے مگر ہر آدمی اس تمنا کو پورا کئے بغیر مر جاتا ہے۔ اس ناکامی کی وجہ یہ ہے کہ تمام لوگ اپنے خواب کی تعبیر اسی موجودہ دنیا میں چاہتے ہیں۔ مگر موجودہ دنیا اس آرزو کی تکمیل کے لئے کافی نہیں۔

ہم اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کی طرف ابھی سفر کر رہے ہوتے ہیں کہ ہم کو موت آجاتی ہے۔ ہم مشینی ترقیاں وجود میں لاتے ہیں مگر نئے نئے مسائل پیدا ہو کر ساری ترقی کو بے معنی بنا دیتے ہیں۔ ہم اپنی پسند کے مطابق اپنا ایک گھر بناتے ہیں مگر دوسرے انسانوں کا بغض، حسد، گھمنڈ، ظلم اور انتقام ظاہر ہو کر ہم کو الجھا دیتے ہیں اور ہم اپنے آشیانہ کو خود اپنی آنکھوں سے بکھرتا ہوا دیکھ کر اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

آدمی کی تمنائیں بجا ہیں مگر ان کے پورے ہونے کی جگہ موت کے بعد آنے والی دنیا ہے نہ کہ موت سے پہلے کی دنیا۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو ہماری موجودہ زندگی کو بامعنی بناتا ہے۔ اس کے بعد موجودہ دنیا جدوجہد کی دنیا بن جاتی ہے اور اگلی دنیا جدوجہد کا انعام پانے کی دنیا۔ موجودہ دنیا کو منزل سمجھنے کی صورت میں آدمی مایوسی کے سوا اور کہیں نہیں پہنچتا۔ جب کہ آخرت کی دنیا کو منزل سمجھنے کا عقیدہ اس کے سامنے ابدی سکون کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

ایک ایسی دنیا جہاں کھونے کے سوا اور کچھ نہ ہو وہاں وہی نظریہ صحیح ہو سکتا ہے جو کھونے میں پانے کا راز بتاتا ہو۔

حادثہ سے بچیے

آدمی بے شمار کوششوں کے بعد ایک قابل اعتماد معاشی زندگی حاصل کرتا ہے۔ وہ اپنے حوصلوں کو ایک دل پسند مکان کی صورت میں بنا کر خوش ہوتا ہے۔ وہ اپنے لئے کامیابی اور ترقی کا مینار کھڑا کرتا ہے۔ مگر عین اس وقت اس کی موت آجاتی ہے۔ وہ اپنے گھر کو سونا چھوڑ کر قبر میں لیٹ جاتا ہے۔ اس کا چکنا جسم مٹی اور کیڑے کی نذر ہو جاتا ہے۔ اس کی کوششوں کا حاصل اس سے اس طرح جدا ہو جاتا ہے جیسے آدمی اور اس کے درمیان کبھی کوئی تعلق ہی نہ تھا۔

کوٹھی کا خواب دیکھنے والا مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ قبر میں داخل ہو، وہ قبر کے راستہ سے گزر کر حشر کے میدان میں پہنچ جائے۔ یہ دوسری دنیا اس کی آرزوؤں کی دنیا سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ یہاں وہ اتنا مفلس ہوتا ہے کہ اس کے پاس کپڑا بھی نہیں ہوتا جس سے وہ اپنے جسم کو چھپائے۔ اس کی ساری کمائی اس سے جدا ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھی اس سے بچھڑ جاتے ہیں۔ اس کا زور اس سے رخصت ہو جاتا ہے۔ ان چیزوں میں سے کوئی چیز وہاں اس کا ساتھ دینے کے لئے موجود نہیں ہوتی جن کے بل پر وہ دنیا میں گھمنڈ کر رہا تھا۔

آہ وہ سفر بھی کیسا عجیب ہے جو عین منزل کے قریب پہنچ کر حادثہ کا شکار ہو جائے۔ وہ مسافر بھی کیسا عجیب مسافر ہے جو یہ سمجھ کر آگے بڑھ رہا ہو کہ وہ منزل کی طرف جا رہا ہے مگر جب منزل آئے تو اس کو معلوم ہو کہ وہ صرف بھٹک رہا تھا، وہ الٹی سمت میں اپنی بھاگ دوڑ جاری کئے ہوئے تھا نہ کہ صحیح سمت میں۔

آفاقی دین

کائنات کا دین اللہ کی اطاعت ہے۔ یہاں کی ہر چیز اللہ کے مقرر کئے ہوئے ضابطہ پر چل رہی ہے۔ درخت اوپر کھڑا ہوتا ہے مگر وہ اپنا سایہ نیچے زمین پر بچھا دیتا ہے۔ ہوائیں چلتی ہیں مگر وہ کسی سے ٹکراؤ نہیں کرتیں۔ سورج اپنی روشنی بکھیرتا ہے مگر وہ چھوٹے بڑے میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ بادل بارش برساتے ہیں مگر وہ اپنے اور غیر میں تمیز نہیں کرتے۔ چڑیاں اور چیونٹیاں اپنے اپنے رزق کی تلاش میں مصروف ہوتی ہیں مگر وہ ایک دوسرے کا حصہ نہیں چھینتیں۔

یہ کائنات کے لئے خدا کا دین ہے اور اسی دین پر انسان کو بھی رہنا ہے۔ اللہ کے محبوب بندے وہ ہیں جو دنیا میں درخت کے سایہ کی طرح متواضع بن کر رہیں۔ جو دوسروں کے درمیان سے اس طرح گزریں جیسے ہوا کے لطیف جھونکے لوگوں کے بیچ سے گزر جاتے ہیں۔ جن کا فیض اور جن کی مہربانیاں بارش کی طرح ہر ایک کے لئے عام ہوں۔ جو دریا کے پانی کی طرح دوسروں کے لئے سیرابی بن جائیں۔ جنھوں نے سورج کی شعاعوں کی طرح ہر ایک کو اجالے کا تحفہ دیا۔ جنھوں نے اپنی سرگرمیوں کے دوران اس بات کی پوری احتیاط کی کہ ان سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔

جنت ایسی ہی پاک روحوں کی آبادی ہے۔ جنت وہ نفیس مقام ہے جہاں آدمی اپنے پڑوسی سے پھولوں کی خوشبو جیسے سلوک کا تجربہ کرے گا اور چڑیوں کے چہچہے جیسے میٹھے بول سنے گا۔ جہاں ایک کا دوسرے سے ملنا لطیف ہواؤں سے ملنے کی طرح ہوگا — کیسی عجیب ہوگی جنت اور کیسا عجیب ہوگا جنت کا پڑوس۔

اسلامی زندگی

اسلامی زندگی کا وجود میں آنا ایسا ہی ہے جیسے کسی درخت کا وجود میں آنا۔ ایک ہرا بھرا درخت زمین پر اس وقت کھڑا ہوتا ہے جب کہ اس نے اپنے آپ کو زمین و آسمان کے نظام کے ساتھ ہم آہنگ کر لیا ہو، اسی طرح اسلامی انسان اس وقت بنتا ہے جب کہ وہ خدا کی پوری کائنات کو اپنی غذا بنا چکا ہو۔

اسلامی زندگی نہ عملیاتی ورزشوں سے وجود میں آتی ہے اور نہ انقلابی نعروں سے۔ ایک بندہ اس وقت مومن و مسلم بنتا ہے جب کہ وہ تجلیات الٰہی کا مہبط بن جائے۔ خدا نے جس طرح مادی سطح پر درختوں کے لئے ایک عالمی دسترخوان پھیلا رکھا ہے، اسی طرح روحانی سطح پر انسان کے لئے ہر وقت اس کے فیضان کی بارش ہو رہی ہے۔ مادی کائنات سے اپنے آپ کو جوڑنے کے نتیجہ میں درخت وجود میں آتا ہے۔ اسی طرح الٰہی تجلیات کے سمندر میں نہانے سے وہ چیز وجود میں آتی ہے جس کو اسلامی زندگی کہتے ہیں۔ درخت ہو یا انسان، دونوں ہی ایک وسیع تر نظام غذا سے اپنے کو ہم آہنگ کر کے اپنی ہستی کو کمال کے مقام پر پہنچاتے ہیں۔ اسلامی انسان بھی ایسا ہی ایک واقعہ ہے جیسا ایک درخت۔ فرق یہ ہے کہ درخت فطری جبر کے تحت وجود میں آتا ہے اور انسان خود اپنے آزادانہ عمل سے۔

جو شخص آج اللہ کے رزق پر جی رہا ہے وہ آخرت میں نہایت شاداب اور تندرست حالت میں اٹھے گا۔ اور جو لوگ اللہ کے رزق سے محروم ہیں ان کا حال وہی ہو گا جو آج خراب غذاؤں پر پلنے والے غریبوں کا نظر آتا ہے۔ وہ وہاں بدحال صورتوں کے ساتھ اٹھیں گے خواہ آج وہ کتنے ہی پُر رونق نظر آتے ہوں۔

مومن خدا کی انڈسٹری ہے

ہر آدمی ایک انڈسٹری ہے۔ ایک شخص وہ ہے جس کی انڈسٹری سے صرف زہر اور انگارے برآمد ہوئے۔ اس کو جب موقع ملا تو اس نے اپنی بڑائی کا جھنڈا بلند کیا۔ اس کے پاس دولت آئی تو اس نے اس کو نمائشی کاموں میں خرچ کیا۔ اس نے کسی کے اوپر غلبہ پایا تو اس کی بربادی کے منصوبے بنائے۔ اس کو کسی سے اختلاف ہوا تو اس نے اسے کڑوی بات اور شیطانی عمل کا مزہ چکھایا۔ اس سے جب کسی کا معاملہ پڑا تو اس کو اس سے خود غرضی، بے انصافی اور دھاندلی کا تجربہ ہوا۔

ایسا آدمی اپنے اندر جہنم کی انڈسٹری قائم کئے ہوئے ہے۔ جو چیز بھی اس کے اندر داخل ہوتی ہے وہ زہر اور آگ اور بدبو بن کر باہر آتی ہے۔ موت کے بعد اس کی یہ پیداوار اسے گھیرے گی۔ وہ اپنے آپ کو خود اپنے بنائے ہوئے جہنم میں پھنسا ہوا پائے گا۔

دوسرا انسان وہ ہے جس کو خدا نے بڑائی دی تو اس نے تواضع کی صورت میں اس کا ردعمل پیش کیا۔ اس کا احتساب کیا گیا تو اس نے عجز کی نفسیات کے ساتھ اس کو قبول کیا۔ اس کے پاس دولت آئی تو اس نے خدا کے راستہ میں اس کا استعمال ڈھونڈ نکالا۔ اس کو اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے مواقع ملے مگر وہ اپنے آپ کو خدا کی خاطر دفن کرنے پر راضی ہوگیا۔ اس نے لوگوں کے اوپر قابو پایا تو وہ ان کے لئے انصاف اور خیر خواہی کا پیکر بن گیا۔

یہ وہ شخص ہے جس نے اپنے اندر خدا کی انڈسٹری قائم کی۔ جو چیز بھی اس کے اندر داخل ہوئی وہ ربانی پیکر میں ڈھل کر باہر نکلی۔ اس نے موجودہ دنیا میں پھول اور خوشبو کی فصل اگائی تھی، آخرت میں وہ ہمیشہ کے لئے پھول اور خوشبو والے باغوں میں رہے گا۔

عمل یا اعتراف

ایمان وہ ہے جو آدمی کے اندر اس طرح داخل ہو کہ وہ اس کی نفسیات کا جزء بن جائے۔ وہ اس کے دل و دماغ پر پوری طرح چھا جائے۔ آدمی کا سوچنا اور چاہنا، اس کا یقین و اعتماد، اس کی دلچسپیاں اور وفاداریاں، اس کا خوف اور اس کی محبت، سب اس کے ایمان کے تابع ہو جائیں۔ یہ ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے۔ ایسے لوگ اسی دنیا میں خدا کی پناہ میں آجاتے ہیں، اور جو شخص دنیا ہی میں خدا کی پناہ میں آچکا ہو اس کے متعلق کون شبہ کرسکتا ہے کہ وہ آخرت میں خدا کی پناہ سے محروم ہوگا۔

دوسرے اہل ایمان وہ ہیں جن سے نیکی کے ساتھ برائیاں بھی ہوئیں مگر انھوں نے اپنی برائیوں کا اعتراف کرلیا۔ امید ہے کہ اللہ انھیں بھی معاف کردے گا۔ کیونکہ وہ معاف کرنے والا مہربان ہے۔

مضبوط ایمان والا وہ ہے جس کے یہاں ایمان اور عمل دونوں ایک چیز بن جائیں۔ مگر کمزور ارادہ کے لوگ اپنے ایمان اور عمل کے درمیان اتنی یکسانی پیدا نہیں کرپاتے۔ تاہم وہ بھی اللہ کی رحمتوں میں حصہ دار ہوں گے، بشرطیکہ انھوں نے ڈھٹائی کے بجائے شرمندگی کا ثبوت دیا ہو۔ انھوں نے تاویلوں کا سہارا لینے کے بجائے کھلے طور پر اعتراف کرلیا ہو۔ وہ بحث کرنے کے بجائے چپ ہو گئے ہوں۔ ان کی کوتاہیوں کی نشان دہی کی جائے تو وہ بپھرنے کے بجائے اپنا سر جھکا لیں۔ اگر وہ اپنے رب کے سامنے عمل کا تحفہ نہ پیش کرسکے ہوں تو انھوں نے اپنے رب کے سامنے عجز کے آنسو پیش کئے ہوں۔ جو لوگ یہ آخری چیز بھی پیش نہ کرسکیں ان کو خدا بخشے گا تو کس بہانے بخشے گا۔

صبر کا سفر

خدا کا محبوب بندہ وہ ہے جو اپنی خود پسندی کو خدا پسندی میں گم کر دے۔ جو اپنی بات کے مقابلہ میں حق کی بات کو اختیار کرلے۔ جو دنیا کی عزت کے مقابلہ میں آخرت کی عزت کو اہمیت دینے لگے۔ لوگوں کی طرف سے خواہ کتنی ہی تلخیاں پیش آئیں مگر وہ اپنی طرف سے جوابی کارروائی نہ کرے۔ اسی کا نام صبر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بے حد مشکل راستہ ہے مگر اس میں بھی شک نہیں کہ یہی وہ راستہ ہے جو کسی کو جنت کی طرف لے جانے والا ہے۔ جنت صبر کرنے والوں کو ملتی ہے اور صبر کرنے والا وہ ہے جو اللہ کی خاطر اپنے آپ کو ہر محرومی پر راضی کرلے۔

امتحان کی اس دنیا میں تلخیوں اور ناخوش گواریوں کے بغیر چارہ نہیں۔ جو شخص جنت کا مسافر بننا چاہے اس کو جان لینا چاہئے کہ وہ ایک ایسے راستہ پر چلنے کا ارادہ کر رہا ہے جس میں لوگوں کی طرف سے کڑوی باتیں پیش آئیں گی۔ جس میں لمبے انتظار کی مشقت برداشت کرنی ہوگی۔ جس میں مخالفین کی طرف سے طرح طرح کی دل آزاریاں ہوں گی۔ ان مواقع پر حق کا مسافر اگر صبر کو کھودے، اگر وہ بے برداشت ہو جائے تو وہ درمیان ہی میں اپنے راستہ کو کھوٹا کرلے گا، وہ جنت کی منزل تک نہ پہنچ سکے گا۔

جنت کا سفر تمام کا تمام صبر کا سفر ہے۔ جنت میں وہی شخص پہنچے گا جو صبر کی تلخیوں کو سہنے کے لئے تیار ہو، جو جذبات کی پامالی پر بھی بے ہمت ہونا نہ جانے، جو نفس کی ہر چوٹ کو اپنے سینہ کی ویرانیوں میں چھپالے۔

خدا کا درخت

درخت کیا ہے، ایک بیج کی اس صلاحیت کا ظہور کہ وہ مٹی اور پانی سے اپنا رزق لے کر اپنے آپ کو تنہ اور شاخ اور پتی اور پھول کے اس مجموعہ کی صورت دے سکے جس سے زیادہ خوش منظر مجموعہ اس دنیا میں اور کوئی نہیں۔

انسان کی مثال بھی کچھ اسی قسم کی ہے۔ وہ اس دنیا میں ایک بیج کی مانند ڈالا گیا ہے۔ اس کو اپنی کوششوں سے درخت بننا ہے۔ خدا کی اس دنیا میں اس کے لئے رزق کے بے پناہ ربانی مواقع رکھ دئے گئے ہیں۔ وہ اس دنیا سے اپنا رزق لے کر اپنے لئے ایک ابدی مستقبل کی تعمیر کر سکتا ہے جو اگلی زندگی میں جنت کے ہرے بھرے باغوں کی شکل میں اس کی طرف لوٹے اور اس کے لئے لازوال خوشی کا باعث ہو۔

اس کے برعکس جو لوگ ان مواقع سے اپنا ربانی حصہ پانے میں ناکام رہیں ان کی مثال اس بیج کی سی ہے جو کسی پتھر پر پڑ گیا ہو یا جس نے کسی ناموافق زمین پر جگہ پائی ہو۔ ایسا بیج کبھی لہلہاتے ہوئے درخت کی صورت اختیار نہیں کرتا۔ موجودہ دنیا میں جس نے اپنی تعمیر کے امکانات سے فائدہ نہیں اٹھایا وہ گویا ایک ایسا بیج ہے جس کی کوتاہیوں نے اس کو درخت نہیں بنایا۔ ایسا شخص اگلی طویل تر زندگی میں ابدی ناکامی سے دوچار ہوگا۔ وہ آخرت کی دنیا میں ایک ایسی زندگی کا وارث ہوگا جو ہر قسم کی شادابی سے مکمل طور پر محروم ہو۔

جنتی انسان گویا ایک بہترین درخت ہے جو دنیا میں اگتا ہے اور پھر آخرت میں لے جا کر خدا کے ہرے بھرے باغ میں لگا دیا جاتا ہے۔

جنت کی وراثت

زمین پر انسان کو آزادی حاصل ہے مگر یہ مستقل آزادی نہیں ہے۔ یہ صرف وقتی آزادی ہے اور خاص منصوبہ کے تحت دی گئی ہے۔ یہ دراصل امتحان کی آزادی ہے۔ کائنات کا مالک یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ان میں سے کون ہے جو آزادی پا کر بھی آزادی کا غلط استعمال نہیں کرتا۔ اس کے بعد خدا ایسے لوگوں کو اپنے انعامات سے نوازے گا اور ان لوگوں کو تباہی کے گڑھے میں ڈال دے گا جو آزادی پا کر بگڑ گئے۔

دنیا کا موجودہ نظام صرف اس وقت تک ہے جب تک جانچ کا یہ عمل پورا نہیں ہو جاتا۔ اس مدت کے پورا ہونے کے بعد زمین کا مالک زمین کا انتظام براہ راست اپنے ہاتھ میں لے لے گا جس طرح وہ بقیہ کائنات کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے ہے۔ اس وقت اچھے اور برے ایک دوسرے سے الگ کر دیے جائیں گے۔ اچھے لوگوں کو ابدی طور پر جنتی زندگی حاصل ہوگی اور برے لوگ ابدی طور پر جہنمی حالات میں دھکیل دیے جائیں گے۔

موجودہ دنیا وہ مقام ہے جہاں آنے والی جنتی دنیا کے شہری چنے جا رہے ہیں۔ جو لوگ آزاد ہونے کے بعد بھی اپنے آپ کو اللہ کا حکم بردار بنائیں گے۔ جو مجبور نہ ہوتے ہوئے بھی اللہ کی مرضی کو اپنے اوپر طاری کریں گے وہی اللہ کے نزدیک اس قابل ٹھہریں گے کہ وہ اللہ کی جنتی دنیا کے باسی بن سکیں۔ آج امتحان کے وقفہ میں ہر طرح کے لوگ زمین پر بسے ہوئے ہیں مگر امتحان کی مدت ختم ہونے کے بعد صرف صالح لوگ خدا کی اس ہری بھری دنیا کے وارث قرار پائیں گے اور بقیہ لوگوں کو اس سے بے دخل کر کے دور پھینک دیا جائے گا جہاں وہ ابدی طور پر حسرتوں اور مایوسیوں کا مزا چکھتے رہیں۔

جنتیوں کا انتخاب

موجودہ امتحان کی دنیا میں انسانوں کو آزادی ملی ہوئی ہے۔ مگر انسان اپنی آزادی کا غلط استعمال کرتا ہے۔ اس نے خدا کی زمین کو ظلم و فساد سے بھر رکھا ہے۔ پھر خدا نے اتنی بڑی برائی کو کیوں گوارا کیا۔ صرف اس لئے کہ اس کے بغیر اس اعلیٰ نوع کا انتخاب نہیں کیا جا سکتا، جو جنت میں بسائے جانے کے قابل ہو۔ اختیار اور آزادی کے ماحول ہی میں وہ انسان چنے جا سکتے ہیں جن کے متعلق خدا کے نگراں فرشتے یہ گواہی دیں کہ یہ وہ روحیں ہیں جنھوں نے مکمل اختیار رکھتے ہوئے اپنے کو خدا کے لئے بے اختیار کر لیا تھا۔ دنیا کی بے پناہ برائیاں دراصل ایک بے پناہ بھلائی کی قیمت ہیں۔ یہ بھلائی کہ انسانوں کے جنگل سے وہ سعید روحیں چھان کر نکالی جائیں جو پورے شعور اور مکمل ارادہ کے ساتھ اپنے کو خدا کا تابعدار بنالیں جو محض حقیقت پسندی کی بنا پر خدا کی محکومی اختیار کریں نہ کہ مجبوری کی بنا پر۔

یہ وہ انوکھی ہستیاں ہیں جن کو یہ موقع تھا کہ وہ حق کو جھٹلا دیں مگر انھوں نے حق کو نہیں جھٹلایا۔ جن کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ اپنی انا کا جھنڈا بلند کریں مگر وہ اپنے کو پچھلی سیٹ پر بٹھا کر خدا کو صدر نشین بنانے پر راضی ہو گئے۔ جن کو یہ آزادی ملی ہوئی تھی کہ وہ اپنی قیادت کا گنبد کھڑا کریں مگر انھوں نے اپنے گنبد کو خود اپنے ہاتھوں سے ڈھا دیا اور صرف حق کو اونچا کرنے میں انھوں نے خوشی حاصل کی۔ اس قسم کی روحیں اس کے بغیر چنی نہیں جا سکتیں کہ ان کو مکمل آزادی کے ماحول میں رکھا جائے اور آزادی کا حقیقی ماحول قائم کرنے کی ہر قیمت کو برداشت کیا جائے۔

دو قسم کی روحیں

انسانوں میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو گندے جذبات میں جیتے ہیں۔ دوسرے وہ جو ستھرے جذبات پر پرورش پاتے ہیں۔

ایک انسان وہ ہے جو نفرت اور عداوت میں جی رہا ہے۔ جو ذاتی نمائش اور شخصی مصلحت کی ہواؤں میں سانس لیتا ہے۔ جس کی روح کو اس سے غذا ملتی ہے کہ وہ حق کا اعتراف نہ کرے۔ جس کے قلب و دماغ کو انانیت، خود پرستی، اظہار برتری سے خوراک ملتی ہے۔ وہ کسی کو تکلیف پہنچا کر خوش ہوتا ہے۔ کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس پر وار کرتا ہے اور پھر کامیابی کے قہقہے لگاتا ہے۔ ایسے لوگ جہنمی غذاؤں پر جی رہے ہیں اور آخرت میں ان کا ٹھکانا صرف جہنم کی آگ ہوگا۔

دوسرا انسان وہ ہے جو ستھرے قلب کے ساتھ جی رہا ہے۔ اس کی روح دوسروں کی کامیابی سے خوش ہوتی ہے۔ وہ دوسروں پر قابو یافتہ ہو کر بھی اس کو چھوڑ دینے میں راحت محسوس کرتا ہے۔ اس کا دل دوسروں کے لئے محبت اور خیر خواہی کے جذبات سے بھرا ہوتا ہے۔ اس کی ہستی کو عجز اور تواضع میں لذت ملتی ہے۔ وہ خدا اور آخرت کی فضاؤں میں سانس لیتا ہے۔ اختلاف کے وقت اپنے کو جھکا لینے میں اس کو سکون ملتا ہے۔ جب کوئی اس کی غلطی کی نشان دہی کرتا ہے تو اپنی غلطی کو مان لینے میں اس کا دل ٹھنڈک پاتا ہے۔ کسی کا حق اس کے ذمہ ہو تو جب تک وہ اس کا حق ادا نہ کرے اس کو راتوں کو نیند نہیں آتی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو جنتی غذاؤں پر جی رہے ہیں۔ آخرت میں وہ جنت کے سدا بہار باغوں میں بسائے جائیں گے۔

شکر کا جذبہ

آدمی ملے ہوئے پر مطمئن نہیں ہوتا اور جو کچھ نہیں ملا ہے اس کے پیچھے دوڑتا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہر آدمی غیر مطمئن زندگی گزارتا ہے۔ ہر شخص کو خدا نے کوئی نہ کوئی نعمت دی ہے۔ مگر آدمی کا حال یہ ہے کہ جو نعمت نہیں ملی اس کی طرف متوجہ رہتا ہے اور جو نعمت ملی ہوئی ہے اس کو حقیر سمجھتا ہے۔ ایسے آدمی کے اندر اپنے خدا کے لئے شکر کا جذبہ نہیں ابھرتا۔ وہ اس قیمتی کیفیت سے محروم رہ جاتا ہے جو جنت کا مستحق بننے کے لئے سب سے زیادہ ضروری ہے۔

موجودہ دنیا کو خدا نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں مکمل راحت کسی کے لئے نہیں۔ اگر سرد علاقہ کے مسائل ہیں تو گرم علاقہ کے بھی مسائل ہیں۔ اگر کم آمدنی والے کی زحمتیں ہیں تو زیادہ آمدنی والے کی بھی زحمتیں ہیں۔ اگر بے زور کچھ مشکلوں سے دوچار رہے تو ان کی بھی مشکلیں ہیں جن کو زور و قوت حاصل ہے۔ امتحان کی اس دنیا میں آدمی کو مسائل سے فرصت نہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ جن مسائل کے درمیان ہے ان کو گوارا کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھے۔ اس کی توجہات کا مرکز خدا کی رضا ہو نہ کہ مشکلات سے خالی زندگی حاصل کرنا، کیونکہ وہ تو آخرت سے پہلے ممکن نہیں۔

جو شخص آخرت کی جنت کا مالک بننا چاہتا ہو اس کو سب سے بڑا تحفہ جو اپنے رب کی خدمت میں پیش کرنا ہے وہ شکر ہے، اور شکر کا جذبہ اس کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا کہ آدمی مشکلات و مسائل سے اوپر اٹھ کر سوچنے کی نظر پیدا کرلے۔ جنت کی قیمت شکر ہے اور جنت اسی کو ملے گی جو اس کی قیمت ادا کرے۔

اللہ والے

اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ عام حالات میں وہ خدا پرست نظر آتے ہیں۔ مگر جب کوئی غیر معمولی حالت پیش آئے تو اچانک وہ دوسری قسم کے انسان بن جاتے ہیں۔ کبھی محبت یا نفرت کا جذبہ، کبھی عزت و وقار کا سوال ان کے اوپر اس طرح چھا جاتا ہے کہ ان کی خدا پرستی اس کے نیچے دب کر رہ جاتی ہے۔ معمول کے حالات میں دینی زندگی گزارنے والا آدمی غیر معمولی حالات میں وہی سب کچھ کر گزرتا ہے جو غافل اور بے دین لوگ عام حالات میں کرتے ہیں۔

مگر حقیقی خدا پرست وہ ہے جو نہ صرف عام حالات میں اللہ سے ڈرے بلکہ غیر معمولی حالات میں بھی وہ اللہ سے ڈرتا ہو۔ کسی کی محبت اس کو حد سے نکلنے پر اکسائے تو وہ حد سے نکلنے پر تیار نہ ہو۔ کسی کے خلاف نفرت اس کو بے انصافی کے راستہ پر لے جانا چاہے تو وہ اس کے لئے راضی نہ ہو۔ ذاتی عزت و وقار کا سوال اس کو حق کے اعتراف سے روکے تو وہ اس کو روکنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

سچا خدا پرست آدمی اپنی تمام خامیوں سے آگاہ ہو کر اپنی اصلاح کرتا رہتا ہے۔ اس کا مسلسل احتساب اس کو ایسے مقام پر پہنچا دیتا ہے جہاں وہ اپنے آپ کو بے لاگ انداز سے دیکھ سکے۔ وہ اپنے آپ کو اس حقیقی نظر سے دیکھے جس نظر سے اس کا خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔

یہی وہ لوگ ہیں جو فیصلہ کے دن خدا کی ان جنتوں میں داخل کئے جائیں گے جہاں نہ کوئی تکلیف ہے اور نہ کسی قسم کا اندیشہ۔

مانگنے والا پاتا ہے

لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ جنت کا نام لیتے ہیں مگر جہنمی اعمال میں مشغول ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انھوں نے خدا سے اس کی جنت مانگی ہی نہیں۔ اگر وہ خدا سے جنت مانگتے تو یہ ممکن نہ تھا کہ وہ لوگوں کو ایسے راستوں میں چلنے دے جو انھیں جہنم کی طرف لے جانے والے ہیں۔

یہ ممکن نہیں کہ آپ خدا سے جنت مانگیں اور وہ آپ کو جہنم دیدے۔ آپ خدا سے خشیت مانگیں اور وہ آپ کو قساوت دے دے۔ آپ خدا کی یاد مانگیں اور وہ آپ کو غفلت میں مبتلا کر دے۔ آپ آخرت کی تڑپ مانگیں اور وہ آپ کو دنیا کی محبت میں ڈال دے۔ آپ کیفیت سے بھری ہوئی دینداری مانگیں اور وہ آپ کو بے روح دین داری میں پڑا رہنے دے۔ آپ حق پرستی مانگیں اور وہ آپ کو شخصیت پرستی کی کوٹھری میں بند کر دے۔

اگر آپ کی زندگی میں مطلوب چیز نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے نہ مانگا تھا اور نہ آپ کو ملا۔ جو مانگے وہ کبھی محروم نہیں رہ سکتا۔ یہ مالک کائنات کی غیرت کے خلاف ہے کہ وہ کسی بندے کو اس حال میں رہنے دے کہ قیامت میں جب خدا سے اس کا سامنا ہو تو وہ اپنے رب کو حسرت کی نظر سے دیکھے۔ وہ کہے کہ خدایا میں نے تجھ سے جنت مانگی تھی اور تو نے جہنم میرے حوالے کر دی۔ بخدا یہ ناممکن ہے، یہ ناممکن ہے۔ کائنات کا مالک تو ہر صبح و شام اپنے سارے خزانوں کے ساتھ آپ کے قریب آکر آواز دیتا ہے کہ کون ہے جو مجھ سے مانگے تاکہ میں اسے دوں۔ مگر جن کو لینا ہے وہ خود منھ پھیرے ہوئے ہوں تو اس میں دینے والے کا کیا قصور۔

جنت کے شہری

جنت کا ماحول وہ ماحول ہوگا جہاں ہر طرف خدا کی حمد ہورہی ہوگی، خدا کی بڑائی کے سوا کسی اور کی بڑائی کا وہاں چرچا نہ ہوگا، اس لئے وہی لوگ جنت کی دنیا میں رہنے کے قابل ٹھہریں گے جو آج کی دنیا میں خدا کی حمد اور اس کی بڑائی سے سرشار رہے ہوں، اپنی یا کسی دوسرے کی بڑائی کے احساس سے جن کا سینہ خالی رہا ہو۔ جنت کی دنیا میں قول وعمل کا فرق نہ ہوگا۔ وہاں کوئی کسی کو دھوکا نہ دے گا۔ وہاں کوئی کسی کا استحصال کرنا نہ چاہے گا۔ وہاں کوئی کسی کو آزار نہ پہنچائے گا۔ اس لئے جنت کا باشندہ وہی شخص ہوسکتا ہے جس نے آج کی زندگی میں اپنے عمل سے دکھا دیا ہو کہ وہ شہریت کے ان اعلیٰ معیاروں پر پورا اترتا ہے۔

جنت مکمل طور پر مثبت سرگرمیوں کی دنیا ہوگی، اس لئے وہاں کی آبادیوں میں بسنے کا اجازت نامہ صرف انھیں لوگوں کو ملے گا جنھوں نے آج کی دنیا میں یہ ثبوت دیا ہو کہ وہ خالص مثبت مزاج رکھنے والے لوگ ہیں اور منفی اور تخریبی کارروائیوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔

جنت کی دنیا ایک ایسی دنیا ہے جہاں آدمی دوسروں کی شرارتوں سے محفوظ ہوگا، اس لئے جنت کی بستیوں میں رہنے کے قابل وہی شخص ہے جس نے دنیا میں یہ ثبوت دیا ہو کہ وہ ایک ایسا شخص ہے جو دوسروں کو اپنے حسد اور اپنی شرارت سے محفوظ رکھنے والا ہے۔

جنت کا ماحول گندگیوں اور بے ہودگیوں سے پاک ہوگا اس لئے جنت کی کالونیوں میں بسانے کے لئے انھیں لوگوں کا انتخاب کیا جائے گا جو ہر قسم کی بے ہودگیوں سے دور رہنے والے ثابت ہوئے ہوں۔

عبدیت کا مقام

بندہ جب تواضع کی حالت میں ہوتا ہے تو وہ خدا کے قریب ترین ہوتا ہے ۔ کیونکہ خدا کے دربار میں کسی بندہ کے لئے جو سب سے قریبی نشست ہے وہ تواضع ہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تواضع اگر نمائشی نہ ہو بلکہ حقیقی ہو تو وہ آدمی کے لئے سب سے لذیذ چیز ہوتی ہے، کیونکہ خدا کی اس دنیا میں وہ اپنی اصل حیثیت کا اعتراف ہوتا ہے، وہ خدا کے سب سے قریب پہنچ جانے کے ہم معنی ہے۔

جس آدمی کو عبدیت کے مقام کی خبر نہ ہو، عبدیت اس کے لئے لذیذ چیز نہیں بن سکتی۔ جو شخص امتیاز میں جیتا ہو وہ مساوات کی لذت کو کس طرح پائے گا۔ جو اپنی انا میں گم ہو وہ خدا کی کبریائی کے اعتراف کا مزہ کیسے چکھے گا۔ جو دوسروں کو غلط ثابت کر کے خوش ہو رہا ہو اس کو اپنی غلطی جاننے اور ماننے کی خوشی کیسے حاصل ہوگی۔ جو اپنے کو ایک پیمانہ سے ناپے اور دوسروں کو دوسرے پیمانہ سے ناپے وہ کیوں کر جانے گا کہ اپنے لئے اور دوسروں کے لئے ایک پیمانہ رکھنا اتنی بڑی دولت ہے کہ دنیا کی تمام دولتیں اس پر قربان کی جا سکتی ہیں۔

جنتی انسان وہ ہے جس کے لئے جنتی عمل دنیا میں سب سے بڑی لذت بن جائے، عبادت میں بھی اور دوسرے معاملات میں بھی۔ حسد کے جذبات کو کچلنا، انتقام کی آگ کو بجھانا، گروہی عصبیت سے اپنے کو اوپر اٹھانا، اختلاف کے باوجود انصاف کرنا، خوشامد کے بجائے حق کی بنیاد پر انسان کی قدر کرنا، یہ سب چیزیں اس کے لئے اس طرح لذیذ بن جائیں کہ ان کو چھوڑنا اس کے لئے ممکن نہ رہے۔

درخت کا سبق

درخت کو دیکھئے ۔ اس کا تنہ کس قدر سخت اور طاقت ور ہے ۔ مگر اس کی پتی ، اس کا پھول اور اس کے پھل اتنا ہی زیادہ نازک اور کمزور ہیں ۔ ایک شخص جب پتیوں کے حسن ، پھولوں کی رنگ کاری اور پھلوں کی لطافت پر غور کرتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ درخت کے یہ نرم و نازک حصے اس کے مضبوط حصوں سے زیادہ قدرت کی توجہ کے مستحق رہے ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تنہ اور شاخیں اس لئے تھیں کہ وہ تخلیق کے اس نرم و نازک شاہکار کو وجود میں لانے کا ذریعہ بنیں جن کو پتی اور پھول اور پھل کہا جاتا ہے ۔

یہ خدا کی طرف سے ایک خاموش اشارہ ہے جو بتاتا ہے کہ انسان سے اس کے خالق کو کیا مطلوب ہے ۔ زندگی کے درخت کو حسین پھولوں کے انجام تک پہنچانے کے لئے آدمی کو کیا کرنا چاہئے ۔ وہ یہ ہے کہ آدمی طاقت سے زیادہ معنویت کا دلدادہ ہو ۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے جنت کے دروازے کھولے جائیں گے ۔

انسان پتھروں کے آگے جھکتا ہے اور سچائی کو نظر انداز کر دیتا ہے ۔ لوگ طاقتور تنوں پر اپنے حسنِ سلوک کا ثبوت دے رہے ہیں حالانکہ ان کا خدا ان سے پھولوں اور پتیوں کی سطح پر حسنِ سلوک کا نذرانہ مانگ رہا ہے ۔ لوگ بڑوں کا استقبال کر کے اپنی شرافت اور انسانیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں ۔ حالانکہ خدا جہاں ان کی شرافت اور انسانیت کو دیکھنے کا منتظر ہے وہ اس کے وہ بندے ہیں جن کو چھوٹا سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے ۔ لوگ شہرت کے مواقع پر پیسہ دے کر فیاضی کا ٹائٹل لے رہے ہیں حالانکہ خدا کے یہاں فیاضی کا ٹائٹل اس کو ملتا ہے جو ایسے مواقع پر پیسہ دے جہاں جیب خالی کر کے بھی شہرت اور عزت حاصل نہیں ہوتی ۔

جنت کی وراثت

مومن خدا کی اس دنیا میں گویا ایک تناور درخت ہے۔ ایک شخص جب مومن بنتاہے تو ساری کائنات اس کو رزق پہنچانے کے لئے مستعد ہو جاتی ہے۔ وہ ایک شاندار درخت کی مانند بڑھنا شروع ہوتا ہے۔ زمین کے اندر بھی وہ اپنی جڑیں پھیلاتا ہے اور آسمان تک بھی اس کی شادابیاں پہنچتی ہیں۔ خدا کی مدد ہر مرحلہ میں اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ وہ ہر موقع پر اپنی بہار دکھاتا ہے۔ اس کی کامیابیاں دنیا کی زندگی سے لے کر آخرت کی زندگی تک چلی جاتی ہیں۔

اس کے برعکس غیر مومن خدا کی اس زمین پر جھاڑ جھنکاڑ کی طرح ہے، وہ غیر مطلوب پودے کے طور پر بس اوپر اوپر اگ آتا ہے۔ خدا کی مدد اس کے ساتھ نہیں ہوتی۔ اس لئے نہ دنیا میں اس کو جماؤ حاصل ہوتا اور نہ آخرت میں وہ کوئی پھل دیتا۔ وہ یہاں بھی محروم رہتا ہے اور وہاں بھی۔

غیر مومن کو موجودہ دنیا میں جو مواقع ملتے ہیں وہ خدا کے قانون مہلت کی بنا پر ہیں۔ امتحان کی مصلحت کے تحت اس کو وقتی طور پر زمین کی سطح پر اگنے اور بڑھنے کا موقع مل جاتاہے۔ مگر امتحان کی مدت ختم ہوتے ہی اس کو زمین سے اکھاڑ دیا جائے گا۔ اس کے بعد اس کو آگ کی دنیا میں پھینک دیا جائے گا جہاں وہ ابدی طور پر جہنم میں جلتا رہے۔ اور خدا کی سرسبز و شاداب دنیا اپنی جنتی فضاؤں کے ساتھ صرف ان لوگوں کی وراثت میں دے دی جائے گی جو موت سے پہلے کی زندگی میں سچے ربانی انسان ثابت ہوئے ہوں۔

آخرت میں جینے والے

جنت اس کے لئے ہے جو جنت کا طالب ہو اور جنت کا طالب وہ ہے جس کے لئے جنت کے مقابلہ میں ہر دوسری چیز بے قیمت ہو جائے۔ جو شخص حقیقی معنوں میں جنت کا طالب ہو اس کی نگاہ میں دنیا کی تمام چیزیں حقیر بن جاتی ہیں۔ اخروی چیزوں کی اہمیت کا احساس دنیوی چیزوں کو اس کی نظر میں غیر اہم بنا دیتا ہے۔

جب آدمی کا ذہن آخرت کی باتیں سوچنے میں اتنا گم ہو کہ وہ دنیا کی باتیں بھولنے لگے۔ جب آخرت کا غم اس کے اوپر اس طرح چھا جائے کہ دنیا کے غم اس کو یاد نہ آئیں۔ جب آنے والے مستقل آرام و تکلیف مسئلہ اس کو اتنا فکرمند بنا دے کہ عارضی آرام و تکلیف کے مسئلے اس کے لئے بے حقیقت ہو جائیں۔ جب کل کی زندگی اس کو اس طرح اپنی طرف کھینچ لے کہ آج کی زندگی کے بارے میں وہ لوگوں کو غافل نظر آنے لگے۔ جب بلند تر حقیقتوں کی طرف متوجہ ہونے کی وجہ سے وہ دنیا میں اس طرح رہنے لگے گویا وہ دنیا میں نہیں ہے۔ جب وہ دنیا کا کوئی آرام دیکھے تو یہ سوچ کر رو پڑے کہ معلوم نہیں آخرت میں کیا ہونے والا ہے۔ اور جب کوئی تکلیف اس کو ستائے تو اس کی زبان سے نکلے کہ خدایا، دنیا کی معمولی تکلیف تو برداشت نہیں ہوتی پھر آخرت کی تکلیف کس طرح برداشت ہو گی۔ جب دنیا کی لذتیں اس کو تسکین نہ دے سکیں اور دنیا کی مصیبتیں اس کی نگاہ میں حقیر بن جائیں۔

جن لوگوں کا یہ حال ہو جائے وہی وہ لوگ ہیں جو آخرت کے ماننے والے بنے۔ انھیں خوش نصیب روحوں کے لئے آخرت میں جنت کے دروازے کھولے جائیں گے۔

جنتی عمل

جنتی عمل وہ ہے جو آدمی کے اندر جنت کے پھول کھلا رہا ہو، جس کو کرنے کے دوران آدمی کو خود بھی کچھ ملے۔ اگر آدمی بظاہر سرگرمیاں دکھا رہا ہو اور اس کا اپنا وجود کچھ پانے سے محروم ہو تو اس کی سرگرمیوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ عمل وہی عمل ہے جس کے دوران آدمی کے ذہن میں شعور کی چنگاری پڑے۔ اس کے دل میں سوز و تڑپ کا کوئی لاوا ابلے۔ اس کی روح کے اندر کوئی کیفیاتی ہلچل پیدا ہو۔ اس کے اندرون میں کوئی ایسا حادثہ گزرے جو برتر حقیقتوں کی کوئی کھڑکی اس کے لئے کھول دے۔

آخرت کے پیمانہ میں اہمیت کی چیز یہ نہیں ہے کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ اہمیت کی چیز یہ ہے کہ آپ کیا ہو رہے ہیں۔ اگر آپ کی مصروفیات بہت بڑھی ہوئی ہوں۔ اگر بتانے کے لئے آپ کے پاس بہت سے کارنامے ہوں مگر آپ کی اندرونی ہستی خالی ہو تو آپ کی مصروفیات محض بے فائدہ سرگرمیاں ہیں، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ ہوائیں ہوں مگر ان سے آکسیجن نہ ملے۔ پانی ہو مگر اس سے سیرابی حاصل نہ ہو۔ غذا ہو مگر اس سے آدمی کو قوت نہ ملے۔ سورج ہو مگر وہ روشنی نہ دے رہا ہو تو ایسا ہونا ہونا نہیں ہے بلکہ نہ ہونے کی بدترین شکل ہے۔

غیر جنتی انسان وہ ہے کہ جب وہ بولے تو اس کے الفاظ اس کے دل کی دھڑکن نہ بنیں۔ وہ عمل کرے مگر اس کا عمل اس کے دل کو نہ چھوئے۔ اس کے برعکس جنتی انسان وہ ہے جس کا عمل اس کے لئے روحانی تجربہ بن رہا ہو۔ اس کی ہستی کو کیفیت کی غذائیں مل رہی ہوں۔ اس کی ظاہری کارروائیاں اس کے اندرونی وجود میں ہلچل پیدا کرنے کا سبب بن جائیں۔

جنت کس کا حصہ ہے

جنت کسی کو سستے داموں نہیں مل سکتی ۔ یہ تو اسی خوش نصیب روح کا حصہ ہے جو حقیقی معنوں میں خدا کا مومن بندہ ہونے کا ثبوت دے۔ مومن ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی اپنی دنیادارانہ زندگی کے ساتھ کچھ عملیات کا جوڑ لگالے۔ مومن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام ہی آدمی کی پوری زندگی بن جائے۔ آدمی کا پورا وجود خدا کے دین میں نہا اٹھے۔

مومن وہ ہے جس کے سینہ میں اسلام ایک نفسیاتی طوفان بن کر داخل ہو۔ جو خدا کو اپنے اتنا قریب پائے کہ اس سے اس کی سرگوشیاں جاری ہو جائیں۔ جس کی تنہائیاں خدا کے فرشتوں سے آباد رہتی ہوں۔ جس کے دینی احساس نے اس کی زبان میں خدا کی لگام دے رکھی ہو۔ جس کے ہاتھوں اور پیروں میں خدا کی بیڑیاں پڑی ہوئی ہوں۔ جس کے اسلام نے اس کو حشر کی آمد سے پہلے حشر کے میدان میں کھڑا کر دیا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کافر پر مرنے کے بعد گزرنے والا ہے، وہ مومن پر جیتے جی اسی دنیا میں گزر جاتا ہے۔ دوسرے لوگ جن باتوں کو اس وقت پائیں گے جب کہ خدا غیب کا پردہ پھاڑ کر سامنے آجائے گا، مومن ان باتوں کو اس وقت پالیتا ہے جب کہ خدا ابھی غیب کے پردہ میں چھپا ہوا ہے۔ مومن پر قیامت سے پہلے قیامت گزر جاتی ہے جب کہ دوسروں پر قیامت اس وقت گزرے گی جب کہ وہ عملاً ان کے اوپر آچکی ہوگی۔

جنتی کون

جنتی وہ ہے جس پر جنت سے پہلے جنت کا تجربہ گزر جائے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے دنیا میں ان کیفیات کو پالیا ہو جو آخرت میں اس کو جنت کا مستحق بنانے والی ہیں۔ جس کے رونگٹے کھڑے ہو کر اس کو خدائی محاسبہ کا احساس دلا چکے ہوں۔ جس کے قلب پر ٹکڑے کر دینے والی تجلیات کے نزول نے اس کو قربت خداوندی سے آشنا کیا ہو۔ جس نے بغض و انتقام کے جذبات کو اپنے اندر کچل کر عفوِ خداوندی کا مشاہدہ کیا ہو۔ جس نے اپنے ندامت کے آنسوؤں میں وہ منظر دیکھا ہو جب کہ ایک مہربان آقا اپنے خادم کے اعتراف قصور پر اس سے درگزر فرماتا ہے۔ جس پر یہ لمحہ گزرا ہو کہ ایک شخص پر قابو پانے کے باوجود وہ اس کو اس لئے چھوڑ دے کہ اس کا خدا بھی اس دن اُسے چھوڑ دے جب کہ وہ بالکل عاجز ہو کر اس کے سامنے کھڑا ہوا ہوگا۔ جو اختیار کے باوجود اپنی زبان کو صرف خدا کی خاطر روک لے۔ جو حق کے آگے اس طرح گر پڑے جیسے لوگ آخرت میں خدا کو دیکھ کر ڈھ پڑیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ مومن جنت کا ایک پھول ہے۔ وہ موجودہ دنیا میں آنے والی دنیا کا ایک ابتدائی شگوفہ ہے۔ مومن پر وہ سارے تجربات اسی دنیا میں گزر جاتے ہیں جو دوسروں پر موت کے بعد گزرنے والے ہیں۔ آدمی کی زندگی میں مختلف قسم کے جو حالات پیش آتے ہیں انھیں میں ہر آدمی کی جنت اور جہنم چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ ان حالات میں کوئی شخص شیطان کا انداز اختیار کر کے جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے اور کوئی شخص فرشتوں کا انداز اختیار کر کے جنت کا۔

قیمت نہ دینا

جنت کی قیمت آدمی کا اپنا وجود ہے۔ جو شخص اپنے وجود کو اللہ کے لئے قربان کرے گا وہی جنت کو پائے گا۔ وجود کی قربانی دئے بغیر جنت کا حصول ممکن نہیں۔

ہر آدمی کی زندگی میں وہ لمحہ آتا ہے جب کہ خدا کا دین اس سے کسی قسم کی قربانی مانگتا ہے —— نفس کی قربانی، شخصیت کی قربانی، مال کی قربانی، زندگی کی قربانی۔ ایسے مواقع پر جو شخص مطلوبہ قربانی پیش کردے وہ خدا کے انعام کا مستحق ہوگیا۔ جو شخص ہچکچا کر رک جائے وہ خدا کی نعمتوں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگیا۔

جنت اتنی زیادہ قیمتی ہے کہ ہماری کوئی بھی چیز اس کا بدل نہیں بن سکتی۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے ایک بہت معمولی چیز کو اس کی قیمت بنا دیا ہے۔ یہ ہماری قربانی ہے۔ آدمی اور جنت کے درمیان بس اتنا ہی فاصلہ ہے کہ وہ خدا کی راہ میں اپنی بے قیمت جان کو پیش کردے۔ وہ اس مقصد کے لئے اپنے حقیر مال کو لٹا دے۔ وہ خدا کے کام میں اپنی مختصر عمر کو صرف کردے —— سچائی کو مان لینا قربانی ہے۔ اپنے اثاثہ کو اللہ کے لئے دینا قربانی ہے۔ اپنے وقت اور قوت کو خدا کی راہ میں لگانا قربانی ہے۔ اپنے خلاف مزاج بات کو خدا کی خاطر سہہ لینا قربانی ہے۔

کتنی بڑی چیز کی یہ کتنی چھوٹی قیمت ہے۔ مگر آدمی یہ معمولی قیمت دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ آدمی اپنی مختصر زندگی گزار کر اس حال میں دنیا سے چلا جاتا ہے کہ اس نے جنت کی قیمت ادا کرنے کے لئے کچھ نہیں کیا تھا۔

جنتی اعمال

آخرت میں جنت کی لذتیں اس شخص کو ملیں گی جس کے لئے جنت والے اعمال اسی دنیا میں لذیذ بن گئے ہوں۔ جب آدمی کا حال یہ ہو جائے کہ وہ دنیا کے دکھائی دینے والے سہاروں سے زیادہ خدا کے نہ دکھائی دینے والے سہارے پر بھروسہ کرنے لگے۔ دنیوی چیزوں کی محبت سے زیادہ خدا کی محبت اس کو عزیز ہو اور دنیوی چیزوں کے خوف سے زیادہ خدا کا خوف اس کے لئے اہمیت رکھتا ہو۔ رسول کے بتائے ہوئے طریقہ کو قبول کرنا اس کو ہر حال میں پسند ہو، خواہ وہ اس کے ذوق کے خلاف کیوں نہ ہو۔ وہ دنیا کی مصلحتوں کے بجائے آخرت کی مصلحتوں کو اہمیت دے۔ حق کو نظر انداز کرنے کے مقابلہ میں حق کو مان لینا اس کی نظر میں زیادہ محبوب بن جائے۔ بے فکری کے ساتھ قہقہہ لگانے سے بڑھ کر تسکین اس کے دل کو اس وقت ملتی ہو جب کہ وہ اللہ کے لئے آنسو بہا رہا ہو۔ وقار کا سوال اگر سچی بات کو قبول کرنے میں رکاوٹ بنے تو وہ اپنے وقار کو مجروح کر کے سچائی کا طریقہ اختیار کرنے پر تیار ہو جائے۔

جب اس کو کسی سے شکایت ہو جائے تو اس سے انتقام لینے کے بجائے اس کو معاف کر دینے میں اس کا دل ٹھنڈک پاتا ہو۔ حقوق کو غصب کرنے سے زیادہ اس کو یہ بات پسند ہو کہ وہ دوسروں کے حقوق ادا کرے۔ جب اس کے سینہ میں حسد اور بغض کے جذبات بھڑک اٹھیں تو ان کو ظاہر کرنے کے بجائے ان کو کچل ڈالنا اس کو زیادہ محبوب ہو۔ کسی کے خلاف بری رائے قائم کرنے سے زیادہ اس کو یہ بات پسند ہو کہ وہ اس کے بارے میں اچھی رائے قائم کرے۔

جنت کا مسافر

خدا کا مطالبہ یہ ہے کہ بندہ اپنے تمام اثاثہ کو خدا کے حوالے کردے۔ اس کے معاوضہ میں خدا نے آخرت میں اپنی جنت کا وعدہ کیا ہے۔

آدمی اکثر اپنے آپ کو بچا کر رکھتا ہے اور اس کے جواب میں دشواریوں کی ایک فہرست پیش کر دیتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہی دشواریاں وہ قیمتی مواقع ہیں جن کو عذر نہ بنا کر وہ اپنے رب کو خوش کرسکتا ہے۔ آدمی جن مسائل کی بنا پر اسلام کی طرف بڑھنے سے رکتا ہے وہی دراصل اس کے لئے ترقی کے زینے ہوتے ہیں۔ وہ اس لئے نہیں ہیں کہ آدمی ان کو دیکھ کر رک جائے، وہ اس لئے ہیں تاکہ آدمی انھیں پھاند کر آگے بڑھ جائے۔ وہ ان کو خدا تک پہنچنے کا زینہ بنائے۔

خدا کے نزدیک اس کا سب سے محبوب بندہ وہ ہے جو اپنی تمناؤں کو اس کے لئے دفن کردے۔ جو اپنے آرام کو اس کی خاطر چھوڑ دے۔ جو اپنی مشکلات کو نظر انداز کر کے اس کی طرف بڑھ جائے۔ دنیا میں کسی کی کامیابی یہ نہیں ہے کہ وہ یہاں کچھ حاصل کرے۔ کامیاب دراصل وہ ہے جو خدا کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کردے۔

سب سے زیادہ صحت مند وہ ہے جس کی صحت خدا کی راہ میں برباد ہوگئی ہو۔ سب سے زیادہ صاحب مال وہ ہے جو خدا کی خاطر بے مال ہو جائے۔ سب سے زیادہ بلند مرتبہ وہ ہے جو خدا کے لئے بے مرتبہ ہوگیا ہو۔ سب سے زیادہ خوش نصیب وہ شخص ہے جو بالکل لٹا ہوا اپنے رب کے پاس پہنچے، کیونکہ اس کا رب اپنی رحمتوں کو اس کے اوپر انڈیل دے گا۔

جنتی اخلاقیات

خدا کو اپنی جنتی دنیا میں بسانے کے لئے کیسے انسان مطلوب ہیں، اس کا نمونہ اس نے موجودہ کائنات میں قائم کر دیا ہے۔ جو آدمی خدا کی ابدی نعمتوں میں حصہ دار بننا چاہتا ، ہو اس کو چاہئے کہ وہ خدا کی پسند کو اپنی پسند بنائے، وہ خدا کی تابعداری میں بقیہ کائنات کا ہم سفر بن جائے۔

کائنات میں جو واقعہ لوہے کی صورت میں پایا جاتا ہے وہ انسانی سطح پر بے لچک کردار کی صورت میں مطلوب ہے۔ جو چیز پتھریلی زمین سے پانی کی صورت میں بہہ نکلتی ہے وہ انسان سے نرم مزاجی کی صورت میں مطلوب ہے۔ فطرت میں جو چیز اٹل قوانین کی صورت میں پائی جاتی ہے وہ انسان سے عہد کی پابندی کی صورت میں مطلوب ہے۔ مادی دنیا میں جو چیز مہک اور لذت اور رنگ کی صورت میں پائی جاتی ہے وہ انسان سے خوش معاملگی کی صورت میں مطلوب ہے۔ خلا میں کھربوں ستارے مسلسل حرکت کرتے ہیں مگر ان میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ یہی واقعہ انسان کی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ ہر آدمی اپنے اپنے دائرہ میں اس طرح سرگرم ہو کہ ایک اور دوسرے کے درمیان ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے۔ درخت کاربن لیتا ہے اور آکسیجن ہماری طرف لوٹاتا ہے، یہی چیز انسانی سطح پر اس اخلاقی اصول کی صورت میں مطلوب ہے کہ جو تمھارے ساتھ برا سلوک کرے اس کے ساتھ تم اچھا سلوک کرو۔ پہاڑ اور تمام کھڑی ہوئی چیزیں اپنا سایہ زمین پر ڈال دیتی ہیں، یہی چیز انسانی زندگی میں اس طرح مطلوب ہے کہ ہر آدمی تواضع اختیار کرے۔ کوئی کسی کے اوپر فخر نہ کرے، کوئی دوسرے کے مقابلہ میں اپنے کو بڑا نہ سمجھے۔

جنت والے

جو لوگ خدا کی کتاب کی بنیاد پر کھڑے ہوں ان پر خدا کے خصوصی انعامات ہوتے ہیں اور آخرت میں ان کے لئے جنت کی بشارتیں دی جاتی ہیں۔ مگر یہ انعامات کسی نسل یا قوم سے تعلق کی بنیاد پر نہیں ہوتے بلکہ صرف کردار کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ بعد کے دور میں اس گروہ کے افراد اس فرق کو بھول جاتے ہیں۔ اب لوگ یہ یقین کر لیتے ہیں کہ وہ خواہ عمل کریں یا نہ کریں خدا کے وعدے ان کے حق میں ضرور پورے ہوں گے۔ وہ ضرور خدا کی ابدی جنتوں میں داخل ہوں گے۔

آسمانی کتاب کی حامل قوم میں جب دین کی اصل روح زندہ ہو تو اس کے اندر حقیقت پسندی کا مزاج پیدا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ خدا کے عادلانہ قانون میں اندھیر نہیں ہے۔ وہاں کسی کو وہی کچھ ملے گا جو اس نے کیا ہے نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم۔

اس کے برعکس جب دین کی اصل روح مٹ جاتی ہے تو خوش خیالیاں جنم لیتی ہیں۔ لوگ حقیقی عمل کے بجائے فرضی امیدوں میں جینے لگتے ہیں۔ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ محض ایک خاص گروہ سے وابستہ ہونے کی بنا پر وہ جنتوں میں داخل کر دئے جائیں گے خواہ وہ عمل کریں یا نہ کریں۔

آخرت کی سرفرازیاں ان لوگوں کے لئے ہیں جنھوں نے دنیا میں عدل خداوندی کی سطح پر زندگی گزاری ہو۔ جنھوں نے خدائی حقیقتوں سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کیا ہو۔ جو دوزخ کے سامنے آنے سے پہلے دوزخ سے بھاگے ہوں اور جنت کو دیکھنے سے پہلے جنت کی طرف دوڑ پڑے ہوں۔

جب آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی

خدا جب اپنے بندے کے کسی عمل کو قبول کرتا ہے تو اس وقت حیرت انگیز طور پر کچھ ملکوتی قسم کی کیفیات آدمی کے اوپر گزرتی ہیں۔ یہ اس جنت کا تعارف ہے جس کا وعدہ سچے بندوں سے کیا گیا ہے۔ یہ باغ بہشت کی خوشبو ہے جس کو اہل ایمان دنیا کے اندر پاتے ہیں۔ یہ کیفیات اگرچہ تڑپ کی صورت میں ہوتی ہیں مگر وہ تمام لذتوں سے زیادہ لذیذ ہیں۔

جب آدمی کو ایسا صدقہ کرنے کی توفیق ملتی ہے جبکہ وہ انسان کو دے کر خدا سے پارہا ہو۔ جب اس کو ایسی تلاوت نصیب ہوتی ہے جب کہ خدا کے کلام کا تاثر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی صورت میں بہہ پڑے۔ جب اس پر ایسے درد انگیز لمحات گزرتے ہیں جس میں وہ قربت خداوندی کا تجربہ کرتا ہے۔ جب وہ بے قرار دل اور کپکپاتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ اپنے رب کو ایسے الفاظ میں پکارنے لگتا ہے جو خود اس کے رب کی طرف سے اس کے قلب پر اتارے گئے ہوں تو یہ سب اللہ کا رزق ہوتا ہے جو اس کو روحانی ذریعوں سے پہنچتا ہے۔ وہ ان جنتی پھلوں میں سے ایک پھل کا مزہ چکھتا ہے جو خدا نے اپنے نیک بندوں کے لئے چھپا رکھے ہیں۔ آج یہ پھل ایمانی کیفیات کی صورت میں ملتے ہیں اور کل وہ جنت کے ابدی انعامات کی صورت میں اس کے حوالے کئے جائیں گے۔

دنیا میں اگر آپ خدا سے قریب نہیں ہوئے تو آخرت میں آپ کو خدا کی قربت کس طرح مل سکتی ہے۔ جس کی عبادت دنیا میں اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک نہیں بنی اس کو آخرت کی وہ نعمتیں کس طرح ملیں گی جن کو پا کر ہمیشہ کے لئے اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔

جنت کا پھول

مومن جنت کا پھول ہے۔ اس کی خوشبو دنیا کی زندگی میں ربانی اخلاقیات کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے اور آخرت میں وہ مادی نعمتوں کی صورت میں ڈھل جائے گی۔ جس کا دوسرا نام جنت ہے۔

مومن وہ ہے جس کا لگاؤ آخرت کے معاملہ میں اتنا بڑھے کہ دنیا کی چیزوں کے بارہ میں وہ بے نفس ہو جائے۔ دوسروں کی طرف سے جب اس کے دل پر چوٹ لگے تو وہ اس کو برداشت کرے۔ اس کو اپنی کمیوں کا اتنا زیادہ احساس ہو کہ دوسروں کی طرف سے کی جانے والی تنقید کو وہ برا نہ مانے۔ دوسرے اس کو بے عزت کریں تو خدا کی خاطر وہ اس کو نظرانداز کر دے۔ اس کا دل خدا کے سمندر میں نہا کر اتنا صاف ہو جائے کہ وہ دوسروں کی زیادتیوں پر ان کو معاف کر سکے اور ان کی تلخ باتوں کو بھلا دیا کرے۔ حتیٰ کہ اس کے دل کا یہ حال ہو جائے کہ تکلیف پہنچانے والوں کے لئے اس کی زبان سے دعائیں نکلنے لگیں۔

یہی وہ روح ہے جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو آخرت میں جنت کی دنیا کے شہری بنائے جائیں گے۔ جنت کی دنیا پھولوں جیسی لطیف دنیا ہے، صرف لطیف روحیں ایسی دنیا میں جگہ پا سکتی ہیں۔ جو لوگ اپنے آپ کو منفی جذبات اور ردعمل کی نفسیات سے اوپر نہ اٹھا سکیں وہ گویا کانٹوں کی سطح پر جی رہے ہیں۔ ایسے لوگ پھولوں کے پڑوسی کس طرح بن سکتے ہیں۔

لوگ جنت سے کتنا دور ہیں پھر بھی وہ اپنے کو جنت سے کتنا قریب سمجھتے ہیں۔

ربّانی اوصاف

جنت ایک مثالی دنیا ہے جو مخصوص خدائی اہتمام کے تحت بنائی جائے گی ۔ موجودہ دنیا دکھ اور محنت کی دنیا ہے اور موت کے بعد آنے والی دنیا خوشیوں اور لذتوں کی دنیا۔ موجودہ دنیا میں وہ انسان چنے جا رہے ہیں جو آنے والی ابدی دنیا میں بسائے جانے کے قابل ہوں۔

اگلی دنیا میں عزت و مسرت کے لازوال مکانات میں بسانے کے لئے وہ لوگ مطلوب ہیں جو اخلاق خداوندی کو اپنا اخلاق بنائیں۔ اخلاق خداوندی کیا ہے، اس کے نمونے آج کی دنیا میں انسان کے چاروں طرف پھیلا دئے گئے ہیں۔

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے دل و دماغ میں پہاڑوں کی بلندیاں اور سمندروں کی وسعتیں لئے ہوئے ہوں۔ جو ہواؤں کی مانند لوگوں سے ٹکرائے بغیر ان کے بیچ سے گزر جانے والے ہوں۔ جو ستاروں اور سیاروں کی طرح خاموش سفر کرنا جانتے ہوں جو سورج کی طرح اپنوں اور غیروں کے اوپر یکساں چمکنے والے ہوں۔ جو پھول کی طرح شہرت اور عزت سے بے نیاز ہو کر کھلنا جانتے ہوں۔ جو دریا کی مانند حسد اور نفرت سے خالی ہو کر زمین کے سینہ پر بہہ رہے ہوں۔ جو درخت کی طرح ساری کائنات کو اپنے لئے ربانی غذا کا دسترخوان بنا چکے ہوں۔ جو زمین پر پڑے ہوئے سایہ کی طرح کبر و غرور سے خالی ہو کر اپنے آپ کو اللہ کے آگے ڈال دینے والے ہوں۔

جو لوگ آج کی دنیا میں ان ربانی خصوصیات کے حامل بنیں وہی وہ لوگ ہیں جو آنے والی جنتی دنیا کے مالک ہوں گے۔

خدا کے لئے جھکنے والے

خدا کو اپنی جنت میں بسانے کے لئے وہ حقیقت پسند انسان مطلوب ہے جو خدا کو نہ دیکھتے ہوئے بھی دنیا میں اس طرح رہے جیسے کہ وہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ خدا کی بڑائی اور اس کے کمالات، اس کے ذہن پر اس طرح چھا جائیں کہ وہ اس کو ہر وقت یاد آنے لگے۔ اس کا دل ہر وقت خدا کی باتوں سے سرشار رہے اور اس کی پوری زندگی خدا کے گرد گھومنے لگے۔

جنت کی حسین دنیا میں رہنے کا اہل صرف وہ ہے جو خدا کو اس طرح اپنا معبود بنائے کہ وہی اس کی زندگی بن جائے۔ جو اپنے شعور کو اس حد تک ترقی دے کہ اپنے آپ کو اپنے سے الگ ہو کر دیکھنے لگے۔ جو خود مختار ہو کر بھی پابند زندگی گزارے۔ جو آزاد ہو کر بھی اپنی آزادی کو مقرر دائرہ میں استعمال کرے۔

یہ بلند نظری اور حقیقت پسندی کا وہ مقام ہے جہاں آدمی نفسیاتی پردوں سے باہر آ کر سوچتا ہے۔ جہاں وہ اپنے آپ کو ذاتی نگاہ سے نہیں بلکہ حقیقتِ واقعہ کی نگاہ سے دیکھنے لگتا ہے۔ جہاں وہ مجبور نہ ہوتے ہوئے بھی ہمہ تن اپنے آپ کو اپنے آقا کے آگے جھکا دیتا ہے۔ جہاں مخالف ترغیبات کے باوجود وہ اپنے آپ کو اللہ کی حدود پر قائم رکھتا ہے۔ جہاں ڈھٹائی کے مواقع ہوتے ہوئے بھی وہ سراپا اپنے کو حق کے آگے ڈال دیتا ہے۔ مالک کائنات کے ظہور کے بعد لوگوں کا جو حال ہو گا وہ حال اس کا اسی وقت ہو جاتا ہے جب کہ مالک کائنات ابھی غیب کے پردہ میں چھپا ہوا ہے۔

جنتی کردار

جنت کی لطیف دنیا میں بسنے کے قابل وہ لوگ ہیں جن کا یہ حال ہو کہ ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آئے تو وہ مایوس نہ ہوں بلکہ صبر کا طریقہ اختیار کریں۔ کسی سے ان کو تکلیف پہنچے تو اس کے حق میں دعائیں دیں۔ کسی سے معاملہ پڑے تو انصاف کے مطابق اس کے حقوق ادا کریں۔ کوئی تنقید کرے تو اس کو برا مانے بغیر ٹھنڈے دل سے سن لیں۔ کسی سے شکایت ہو تب بھی اس کے بارے میں انصاف کا رویہ نہ چھوڑیں۔ جب بھی کسی سے معاملہ پڑے تو دوسرے شخص کو ان سے بہتر سلوک کا تجربہ ہو۔

مومن وہ ہے جو دنیا کی زندگی میں خدا کا ایسا پھول بن جائے جو اپنی کثافت کو بھی مہک کی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ ایسی پاک زندگی گزارنے کی توفیق ان لوگوں کو ملتی ہے جو اللہ کو اس طرح یاد کرنے لگیں جس طرح کوئی آدمی سانس لیتا ہے۔ وہ اللہ کو اس طرح پالیں کہ وہ ان کی روح کے اندر تیر جائے، وہ ان کی دل کی دھڑکنوں میں شامل ہو جائے، وہ اللہ کے خوف و محبت میں نہا اٹھیں۔

جہاں لوگوں میں سرکشی بھڑکتی ہے، مومن تواضع سے جھک جاتا ہے۔ جب نفرت امنڈتی ہے وہ محبت کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ جب بدخواہی کا موقع ہو تو وہ خیرخواہی کا ثبوت دیتا ہے۔ جہاں حقوق دبائے جاتے ہیں وہ انصاف کے ساتھ حقوق لوٹاتا ہے۔ جب اعتراف کرنے میں وقار گرتا ہے تو وہ سچائی کا اعتراف کر لیتا ہے۔ جب جوابی کارروائی کا ذہن ابھرتا ہے تو اس وقت بھی وہ وہی کرتا ہے جو انصاف کے مطابق ہو۔

داعی خدا کا نمائندہ

خدا کا داعی خدا کے سمندر میں نہاتا ہے۔ وہ خدا سے الفاظ پاکر بولتا ہے۔ اس طرح اس کے لئے ممکن ہوتا ہے کہ وہ خدا کی دنیا میں خدا کے گیت گائے۔ وہ فطرت کے ساز پر خدا کے ابدی نغمے چھیڑے۔ مگر انسان اتنا غافل ہے کہ پھر بھی وہ اس سے کوئی اثر نہیں لیتا۔ پھر بھی وہ اپنے بند سینہ کو نہیں کھولتا۔

خدا کی طرف سے ایک پکارنے والے کا وجود میں آنا کسی مشین پر بجنے والے ریکارڈ کا وجود میں آنا نہیں ہے۔ یہ روح انسانی میں ایک ایسے انقلاب کا برپا ہونا ہے جس کی شدت جوالا مکھی پہاڑوں سے بھی زیادہ سخت ہوتی ہے۔ داعی کا بولنا اپنے جگر کے ٹکڑوں کو باہر لانا ہوتا ہے۔ اس کا لکھنا اپنے خون کو سیاہی بنانے کے بعد وجود میں آتا ہے۔ اس کے نغمے محض نغمے نہیں ہوتے بلکہ روح انسانی میں ایک لطیف ترین خدائی بھونچال کی آواز ہوتے ہیں۔

مگر اس دنیا کا یہ سب سے زیادہ عجیب واقعہ ہے کہ ایسے ربانی کلمات بھی انسان کو نہیں پگھلاتے۔ داعی اپنے پورے وجود کے ساتھ نذیر عریاں بن جاتا ہے اس کے باوجود آدمی اندھا بہرا بنا رہتا ہے۔ انسان کے سامنے جنت کی کھڑکیاں کھولی جاتی ہیں مگر وہ وجد میں نہیں آتا۔ اس کو بھڑکتے ہوئے جہنم کا نقشہ دکھایا جاتا ہے پھر بھی اس پر گریہ طاری نہیں ہوتا۔ اس کے سامنے خدا خود آکر کھڑا ہو جاتا ہے اس کے باوجود وہ سجدہ میں نہیں گرتا۔

انسان سے زیادہ نازک مخلوق خدا نے کوئی نہیں بنائی مگر انسان سے زیادہ بے حسی کا ثبوت بھی اس دنیا میں کوئی نہیں دیتا۔

سچا راستہ

خدا تک پہنچنے کی صراط مستقیم

آغاز کلام

سورج اپنے روشن چہرہ کے ساتھ طلوع ہوتا ہے اور انسان کے اوپر اس طرح چمکتا ہے جیسے وہ کوئی پیغام سنانا چاہتا ہو۔ مگر وہ کچھ کہنے سے پہلے ڈوب جاتا ہے۔ درخت اپنی ہری بھری شاخیں نکالتے ہیں، دریا اپنی موجوں کے ساتھ رواں ہوتا ہے۔ یہ سب بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ مگر انسان ان کے پاس سے گزر جاتا ہے، بغیر اس کے کہ ان کا کوئی بول اس کے کان میں پڑا ہو۔ آسمان کی بلندیاں، زمین کے مناظر سب ایک بہت بڑے "اجتماع" کے شرکار معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان میں سے ہر ایک خاموش کھڑا ہوا ہے۔ وہ انسان سے ہم کلام نہیں ہوتا۔

کائنات کیا گونگے شاہکاروں کا ایک عظیم عجائب خانہ ہے۔ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے پاس خدا کا ایک پیغام ہے اور اس کو وہ ابدی زبان میں نشر کر رہا ہے۔ مگر انسان دوسری آوازوں میں اتنا کھویا ہوا ہے کہ اس کو کائنات کا خاموش کلام سنائی نہیں دیتا۔

پیغمبر اسی بے الفاظ خدائی کلام کو الفاظ دیتا ہے۔ وہ خاموش پیغام کو ہمارے لئے سننے کے قابل بناتا ہے۔ پیغمبر بتاتا ہے کہ خدا کا وہ دین کون سا ہے جو اس کو انسان سے بھی مطلوب ہے اور بقیہ کائنات سے بھی۔

پیغمبر کے لائے ہوئے اس دین کی بنیاد قرآن پر ہے جو خدا کی طرف سے عربی زبان میں اتارا گیا ہے۔ پھر اس کتاب کی مزید وضاحت سنت سے ہوتی ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور تعلیمات کی صورت میں کتابوں کے وسیع ذخیرہ میں مرتب ہو کر موجود ہے۔ جو شخص سنجیدگی کے ساتھ اس کو جاننا چاہتا ہو اس کو چاہئے کہ ان کتابوں کو پڑھے۔ کیونکہ یہی وہ کتابیں ہیں جو دین خداوندی کو سمجھنے کے لئے اصل ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جو لوگ ان کتابوں کے پورے ذخیرے کے مطالعہ کا وقت نہ رکھتے ہوں ان کے لئے کم سے کم مختصر نصاب ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

قرآن مجید
سیرۃ نبوی از حافظ ابن کثیر
مشکوٰۃ المصابیح
حیاۃ الصحابہ از مولانا محمد یوسف کاندھلوی

یہ سب معروف و مشہور کتابیں ہیں اور ہر جگہ بآسانی دستیاب ہو سکتی ہیں۔ یہ کتابیں اصلاً عربی زبان میں ہیں۔ تاہم ان کے ترجمے مختلف زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ پڑھنے والا اپنی سہولت کے مطابق ان کو اپنی مطلوبہ زبان میں حاصل کر کے پڑھ سکتا ہے۔

زیر نظر کتاب اسی دین خداوندی کے عمومی اور ابتدائی تعارف کے لئے تیار کی گئی ہے۔ اگر وہ پڑھنے والے کے اندر یہ شوق پیدا کر دے کہ وہ اس دین کا مزید تفصیلی مطالعہ کر کے حقیقت کو جاننے کی کوشش کرے تو یہی اس کی کامیابی کے لئے کافی ہے۔

وحید الدین ۲۷ دسمبر ۱۹۸۰ء

انسان کی تلاش

انسان ایک کامل دنیا چاہتا ہے، مگر وہ ایک ناقص دنیا میں رہنے کے لئے مجبور ہے۔ ہماری خوشیاں بے حد عارضی ہیں۔ ہماری ہر کامیابی اپنے ساتھ ناکامی کا انجام لئے ہوئے ہے۔ ہم اپنی امیدوں کی "صبح" کو بھرپور دیکھ بھی نہیں پاتے کہ اس پر "شام" آجاتی ہے۔ ہماری زندگی کے درخت پر شادابی اور بہار کے چند سال بھی نہیں گزرتے کہ حادثہ اور بڑھاپا اور موت اس کو اس طرح ختم کر دیتے ہیں جیسے کہ اس کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔

پھول کس قدر حسین ہوتے ہیں، مگر پھول صرف اس لئے کھلتے ہیں کہ وہ مرجھا جائیں۔ سورج کی روشنی کتنی لطیف ہے، مگر سورج کی روشنی کے لئے مقدر ہے کہ وہ کچھ دیر کے لئے چمکے اور اس کے بعد رات کا تاریک پردہ اسے چھپالے۔ ایک زندہ انسان کیسا معجزاتی وجود ہے، مگر کوئی انسان اپنے آپ کو موت اور حادثات سے نہیں بچاسکتا۔ یہی موجودہ دنیا کی تمام چیزوں کا حال ہے۔ یہ دنیا ناقابل قیاس حد تک نفیس اور بامعنی ہے۔ مگر یہاں کی ہر خوبی زائل ہونے والی ہے، یہاں کی ہر چیز میں کوئی نہ کوئی نقص کا پہلو ہے جو کسی طرح اس سے جدا نہیں ہوتا۔ جو خدا اپنی ذات میں کامل ہو وہ ایک ایسی کائنات کو پیدا کرنے پر اکتفا نہیں کرسکتا جو اپنی ذات میں ناقص ہو۔ کامل کا غیر کامل پر ٹھیر جانا ممکن نہیں۔ یہی اس بات کا ثبوت ہے کہ موجودہ دنیا آخری نہیں۔ ضرور ہے کہ اس کے بعد ایک اور دنیا آئے جو موجودہ دنیا کی کمیوں کی تلافی کرنے والی ہو۔

موجودہ دنیا کے متعلق یہ معلوم ہو چکا ہے کہ وہ فانی ہے۔ وہ تقریباً ۲۰ ہزار ملین سال پہلے ایک وقت خاص میں وجود میں آئی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کائنات کا خالق ازلی وجود رکھنے والا ہے۔ ایک ازلی خالق ہی ایک غیر ازلی مخلوق کو پیدا کر سکتا ہے۔ خدا اگر ہمیشہ سے نہ ہو تو وہ کائنات کبھی موجود نہیں ہو سکتی جو ہمیشہ سے نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فانی کائنات کو ماننے کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ ہم ایک غیر فانی خالق کو مانیں۔ "فانی" کائنات کا موجود ہونا ہی یہ ثابت کرتا ہے کہ یہاں ایک "غیر فانی" خالق موجود ہے۔ خالق اگر غیر ابدی ہوتا تو وہ سرے سے موجود ہی نہ ہوتا، اور جب خالق موجود نہ ہوتا تو مخلوقات کے وجود میں آنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔

جب ہم کہتے ہیں کہ دنیا "۲۵ نومبر" کو پیدا ہوئی تو اس کا لازمی مطلب یہ ہوتا ہے کہ ۲۵ نومبر سے

پہلے بھی کوئی موجود تھا جس نے اس کو پیدا کیا۔ اگر کہا جائے کہ پیدا کرنے والا بھی کسی پچھلے "۲۵ نومبر" کو پیدا ہوا تھا تو یہ بات بالکل بے معنی ہوگی۔ پیدا کرنے والا اگر پچھلے کسی ۲۵ نومبر کو پیدا ہونے والا ہو تو وہ کبھی پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ خالق ہمیشہ سے تھا، اسی لئے اس نے غیر ہمیشہ کو پیدا کیا، اگر وہ ہمیشہ سے نہ ہوتا تو وہ سرے سے موجود نہ ہوتا پھر غیر ہمیشہ کا وجود کہاں سے آتا۔

خدا ازلی ہے اور اسی لئے خدا ایک کامل ہستی ہے۔ کیونکہ ازلیت کمال کا سب سے بڑا وصف ہے۔ جو ازلی ہو وہ لازماً کامل بھی ہوگا۔ ازلیت اور کمال دونوں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔

موجودہ دنیا خدا کی صفات کا ایک ظہور ہے۔ مگر موجودہ دنیا میں کمی اور محدودیت کا ہونا بتاتا ہے کہ موجودہ دنیا خدا کی صفات کا کامل ظہور نہیں۔ کامل اور ابدی خدا کی صفات کا کامل ظہور وہی ہے جو خود بھی کامل اور ابدی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری دنیا کو ابھی ایک اور دنیا کا انتظار ہے، خدا کی صفات کا ظہور اپنی تکمیل کے لئے ابھی ایک اور ظہور کا تقاضا کرتا ہے۔

جنت خدا کی وہ دنیا ہے جہاں اس کی صفات اپنے پورے کمال کے ساتھ ظاہر ہوں گی۔ جنت ان تمام کمیوں سے پاک ہوگی جن کا ہم آج کی دنیا میں تجربہ کرتے ہیں۔ جنت خدا کی اس قدرتِ کاملہ کا مظہر ہے کہ وہ حسن میں ابدیت کی شان پیدا کر سکتا ہے، وہ لذت کو لامحدود بنانے کا اختیار رکھتا ہے۔ وہ ایسی دنیا کی تخلیق کر سکتا ہے جہاں اتھاہ سکون ہو اور جس کا چین کبھی ختم نہ ہو سکے۔

ہر آدمی ایک اَن دیکھے سکون کی تلاش میں ہے۔ ہر آدمی ایک ایسی مکمل دنیا کا طالب ہے جس کو وہ ابھی تک پا نہ سکا۔ یہ طلب موجودہ کائنات میں اجنبی نہیں۔ جو کائنات ایک ازلی خدا کی شہادت دے رہی ہو وہاں ازلی خوبیوں کی ایک دنیا کا ظہور اتنا ہی ممکن ہے جتنا خود موجودہ غیر ازلی دنیا کا ظہور۔ کیونکہ جس کائنات کا خالق اپنی ذات میں ازلی ہو وہ اپنی صفات کے غیر ازلی ظہور پر اکتفا نہیں کر سکتا۔ جس خدا نے نیست سے ہست کو پیدا کیا وہ یقیناً ہست میں ابدیت کی شان بھی پیدا کر سکتا ہے، اور یقیناً دوسرا کارنامہ پہلے کارنامہ سے کچھ مشکل نہیں۔

ازلیت ایک خاص الخاص خدائی صفت ہے، اس صفت میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں۔ ازلیت

اعلیٰ ترین کمال ہے جو صرف ایک خدا کے لئے سزاوار ہے۔ وہ جنت جو خدا کی صفتِ ازلیت کا ظہور ہو وہ ایسی عجیب وغریب چیز ہوگی جس کا آج کوئی انسان تصور نہیں کر سکتا۔ وہ حسن جس کے لئے کبھی مرجھانا نہ ہو، وہ لذت جو کبھی ختم ہونے والی نہ ہو، وہ عیش جس کا تسلسل ابدی طور پر باقی رہے، امیدوں اور تمناؤں کی وہ دنیا جس کے کمالات پر کبھی کوئی زوال نہ آئے، ایسی جنتی دنیا اتنی حیرت ناک حد تک لذیذ ہوگی کہ آدمی نیند کے بقدر بھی اس سے انقطاع نہ چاہے گا خواہ اس پر اربوں اور کھربوں سال کیوں نہ گزر جائیں۔

انسان ہمیشہ ایک ایسی زندگی کی تلاش میں رہتا ہے جس میں اس کو ابدی آرام حاصل ہو۔ یہ تلاش صحیح بھی ہے اور انسانی فطرت کے مطابق بھی۔ مگر ہمارے خوابوں کی یہ زندگی ہمیں موجودہ دنیا میں نہیں مل سکتی۔ موجودہ دنیا میں ابدی خوشیوں کا نظام بننا ممکن نہیں۔ یہاں وہ اسباب موجود ہی نہیں جو ابدی خوشیوں اور راحتوں کی دنیا کو ظہور میں لانے کے لئے ضروری ہیں۔

پیغمبر نے بتایا کہ موجودہ دنیا کو خدا نے امتحان کی جگہ بنایا ہے نہ کہ انعام پانے کی جگہ۔ یہاں صرف وہ اسباب جمع کئے گئے ہیں جو آدمی کے امتحان کے لئے ضروری ہیں۔ خوشیوں اور راحتوں کی ابدی زندگی حاصل کرنے کے لئے جو اسباب درکار ہیں وہ دوسری دنیا میں فراہم ہوں گے جو موجودہ دنیا کے بعد ہمارے سامنے آنے والی ہے۔ ہمارے اور اس اگلی دنیا کے درمیان موت کا فاصلہ ہے۔ موت آدمی کے امتحان کی تکمیل کا وقت ہے اور اسی کے ساتھ آگے کی ابدی دنیا میں داخل ہونے کا بھی۔

جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اس کو اس کے خوابوں کی زندگی ملے، اس کو موجودہ دنیا میں اپنی "جنت" بنانے کی بے فائدہ کوشش میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ اس کے بجائے اس کو یہ کوشش کرنا چاہئے کہ وہ آج کی دنیا میں ہونے والے امتحان میں پورا اترے۔ وہ دنیا میں خدا کا بندہ بن کر زندگی گزارے۔ وہ پیغمبر کی پیروی کو اپنا طریقہ بنائے۔ وہ اپنی آزادی کو خدا کے احکام کی پابندی میں دے دے۔

جو لوگ آج کے امتحان میں پورے اتریں گے وہ اگلی زندگی میں اپنے خوابوں کی دنیا کو پائیں گے۔ جو لوگ امتحان میں ناکام رہیں گے وہ زندگی کے اگلے مرحلے میں اس حال میں پہنچیں گے کہ ابدی بربادی کے سوا اور کوئی چیز نہ ہوگی جو وہاں ان کا استقبال کرے۔

سچائی کیا ہے

ایک نقطہ سے دوسرے نقطہ تک سیدھی لکیر صرف ایک ہوتی ہے۔ اسی طرح بندے کو خدا تک پہنچانے والا سیدھا راستہ بھی کوئی ایک ہی راستہ ہو سکتا ہے۔ اسی راستہ کا نام سچائی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ سچائی کیا ہے اور اس کو کس طرح دریافت کیا جائے۔

ہماری خوش قسمتی سے سچائی جس طرح ایک ہے اسی طرح وہ میدان میں بھی تنہا ہے۔ یہاں کئی چیزیں نہیں ہیں جن کے درمیان انتخاب کا سوال ہو۔ یہاں تو ایک ہی چیز ہے اور ہمارے لئے اس کے سوا چارہ نہیں کہ اس ایک کو مان لیں۔ یہ واحد سچائی محمد رسول اللہ کی تعلیمات ہیں۔ اگر آدمی سچائی کی تلاش میں فی الواقع سنجیدہ ہو تو وہ پائے گا کہ خدا نے اس کو انتخاب کی آزمائش میں نہیں ڈالا۔ خدا نے ہم کو ایک ایسی دنیا میں رکھا ہے جہاں انتخاب حق اور ناحق کے درمیان ہے نہ کہ حق اور حق کے درمیان۔ (یونس ۳۲)

فلسفہ سچائی کی تلاش میں کم از کم پانچ ہزار سال سے سرگرداں ہے۔ مگر اس کی لمبی تلاش نے اس کو صرف اس مقام پر پہنچایا ہے کہ وہ خود اقرار کر رہا ہے کہ وہ آخری سچائی تک نہیں پہنچ سکا اور نہ کبھی پہنچ سکتا۔ فلسفہ کا طریقہ یہ ہے کہ وہ عقلی غور و فکر کے ذریعہ سچائی تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر عقل اپنی معلومات کے دائرہ میں غور کرتی ہے۔ اور سچائی کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کے بارے میں کوئی واقعی رائے قائم کرنے کے لئے پوری کائنات کا علم درکار ہے۔ کوئی فلسفی کبھی کائناتی معلومات تک نہیں پہنچ سکتا اس لئے وہ سچائی کے بارے میں کوئی قطعی رائے بھی قائم نہیں کر سکتا۔

سائنس نے اس معاملہ میں اپنے کو میدان میں کھڑا ہی نہیں کیا ہے۔ سائنس اپنی کھوج ان امور میں جاری کرتی ہے جہاں قابل اعادہ تجربات کے ذریعہ نتائج تک پہنچنا ممکن ہو۔ سائنس پھول کی کیمسٹری کو موضوع بحث بناتی ہے مگر وہ پھول کی مہک کو اپنی بحث سے خارج قرار دیتی ہے۔ کیونکہ پھول کے کیمیائی اجزاء تولے اور ناپے جا سکتے ہیں مگر پھول کی مہک کو تولنے اور ناپنے کا کوئی ذریعہ سائنس کے پاس نہیں۔ اس طرح سائنس نے اپنے دائرہ بحث کو خود ہی محدود کر لیا ہے۔ چنانچہ سائنس نے پیشگی یہ اقرار کر لیا ہے کہ وہ عالم حقائق کے صرف جزئی پہلو سے بحث کرتی ہے، وہ کلی حقائق کے بارے میں کوئی بیان دینے کی پوزیشن میں نہیں۔

روحانی شخصیات کا دعویٰ ہے یا کم ازکم ان کے ماننے والے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ سچائی سے باخبر ہیں اور سچائی کے بارے میں قطعی معلومات دے سکتے ہیں۔ مگر اس عقیدہ کے لئے کوئی بنیاد موجود نہیں۔ روحانی شخصیات اپنے دعوے کے مطابق جس ذریعہ سے سچائی تک پہنچتی ہیں وہ روحانی ریاضتیں ہیں۔ مگر نام نہاد روحانی ریاضتیں حقیقۃً جسمانی ریاضتیں ہیں اور جسمانی ریاضتوں کے ذریعہ روحانی دریافت بجائے خود ایک بے اصل بات ہے۔ دوسرے یہ کہ کوئی بھی روحانی شخصیت، اپنی ذات میں، ان محدودیتوں سے خالی نہیں ہے جن محدودیتوں کا شکار اس کے جیسے دوسرے تمام انسان ہیں۔ دوسرے انسان اپنی جن محدودیتوں کی وجہ سے سچائی تک نہیں پہنچ سکتے وہی محدودیتیں خود ان روحانی شخصیتوں کی راہ میں بھی حائل ہیں۔ کسی بھی قسم کی ریاضت آدمی کو اس کی فطری محدودیتوں سے بالا نہیں کر سکتی، اس لئے کسی بھی قسم کی ریاضت اس کو مطلق سچائی تک نہیں پہنچا سکتی۔

اس کے بعد میدان میں صرف پیغمبر رہ جاتے ہیں۔ پیغمبر وہ انسان ہے جو یہ کہتا ہے کہ خدا نے اس کو چنا ہے اور اس پر سچائی کا علم اتارا ہے تاکہ وہ اس کو دوسرے تمام لوگوں تک پہنچا دے۔ اپنی نوعیت کی حد تک یہی ایک دعویٰ ہے جو اس معاملہ میں قابل اعتبار ہے۔ کیونکہ سچائی کا حقیقی علم صرف خدا ہی کو ہو سکتا ہے جو ازلی و ابدی ہے اور تمام حقیقتوں سے براہ راست واقف ہے۔ خدا کا خدا ہونا ہی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ وہ حقیقت کا کلی علم رکھتا ہو۔ اس لئے جو شخص یہ کہے کہ اس کو براہ راست خدا کی طرف سے سچائی کا علم پہنچا ہے اس کا دعویٰ یقیناً اس قابل ہے کہ اس معاملہ میں اس کا لحاظ کیا جائے۔

یہاں ایک سوال ہے۔ پیغمبر ہماری دنیا میں کوئی ایک نہیں بلکہ بہت سے ہیں۔ ان کی کتابیں بھی کئی ہیں۔ پھر کس پیغمبر کو مانا جائے۔ تاہم آدمی اگر سچائی کی تلاش میں سنجیدہ ہو تو اس سوال کا جواب معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں۔ بلاشبہ ماضی میں خدا نے بہت سے پیغمبر بھیجے۔ مگر انسان کے پاس ماضی کے کسی واقعہ کو ماننے کا واحد معیار یہ ہے کہ اس کو تاریخی اعتباریت حاصل ہو، اور ایک کے سوا دوسرے تمام پیغمبر اس انسانی معیار پر پورے نہیں اترتے۔ آج ایک ہی پیغمبر تاریخی پیغمبر ہیں اور دوسرے تمام پیغمبر اب عملاً اعتقادی پیغمبر۔ دنیا میں جتنے پیغمبر گزرے ہیں ان میں صرف ایک ہی پیغمبر ہیں جن کو پورے معنوں میں تاریخی اعتباریت کا درجہ حاصل ہے۔ اور وہ پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ کے بارے میں ہر بات تاریخی طور پر معلوم اور مسلّم ہے۔ موجودہ زمانہ کی کسی شخصیت کے بارے میں ہم جتنا جانتے ہیں اس سے بھی زیادہ ہم پیغمبر عربی کے بارے میں جانتے ہیں۔ آپ کے سوا دوسرے

تمام پیغمبر روایات کے اندھیرے میں گم ہیں۔ ان کے بارے میں مکمل تاریخی معلومات حاصل نہیں۔ اور نہ ان کی چھوڑی ہوئی کتاب آج اپنی اصل صورت میں محفوظ ہے۔ یہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کی زندگی تاریخی طور پر پوری طرح معلوم ہے۔ اور وہ کتاب بھی ادنیٰ تبدیلی کے بغیر کامل صورت میں موجود ہے جس کو آپ نے یہ کہہ کر لوگوں کے حوالے کیا تھا کہ یہ میرے پاس خدا کی طرف سے آئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خالص علمی و عقلی اعتبار سے دیکھا جائے تو "سچائی کیا ہے" کے سوال کا جواب نہ صرف نظری طور پر ایک ہے بلکہ عملی طور پر بھی میدان میں صرف ایک ہی جواب موجود ہے۔ یہاں دوسرا کوئی جواب حقیقی طور پر موجود ہی نہیں۔ ہمیں بہت سے جوابات میں سے ایک جواب کو چننا نہیں ہے بلکہ ایک ہی موجود جواب کو اختیار کرنا ہے

یہ سچائی خدا کی بات ہے اور خدا کی بات ہمیشہ ایک رہتی ہے۔ جس طرح دنیا کی دوسری چیزوں کے لئے خدا کا حکم ہمیشہ سے ایک ہے، اسی طرح انسان کے لئے بھی خدا کا حکم ایک ہے اور ہمیشہ ایک رہے گا۔ زمین و آسمان کا قانون اربوں سال گزرنے پر بھی نہیں بدلتا۔ درخت اور پانی کے اصول جو ایک جغرافیہ میں ہوتے ہیں وہی دوسرے جغرافیہ میں ہوتے ہیں، یہی حال انسان کے بارے میں خدا کے حکم کا بھی ہے۔ انسان کے بارے میں خدا کا جو حکم ہے وہ وہی آج بھی ہے جو ہزاروں سال پہلے تھا۔ وہ ایک ملک کے انسانوں کے لئے بھی وہی ہے جو دوسرے ملک کے انسانوں کے لئے۔

زندگی کے کچھ پہلو ایسے ہیں جو بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً سواریاں، مکانات وغیرہ۔ مگر سچائی کا تعلق اس قسم کی چیزوں سے نہیں۔ سچائی کا تعلق "اس انسان" سے ہے جو ہمیشہ ایک حالت میں رہتا ہے۔ سچائی کا تعلق اِس سے ہے کہ آدمی کس کو اپنا خالق و مالک سمجھے۔ وہ کس کے آگے جھکے اور کس کی عبادت کرے۔ وہ کس سے ڈرے اور کس سے محبت کرے۔ وہ اپنی کامیابی اور ناکامی کو کس معیار سے جانچے۔ اس کی زندگی کا مقصد اور اس کے جذبات کا مرکز کیا ہو۔ لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے وہ کن قواعد کے تحت ان سے معاملہ کرے۔ سچائی کا تعلق زندگی کے انھیں امور سے ہے، اور یہ امور وہ ہیں جن کا کوئی تعلق زمانہ یا جغرافیہ سے نہیں۔ وہ ہر مقام پر اور ہر زمانہ میں یکساں طور پر ہر ایک سے مطلوب ہوتے ہیں۔ خدا ایک ہے اور ابدی ہے۔ ٹھیک اسی طرح سچائی بھی ایک ہے اور اسی کے ساتھ ابدی بھی۔

خطرہ کا الارم

زندگی کی حقیقت کیا ہے، عام آدمی اس قسم کے سوالات میں پڑنا پسند نہیں کرتا۔ وہ خیال کرتا ہے کہ جو کچھ ہے بس یہی دنیا کی زندگی ہے۔ یہاں عزت اور آرام کے ساتھ اپنی عمر پوری کر لو۔ اس کے بعد نہ تم ہوگے اور نہ تمھارا کوئی مسئلہ۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جو اس سوال کے بارے میں سوچتے ہیں۔ مگر ان کا سوچنا فلسفیانہ انداز کا ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کی ساری کوشش صرف یہ ہوتی ہے کہ سامنے کی دنیا کی کوئی نظریاتی توجیہہ حاصل کر لیں۔ اس قسم کی فلسفیانہ توجیہات، تعداد میں مختلف ہونے کے باوجود، صرف توجیہات ہیں۔ وہ آدمی کے لئے کوئی ذاتی مسئلہ پیدا نہیں کرتیں۔ ایک روح عالم اپنی تکمیل کے لئے پورے کارخانہ کو چلا رہی ہے یا تمام چیزیں کسی بالاتر وجود کے اجزاء ہیں، اس قسم کی نظریاتی بحثوں سے ایک آدمی کا ذاتی تعلق کیا ہے۔ تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کے پاس اس سوال کا کوئی نہ کوئی مذہبی جواب ہے۔ مگر ان میں بھی آدمی کے لئے کوئی سنگینی کا پہلو نہیں۔ ان میں سے کسی کے نزدیک خدا کا بیٹا تمام انسانوں کے گناہوں کا کفارہ بن چکا ہے۔ کسی کے نزدیک زندگی ہمارے شعور سے بالاتر ایک جبری چکر ہے۔ آدمی ایک جبری نظام کے تحت اپنے آپ بار بار پیدا ہوتا ہے اور بار بار مرتا ہے۔ کوئی بتاتا ہے کہ آدمی کی جو کچھ جزا و سزا ہے اسی دنیا کی زندگی میں ہے، وغیرہ۔

زندگی کے مسئلہ کے بارے میں اس قسم کے جتنے بھی جوابات ہیں وہ باہم ایک دوسرے سے کافی مختلف ہیں۔ مگر اس حیثیت سے سب ایک ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو ایک ایک آدمی کے لئے ذاتی طور پر کوئی سنگین مسئلہ پیدا کرتا ہو۔ یہ جوابات یا تو جو کچھ ہو رہا ہے اس کی محض توجیہات ہیں یا ہمارے لئے صرف ایک قسم کی روحانی تسکین فراہم کرنے کا ذریعہ ہیں۔ وہ اس نوعیت کی کوئی چیز نہیں ہیں جس کو کسی بڑے خطرہ کا الارم کہا جائے۔

مگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب ان تمام جوابات سے سراسر مختلف ہے۔ دوسرے جوابات میں سے کوئی جواب بھی آدمی کے لئے ذاتی سوال نہیں بنتا، وہ آدمی کے لئے کوئی نازک مسئلہ کھڑا نہیں کرتا۔ مگر پیغمبر اسلام کا جواب ایک ایک آدمی کو ایسے خطرناک کنارے پر کھڑا کر رہا ہے جس کے بعد اس کا اگلا قدم یا تو تباہی

کے خوفناک گڑھے میں پڑنے والا ہے یا کامیابی کی ابدی دنیا میں۔ اس کا تقاضا ہے کہ ہر آدمی آپ کے بارے میں انتہائی سنجیدہ ہو۔ وہ اندھیرے میں چلنے والے اس مسافر سے بھی زیادہ سنجیدہ ہو جائے جس کی ٹارچ اچانک اس کو "خبر" دے کہ اس کے سامنے عین اگلے قدم پر کالا سانپ رینگ رہا ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو پیغام دیا وہ ساری دنیا کے لئے بہت بڑی چیتاونی ہے۔ آپ نے بتایا کہ موجودہ دنیا کے بعد ایک اور وسیع تر دنیا آنے والی ہے جس کا نام آخرت ہے۔ وہاں ہر آدمی کا حساب لیا جائے گا اور ہر آدمی کو اس کے عمل کے مطابق یا تو ابدی عذاب ہوگا یا ابدی ثواب۔ موجودہ دنیا میں جو چیزیں آدمی کا سہارا بنی ہوئی ہیں ان میں سے کوئی چیز وہاں کسی کے کام نہیں آئے گی۔ وہاں نہ خرید و فروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ کسی قسم کی سفارش چلے گی (بقرہ ۲۵۴)

آپ کی یہ چیتاونی آپ کے وجود کو ہر شخص کا ذاتی سوال بنا دیتی ہے۔ اس کے مطابق ہر آدمی ایک انتہائی نازک انجام کے کنارے کھڑا ہوا ہے۔ وہ یا تو آپ کی خبر پر یقین کر کے آپ کی ہدایت کے مطابق ابدی جنت میں جانے کی تیاری کرے یا آپ کی خبر کو نظرانداز کر دے اور بے پروائی کی زندگی گزار کر ابدی جہنم کا خطرہ مول لے۔

یہاں دو چیزیں ہیں جو اس مسئلہ کو مزید سنجیدہ بنا رہی ہیں۔ آپ کے سوا دوسرے لوگ جو اس معاملہ میں کوئی بات کہہ رہے ہیں ان کا استناد حد درجہ مشتبہ ہے۔ وہ لوگ جو کمانے اور مر جانے کو سب کچھ سمجھتے ہیں ان کے پاس اپنے خیال کے لئے سرے سے کوئی دلیل نہیں۔ ان کا فکری ڈھانچہ کسی دلیل کے بغیر محض سطحی جذبات پر قائم ہے۔ فلسفیانہ انداز میں بات کرنے والے لوگوں کے پاس بھی دلیل کے نام سے صرف قیاسات ہیں۔ ان کو نہ اپنی رائے پر خود یقین حاصل ہے نہ وہ کوئی ایسی بات پیش کرتے جس کے اوپر دوسرا شخص یقین کر سکے۔

اس کے بعد وہ لوگ ہیں جو پیغمبروں اور مذہبی کتابوں کے حوالے سے بول رہے ہیں۔ یہ اصولی طور پر اپنے پیچھے ایک قابل اعتماد بنیاد رکھتے ہیں۔ مگر وہ جن کتابوں اور پیغمبروں کا حوالہ دیتے ہیں ان کا تعلق ماضی کے بہت پہلے گزرے ہوئے زمانہ سے ہے۔ ان کتابوں اور شخصیتوں کے بارے میں آج ہمارے پاس مستند معلومات موجود نہیں۔ اس لئے اصولی طور پر قابل اعتماد ذریعہ سے وابستہ ہونے کے باوجود وہ جو کچھ پیش کر رہے ہیں وہ

بجائے خود قابل اعتماد نہیں۔ ماضی کی کسی چیز کی صداقت کو جانچنے کا معیار تاریخ ہے اور ان تعلیمات کو تاریخ کی تصدیق حاصل نہیں۔

مگر پیغمبر اسلام کا معاملہ سراسر مختلف ہے۔ ایک طرف یہ کہ کسی شخص کے پیغمبر خدا ہونے کا جو بھی معیار مقرر کیا جائے، اس پر آپ کامل طور پر پورے اترتے ہیں۔ آپ کی زندگی میں وہ تمام عناصر بتمام و کمال موجود ہیں جو خدا کے ایک پیغمبر میں ہونے چاہئیں۔ آپ کی پیغمبری ایک ایسا ثابت شدہ واقعہ ہے جس سے انکار کسی حال میں ممکن نہیں۔

دوسرے یہ کہ آپ کی زندگی اور آپ کی تعلیمات اتنی صحت کے ساتھ آج بھی ہمارے پاس موجود ہیں کہ ان کی تاریخی اعتباریت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کا دیا ہوا قرآن آج بھی اسی طرح لفظ بلفظ موجود ہے جس طرح آپ نے اس کو دیا تھا۔ آپ کا قول و عمل اس طرح صحت کے ساتھ حدیث اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہے جیسے کہ آج بھی آپ ہمارے سامنے بول رہے ہوں اور چل پھر رہے ہوں۔ بغیر کسی ادنیٰ شبہ کے آدمی آج بھی یہ معلوم کر سکتا ہے کہ آپ نے کیا کہا اور کیا کیا۔

پیغمبر کی چیتاونی کے مطابق ہم ایک ایسی حقیقت سے دوچار ہیں جس کو ہم بدل نہیں سکتے۔ ہم مجبور ہیں کہ اس کا سامنا کریں۔ موت یا خودکشی سے بھی ہم معدوم نہیں ہوتے بلکہ صرف دوسری دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ کامیابی یا ناکامی کا ایک نقشہ خالق نے ابدی طور پر بنا دیا ہے۔ کسی کے لئے ممکن نہیں کہ وہ اس خدائی نقشہ کو بدل دے یا اپنے آپ کو اس سے مستثنیٰ کرلے۔ ہم کو صرف یہ اختیار ہے کہ جنت یا جہنم میں سے کسی ایک کو چن لیں۔ ہم کو یہ اختیار نہیں کہ دونوں سے الگ ہو کر اپنے لئے کسی تیسرے انجام کی تخلیق کریں۔

رصد گاہ اگر بھونچال کی خبر دے تو یہ ایک ایسے آنے والے حادثہ کی خبر ہوتی ہے جس میں فیصلہ کا اختیار تمام تر دوسرے فریق کو ہوتا ہے، دوچار ہونے والے کو اس میں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ آدمی یا تو اس سے بھاگ کر اپنے کو بچائے یا اس میں پڑ کر اپنے کو برباد کرلے۔ اسی طرح قیامت بھی ایک ایسا بھونچال ہے جس میں آدمی یا تو پیغمبر کی بتائی ہوئی تدبیر اختیار کرکے اپنے کو بچائے گا یا اس کو نظر انداز کرکے اپنے کو ابدی ہلاکت میں مبتلا کرے گا۔

پیغمبر خدا کی تعلیمات

خدا کا دین ایک دین ہے۔ تمام پیغمبروں کے ذریعہ ایک ہی دین ہمیشہ بھیجا جاتا رہا ہے۔ مگر انسان نے اپنی غفلت کی وجہ سے یا تو اس کو ضائع کر دیا یا اس کو بدل ڈالا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اسی خدائی دین کو دوبارہ زندہ کیا گیا۔ اور اس کو اس کی اصلی شکل میں پیش کر کے ہمیشہ کے لئے کتابی صورت میں محفوظ کر دیا گیا۔ اب تمام انسانوں کے لئے قیامت تک یہی مستند دین ہے۔ خدا کی قربت اور آخرت کی نجات حاصل کرنے کا اس کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں۔

آپ نے بتایا کہ خدا ایک ہے۔ اس کا کسی بھی اعتبار سے کوئی شریک نہیں۔ اسی نے تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے اور اسی کو ہر قسم کی طاقتیں حاصل ہیں۔ انسان کو چاہئے کہ صرف اسی کے آگے جھکے اور اسی کی عبادت کرے۔ اسی سے مانگے اور اسی سے امیدیں قائم کرے۔ خدا اگرچہ بظاہر دکھائی نہیں دیتا مگر وہ انسان سے اتنا قریب ہے کہ جب بھی آدمی اس کو پکارتا ہے وہ اس کی پکار کو سنتا ہے اور اس کا جواب دیتا ہے۔ خدا کے نزدیک کسی انسان کا یہ سب سے بڑا گناہ ہے کہ وہ کسی اعتبار سے کسی کو خدا کا شریک یا اس کے برابر ٹھہرائے۔

کوئی انسان یا غیر انسان ایسا نہیں جس کو خدا اور بندوں کے درمیان وسیلہ یا واسطہ کا مقام حاصل ہو۔ انسان جب بھی خدا کو یاد کرتا ہے، وہ براہ راست خدا سے مربوط ہو جاتا ہے۔ انسان کو اپنے خالق و مالک سے جڑنے کے لئے کسی درمیانی وسیلہ کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح آخرت میں بھی کوئی خدا کی عدالت میں کسی کا سفارشی نہیں بن سکتا۔ خدا اپنے ہر بندے کا فیصلہ خود اپنے علم کے مطابق کرے گا۔ کوئی نہیں جو اس کے فیصلہ پر اثر انداز ہو سکے۔ خدا اپنا فیصلہ کرنے میں کسی کا پابند نہیں۔ خدا کے تمام فیصلے حکمت اور انصاف کی بنیاد پر ہوتے ہیں نہ کہ سفارش یا تقرب کی بنیاد پر۔

خدا کی عبادت کوئی عملیاتی ضمیمہ نہیں ہے۔ یہ پوری زندگی کے ساتھ خدا کے آگے جھک جانا ہے۔ خدا کی عبادت کرنے والا وہی ہے جو خدا کا عابد اس طرح بنے کہ خدا ہی اس کا سب کچھ ہو جائے۔ وہ اسی کی پرستش کرے، اسی سے ڈرے، اسی کو چاہے، اسی سے امید باندھے، وہ اس کو اپنی تمام توجہات اور سرگرمیوں کا مرکز بنائے۔ خدا کی عبادت خدا کے سامنے کامل حوالگی کا نام ہے نہ کہ محض کسی رسم کی وقتی بجا آوری کا۔

بندوں کے درمیان رہتے ہوئے آدمی کو ہر وقت یہ یاد رکھنا چاہئے کہ خدا اس کو دیکھ رہا ہے اور اپنے علم کے مطابق اس سے اس کی کارگزاری کا حساب لے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ آدمی ظلم، جھوٹ، بغض، گھمنڈ حسد، خود غرضی، بدمعاملگی، لوٹ کھسوٹ، دھاندلی، اور اس قسم کی دوسری اخلاقی برائیوں سے اپنے کو بچائے تاکہ خدا کی میزان میں وہ مجرم نہ ٹھہرے۔ اللہ سے ڈرنے والا بندوں کے معاملہ میں نڈر ہو کر نہیں رہ سکتا۔ جو لوگ بندوں کے ساتھ برا سلوک کریں گے ان کو خدا سے اپنے لئے اچھے سلوک کی امید نہ رکھنی چاہئے۔ خدا کے اچھے سلوک کا مستحق صرف وہ ہے جو خدا کے یہاں اس طرح پہنچے کہ اس نے خدا کے بندوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا ہو۔

آپ نے بتایا کہ خدا کی زمین پر خدا کے بندوں کے لئے زندگی گزارنے کا صرف ایک ہی جائز طریقہ ہے۔ یہ کہ آدمی پوری زندگی اور تمام معاملات میں خدا کا فرماں بردار بن کر رہے۔ اس فرماں برداری کے آداب اور اصول قرآن میں لکھے ہوئے ہیں۔ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس کا عملی نمونہ موجود ہے۔ اب تمام انسانوں کے لئے خدا کی پسندیدہ زندگی صرف یہ ہے کہ وہ قرآن سے اپنے لئے ہدایت حاصل کرے اور پیغمبر کے نمونہ کو دیکھتے ہوئے اس کے مطابق زندگی گزارے

آپ نے جو دین پیش کیا ہے وہ آدمی کی پوری زندگی کے لئے ایک واضح نقشہ دیتا ہے اور ہر آدمی کو اسی نقشہ پر چلنا ہے۔ اس نقشہ کا ایک مختصر علامتی نظام پانچ خاص ارکان کی صورت میں مقرر کیا گیا ہے۔ یہ پانچ ارکان پوری اسلامی زندگی کے لئے بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں۔

اول کلمۂ شہادت (لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ) کا اقرار ہے۔ یہ کلمہ گویا وہ اعلان ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ آدمی ایک دائرہ سے نکل کر دوسرے دائرہ میں داخل ہو گیا۔ وہ غیر اسلام کو چھوڑ کر اسلام کی صف میں آگیا۔ دوسری چیز نماز ہے۔ یعنی پیغمبر کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق روزانہ پانچ وقت خدا کی عبادت کرنا۔ تیسری چیز روزہ ہے۔ یعنی ہر سال رمضان میں پورے ایک مہینہ تک صبر و برداشت کا وہ عمل کرنا جس کو روزہ کہا جاتا ہے۔ چوتھی چیز زکوٰۃ ہے۔ یعنی آدمی اپنے مال میں سے مقرر طریقہ کے مطابق ہر سال خدا کا حق نکالے اور اس کو خدا کی مقرر کی ہوئی مدوں میں خرچ کرے۔ پانچویں چیز حج ہے۔ یعنی استطاعت کی صورت میں عمر میں کم از کم ایک بار بیت اللہ کا حج کرنا۔ آدمی جب یہ پانچ شرطیں پوری کرتا ہے تو وہ پیغمبر کی قائم کی ہوئی اسلامی برادری میں شامل ہو جاتا ہے۔

زندگی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک زندگی وہ ہے جو آخرت کی بنیاد پر بنتی ہے۔ دوسری زندگی وہ ہے جو دنیا کی بنیاد پر بنتی ہے۔ آخرت کی بنیاد پر بننے والی زندگی میں رہنمائی کا مقام پیغمبر کو حاصل رہتا ہے۔ آدمی پیغمبر کے بتانے کے مطابق اپنا عقیدہ بناتا ہے اور اسی کے بتانے کے مطابق اپنی زندگی کو چلاتا ہے۔ اس کے برعکس جو زندگی دنیا کی بنیاد پر بنتی ہے اس میں آدمی اپنا رہنما آپ ہوتا ہے اور اپنی عقل یا نفس کے مطابق اپنے فکر و عمل کا ڈھانچہ بناتا ہے۔ پہلا اگر خدا کا پرستار ہوتا ہے تو دوسرا خود اپنا۔

پیغمبر کی رہنمائی میں جو زندگی بنتی ہے اس کے اجزاء ہوتے ہیں —— خدا پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، خدا کی کتابوں پر ایمان، خدا کے رسولوں پر ایمان، قیامت اور زندگی بعد موت پر ایمان، جنت دوزخ پر ایمان، اللہ کے مالک اور حاکم ہونے پر ایمان۔ اس ایمانیات کے تحت جو انسان بنتا ہے وہ ایسا انسان ہوتا ہے جو اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کئے ہوئے ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کی تمام سرگرمیاں آخرت رخی بن جاتی ہیں۔ اس کی عبادت، اس کی قربانیاں، اس کا جینا اور اس کا مرنا سب اللہ اور رسول کے لئے ہو جاتا ہے۔

جو زندگی خود اپنی رہنمائی میں بنے وہ ایک آزاد اور بے قید زندگی ہوتی ہے، اس میں آدمی کو اس سے بحث نہیں ہوتی کہ حقیقت کیا ہے۔ وہ اپنے خیالات کے مطابق اپنی پسند کا عقیدہ بنا لیتا ہے۔ اس کے صبح و شام خود اپنی عقل یا نفس کی رہنمائی میں بسر ہوتے ہیں۔ اس کی سرگرمیاں تمام تر دنیا کے فائدوں کے گرد گھومتی ہیں۔ وہ ویسا بنتا ہے جیسا وہ خود بننا چاہتا ہے نہ کہ ویسا جو خدا اور رسول چاہتے ہیں کہ وہ بنے۔

جو لوگ کسی پچھلے پیغمبر کے نام پر کسی دین کو پکڑے ہوئے ہیں، ان کی مذہبیت یا خدا پرستی اس وقت تک معتبر نہیں جب تک وہ پیغمبر اسلام پر ایمان نہ لائیں۔ پیغمبر اسلام پر ایمان لانا گویا خود اپنے دین ہی کو زیادہ صحیح اور کامل صورت میں اختیار کرنا ہے۔ جو لوگ آپ کے اوپر ایمان نہ لائیں وہ اپنے اس عمل سے اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ وہ پیغمبر کے نام پر اپنی قومی روایات اور گروہی تعصبات کو اپنا دین بنائے ہوئے ہیں۔ جو لوگ قومی مذہب کے پرستار ہوں وہ آپ کے لائے ہوئے خدائی مذہب کو نہ پائیں گے۔ وہ اپنے تعصباتی پردہ کی وجہ سے اس سچائی کو نہ دیکھ سکیں گے جو خدا نے اپنے آخری پیغمبر کے ذریعہ ان کے لئے کھولی ہے۔ البتہ جو لوگ فی الواقع خدا اور پیغمبر کے ماننے والے ہوں ان کو پیغمبر اسلام کا دین خود اپنی ہی چیز معلوم ہوگا۔ وہ اس کو اس طرح لیں گے جس طرح کوئی اپنی کھوئی چیز کو دوڑ کر لے لیتا ہے۔

موت کی طرف

موت ہر ایک پر آتی ہے۔ کوئی اس سے بچ نہیں سکتا۔ تاہم موتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جب کہ آدمی اللہ کو اپنا مقصود بنائے ہوئے ہو۔ وہ اللہ کے لئے بولتا ہو اور اللہ کے لئے چپ ہوتا ہو۔ اس کی توجہ تمام تر آخرت کی طرف لگی ہوئی ہو۔ ایسے آدمی کے لئے موت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی طرف سفر کر رہا تھا اور موت کے فرشتہ نے اس کے سفر کو مختصر کر کے اس کو اس کی منزل تک پہنچا دیا۔

دوسرا آدمی وہ ہے جس نے اپنے مالک کو بھلا رکھا ہے۔ اس کا رکنا اور اس کا چلنا اللہ کے لئے نہیں ہوتا۔ وہ اپنے رب کو چھوڑ کر کسی اور طرف بھاگ رہا ہے۔ ایسے شخص کے لئے موت کا دن اس کی گرفتاری کا دن ہے۔ اس کی مثال اس باغی کی سی ہے جو چند دن سرکشی دکھائے اور اس کے بعد اس کو پکڑ کر عدالت میں حاضر کر دیا جائے

بظاہر ایک ہی موت ہے جو دونوں آدمیوں پر آتی ہے۔ مگر دونوں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا پھول اور آگ میں۔ ایک کے لئے موت رب العالمین کا مہمان بننا ہے اور دوسرے کے لئے موت رب العالمین کے قید خانہ میں ڈالا جانا۔ ایک کے لئے موت جنت کے باغوں میں داخلہ کا دروازہ ہے اور دوسرے کے لئے موت وہ دن ہے جب کہ اس کو جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں پھینک دیا جاتا ہے تاکہ اپنی سرکشی کے جرم میں وہاں وہ ابدی طور پر جلتا رہے۔

مومن اور غیر مومن کی تعریف یہ ہے کہ مومن وہ ہے جس کی نگاہیں موت کے مسائل کی طرف لگی ہوئی ہوں، جو موت کے بعد آنے والی دنیا میں عزت حاصل کرنے کو اپنی تمام توجہات کا مرکز بنائے ہوئے ہو۔ اس کے برعکس غیر مومن وہ ہے جو زندگی کے مسائل میں الجھا ہوا ہو، جو موجودہ دنیا میں عزت اور کامیابی حاصل کرنے کو سب سے بڑی چیز سمجھتا ہو۔ آج کے حالات میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کامیاب وہی ہے جو موجودہ دنیا میں اپنی جڑیں مضبوط کئے ہوئے ہو۔ مگر موت اس فریب کو مکمل طور پر ڈھا دے گی۔ اس کے بعد اچانک یہ معلوم ہوگا کہ وہی شخص مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہوا تھا جس کو دنیا والوں نے بے بنیاد سمجھ لیا تھا اور وہ تمام لوگ بالکل بے حقیقت تھے جو موت سے پہلے کے حالات میں بظاہر عزت اور ترقی کی بلندیوں پر بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ موت ہر چیز کو باطل کر دے گی اور اس کے بعد وہی چیز بچے گی جس کی عالم آخرت میں کوئی قیمت ہو —— سچائی کی پکار پر دھیان نہ دینا ہمیشہ اس لئے ہوتا ہے کہ آدمی کے سامنے صرف موت، سے پہلے کی دنیا ہوتی ہے۔ آدمی اگر موت کے بعد کی دنیا کو دیکھ لے تو آج ہی وہ اس خدا کے آگے جھک جائے جس کے آگے اسے کل جھکنا ہے، اگرچہ کل کا جھکنا کسی کے کچھ کام نہ آئے گا۔

آخری بات

ایک گھنٹہ گھر کسی چوراہہ پر تعمیر کر دیا جائے تو ہر شخص اس میں وقت دیکھتا ہے اور اپنی گھڑیاں اس سے ملا لیتا ہے۔ کسی کو یہ سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ جن کاریگروں اور انجینیروں نے اس کو نصب کیا ہے وہ مسلمان تھے یا غیر مسلمان۔ اپنی قوم کے تھے یا دوسری قوم کے۔ یا یہ کہ جو گھڑی اس میں لگائی گئی ہے وہ کہاں کی بنی ہوئی ہے۔ اپنے ملک کی یا دوسرے کسی ملک کی۔ صرف اس بات کا یقین کہ اس سے صحیح وقت معلوم کیا جا سکتا ہے، ہر شخص کو اس کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ خدا کا دین بھی تمام انسانوں کی رہنمائی کے لئے اسی قسم کا ایک "گھنٹہ گھر" ہے۔ مگر یہاں ایسا نہیں ہوتا کہ لوگ اس کو دیکھیں اور اس سے اپنے لئے رہنمائی حاصل کریں۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ لوگ وقت جاننے کے بارے میں سنجیدہ ہیں۔ مگر خدا کی بات جاننے کے بارے میں سنجیدہ نہیں۔ خدا کے دین کا تعلق اگلی زندگی کے معاملہ سے ہے اور گھڑی کا تعلق آج کی زندگی کے معاملہ سے ہے۔ لوگوں نے جس چیز کو اپنا مقصد بنا رکھا ہے اس کے بارے میں گھڑی کی اہمیت انھیں معلوم ہے۔ مگر اگلی زندگی میں کامیابی کو انھوں نے اپنا مقصد ہی نہیں بنایا۔ پھر اس میں رہنمائی دینے والی چیز کی اہمیت کا احساس انھیں کیوں کر ہو۔

پھر خدا پرستی کا تقاضا صرف یہ نہیں ہے کہ اس کو مان لیا جائے۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے ساتھ اپنے کو شامل کیا جائے۔ خدا پرستی اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ایک اندرونی حالت کا نام ہے مگر اسی کے ساتھ اس کی ایک ظاہری صورت بھی ہے۔ خدا کو پانا کسی آدمی کے لئے سخت تاثر کا سب سے بڑا واقعہ ہے اور شدت تاثر کبھی چھپا ہوا نہیں رہ سکتا۔ ایک شخص پر خدا کی سچائی منکشف ہو تو وہ ضرور ظاہر ہو کر رہے گی۔ ایسا آدمی بے اختیار چاہے گا کہ اس کا پورا ماحول اس بات کا گواہ بن جائے کہ اس نے خدا کی پکار پر لبیک کہا اور مفاد اور مصلحت کے بتوں کو توڑ کر اس کا ساتھ دیا۔ اگر کوئی شخص قلبی ایمان کا مدعی ہو مگر وہ اعلان و اظہار سے گریز کرتا ہو تو یہ یقینی طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ مصلحتوں کا شکار ہے۔ اور جو لوگ خدا کے مقابلہ میں مصلحت کو ترجیح دیں وہ کبھی خدا کو نہیں پاتے۔ مصلحت اور تعصب خدا پرستی کی ضد ہیں۔ مصلحت اور تعصب کے ساتھ خدا پرستی کا ایک روح میں جمع ہونا ممکن نہیں۔

تعارفِ اسلام

فہرست مضامین

حصہ	عنوان	صفحہ
	آغاز کلام	۳
پہلا حصہ :	عقیدۂ خدا	۴
	رسالت	۸
	آخرت	۱۵
دوسرا حصہ :	نماز	۱۹
	روزہ	۲۱
	انفاق	۲۳
	حج	۲۶
تیسرا حصہ :	اسلامی معاشرہ	۲۸
	تنظیم	۳۴
	دعوت	۳۷

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہر آدمی کی ایک سوچ ہوتی ہے جس کے تحت وہ زندگی اور کائنات کے بارے میں رائے قائم کرتا ہے۔ پھر اسی سوچ کے مطابق وہ کسی چیز کو سب سے اونچی جگہ دیتا ہے اور اس کو اپنی عقیدتوں اور توجہات کا مرکز بناتا ہے۔ پھر اسی کے مطابق وہ ماحول کے اندر اپنا عمل کرتا ہے۔ ان تینوں چیزوں کو عقیدہ، عبادت اور کردار کہہ سکتے ہیں۔ انھیں تینوں چیزوں کے مجموعہ کا نام دین ہے اور اس اعتبار سے ہر آدمی کا کوئی نہ کوئی دین ہوتا ہے، خواہ وہ خدا پرست ہو یا غیر خدا پرست۔

اسلام یہ ہے کہ آدمی اس حقیقت واقعہ کو پالے کہ اس دنیا کے پیچھے ایک قادر مطلق کا ارادہ کام کر رہا ہے۔ وہی اس کا خالق و مالک ہے۔ اسی کے یہاں ہر ایک کا حساب کتاب ہونے والا ہے۔ صحیح وہ ہے جو اس کے نزدیک صحیح ٹھہرے اور غلط وہ ہے جو اس کے یہاں غلط قرار پائے۔

اس حقیقت کا پانا کسی ریاضیاتی فارمولے کا پانا نہیں ہے۔ وہ بندے کا اپنے خدا کو پانا ہے، یہ "بے کچھ" کا "سب کچھ" کو پالینا ہے۔ اس لئے جو آدمی اس حقیقت کو پالے وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ ایک اور ہی انسان بن جاتا ہے۔ اس کی زندگی ایک ربانی سمندر میں نہا اٹھتی ہے۔ یہ ایک ایسی دریافت ہوتی ہے جو اس کے دل و دماغ کو پوری طرح اپنی پکڑ میں لے لیتی ہے۔ اس کا دیکھنا اور سننا خدا کی نظر سے دیکھنا اور سننا بن جاتا ہے۔ اس کے فکر و خیال کی دنیا اگر اب تک تاریک تھی تو اب اس کے اندر ایک نیا آفتاب جل اٹھتا ہے جو اس کی پوری ہستی کو روشن کر دیتا ہے۔

اس نفسیاتی یافت کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہمہ تن خدا کا ہو جاتا ہے۔ وہ اس کی یاد میں جینے لگتا ہے۔ وہ اپنی ہستی کو اس کے مقابلہ میں کھو دیتا ہے۔ وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ اس کے آگے جھک جاتا ہے۔

پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کے درمیان اس کا سلوک ایک بندۂ خدا کا سلوک بن جاتا ہے۔ جہاں لوگ انانیت دکھاتے ہیں وہاں وہ متواضع بن جاتا ہے۔ جہاں لوگ انتقامی کارروائی کرتے ہیں وہاں وہ معاف کر دیتا ہے۔ جہاں لوگ ظلم پر اتر آتے ہیں وہاں وہ انصاف پر قائم رہتا ہے۔ جہاں لوگ اپنی ذات کے لئے کٹ جاتے ہیں وہاں وہ حق کی خاطر جڑ جاتا ہے۔ جہاں لوگ خود پاکر مطمئن ہو جاتے ہیں وہاں وہ دوسروں کو دینے کی فکر کرتا ہے۔ جہاں لوگ دنیا کی رونقوں کی طرف دوڑتے ہیں وہاں وہ آخرت کی چھپی ہوئی دنیا میں اپنے گم کر دیتا ہے —— یہی وہ پچی زندگی ہے جو پیغمبر کے ذریعہ انسان کو بتائی گئی ہے۔

جو لوگ اس طرح ایک خدا کو اپنا لیں وہ فطری طور پر باہم جڑ کر ایک ہو جاتے ہیں۔ وہ اس بھلائی کو دوسروں تک بھی پہنچانے لگتے ہیں جس کو انھوں نے اپنے لئے اختیار کیا ہے۔ ان کی باہری زندگی ان کی اندرونی زندگی کا عکس بن جاتی ہے۔

وحید الدین ۲۹ دسمبر ۱۹۸۰

عقیدۂ خدا

کائنات کا ایک خدا ہے جو اس کا خالق اور مالک ہے۔ اس خدا کے وجود کی سب سے بڑی دلیل خود وہ کائنات ہے جو ہمارے سامنے پھیلی ہوئی ہے۔ کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ پکار رہی ہے کہ ایک عظیم خدا ہے جس نے اس کو بنایا اور جو اس کو اپنی بے پناہ طاقت سے چلا رہا ہے۔ ہم مجبور ہیں کہ ہم کائنات کو مانیں اور اسی لئے ہم مجبور ہیں کہ ہم خدا کو مانیں۔ کیونکہ کائنات کو ماننا اس وقت تک بے معنی ہے جب تک اس کے خالق و مالک کو نہ مانا جائے۔ کائنات اتنی حیرت انگیز ہے کہ وہ کسی بنانے والے کے بغیر بن نہیں سکتی اور اس کا نظام اتنا عجیب ہے کہ وہ کسی چلانے والے کے بغیر چل نہیں سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کو ماننے پر آدمی اسی طرح مجبور ہے جس طرح اپنے آپ کو یا کائنات کو ماننے پر۔

آپ سائیکل کے پہیہ پر ایک کنکری رکھیں اور اس کے بعد پیڈل چلا کر پہیہ کو تیزی سے گھمائیں تو کنکری دور جا کر گرے گی۔ حالاں کہ سائیکل کے پہیہ کی رفتار مشکل سے ۲۵ میل فی گھنٹہ ہے۔ ہماری یہ زمین جس پر ہم رہتے ہیں وہ بھی ایک بہت بڑے پہیہ کی مانند ہے۔ زمین اپنے محور پر مسلسل ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ رہی ہے۔ یہ رفتار سواری کے عام ہوائی جہازوں سے زیادہ ہے۔ ہم اس تیز رفتار زمین پر چلتے پھرتے ہیں۔ گھر اور شہر بناتے ہیں۔ مگر ہمارا وہ حال نہیں ہوتا جو گھومتے ہوئے پہیہ پر رکھی ہوئی کنکری کا ہوتا ہے۔ کیسا عجیب ہے یہ معجزہ۔ کہا جاتا ہے کہ زمین پر ہمارے قائم رہنے کی وجہ یہ ہے کہ نیچے سے زمین بہت بڑی طاقت کے ساتھ کھینچ رہی ہے اور اوپر سے ہوا کا بھاری دباؤ ہم کو زمین کی سطح پر روکے رہتا ہے۔ یہ دو طرفہ عمل ہم کو زمین پر تھامے ہوئے ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم پہیہ کی کنکری کی طرح فضا میں اڑ نہیں جاتے۔ مگر یہ جواب صرف یہ بتاتا ہے کہ ہمارے آس پاس ایک اور اس سے بھی زیادہ بڑا معجزہ موجود ہے۔ زمین میں اتنے بڑے پیمانہ پر کھینچنے کی قوت ہونا اور اس کے چاروں طرف ہوا کا پانچ سو میل موٹا غلاف مسلسل لپٹا رہنا صرف معاملہ کی حیرت ناکی کو بڑھاتا ہے، وہ کسی بھی درجہ میں اس کو کم نہیں کرتا۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا کی ہر چیز معجزہ ہے۔ آدمی مٹی کے اندر ایک چھوٹا سا دانہ ڈالتا ہے۔ اس کے بعد حیرت انگیز طور پر وہ دیکھتا ہے کہ مٹی کے اندر سے ایک ہری اور سفید مولی نکلی چلی آ رہی ہے۔ وہ دوسرا دانہ ڈالتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ اس کے اندر سے میٹھا گاجر نکلا چلا آ رہا ہے۔ اسی طرح بے شمار دوسری چیزیں۔ کسی دانہ کو مٹی میں ڈالنے سے امرود نکل رہا ہے۔ کسی دانہ کو ڈالنے سے آم۔ کسی دانہ سے شیشم کا درخت نکلا چلا آ رہا ہے اور کسی دانہ سے چنار کا۔ پھر ان میں سے ہر ایک کی صورت الگ، ہر ایک کا مزہ الگ، ہر ایک کے فائدے الگ، ہر ایک کی خاصیتیں الگ۔ ایک ہی مٹی ہے اور ناقابل لحاظ چھوٹے چھوٹے بیج ہیں اور ان سے اتنی مختلف چیزیں اتنی مختلف صفتوں کو لئے ہوئے نکل رہی ہے جن کی گنتی نہیں کی جا سکتی۔ حیرت ناک معجزوں کی ایک پوری کائنات ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں سارے انسان مل کر ایک ذرہ کی بھی تخلیق نہیں کر سکتے وہاں ہر لمحہ بے شمار طرح طرح کی چیزیں پیدا ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب اتنے بڑے معجزے ہیں کہ ان کے کمالات کو انسانی زبان میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ان کو بتانے کے لئے ہماری لغت کے تمام الفاظ بھی،

ناکافی ہیں۔ ہمارے الفاظ ان معجزوں کے اتھاہ کمالات کو صرف محدود کرتے ہیں۔ وہ کچھ بھی ان کا اظہار نہیں کرتے۔ کیا یہ معجزہ ایک خدا کے بغیر خود بخود وجود میں آسکتا ہے۔

دنیا کی ہر چیز ایٹم سے بنی ہے۔ ہر چیز اپنا آخری تجزیہ میں ایٹموں کا مجموعہ ہے۔ مگر کیسا عجیب معجزہ ہے کہ کہیں ایٹموں کی ایک مقدار جمع ہوتی ہے تو سورج جیسا روشن کرہ بن جاتا ہے۔ دوسری جگہ یہی ایٹم جمع ہوتے ہیں تو وہ بہتے ہوئے پانی کی صورت میں رواں ہو جاتے ہیں۔ تیسری جگہ ایٹموں کا یہی مجموعہ لطیف ہواؤں کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کسی اور جگہ یہی ایٹم زرخیز زمین کی صورت میں ڈھل جاتے ہیں۔ اسی طرح دنیا میں ان گنت چیزیں ہیں۔ سب کی ترکیب ایٹم سے ہوئی ہے۔ مگر سب کی نوعیت اور خاصیت جدا جدا ہے۔ اس قسم کی ایک معجزاتی کائنات اپنی بے شمار سرگرمیوں کے ساتھ انسان کی خدمت میں لگی ہوئی ہے۔ انسان کو اپنی زندگی کے لئے جو کچھ درکار ہے وہ بہت بڑے پیمانہ پر دنیا میں جمع کر دیا گیا ہے اور ہر روز جمع کیا جا رہا ہے۔ دنیا کو اپنے لئے قابل استعمال بنانے کی خاطر انسان کو خود جو کچھ کرنا ہے وہ بہت تھوڑا ہے۔ کائناتی انتظام کے تحت بے حساب مقدار میں قیمتی رزق پیدا کیا جاتا ہے۔ ہم اس میں صرف اتنا کرتے ہیں کہ اپنا ہاتھ اور منہ چلا کر اس کو اپنے پیٹ میں ڈال لیتے ہیں۔ اس کے بعد ہمارے ارادہ کے بغیر خود کار فطری نظام کے تحت غذا ہمارے اندر تحلیل ہوتی ہے اور گوشت اور خون اور ہڈی اور ناخن اور بال اور دوسری بہت سی چیزوں کی صورت اختیار کر کے ہمارے جسم کا جزء بن جاتی ہے۔ زمین اور آسمان کی بے شمار گردشوں کے بعد وہ حیرت انگیز چیز پیدا ہوتی ہے جس کو تیل کہتے ہیں۔ انسان صرف یہ کرتا ہے کہ اس کو ٹنکیوں میں اپنی مشینوں میں بھر لیتا ہے اور پھر یہ سیال ایندھن انسانی تہذیب کے پورے نظام کو حیرت انگیز طور پر رواں دواں کر دیتا ہے۔ اسی طرح کائنات کے نظام کے تحت وہ ساری چیزیں بے شمار تعداد اور مقدار میں پیدا کی گئی ہیں جن پر انسان صرف معمولی عمل کرتا ہے اور اس کے بعد وہ کپڑا، مکان، فرنیچر، آلات، مشینوں، سواریوں اور بے شمار تمدنی ساز و سامان کی صورت میں ڈھل جاتی ہیں۔ کیا یہ واقعات اس بات کے ثبوت کے لئے کافی نہیں کہ اس کا ایک بنانے والا اور چلانے والا ہے۔

اب ایک اور پہلو سے دیکھئے۔ قدرت اپنے طویل اور ناقابل بیان عمل کے ذریعہ ہر قسم کی چیزیں تیار کر کے ہم کو دے رہی ہے۔ انسان ان کو اپنے حق میں کارآمد بنانے کے لئے بے حد تھوڑا حصہ ادا کرتا ہے۔ وہ لوہے کو مشین کی صورت میں ڈھالتا ہے اور تیل کو صاف کر کے اس کو اپنی گاڑی کی ٹنکی میں بھرتا ہے۔ مگر اس قسم کے معمولی عمل کا یہ نتیجہ ہے کہ خشکی اور تری فساد سے بھر گئے ہیں۔ قدرت نے ہم کو ایک انتہائی حسین اور خالص دنیا دی تھی مگر ہمارے عمل نے ہم کو دھواں، شور، غلاظت، توڑ پھوڑ، لڑائی جھگڑا اور طرح طرح کے ناقابل حل مسائل سے گھیر لیا ہے۔ ہم اپنے کارخانوں یا تمدنی سرگرمیوں کی صورت میں جو تھوڑا سا عمل کرتے ہیں وہی عمل کائنات میں بے حساب گنا زیادہ بڑے پیمانہ پر رات دن ہو رہا ہے مگر یہاں کسی قسم کا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ زمین مسلسل دو قسم کی دوڑ میں لگی ہوئی ہے ایک اپنے محور پر اور دوسری سورج کے گرد اپنے مدار پر، مگر وہ کوئی شور برپا نہیں کرتی۔ درخت ایک عظیم الشان کارخانہ کی صورت میں کام کرتے ہیں مگر وہ دھواں نہیں بکھیرتے۔ سمندروں میں بے شمار جانور ہر روز مرتے ہیں مگر وہ پانی کو خراب نہیں کرتے۔ کائنات کا نظام کھرب ہا کھرب سال سے چل رہا ہے مگر اس کا منصوبہ اتنا کامل ہے کہ اس کو کبھی اپنے منصوبہ پر نظر ثانی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ بے شمار ستارے اور سیارے خلا میں ہر وقت دوڑ رہے ہیں۔ مگر ان کی رفتار میں

کبھی فرق نہیں آتا، وہ کبھی آگے پیچھے نہیں ہوتے۔ یہ تمام معجزوں سے بڑا معجزہ اور تمام کرشموں سے بڑا کرشمہ ہے جو ہر لمحہ ہماری دنیا میں پیش کیا جا رہا ہے۔ کیا اس کے بعد کوئی اور ثبوت چاہیے کہ آدمی اس کائنات کے پیچھے ایک عظیم خدائی طاقت کو تسلیم کرے۔

پھر زندگی کو دیکھئے۔ فطرت کا کیسا انوکھا واقعہ ہے کہ چند مادی چیزیں خود بخود ایک جسم میں یک جا ہوتی ہیں اور پھر ایک ایسی شخصیت وجود میں آجاتی ہے جو مچھلی بن کر پانی میں تیرتی ہے، جو چڑیا بن کر ہوا میں اڑتی ہے۔ طرح طرح کے جانوروں کی صورت میں زمین پر چلتی پھرتی ہے، انھیں میں وہ جاندار بھی ہے جس کو انسان کہا جاتا ہے، پراسرار اسباب کے تحت ایک موزوں جسم بنتا ہے اور اس کے اندر ہڈیاں ایک انتہائی بامعنی ڈھانچہ کی صورت اختیار کر لیتی ہیں، پھر اس کے اوپر گوشت چڑھایا جاتا ہے۔ اس کے اوپر کھال کی تہیں اڑھائی جاتی ہیں، بال اور ناخن پیدا کئے جاتے ہیں۔ پھر سارے جسم میں خون کی نہریں جاری کی جاتی ہیں۔ اس طرح ایک خودکار عمل کے ذریعہ ایک عجیب و غریب انسان بنتا ہے، جو چلتا ہے، جو پکڑتا ہے، جو دیکھتا ہے، جو سنتا ہے، جو سونگھتا ہے۔ جو چکھتا ہے، جو سوچتا ہے، جو یاد رکھتا ہے، جو معلومات جمع کر کے ان کو مرتب کرتا ہے، جو لکھتا اور بولتا ہے۔ مردہ مادہ سے اس قسم کے ایک حیرت ناک وجود کا بن جانا ایک ایسا انوکھا واقعہ ہے کہ معجزہ کا لفظ بھی اس کے اعجاز کو بتانے کے لئے کافی نہیں۔ اگر کوئی شخص کہے کہ میں نے مٹی کو بولتے ہوئے سنا اور پتھر کو چلتے ہوئے دیکھا تو لوگ حیران ہو کر اس کی تفصیل دریافت کریں گے۔ مگر یہ انسان جو چلتا پھرتا ہے جو بولتا اور دیکھتا ہے آخر مٹی پھر ہی تو ہے۔ اس کے اجزاء وہی ہیں جو مٹی اور پتھر میں ہوتے ہیں۔ مٹی اور پتھر کے بولنے اور دیکھنے کی خبر کو ہم جس طرح عجیب سمجھیں گے اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ تعجب ہم کو اس مخلوق پر ہونا چاہئے جس کو انسان کہا جاتا ہے۔ بے جان مادہ میں اس قسم کی زندگی اور شعور پیدا ہو جانا کیا اس بات کا ثبوت نہیں کہ یہاں ایک برتر ہستی ہے جس نے اپنی خصوصی قدرت سے یہ عجیب و غریب معجزہ رونما کیا ہے۔

انسان اگر اپنے اوپر غور کرے تو بآسانی وہ خدا کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی صورت میں ایک "میں" زمین پر موجود ہے۔ اس کی اپنی ایک مستقل ہستی ہے۔ وہ دوسری چیزوں سے الگ اپنا ایک وجود رکھتا ہے۔ یہ "میں" بلا اشتباہ یقین رکھتا ہے کہ وہ ہے۔ وہ سوچتا ہے اور رائے قائم کرتا ہے۔ وہ ارادہ کرتا ہے اور اس کو بالفعل نافذ کرتا ہے۔ وہ اپنے فیصلہ کے تحت کبھی ایک رویہ اور کبھی دوسرا رویہ اختیار کرتا ہے۔ یہی شخصیت اور قوت جس کا ایک آدمی اپنی "میں" کی سطح پر ہر وقت تجربہ کر رہا ہے یہی "میں" اگر خدا کی صورت میں زیادہ بڑے پیمانہ پر موجود ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کو ماننا ایسا ہی ہے جیسے اپنے آپ کو ماننا۔ اسی لئے قرآن میں کہا گیا ہے کہ آدمی اپنے واسطے آپ دلیل ہے چاہے وہ کتنی ہی معذرت کرے (قیامہ)

لوگ خدا اور خدا کے پیغام پر یقین کرنے کے لئے معجزاتی دلیل مانگتے ہیں۔ آخر لوگوں کو اس کے سوا اور کون سا معجزہ درکار ہے جو ناقابل قیاس حد تک بڑے پیمانہ پر ساری کائنات میں جاری ہے۔ اگر اتنا بڑا معجزہ آدمی کو جھکانے کے لئے کافی نہ ہو تو دوسرا کوئی معجزہ دیکھ کر وہ کیسے ماننے کے لئے تیار ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کو ماننے اور اس کے آگے اپنے آپ کو ڈالنے کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ ہر وقت ہر آدمی کے سامنے موجود ہے۔ اس کے باوجود آدمی اگر خدا کو اور اس کے جلال و کمال کو نہ مانے تو یہ اس کا اپنا قصور ہے نہ کہ کائنات کا۔

جو شخص خدا کو پالے اس نے سب کچھ پالیا۔ خدا کو پانے کے بعد کوئی چیز پانے کے لئے باقی نہیں رہتی۔ اس لئے جب کوئی شخص خدا کو پاتا ہے تو اس کی ساری توجہ خدا کی طرف لگ جاتی ہے۔ اس کے لئے خدا ایسا اتھاہ خزانہ بن جاتا ہے جہاں وہ سب کچھ موجود ہو جو آدمی کو اپنی دنیا و آخرت کے لئے درکار ہے۔

ایک شخص "سیب" کھائے۔ مگر سیب کے کھانے سے اس کو نہ کوئی مزہ ملے اور نہ وہ اس کے جسم میں داخل ہو کر اس کو طاقت دے تو کہا جائے گا کہ اس نے سیب نہیں کھایا، اس نے سیب کی شکل کی کوئی چیز چبالی ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ خدا کا بھی ہے۔ خدا کو پانا وہی پانا ہے جو آدمی کے لئے مزہ بن جائے۔ جب "خدا" کو پا کر بھی آدمی مزہ سے خالی رہے تو کہنا چاہئے کہ اس نے خدا کو نہیں پایا۔ اس نے کوئی اور چیز پائی ہے اور غلطی سے اس کو خدا سمجھ رہا ہے۔ وہ مٹی کا سیب چبا رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں حقیقی سیب کھا رہا ہوں۔

دنیا اپنی ابتدائی شکل میں صرف ایک قسم کا مادہ ہے۔ ساری دنیا ایٹموں کا مجموعہ ہے۔ بالفاظ دیگر ساری دنیا بے روح مادہ ہے۔ اس بے روح مادہ کو خدا بے شمار صورتوں میں جلوہ گر کر رہا ہے۔ اس بے روح مادہ سے خدا کہیں روشنی پیدا کر رہا ہے اور کہیں حرارت۔ کہیں وہ اس بے روح مادہ کو ہریالی میں تبدیل کر رہا ہے اور کہیں پانی کی روانی میں۔ کہیں وہ اس بے روح مادہ کو رنگ کی صورت میں ظاہر کر رہا ہے اور کہیں مزہ اور خوش بو کی صورت میں۔ کہیں اس بے روح مادہ سے حرکت کے کرشمے ظاہر ہو رہے ہیں اور کہیں کشش کے کرشمے۔ ایسے عجیب و غریب قدرت والے خدا کو پانا ایک خشک عقیدہ کو پانا نہیں ہو سکتا۔ ایسے خدا کو پانا تو یہ ہے کہ آدمی کی روح ایک اتھاہ روشنی سے جگمگا اٹھے۔ وہ اس کے قلب کے لئے لطف و لذت بن جائے۔ آدمی ایک عمدہ پھل کھاتا ہے تو وہ باغ باغ ہو جاتا ہے۔ ایک شخص ایک لطیف نغمہ سنتا ہے تو وہ ہمہ تن وجد میں آجاتا ہے۔ کسی کے یہاں ایک خوبصورت بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو اس کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔ پھر خدا جو ساری خوبیوں کا سرچشمہ ہے، اس کا پانا کیا کسی کو بے قرار نہیں کرے گا، وہ محض ایک بے کیف واقعہ بن کر رہ جائے گا۔

خدا کو پانا یہ ہے کہ وہ ایک خوشبو ہو جس سے آدمی کا شامہ معطر ہو جائے۔ وہ ایک مزہ ہو جس سے اس کا ذائقہ لطف اندوز ہو۔ وہ ایک لطافت ہو جو اس کے لامسہ کو کیف سے بھر دے۔ وہ ایک حسن ہو جو اس کی بصارت کو ایک حیرت ناک نظارہ میں محو کر دے۔ وہ ایک ترنم ہو جو اس کے سامعہ کو ایسی لذت دے جس سے وہ کبھی سیر نہ ہو۔ جس خدا نے روشنی پیدا کی، کیسے ممکن ہے کہ اس کے اندر روشنی نہ ہو۔ جس خدا نے مزہ پیدا کیا کیسے ممکن ہے کہ اس میں مزہ نہ ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا تمام روشنیوں سے زیادہ روشن ہے۔ وہ تمام مزوں سے زیادہ مزہ والا ہے۔ کسی کو خدا کی قربت ملنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص رنگت اور خوشبو کے ابدی چمنستان میں جا بسے، جیسے وہ ایک پیکر نور کے پڑوس میں پہنچ جائے۔

خدا ساری حکمتوں کا خزانہ ہے، اس لئے خدا کو پانا آدمی کو انتہائی با شعور بنا دیتا ہے۔ خدا سارے زمین و آسمان کا نور ہے، اس لئے خدا کو پانا آدمی کی پوری شخصیت کو ربانی نور سے جگمگا دیتا ہے۔ خدا تمام طاقتوں کا سرچشمہ ہے، اس لئے خدا کو پانا آدمی کو اتنا طاقت ور بنا دیتا ہے کہ کوئی سیلاب اس کو غرق نہ کر سکے اور کوئی طوفان اس کے درخت کو اکھاڑنے والا ثابت نہ ہو ——

٭

رسالت

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ غیر مسلم آئے اور آپ سے آپ کے پیغمبر ہونے کا ثبوت مانگا۔ انھوں نے کہا کہ خدا کے پیغمبر حضرت موسیٰ عصا اور ید بیضا لے کر آئے جو لوگوں کے لئے ان کی پیغمبری کا ثبوت تھا۔ اسی طرح خدا کے پیغمبر حضرت عیسیٰ اندھوں کو بینا کرتے تھے اور کوڑھیوں کو اچھا کرتے تھے۔ یہ ان کا معجزہ تھا جو ان کے پیغمبر خدا ہونے کو ثابت کرتا تھا۔ اسی طرح دوسرے پیغمبر بھی کوئی نہ کوئی معجزہ لائے اور اس کو اپنی پیغمبری کے ثبوت کے لئے پیش کیا۔ آپ بتائیں کہ آپ اپنی پیغمبری کے ثبوت کے لئے کیا معجزہ لائے ہیں۔ آپ نے خاموشی کے ساتھ ان کے سوال کو سنا اور اس کے بعد سورۂ آل عمران کے آخر کی یہ آیتیں پڑھیں: زمین و آسمان کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری آنے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں جو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی بناوٹ میں غور کرتے ہیں۔ وہ بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب، تو نے یہ سب کچھ بے مقصد نہیں بنایا۔ تو پاک ہے اس سے کہ تو عبث کام کرے۔ پس اے ہمارے رب، ہم کو آگ کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے رب، ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف پکار رہا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو۔ ہم نے اس کی دعوت قبول کرلی۔ اے ہمارے رب، ہمارے گناہوں کو معاف فرما اور ہم سے درگزر فرما۔ ہماری برائیوں کو دور کردے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔۔۔۔ آل عمران

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ آیتیں پڑھ کر سنانا دوسرے لفظوں میں یہ کہنا تھا کہ میری نبوت کا ثبوت وہ پوری کائنات ہے جو تمہارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ زمین و آسمان کا پورا نظام اپنی خاموش زبان میں رسالت اور پیغام رسالت کی تصدیق کر رہا ہے۔ پھر اس کے بعد کسی اور معجزہ کی کیا ضرورت۔ پیغمبر اسلام کی نبوت دائمی نبوت تھی۔ اس لئے آپ کے لئے وقتی معجزہ کارآمد نہ تھا۔ آپ کے لئے وہ معجزہ مفید تھا جو آپ کی نبوت کی طرح مستقل ہو اور آپ کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی باقی رہے۔ تاکہ ہر دور کا انسان اس کو دیکھ سکے۔ اسی لئے آپ نے خدا کی دنیا کو اپنے حق میں ابدی معجزہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ قرآن میں عالمی نظام کے ان پہلوؤں کی نشان دہی کی گئی جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ انسان کی اصلاح کے لئے خدائی رہنمائی کا انتظام ہونا چاہئے۔

کائنات اپنے پورے وجود کے ساتھ ایک سوال ہے اور پیغمبری اسی سوال کا جواب۔ ہمارے سامنے ایک انتہائی عظیم اور مکمل دنیا ہے۔ وہ نہ صرف موجود ہے بلکہ ایک حد درجہ محکم نظام کے ساتھ مسلسل متحرک ہے۔ اس کے اندر نہ کوئی نقص ہے اور نہ کوئی خلا۔ وہ ناقابل قیاس پھیلاؤ اور تنوع کے باوجود کمال درجہ ہم آہنگ ہے۔

اس کے اندر انتہائی بامعنی سرگرمیاں جاری ہیں۔ وہ اپنے بے شمار اجزار کے ساتھ انتہائی محکم بنیادوں پر چل رہی ہے۔ ایسی ایک کائنات کو دیکھ کر فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا خالق و مالک کون ہے۔ کون ہے جو اس کو عدم سے وجود میں لے آیا۔ کائنات یہ انتہائی اہم سوال ہمارے سامنے لاتی ہے مگر وہ اس کا کوئی جواب نہیں دیتی۔ وہ ہم کو قوس قزح کا مشاہدہ کراتی ہے مگر وہ ہم کو اپنے خالق کا چہرہ نہیں دکھاتی۔ کائنات میں حرکت ہے، زندگی ہے، روشنی ہے، تخلیق ہے، مختلف قسم کی طاقتیں ہیں۔ حتیٰ کہ طرح طرح کے جانداروں کی صورت میں بولنے والی زبانیں بھی ہیں۔ مگر اس اہم ترین سوال کے بارے میں سب خاموش ہیں۔ کوئی بھی انسان کو اس سوال کا جواب نہیں دیتا۔ کسی پہاڑ کی چوٹی پر ایسا کوئی بورڈ لگا ہوا نہیں ہے جہاں اس سوال کا جواب لکھ دیا گیا ہو۔ یہ صورت حال پکار رہی ہے کہ کوئی بتانے والا ہو جو انسان کو اس سوال کے بارے میں بتائے۔

اسی کے ساتھ دوسرا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اس کائنات کا انجام کیا ہے۔ کائنات کی ہر چیز حرکت میں ہے۔ زمین مسلسل سفر کر رہی ہے۔ شمسی نظام زمین اور دوسرے سیاروں کو لئے ہوئے ایک طرف کو چلا جا رہا ہے۔ پھر کہکشاں ہمارے شمسی نظام اور دوسرے ستاروں کو لئے ہوئے ہر لمحہ رواں دواں ہے۔ کائنات کا قافلہ اپنے تمام اجزار کے ساتھ کسی منزل کی طرف چلا جا رہا ہے۔ مگر کوئی بھی اپنی منزل کے بارے میں اعلان نہیں کرتا۔ کائنات کچھ نہیں بتاتی کہ وہ کہاں سے چلی ہے اور کہاں چلی جا رہی ہے اور بالآخر اس کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ یہ شدید ترین اہمیت رکھنے والا سوال ہے۔ کیوں کہ کائنات کے تیز رفتار قافلہ میں انسان بھی شریک ہے اور وہ مسلسل ایک نامعلوم سفر کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ اگر وہ اپنے سفر اور اپنی منزل کی بابت نہ جانے تو سارا سفر اندھیرے کا سفر بن جائے گا۔ اس صورت حال کا تقاضا ہے کہ یہاں کوئی انتظام ہو جو انسان کو اس معاملہ کی حقیقت سے باخبر کرے۔

پھر اسی سے متعلق یہ سوال ہے کہ انسان کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ آدمی کے سامنے بے شمار معاملات آتے ہیں اور ان کے درمیان ایک سے زیادہ طریقے اختیار کرنا اس کے لئے ممکن رہتا ہے۔ پھر انسان کون سا معیار اپنے سامنے رکھے۔ وہ کون سا طریقہ اختیار کرے اور کون سا طریقہ اختیار نہ کرے۔ انسان کے لئے راہ عمل کیا ہو۔ پانی کا راستہ زمین کے نشیب و فراز سے بن جاتا ہے۔ درخت سے لے کر ستاروں تک ہر چیز کا ایک نظام مقرر ہے جس پر وہ پابندی کے ساتھ چلے جا رہے ہیں۔ کائنات کی دوسری چیزوں کے لئے یہ سوال نہیں کہ وہ کس کو لے اور کس کو چھوڑ دے۔ جب کہ انسان اپنے اختیار کی وجہ سے ہر وقت اس سوال سے دوچار رہتا ہے پوری کائنات میں انسان ہی ایک ایسی مخلوق ہے جس کے سامنے کوئی معلوم اور مقرر راہ عمل نہیں۔ سورج ایک حد درجہ پابند نظام کے تحت ہر روز ہمارے لئے روشنی بھیجتا ہے مگر وہ ہماری اپنی زندگی کے سوال پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا۔ ہوا ایک مکمل نظام کے تحت چلتی ہے اور پھولوں کی خوشبو ہمارے مشام تک پہنچاتی ہے

مگر وہ ہمارے اصل مسئلہ کے بارے میں ہم کو کوئی خبر نہیں دیتی۔ پانی ایک متعین قانون میں بندھا ہوا ہے، وہ ہمارے لئے ٹھنڈک اور تراوٹ لے کر آتا ہے مگر ہماری تلاش کے بارے میں وہ ہماری کوئی مدد نہیں کرتا۔ زمین اپنی محوری گردش کے ذریعہ ہر روز ہمارے لئے دن لاتی ہے اور رات کا پردہ ہمارے اوپر سے ہٹاتی ہے مگر وہ زندگی کے بھید کا پردہ نہیں کھولتی۔ درخت زمین کو پھاڑ کر نکلتے ہیں اور ایک منظم کارخانہ کی طرح عمل کرتے ہوئے ہمارے لئے سایہ اور رزق فراہم کرتے ہیں۔ مگر وہ ہماری ذہنی غذا کے لئے ہمیں کوئی چیز فراہم نہیں کرتے۔ چڑیاں چہچہاتی ہیں، ان کو اپنی زندگی کا نظام پوری طرح معلوم ہے مگر وہ ہماری قابل فہم زبان میں ہم کو کوئی پیغام نہیں دیتیں۔ ستارے اور سیارے اپنے نظام میں ایک سکنڈ کا فرق کئے بغیر دوڑ رہے ہیں مگر وہ نہیں بتاتے کہ وہ کون سی منزل ہے جس کی طرف انسان کو رواں دواں ہونا چاہئے۔ کائنات کی ہر چیز ایک ہی مقرر راستہ پر چل رہی ہے۔ حقیر چیونٹی سے لے کر عظیم کہکشانوں تک سب کے سب اپنے مقرر نظام کے اس طرح پابند ہیں جیسے ان کو اپنی راہ عمل پوری طرح معلوم ہو۔ یہاں صرف ایک انسان ہے جو اپنی راہ عمل سے بے خبر ہے۔ ایک باخبر کائنات میں وہ بالکل بے خبر حالت میں کھڑا ہوا تمام چیزوں کو دیکھ رہا ہے۔ وہ ہر چیز کو اپنی منزل کی طرف جاتا ہوا دیکھتا ہے مگر اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ خود کیا کرے اور کدھر جائے۔

کائنات میں جتنی بھی چیزیں ہیں سب کا ایک نظام عمل مقرر ہے جس پر وہ حد درجہ پابندی کے ساتھ قائم ہیں۔ یہاں صرف ایک انسان کا استثنا ہے۔ انسان واحد مخلوق ہے جو کسی نظام میں بندھا ہوا نہیں ہے۔ وہ اختیار رکھتا ہے کہ جو چاہے کرے اور جو چاہے نہ کرے۔ زمین اپنے مدار میں گھومتی ہے۔ وہ دوسرے سیاروں کے مدار میں داخل نہیں ہوتی۔ ایک متعین صورت حال جہاں دوسری چیزیں ہمیشہ ایک ہی رخ اختیار کرتی ہیں، انسان کے لئے ممکن ہوتا ہے کہ وہ کئی رخ اختیار کر سکے۔ وہ اپنے "مدار" سے نکل کر دوسرے کے "مدار" میں مداخلت کرنے لگے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کے لئے راہ عمل پانے کا معاملہ اس سے مختلف ہے جو بقیہ کائنات کا ہے۔ بقیہ چیزیں اپنے لئے راہ عمل خود اپنے ساتھ لاتی ہیں مگر انسان کو اپنی راہ عمل باہر سے حاصل کرنا ہے۔

مطالعہ یہ بھی بتاتا ہے کہ انسان اپنی راہ عمل خود دریافت نہیں کر سکتا۔ انسان عقل و فہم رکھتا ہے مگر اس کی عقل و فہم اصل مسئلہ کی نسبت سے اتنی محدود ہے کہ کسی طرح بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی کوشش سے اس سوال کا جواب معلوم کر سکے۔ پچھلے ہزاروں سال کی تاریخ نے اس کو تجرباتی سطح پر ثابت کر دیا ہے۔ کائنات کے اندر اپنے سوال کا جواب نہ پا کر انسان نے خود تحقیق شروع کی۔ مگر نسلوں کی کوششیں بھی اس کو کسی ایسی بات تک نہ پہنچا سکیں جس پر وہ یقین کر سکے۔ اس نے ستاروں اور سیاروں کی حرکت کے اصول معلوم کر لئے مگر انسان کے سفر اور اس کے آغاز و انجام کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ کر سکا۔ اس نے جمادات، نباتات اور حیوانات کا قانون دریافت کر لیا مگر خود انسان کا قانون دریافت کرنے میں ناکام رہا۔ اس نے یہ جان لیا کہ مادہ فنا ہوتا ہے تو ہر جی

بن جاتا ہے اور انرجی ختم ہوتی ہے تو وہ مادہ کی صورت اختیار کرلیتی ہے مگر انسان مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے اس کی بابت وہ کچھ نہ جان سکا۔ اس نے معلوم کرلیا کہ کائنات کی تمام چیزیں ایک ہی محکم قانون میں بندھی ہوئی ہیں اور اس سے ادنیٰ انحراف کئے بغیر کھرب ہا کھرب سال تک چلتی رہتی ہیں۔ مگر انسان کا قانون حیات کیا ہو، اس کے بارے میں وہ کچھ معلوم نہ کرسکا۔ اس نے کائنات کی وسعتوں کو اپنے آلات کی مدد سے دیکھ لیا اور انتہائی چھوٹے ایٹم کے اندرونی نظام کا پتہ کرلیا۔ مگر انسان کی حقیقت کیا ہے۔ وہ کس منصوبہ کے تحت وجود میں آیا ہے اس کی بابت وہ کچھ نہ جان سکا۔ انسان کی سب سے بڑی ضرورت کے بارے میں انسان کی یہ مجبوری ثابت کرتی ہے کہ اس کو اس بارے میں ایک خصوصی رہنما درکار ہے۔ اس سے پیغمبر کی ضرورت پوری طرح ثابت ہوجاتی ہے۔ انسان اپنی زندگی کو بامعنی بنانے کے لئے پیغمبر کا لازمی طور پر محتاج ہے۔ اس کے بعد جب ہم ان تعلیمات پر غور کرتے ہیں جو پیغمبر نے پیش کی ہیں تو مزید یقین ہوجاتا ہے کہ پیغمبری فی الواقع انسان کی ایک لازمی ضرورت ہے۔ پیغمبر کی بتائی ہوئی باتیں ان تمام سوالات کا تسلی بخش اور مکمل جواب ہیں جو انسان کو درپیش ہیں۔ یہ تعلیمات خود اس بات کا ثبوت ہیں کہ پیغمبر واقعی اللہ کی طرف سے ہے۔ اللہ نے اس کو حقیقت کا علم دے کر انسانوں کی رہنمائی کے لئے بھیجا ہے۔ بقیہ چیزوں کا قانون عمل ان کے پیدا کرنے والے نے اندرونی طور پر ان کے اندر رکھ دیا اور انسان کا قانون عمل پیغمبر کے ذریعہ اس کے پاس بھیجا۔

پیغمبر ہم کو بتاتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے اور وہ اپنی غیر معمولی قدرت کے ساتھ اس نظام کو چلا رہا ہے۔ اس جواب سے زیادہ صحیح جواب کوئی اور نہیں ہوسکتا۔ یہ جواب ایسا ہی ہے جیسے ایک مشین بہت عمدہ چل رہی ہو۔ لوگ اس کی کارکردگی کو دیکھ کر حیران ہوتے ہوں۔ مگر اس کی ساخت اس پر لکھی ہوئی نہ ہو۔ اب ایک واقف کار یہ کہے کہ یہ فلاں کارخانہ کی بنی ہوئی ہے جو دنیا بھر میں انجینیرنگ کا سب سے اچھا کارخانہ ہے۔ یہ بات معلوم ہوتے ہی دیکھنے والوں کی الجھن ختم ہوجائے گی۔ کیونکہ اب ان کو مشین کی اعلیٰ کارکردگی کی توجیہہ مل گئی۔ اسی طرح ایک عظیم کائنات کا موجود ہونا اور پھر اس کا حد درجہ محکم طریقہ پر چلنا اس کے بارے میں یہ سوال پیدا کرتا ہے کہ وہ کیوں کر بنی اور کیسے چل رہی ہے۔ جب پیغمبر یہ کہتا ہے کہ ایک خدا ہے جس نے اس کو بنایا اور جو اس کو اپنی خدائی طاقتوں سے چلا رہا ہے تو فوراً ہم کو اپنے سوال کا جواب مل جاتا ہے۔ یہ جواب ہمارے لئے ذرا بھی بعید از قیاس نہیں۔ کیوں کہ خدا کو ماننا ایسا ہی ہے جیسے اپنے آپ کو ماننا۔ ہم اپنی ذات کی سطح پر ایک ایسے وجود کا تجربہ کر رہے ہیں جو دیکھتا ہے، جو سنتا ہے، جو سوچتا ہے، جو چلتا ہے، جو پکڑتا ہے، جو منصوبہ بناتا ہے، جو واقعات کو ظہور میں لاتا ہے۔ "انسان" کی صورت میں جن قوتوں کو ہم محدود طور پر دیکھ رہے ہیں وہی قوتیں زیادہ کامل طور پر خدا کی صورت میں موجود ہوں تو اس میں تعجب کی بات کیا ہے۔ یہ تو گویا اسی واقعہ کو زیادہ بڑے پیمانہ پر ماننا ہے جس کا ہر وقت ہم چھوٹے پیمانہ پر تجربہ کر رہے ہیں۔ "ہم" ہوں یہی اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ "خدا" ہے۔

دوسری بات جو پیغمبر بتاتا ہے وہ یہ کہ یہ کائنات بے انجام نہیں۔ اس کا ایک انجام ہے جو موت کے بعد سامنے آنے والا ہے۔ آدمی کو بظاہر اس دنیا میں جو آزادی حاصل ہے وہ صرف امتحان کے لئے ہے۔ یہ آزادی ایک خاص مدت تک ہے۔ اس مدت کے ختم ہونے کے بعد موجودہ نظام توڑ دیا جائے گا۔ اور نیا زیادہ کامل اور ابدی نظام بنایا جائے گا۔ وہاں خدا اپنی طاقتوں کے ساتھ ظاہر ہو جائے گا جو اس وقت امتحان کی مصلحت کی بنا پر غیب کے پردہ میں چھپا ہوا ہے۔ آج کی دنیا میں ہر ایک کو فائدہ اٹھانے کا موقع ہے۔ مگر آنے والی دنیا میں خدا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا حق صرف ان لوگوں کو ہوگا جنھوں نے حالت غیب میں خدا کی وفاداری کی ہوگی۔ بقیہ تمام لوگ خدا کی نعمتوں سے دور پھینک دئے جائیں گے۔ پیغمبر کی یہ خبر بھی پوری طرح سچائی کے مطابق معلوم ہوتی ہے۔ ایک ایسا خدا جس نے دیکھنے اور سمجھنے والے انسان کو بنایا، کیسی عجیب بات ہوگی کہ انسان یوں ہی پیدا ہو کر مر جائے اور اس کا خدا اس کے سامنے ظاہر نہ ہو کہ وہ اس کو دیکھے اور جانے۔ پھر موجودہ کائنات اتنی باحکمت ہے کہ کسی طرح بھی یہ بات قابل تصور نہیں ہے کہ اس کا کوئی انجام نہ ہو، کوئی ایسا دن نہ آئے جہاں ظلم ظلم کی صورت میں اور انصاف انصاف کی صورت میں نمایاں ہو۔ پیغمبر کی خبر عین وہی ہے جس کا انسانی فطرت تقاضا کر رہی تھی، ایک ایسی دنیا جہاں عدم سے وجود کے مظاہرے ہوتے ہوں۔ جہاں رات کے بعد دن آتا ہو، جہاں ایک معمولی بیج سے بے شمار بڑے بڑے درخت پیدا ہوتے ہوں۔ جہاں "آج" ہمیشہ "کل" میں تبدیل ہوتا ہو، ایسی دنیا کے بارے میں یہ کہنا کہ اس کی ایک آخرت ہے حد درجہ قابلِ فہم ہے۔ جو دن ہم ہر روز نکلتا دیکھتے ہیں، یہ اسی کے زیادہ بڑے پیمانہ پر نکلنے کی خبر ہے۔ جو کل ہر روز ہمارے اوپر آتی ہے یہ اسی کے زیادہ بڑی صورت میں ظاہر ہونے کی اطلاع ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر ہماری اپنی فطرت کی مانگ کو شعور تک پہنچاتا ہے، جس بات کے اشارے آج بھی کائنات میں موجود ہیں اس کو وہ یقینی علم کا درجہ عطا کرتا ہے۔

پیغمبر نے انسان کے لئے جو راہ عمل بتائی ہے وہ بھی حد درجہ قابل فہم ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ پیغمبر کا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے کہ وہ خدا کا بھیجا ہوا ہے۔ کیوں کہ اتنی صحیح بات وہی کہہ سکتا ہے جو خدا کی طرف سے بول رہا ہو۔ پیغمبر یہ بتاتا ہے کہ انسان کے لئے راہ عمل یہ ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کرے۔ عبادت کا مطلب ہے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دینا۔ اسی سے ڈرنا اور اسی سے محبت کرنا۔ اللہ ہی کو اپنا سب کچھ بنا لینا۔

انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک ایسا وجود ہے جو اپنی توجہات کا ایک مرکز چاہتا ہے۔ اس کو کوئی ایسا نقطہ درکار ہے جس کے اوپر وہ اپنی سوچ اور اپنے جذبات کو مرتکز کر سکے۔ یہ انسان کی ایسی ضرورت ہے جس سے وہ کسی حال میں خالی نہیں ہو سکتا، اور نہ کوئی ایسا شخص موجود ہے جو اس سے خالی ہو۔ کسی کا مرکز توجہ اس کے بیوی بچے ہیں۔ کسی کا مرکز اس کا قبیلہ اور برادری ہے۔ کسی کا مرکز توجہ قوم اور وطن ہے۔ کوئی دولت کو اور کوئی اقتدار کو اپنا مرکز توجہ بنائے ہوئے ہے۔ مگر ان میں سے کوئی بھی چیز نہیں جو حقیقۃً اس قابل ہو کہ انسان

اس کو اپنا مرکز توجہ بنائے ۔ مرکز توجہ بننے کے قابل وہ ہو سکتا ہے جو انسان کو سہارا دے سکے ۔ جو زندگی کے انجام کو بہتر بنانے میں انسان کی مدد کر سکتا ہو ۔ مگر ان میں سے کسی چیز کو بھی یہ طاقت حاصل نہیں ۔ یہ تمام چیزیں خود ہی دوسروں کی محتاج ہیں پھر وہ کسی انسان کی کیا مدد کر سکتی ہیں ۔ پھر مرکز توجہ بننے کے قابل وہ ہے جس کو بیک وقت سارے انسان مرکز توجہ بنائیں اور اس کے باوجود معاشرہ میں کوئی بگاڑ پیدا نہ ہو ۔ مگر ان میں سے ہر چیز کا معاملہ اس کے برعکس ہے ۔ وہ تمام چیزیں جن کو آدمی عام طور پر مرکز توجہ بناتا ہے وہ محدود ہیں ۔ ایک آدمی کا انھیں پانا ہمیشہ دوسرے آدمی کی محرومی کی قیمت پر ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ سماج میں مستقل چھین جھپٹ جاری رہتی ہے ۔ ایک شخص جب پاتا ہے تو وہ دوسرے شخص سے چھین رہا ہوتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف خدا ہی کی شان ہے کہ بیک وقت سارے انسان اس کو پانے کے لئے دوڑیں اور پھر بھی لوگوں میں کوئی ٹکراؤ پیدا نہ ہو ۔ کیوں کہ خدا مادی چیزوں سے بلند ہے ۔ خدا ہر قسم کی محدودیت سے پاک ہے ۔

انسانی سماج کا بہت بڑا مسئلہ یہ ہے کہ خواہ کتنا ہی اچھا قانون بنایا جائے ، انسان اس سے بچنے کا راستہ تلاش کر لیتا ہے ۔ کسی کے پاس طاقت ہے تو وہ طاقت کے بل پر دھاندلی کرتا ہے ۔ کسی کے پاس دولت ہے تو وہ دولت کے ذریعہ انصاف کو خرید لیتا ہے ۔ کسی کے پاس الفاظ ہیں تو وہ خوبصورت الفاظ کے ذریعہ اپنے ظلم کو عدل ثابت کرتا ہے ۔ غرض ہر ایک اپنے ناحق کو حق ظاہر کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی تدبیر پا لیتا ہے ۔ مگر جب خدا کو درمیان میں کھڑا کر دیا جائے تو ہر آدمی محسوس کر لیتا ہے کہ اس کی تدبیریں بے معنی ہیں ۔ تمام تدبیریں اسی وقت تک تدبیریں ہیں جب تک معاملہ انسان اور انسان کے درمیان ہو ۔ جب معاملہ کو انسان اور خدا کا معاملہ بنا دیا جائے تو ہر آدمی مکمل طور پر سنجیدہ اور محتاط ہو جاتا ہے ۔ کیوں کہ خدا سے نہ کوئی بات چھپائی جا سکتی اور نہ وہاں کسی قسم کا کوئی زور چل سکتا ۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا پرستی ہی واحد بنیاد ہے جس سے لوگوں میں قانون کے احترام کا جذبہ پیدا کیا جا سکتا ہے ۔ اس کے سوا کوئی بنیاد نہیں جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکے ۔

دنیا میں صحیح نظام بنانے کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت پڑتی ہے وہ قربانی ہے ۔ کہیں کسی کی رائے کے مقابلہ میں اپنی رائے کو چھوڑنا پڑتا ہے ۔ کہیں اپنے ایک کریڈٹ کو دوسرے کے حوالے کرنے پر راضی ہونا پڑتا ہے ۔ کہیں اپنے گھر والوں کے مفاد کے مقابلہ میں دوسروں کے مفاد کو ترجیح دینی پڑتی ہے ۔ کہیں اپنی محنت سے کمائے ہوئے مال کو دوسروں کے حوالے کر دینا پڑتا ہے ۔ کہیں ایک ایسے کام میں اپنی قوتیں کھپانے کا سوال ہوتا ہے جس میں بظاہر کچھ ملنے والا نہیں ہے ۔ جب تک افراد میں اس قسم کی قربانی کا مزاج نہ ہو حقیقی معنوں میں کسی درست نظام کا قائم ہونا ممکن نہیں ۔ اس کے بغیر ہر آدمی اپنی بات پر اصرار کرے گا اور نتیجۃً پورا سماج چھین جھپٹ کا سماج بن جائے گا ۔ اگر یہی موجودہ دنیا سب کچھ ہو تو آدمی اس قسم کی قربانیاں کیوں کرے ۔ یہی وجہ ہے کہ جس سماج میں خدا کو چھوڑ کر دوسری چیزوں کو مرکز توجہ بنایا جائے وہاں مستقل فساد برپا رہتا ہے ۔ لوگ قربانی دینے پر تیار نہیں ہوتے اس لئے صالح ماحول بننے کی نوبت ہی نہیں آتی ۔ مگر پیغمبر زندگی کے جس مقصد کی

نشان دہی کرتا ہے اس میں یہ مسئلہ نہایت خوبی کے ساتھ حل ہو جاتا ہے۔ اب قربانی کرنے کے لئے بہت بڑا محرک مل جاتا ہے۔ اب انسان جان لیتا ہے کہ اس کی ہر قربانی کی اللہ کے یہاں بہت بڑی قیمت ہے جو مرنے کے بعد اس کو ابدی زندگی میں لوٹائی جائے گی۔ یہ ذہن انسانی سماج میں ہر قسم کے ظلم کی جڑ کاٹ دیتا ہے اور حق و انصاف کے لئے مضبوط ترین بنیاد فراہم کر دیتا ہے۔ اب ہر شخص اس قربانی کے لئے تیار ہو جاتا ہے جو ماحول کو صالح بنانے کے لئے ضروری ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جو دین لے کر آئے وہ وہی دین ہے جو خدا کے دوسرے پیغمبر لے کر آئے تھے۔ مگر دوسرے پیغمبروں کا دین ان کے بعد محفوظ نہ رہ سکا۔ ان کے بعد ان کے دین کے ماننے والے اتنے طاقت ور ثابت نہ ہو سکے کہ ان کے دین کو اس کی اصلی صورت میں محفوظ رکھ سکتے۔ پیغمبر اسلام کو اللہ تعالیٰ نے آخری نبی کی حیثیت سے بھیجا اور ان کی خصوصی مدد کر کے ان کو تمام قوموں اور مذہبوں کے اوپر غالب کر دیا۔ آپ کی یہ غیر معمولی فتح ایک طرف آپ کے پیغمبر خدا ہونے کی دلیل بن گئی۔ آپ کی کامیابی اتنی غیر معمولی تھی کہ دنیا میں کبھی کسی کو ایسی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ یہ واقعہ اس بات کا ایک محسوس ثبوت ہے کہ آپ خدا کی طرف سے تھے اور خدا نے اپنی خصوصی مدد سے آپ کو یہ غلبہ اور کامیابی عطا فرمائی۔ کوئی عام آدمی کبھی اس قسم کی کامیابی پر قادر نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف آپ کی اسی کامیابی کے ذریعہ آپ کے لائے ہوئے دین کی مستقل حفاظت کا انتظام ہو گیا۔ آپ کی اس کامیابی کی وجہ سے آپ کے ماننے والوں کی ایک بہت بڑے رقبہ پر طاقت ور حکومت قائم ہو گئی۔ یہ حکومت آپ کے دین کی دائمی محافظ بن گئی۔ چنانچہ آپ کی آمد کو چودہ سو سال ہو گئے اور آج تک آپ کے دین میں کوئی تبدیلی نہ ہو سکی۔ وہ اسی خالص صورت میں محفوظ ہے جس صورت میں آپ نے اس کو دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب کوئی پیغمبر آنے والا نہیں۔ آپ قیامت تک کے لئے تمام انسانوں کے اوپر خدا کے پیغمبر ہیں۔ نیا پیغمبر آنے کی ضرورت ہمیشہ اس لئے پڑتی ہے کہ خدا کا دین اپنی اصلی صورت میں محفوظ نہ رہا ہو۔ پچھلے زمانہ میں بار بار ایسا ہوا کہ آسمانی کتاب کی حامل قومیں اپنی کتاب کو ضائع کرتی رہیں۔ اس لئے بار بار نبی آئے تاکہ خدا کی تعلیمات کو زندہ کریں اور ان کو دوبارہ ان کی صحیح صورت میں لوگوں کے سامنے پیش کر دیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی صورت میں جو کتاب پیش کی وہ مکمل طور پر اپنی ابتدائی صورت میں محفوظ ہے اور پریس کا دور آنے کے بعد آخری طور پر محفوظ ہو چکی ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ آپ آج بھی ایک زندہ نبی کی حیثیت سے ہمارے درمیان موجود ہیں۔ کیوں کہ آپ کے اقوال، آپ کے حالات، آپ کی پیغمبرانہ جدوجہد، غرض آپ کے پورے عمل کا ریکارڈ اس طرح مکمل طور پر محفوظ ہے کہ جب ہم اس کو پڑھتے ہیں تو گویا کہ ہم آپ کو اپنے درمیان محسوس کرنے لگتے ہیں۔ بحیثیت رسول آپ نے جو کچھ کیا وہ سب کا سب ہم شروع سے آخر تک آج بھی معتبر کتابوں میں دیکھ رہے ہیں۔ ایسی حالت میں اب نیا نبی آنے کی کیا ضرورت۔

آخرت

آخرت میں آدمی کو جو بدلہ دیا جائے گا وہ دنیا میں اس کے عمل ہی کا اخروی پہلو ہوگا۔ اس لئے عمل اور بدلہ دونوں ایک دوسرے کے انتہائی مطابق ہوں گے۔ ایک شخص سونا جمع کئے ہوئے ہے اور اللہ کا حصہ اللہ کے راستہ میں نہیں دیتا تو وہ سونا گویا آگ کا انگارہ ہے۔ موت کے بعد یہ سونا آگ کی صورت اختیار کر کے آدمی کے ساتھ چپک جائے گا (توبہ) حدیث میں اس قسم کی بہت سی مثالیں دی گئی ہیں کہ آدمی کا عمل اور اس کے اخروی نتائج کس طرح ایک دوسرے کے مطابق ہوں گے۔

معراج کے سفر سے متعلق جو روایات ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آسمانی سفر میں آپ کو جو چیزیں دکھائی گئیں ان میں وہ عالم مثال بھی تھا جہاں انسان کے دنیوی اعمال اپنی اخروی صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں ایک طرف آپ کو اچھے اعمال کی اخروی صورتیں دکھائی گئیں۔ مثلاً ایک جگہ آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ کھیتی کاٹ رہے ہیں۔ وہ جتنی کھیتی کاٹتے ہیں اتنی ہی ان کی کھیتی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرشتہ سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ آپ کو بتایا گیا کہ یہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے لوگ ہیں۔ اسی طرح آپ کو تفصیل کے ساتھ برے اعمال کی اخروی صورتیں بھی دکھائی گئیں۔

آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ ہیں جن کے سر پتھروں سے کچلے جا رہے ہیں۔ آپ نے پوچھا یہ کون ہیں۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی سرگرانی ان کو نماز کے لئے اٹھنے نہ دیتی تھی۔ اسی طرح آپ نے کچھ لوگ دیکھے جن کے کپڑوں میں بہت سے پیوند لگے ہوئے تھے اور وہ جانوروں کی طرح گھاس چر رہے تھے۔ آپ نے پوچھا یہ کون ہیں۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرتے تھے۔ پھر آپ نے ایک شخص کو دیکھا۔ وہ لکڑیوں کا گٹھا جمع کر کے اٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور جب وہ گٹھا اس سے نہیں اٹھتا تو وہ اس میں کچھ اور لکڑیاں بڑھا لیتا ہے۔ آپ نے پوچھا یہ کون ہے۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ وہ شخص ہے جس پر ذمہ داریوں اور امانتوں کا اتنا بوجھ تھا کہ وہ اٹھا نہ سکتا تھا مگر وہ ان کو کم کرنے کے بجائے اور زیادہ ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے اوپر ڈال لیتا تھا۔ پھر آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ ہیں جن کی زبانیں اور ہونٹ قینچیوں سے کاٹے جا رہے ہیں۔ آپ نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ وہ مقرر ہیں جو بے روک ٹوک زبان چلاتے تھے اور غیر ذمہ دارانہ باتیں کہہ کر فتنہ برپا کرتے تھے۔ ایک جگہ آپ نے دیکھا کہ ایک پتھر میں چھوٹا سا سوراخ ہوا اور اس میں سے ایک بڑا سا بیل نکل آیا۔ اس کے بعد وہ بیل دوبارہ اسی سوراخ میں جانے کی کوشش کرنے لگا مگر کوشش کے باوجود وہ دوبارہ اس کے اندر نہ جا سکا۔ آپ نے پوچھا یہ کیا معاملہ ہے۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ اس آدمی کی مثال ہے جو بے پروائی کے ساتھ ایک فتنہ کی بات کہہ دیتا ہے۔ اس کے بعد اس کے برے نتائج دیکھ کر اس کو واپس لینا چاہتا ہے مگر واپس نہیں لے سکتا۔ اسی طرح ایک جگہ آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ ہیں جو خود اپنے جسم کا گوشت کاٹ کاٹ کر کھا رہے ہیں۔ آپ نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے دوسرے بھائیوں پر طعن وطنز کرتے تھے۔ کچھ اور لوگوں کو آپ نے دیکھا۔ ان کے ناخن تانبے کے تھے اور وہ اس سے اپنے منہ اور سینے نوچ رہے تھے۔ آپ نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو لوگوں کے پیچھے ان کی برائیاں کرتے تھے اور ان کی عزت وآبرو پر حملے کرتے تھے۔ کچھ لوگوں کو آپ نے دیکھا۔ ان کے ہونٹ اونٹوں سے ملتے جلتے تھے اور وہ آگ کھا رہے تھے۔ آپ نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو یتیموں کا مال دنیا میں کھاتے تھے۔ پھر آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ ہیں جن کے پیٹ بہت بڑے ہیں اور وہ سانپوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ آنے جانے والے ان کو روندتے

ہوئے گزر جاتے ہیں مگر وہ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے۔ آپ نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ سود کھانے والے لوگ ہیں۔ پھر کچھ لوگ دکھائی دئے جن کے ایک جانب اچھا گوشت رکھا ہوا تھا اور دوسری جانب سڑا ہوا گوشت جس سے سخت بدبو آرہی تھی۔ وہ اچھے گوشت کو چھوڑ کر سڑا ہوا گوشت کھا رہے تھے۔ آپ نے پوچھا یہ کون لوگ ہیں۔ فرشتہ نے بتایا کہ یہ وہ مرد اور عورتیں ہیں جنھوں نے جائز بیویوں اور شوہروں کو چھوڑ کر حرام سے اپنی خواہش پوری کی۔

جنت کا معاملہ بھی یہی ہے۔ قرآن میں جنت کو عطاء متشابہ کہا گیا ہے، یعنی ایسا انعام جو آدمی کے عمل سے ملتا جلتا ہو۔ ارشاد ہوا ہے کہ جنت میں جب کوئی پھل انھیں کھانے کے لئے دیا جائے گا تو اہل جنت کہیں گے کہ ایسے ہی پھل اس سے پہلے ہم کو دنیا میں دئے گئے تھے اور ان کو دنیا کے پھلوں سے ملتے جلتے پھل دئے جائیں گے (بقرہ ۲۵) اس کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کے انعامات دنیا کے عمل کے عین مطابق و مماثل ہوں گے۔ دنیا میں کسی بندۂ خدا کو جس عمل کی توفیق ملی ہو گی اسی سے ملتا جلتا بدلہ جنت میں اس کے حصہ میں آئے گا۔

دنیا میں آدمی کا اصل امتحان یہ ہے کہ وہ کسی صورت حال میں کس قسم کا جواب دیتا ہے۔ پتھر کے ساتھ کوئی صورت حال پیش آئے تو وہ اس کے جواب میں کوئی رویہ پیش نہیں کرتا۔ مگر انسان ایک احساس اور شعور رکھنے والی مخلوق ہے۔ انسان کے ساتھ جب کوئی صورت حال پیش آتی ہے تو وہ اس کے اندر ہلچل پیدا کرتی ہے۔ وہ اس کے جواب میں اپنے ہاتھ یا زبان سے کوئی ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ اسی میں آدمی کا اصل امتحان ہے۔ ہر ایسے موقع پر خدا یہ دیکھتا ہے کہ آدمی نے اپنے فکر و عمل کی آزادی کو کس رخ پر استعمال کیا۔ اس نے گالی کے جواب میں گالی دی یا گالی کے جواب میں اس کی زبان سے دعائیں نکلیں۔ ہر صورت حال جو دنیا میں آدمی کے ساتھ پیش آتی ہے اس کے جواب کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک جہنمی جواب، دوسرا جنتی جواب۔ جہنمی جواب وہ ہے جو اللہ کی مرضی کے مطابق نہیں ہے اور جنتی جواب وہ ہے جو اللہ کی مرضی کے مطابق ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک جواب وہ ہے جو شیطانی اخلاقیات کے مطابق ہو، ایسے لوگ جہنم کے مستحق قرار پائیں گے۔ دوسرا جواب وہ ہے جو خدائی اخلاقیات کے مطابق ہو، ایسے لوگ جنت کے لطیف ماحول میں بسائے جائیں گے۔

شیطانی اخلاقیات یہ ہے کہ جب کوئی ناخوش گوار صورت حال پیش آئے تو آدمی بے خوف ہو کر جوابی کارروائی کرنے لگے۔ وہ نفرت کا جواب نفرت سے دے اور غصہ کے مقابلہ میں غصہ کا تحفہ پیش کرے۔ اس کے برعکس خدائی اخلاقیات یہ ہے کہ آدمی اللہ سے ڈرے۔ وہ وقتی جذبات سے اوپر اٹھ کر سوچے اور نفرت اور محبت کی نفسیات سے بلند ہو کر معاملہ کرے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے میرے رب نے یہ حکم دیا ہے کہ جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں، جو مجھ کو محروم کرے میں اس کو دوں، جو مجھ پر ظلم کرے میں اس کو معاف کردوں (وان اصل من قطعنی واعطی من حرمنی واعفو من ظلمنی) اس طرح کے مختلف احکام ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن سے یہ مطلوب ہے کہ وہ لوگوں کے سلوک سے بالاتر ہو کر ان کے ساتھ معاملہ کرے۔ وہ منفی نفسیات کے مواقع پر مثبت نفسیات ظاہر کرے۔ لوگوں کے درمیان زندگی گزارتے ہوئے بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ناخوش گوار واقعات پیش آتے ہیں۔ اللہ آدمی کے اندر مخالفانہ جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے مواقع پر مومن کو یہ کرنا ہے کہ مخالفانہ جذبات کو اندر ہی اندر دبالے اور تلخی کے باوجود دوسروں کے ساتھ بہتر جذبات کے ساتھ پیش آئے۔

جنت ایک نہایت لطیف اور پاکیزہ مقام ہے۔ جو اللہ خصوصی اہتمام کے ساتھ اپنے نیک بندوں کے لئے بنائے گا:

عن جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اھل الجنۃ یاکلون فیھا ویشربون ولا یتفلون ولا یبولون ولا یتغوطون ولا یمتخطون۔ قالوا فما بال الطعام قال جشاء ورشح کرشح المسک یلھمون التسبیح والتحمید کما تلھمون النفس (مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت کے لوگ کھائیں گے اور پئیں گے مگر وہ نہ تھوکیں گے اور نہ پیشاب کریں گے اور نہ پاخانہ کریں گے۔ لوگوں نے پوچھا پھر کھانے کا کیا ہوگا۔ فرمایا: ڈکار اور پسینہ نکلے گا جو مشک کی طرح خوشبودار ہوگا۔ ان کو حمد اور تسبیح اسی طرح الہام کی جائے گی جس طرح تم سانس لیتے ہو۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت ایک ایسی دنیا ہے جہاں میل اور کثافت بھی خوشبو کی صورت میں خارج ہوتی ہے۔ پھر ایسی دنیا میں وہ لوگ کیوں کر داخل ہوں گے جو اپنی کثافت کو صرف کثافت کی صورت میں خارج کرنا جانتے ہوں۔ بغض، نفرت، حسد، انتقام اور کبر وظلم یہ سب انسان کی نفسیات کا میل کچیل ہے۔ جو لوگ اپنے میل کچیل کو صرف میل کچیل کی صورت میں ظاہر کرنا جانتے ہوں وہ جنت میں بسائے جانے کے قابل نہیں۔ جنت خدا کے ان بندوں کی کالونی ہے جو اپنے اندر کے میل کو بھی پاکی کی صورت میں خارج کرتے ہیں۔ جنت میں وہ لوگ بسائے جائیں گے جو نفرت کے مواقع پر محبت کریں۔ جو انتقام کے مواقع پر معاف کریں۔ جو حسد اور بغض کے مواقع پر خیر خواہی کا ثبوت دیں۔ جو کبر کے مواقع پر خاکساری دکھائیں اور ظلم کے مواقع پر انصاف کا رویہ اختیار کریں۔ یہ گویا اپنے میل اور کثافت کو خوشبو کی صورت میں ظاہر کرنا ہے، انھیں خصوصیات والے لوگ جنت کی کالونیوں میں بسائے جائیں گے۔

دنیا کو اس ڈھنگ پر بنایا گیا ہے کہ یہاں بار بار آدمی کو ناخوش گوار صورت حال سے سابقہ پیش آئے۔ یہ موجودہ دنیا کے دار الامتحان ہونے کا تقاضا ہے۔ ان ناخوش گوار مواقع پر جو شخص مثبت ردعمل کا اظہار کرے گا وہ جنت کا مستحق بنا اور جو منفی جذبات کا شکار ہو جائے اس نے اگلی زندگی میں اپنے لئے جنت کا استحقاق کھو دیا۔ جنت کی فضاؤں میں بسنے کے قابل وہ لوگ ہیں جن کا یہ حال ہو کہ ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آئے تو وہ مایوس نہ ہوں بلکہ صبر کا طریقہ اختیار کریں۔ کسی سے ان کو تکلیف پہنچے تو اس کے حق میں دعائیں دیں۔ کسی سے معاملہ پڑے تو انصاف کے مطابق اس کے حقوق ادا کریں۔ کوئی تنقید کرے تو اس کو برا مانے بغیر ٹھنڈے دل سے سنیں۔ کسی سے خواہ کتنی ہی شکایت ہو اس کے بارے میں عدل کا رویہ نہ چھوڑیں۔ جب بھی کسی سے معاملہ پڑے تو دوسرے شخص کو ان سے بہتر سلوک کا تجربہ ہو۔ حتی کہ دوسروں کے ناخوش گوار رویہ سے اپنے سینہ میں اگر نفرت و عداوت کے جذبات پیدا ہوں تب بھی اس کو پی جائیں اور اپنے مخالفانہ جذبہ کو خیر خواہی اور انصاف کی صورت میں ظاہر کریں۔ وہ دنیا کی زندگی میں خدا کا ایسا پھول بن جائیں جو اپنی کثافت کو بھی خوشبو کی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ ایسی پاک زندگی گزارنے کی توفیق ان لوگوں کو ملتی ہے جو اللہ کو اس طرح یاد کرنے لگیں جس طرح کوئی آدمی سانس لیتا ہے۔ وہ اللہ کو اس طرح پالیں کہ وہ ان کی روح کے اندر تیر جائے۔ وہ ان کی دل کی دھڑکنوں میں شامل ہو جائے۔ وہ اللہ کے خوف و محبت میں نہا اٹھیں۔

وہ مواقع جب کہ آدمی کے اندر سرکشی کی آگ بھڑکتی ہے اس وقت مومن کو تواضع کے ساتھ جھک جاتا ہے۔ جب نفرت کے جذبات امنڈتے ہیں اس وقت اس کو محبت کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ جب بد خواہی کی نفسیات ابھرتی ہے اس وقت اس کو خیر خواہی

کا ثبوت دینا ہے۔ جب بددعا کے کلمات زبان سے نکلتے ہیں اس وقت اس کو دعا کے کلمات اپنی زبان سے ادا کرنا ہے۔ جب حقوق کو دبانے کا خیال آنے لگتا ہے اس وقت حقوق کو پورے انصاف کے ساتھ لوٹانا ہے۔ جب حق کا اعتراف کرنے میں اپنا وقار گرتا ہوا نظر آتا ہے اس وقت وقار کا خیال چھوڑ کر حق کا اعتراف کر لینا ہے۔ جب کسی کے خلاف جوابی کارروائی کا ذہن ابھرتا ہے اس وقت جوابی کارروائی سے اپنے کو روک کر مخالف کے ساتھ وہی کرنا ہے جو خیر خواہی اور انصاف کے تقاضوں کے مطابق ہو۔

اگر آپ ٹرک پر سوار ہوں تو سڑک پر دوڑتا ہوا ٹرک آپ کو زبردست جھٹکے دے گا۔ اس کے برعکس جب آپ ایک اچھی کار پر بیٹھتے ہیں تو تیز دوڑتے ہوئے بھی کار آپ کو جھٹکے نہیں دیتی۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ کار کے پہیہ کے ساتھ اچھی قسم کی اسپرنگ لگی ہوئی ہوتی ہے اس کی وجہ سے کار اپنے تمام جھٹکوں کو اپنے پہیہ پر لے لیتی ہے، وہ جھٹکے کو مسافر تک پہنچنے نہیں دیتی۔ اس کے برعکس ٹرک کی اسپرنگ بہت معمولی ہوتی ہے اس لئے اس کے جھٹکے مسافر تک پہنچتے رہتے ہیں۔ اللہ سے بے خوف آدمی ٹرک کی مانند ہے وہ اپنے اندر کے نفسیاتی جھٹکوں کو برداشت نہیں کرتا۔ وہ ان کو دوسروں کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس اللہ سے ڈرنے والا آدمی کار کی مانند ہوتا ہے، وہ تمام جھٹکوں " کو اپنے اوپر لے لیتا ہے، ان کو دوسرے انسان تک منتقل ہونے نہیں دیتا اسی کا نام صبر ہے۔ صبر یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے جو ناخوش گواریاں پیش آئیں ان کو آدمی اپنے اندر ہی اندر سہ لے، ان کے اثرات دوسروں تک پہنچنے نہ دے۔ ناخوش گواری کے جھٹکوں کو اپنے اوپر لے کر دوسروں کی طرف خوش گواری کو منتقل کرے یہی وہ صلاحیت ہے جو آدمی کو جنت میں آباد کئے جانے کے قابل بناتی ہے۔ جنت وہ لطیف مقام ہے جہاں کثافت بھی بہ شکل خوش بو ظاہر ہوگی۔ ایسی لطیف آبادی میں رہنے کا مستحق صرف وہ شخص قرار دیا جائے گا جس نے دنیا کی زندگی میں یہ ثبوت دیا ہو کہ وہ اپنی نفسیاتی کثافت کو خوش بو کی صورت میں خارج کر سکتا ہے، کثافت کا خوشبو کی صورت میں ظاہر ہونا موجودہ دنیا میں نفسیاتی اعتبار سے ہوتا ہے، آخرت میں یہی واقعہ اللہ کے حکم کے تحت مادی صورت میں پیش آئے گا۔

ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ یہ آدمی کے اپنے اعمال ہیں جو آخرت میں اس کو لوٹائے جائیں گے (انما ھی اعمالکم ترد الیکم) دنیا میں آدمی کے اخلاقی اعمال آخرت میں مادی نتائج کی صورت اختیار کر لیں گے۔ ہر واقعہ جو دنیا میں پیش آتا ہے اس میں آدمی کے لئے دو قسم کے جواب کا امکان رہتا ہے۔ اسی سے فیصلہ ہوتا ہے کہ کون جنتی ہے اور کون جہنمی۔ کوئی حق بات سامنے آتی ہے، اب ایک شخص اس کا اعتراف کر لیتا ہے اور دوسرا شخص انکار کرتا ہے۔ کوئی معاملہ پڑتا ہے، اس میں ایک شخص انصاف پر قائم رہتا ہے اور دوسرا ظلم پر اتر آتا ہے۔ کوئی ناموافق صورت حال پیش آتی ہے، اب ایک شخص تواضع کا انداز اختیار کرتا ہے اور دوسرا شخص سرکشی کرنے لگتا ہے۔ کوئی باہمی قضیہ ابھرتا ہے، اب ایک شخص محبت اور خیر خواہی کا رویہ اپناتا ہے اور دوسرا شخص نفرت اور انتقام کا۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ردعمل ہیں اور یہی آخرت کی زندگی میں آدمی کے انجام کی تشکیل کر رہے ہیں۔ ہمارے اخلاقی اعمال جب مادی صورت اختیار کر لیں تو انھیں میں سے ایک صورت کا نام جنت ہوتا ہے اور دوسری صورت کا نام جہنم۔

نوٹ: خلاصہ تقریر بمقام نمبا ہیڑہ (راجستھان) یکم فروری ۱۹۸۰

نماز

"نماز کے مسائل" کا لفظ بولا جائے تو ذہن عام طور پر ان جزئی آداب کی طرف چلا جاتا ہے جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں ملتی ہے۔ اسی لئے جب کسی کو نماز کے "مسائل" کی تلاش ہوتی ہے تو وہ فقہ کی کتاب دیکھتا ہے۔ مگر نماز کے مسائل کا تعلق صرف اس کے جزئی آداب سے نہیں ہے۔ اس سے پہلے اس کا تعلق نماز کے مقصد اور اس کے بنیادی پہلوؤں سے ہے۔ نماز کے جزئی آداب بلاشبہ فقہ کی کتابوں ہی میں ملیں گے۔ مگر جہاں تک نماز کے اساسی امور کا تعلق ہے وہ مکمل طور پر قرآن میں موجود ہیں اور قرآن کے تتبع سے واضح طور پر ان کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس ذہن کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک آدمی نماز میں جزئی آداب کا اہتمام تو خوب کرے گا۔ مگر نماز کے جو بنیادی اور مقصدی پہلو ہیں ان کی طرف سے غافل رہے گا۔ کیوں کہ وہ ان کو نماز کے "مسائل" نہیں سمجھتا ——— یہاں اس سے متعلق قرآن کے کچھ حوالے نقل کئے جاتے ہیں:

ہر نماز کا ایک وقت ہے اور اس کی ادائگی میں وقت کی پابندی ضروری ہے	ان الصلاۃ کانت علی المومنین کتاباً موقوتا،	نساء	۱۰۳
جب نماز پڑھی جائے تو صاف پاک ہو کر پڑھی جائے ———	اذا قمتم الی الصلاۃ فاغسلوا	مائدہ	۶
نماز کے وقت اپنے کو ماحول سے الگ کر کے اللہ کی طرف متوجہ ہونا ———	واذکر اسم ربک وتبتل الیہ تبتیلا	مزمل	۸
نماز اس طرح پڑھی جائے کہ آدمی کا شعور اس کے ساتھ جڑا ہوا ہو ———	لاتقربوا الصلاۃ وانتم سکاریٰ	نساء	۴۳
نماز آدمی کے اوپر نگراں بن جائے جو اس کو برے کاموں سے روکے ———	ان الصلاۃ تنھیٰ عن الفحشاء والمنکر	عنکبوت	۴۵
نماز آدمی کو اللہ کی یاد کرنے والا بناتی ہے ———	اقم الصلاۃ لذکری	طٰہٰ	۱۴
نماز کے وقت آدمی کے اوپر پستی کی حالت طاری ہونا چاہئے ———	الذین ہم فی صلاتہم خاشعون	مومنون	۲
جب نماز کا وقت آجائے تو کام چھوڑ کر نماز کی طرف دوڑنا چاہئے ———	فاسعوا الیٰ ذکر اللہ	جمعہ	۹
نماز نمازیوں کے لئے ایک ہو کر رہنے کی تربیت ہے ———	وارکعوا مع الراکعین	بقرہ	۴۳
نماز ایک واسطہ ہے جس کے ذریعہ آدمی خدا کی مدد کا طالب ہوتا ہے ———	استعینوا بالصبر والصلاۃ	بقرہ	۱۵۳
نماز میں مشغول ہو کر آدمی کو خدا کی نزدیکی کا تجربہ ہوتا ہے ———	واسجد واقترب	علق	۱۹
نماز جاہلی طریقوں کو چھوڑ دینے کا سبق دیتی ہے ———	اصلاتک تامرک ان نترک ما یعبد آباؤنا	ھود	۸۷
نماز آدمی کے اوپر اس طرح چھائے کہ وہ اس کی پہچان بن جائے ———	سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود	فتح	۲۹
نماز آدمی کے لئے اس کی تنہائیوں کی ساتھی ہے ———	والذین یبیتون لربھم سجدا وقیاما	فرقان	۶۴
نماز ہر آدمی پر ساری عمر کے لئے فرض ہے ———	ھم علیٰ صلاتھم دائمون	معارج	۲۳
نماز حفاظت کی چیز ہے جس طرح مال حفاظت کی چیز ہے ———	حافظوا علی الصلوات	بقرہ	۲۳۸
نماز کا مطلب خوف آخرت کی وجہ سے خدا کے سامنے گر پڑنا ہے ———	ساجدا وقائما یحذر الآخرۃ	زمر	۹
نماز میں آدمی کو عاجز بندہ کی طرح کھڑا ہونا چاہئے ———	قوموا للہ قانتین	بقرہ	۲۳۸

نماز کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ وقت وقت پر مقرر کی گئی ہے۔ دنیا میں بار بار اوقات بدلتے ہیں اور اسی کے لحاظ سے آدمی اپنے کاموں کا نظام بناتا ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ آدمی وقت کی ہر تبدیلی کے ساتھ اپنے خالق اور مالک کے آگے جھک کر اس بات کا اقرار کرے کہ وہ یہاں سرکش بن کر نہیں رہے گا بلکہ جھکی ہوئی زندگی گزارے گا۔ صبح کو آدمی جب سو کر اٹھتا ہے اور رات کو جب وہ سونے کے لئے بستر پر جاتا ہے۔ اسی طرح سورج جب ڈھلتا ہے اور جب وہ غروب ہوتا ہے۔ ان تمام لمحات کو پانچ وقتوں میں بانٹ دیا گیا ہے اور حکم ہے کہ اس کے مطابق رات دن میں پانچ بار اپنے رب کے سامنے مخصوص آداب کے ساتھ حاضری دو۔ یہ نماز عمر بھر کے لئے فرض ہے۔ آدمی پر جب موت آئے تو اس حال میں آئے کہ وہ اپنے رب کے آگے اپنے آپ کو ڈالے ہوئے ہو۔

نماز کے لئے وضو کی شرط اس بات کا سبق ہے کہ آدمی کو اس طرح رہنا چاہیے کہ اس کی زندگی خدا کی نافرمانیوں سے پاک ہو، اس نے اپنے گناہوں کو توبہ کے آنسوؤں سے دھو ڈالا ہو۔ مسجد میں نماز ادا کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آدمی اپنے دنیوی مشاغل سے الگ ہو کر کچھ دیر کے لئے اپنے کو اللہ کی طرف یکسو کرے۔ وہ اپنے ماحول کو چھوڑ کر خدا کی دنیا میں داخل ہو جائے۔ نماز میں ایک ہی قبلہ کی طرف تمام لوگوں کا رخ کرنا اور ایک امام کے تحت مل کر نماز ادا کرنا اتحاد کی تربیت ہے۔ نماز مسلمانوں کو یہ سکھاتی ہے کہ وہ اپنا ایک سربراہ بنالیں اور اس کی ماتحتی میں متحد اور منظم ہو کر زندگی گزاریں۔

نماز اللہ کی یاد ہے۔ اللہ کی یاد اپنے محسن اور آقا کی یاد ہے جو خوف اور محبت کے جذبات کے ساتھ برابر جاری رہتی ہے۔ آدمی پر جب یہ یاد طاری ہوتی ہے تو وہ رکوع اور سجدہ کی صورت میں اللہ کے سامنے گر پڑتا ہے۔ وہ سراپا عجز بن کر اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ ہمہ تن پستی کی تصویر بن جاتا ہے۔ جب آدمی اس طرح نماز ادا کرتا ہے تو نماز اس کے اوپر ایک قسم کی چوکیدار بن جاتی ہے۔ جب اس کا نفس برائی یا سرکشی کی طرف مائل ہوتا ہے تو اس کو فوراً خیال آجاتا ہے کہ اللہ کے سامنے میں نے اطاعت کا جو اقرار کیا ہے یہ رویہ اس کے خلاف ہے۔ نماز اس کو ہر برے کام سے روکنے والی بن جاتی ہے۔

جب آدمی کے دل میں اللہ کا ڈر سما جاتا ہے اور اس کو اللہ کی رحمت و مغفرت کا شوق لگ جاتا ہے تو اس کی نماز کوئی رسمی چیز نہیں رہتی بلکہ روح اور کیفیت سے بھری ہوئی ایک چیز بن جاتی ہے۔ نماز کے ذریعہ جب وہ روزانہ خدا کی یاد کے سمندر میں نہاتا ہے تو نماز کی روح اس کے وجود پر چھا جاتی ہے۔ اس کا چہرہ اللہ کے آگے جھکنے والے کا چہرہ بن جاتا ہے۔ نماز اس کی پہچان بن جاتی ہے۔ نماز اس کے چہرہ پر سنجیدگی، خاموشی، احتیاط، محبت خدا اور فکر آخرت کا رنگ پھیر دیتی ہے۔ اس کو دیکھتے ہی آدمی کہہ اٹھتا ہے کہ یہ ایک نمازی کا چہرہ ہے، یہ اللہ کے رنگ میں رنگ جانے والا انسان ہے۔

نماز میں جب یہ خصوصیات پیدا ہو جائیں تو وہ ایک زندہ اور پرکیف چیز بن جاتی ہے۔ وہ اللہ سے نزدیکی کے ہم معنی ہوتی ہے نماز میں مشغول ہو کر وہ اپنے رب کی قربت کا تجربہ کرتا ہے۔ وہ اس سے عرضداشت کرتا ہے۔ اپنے کو نماز کی حالت میں لے جا کر اللہ سے مدد طلب کرتا ہے۔ نماز اس کی زندگی کا لازمی حصہ بن جاتی ہے۔ نماز اس کے لئے سادہ معنوں میں صرف نماز نہیں ہوتی بلکہ مالک کائنات سے ملاقات کے ہم معنی ہوتی ہے۔ نماز اس کے لئے ایسی محبوب چیز بن جاتی ہے جس کی وہ حفاظت کرے جس کو وہ اپنی تنہائیوں کا ساتھی بنالے —— نماز اگر زندگی سے الگ ہو تو وہ محض ایک بے روح رسم ہے۔ نماز اگر زندگی کے ساتھ شامل ہو تو وہ ایک غذا ہے جس پر آدمی جیتا ہے، وہ ایک روشنی ہے جس کی رہنمائی میں آدمی اپنا سفر حیات طے کرتا ہے

روزہ

سورہ بقرہ رکوع ۲۳ میں رمضان کے روزوں کا بیان ہے۔ روزہ کے احکام بتاتے ہوئے درمیان میں ارشاد ہوا ہے: اور جب میرے بندے تجھ سے میرے بارے میں سوال کریں تو میں نزدیک ہوں۔ پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔ پس چاہئے کہ وہ میری پکار کا جواب دیں اور مجھ پر ایمان رکھیں۔ امید ہے کہ وہ بھلائی کو پالیں گے (بقرہ ۱۸۶) گویا خدا سے پانے کے لئے بندہ کو بھی خدا کو کچھ دینا ہے۔ روزہ اسی "دینے" کے عمل کی ایک علامت ہے۔ روزہ میں آدمی خدا کی خاطر اپنا کھانا پانی چھوڑ دیتا ہے جو آدمی کی آخری سب سے بڑی ضرورت ہے۔ یہ اس بات کا ایک سبق ہے کہ دنیا کی زندگی میں آدمی کو جو کچھ اپنے رب کے سامنے پیش کرنا ہے اس کا سلسلہ ناگزیر ضروریات تک پہنچتا ہے۔ روزہ یہ پیغام دیتا ہے کہ آدمی خود "بھوکا" رہ کر اپنی متاع کو خدا کے حضور نذر کر دے۔

روزہ عمل کا خاتمہ نہیں بلکہ عمل کا آغاز ہے۔ روزہ دار کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ اللہ کے لئے وقف کر دے۔ اس کو اپنے بیوی بچوں کی امنگوں میں کمی کر کے دین کے تقاضے پورے کرنا ہیں۔ حتی کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کو اپنی زندگی یہاں تک مختصر کرنی پڑے کہ بہت سی ضروری چیزوں سے اس کے لئے "فاقہ" کرنے کی نوبت آ جائے۔ اگر آدمی یہ چاہتا ہے کہ اس کو وہ سب کچھ ملے جو خدا کے پاس ہے تو اس کو بھی وہ سب کچھ دینا پڑے گا جو اس کے پاس ہے۔ "سب کچھ" دے کر ہی سب کچھ ملتا ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

جس طرح رمضان کے مہینہ میں خدا روزہ کے لئے پکارتا ہے اسی طرح سال بھر اس کی پکار بلند ہوتی رہتی ہے۔ آدمی کے سامنے ناجائز کمائی کی صورتیں آتی ہیں، اس وقت خدا پکارتا ہے کہ اے میرے بندے ناجائز کمائی کو چھوڑ کر جائز کمائی پر قناعت کر۔ کسی بھائی کے خلاف اس کے اندر غصہ کی آگ بھڑکتی ہے، اس وقت خدا پکارتا ہے کہ میرے بندے تو اس کو معاف کر دے۔ حق کو ماننے میں مفاد یا عزت نفس کا سوال رکاوٹ بنتا ہے، اس وقت خدا پکارتا ہے کہ میرے بندے تو کسی مصلحت کی پروا کئے بغیر حق کو مان لے۔ اسی طرح زندگی کے ہر موقع پر خدا اپنے بندوں کو پکارتا ہے۔ اب جو شخص ان مواقع پر وہی کرے جو اس کا خدا اس سے چاہتا ہے تو اس نے خدا کی پکار پر لبیک کہا۔ اسی کو قرآن میں تقویٰ کہا گیا ہے (بقرہ ۔ ۱۸۳)

روزہ کا عمل اللہ کو بڑا بنانے (بقرہ ۱۸۵) کی ایک علامت ہے۔ اللہ کے حکم سے آدمی اپنے ایک ایسے تقاضے پر پابندی لگا لیتا ہے جو اس کی زندگی کا سب سے زیادہ ضروری تقاضا ہے۔ یہ عمل کی زبان میں اس بات کا عہد ہے کہ آدمی اللہ کو اپنا "کبیر" اور اپنے آپ کو اس کے مقابلہ میں "صغیر" بنائے گا۔

یہی تکبیر ہے جو زبان سے اللہ اکبر کی صورت میں نکلتی ہے اور عمل سے اپنی انا کو ختم کر دینے کی صورت میں۔ آدمی کی پوری زندگی اس بات کا امتحان ہے کہ وہ کس کو بڑا بناتا ہے، خدا کو یا اپنے آپ کو۔ اپنے کو بڑا بنانے والے کے اندر گھمنڈ کی نفسیات پرورش پاتی ہیں اور خدا کو بڑا بنانے والے کے اندر تواضع کی نفسیات۔ جو شخص خدا کو اپنا بڑا بنائے اس کے اندر سے انانیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی پوری ہستی خدا کے آگے جھک جاتی ہے۔ خدا کی عظمت کا تصور اس کے اوپر اتنا چھا جاتا ہے کہ اپنی ہستی اس کو بالکل بے قیمت دکھائی دینے لگتی ہے۔ ایسے شخص سے جب کسی کا معاملہ پڑتا ہے تو وہ "عبد" کی طرح اس سے معاملہ کرتا ہے نہ کہ "معبود" کی طرح۔ وہ خدا کے بندوں کے مقابلہ میں سرکشی نہیں دکھاتا۔ وہ بندوں سے معاملہ کرتے ہوئے گھمنڈ کا مظاہرہ نہیں کرتا، اس کو دولت یا عہدہ یا حیثیت کا کوئی حصہ مل جائے تو وہ اپنے کو دوسروں سے بڑا نہیں سمجھتا۔ اللہ کو اپنا بڑا بنانا اللہ کے سامنے ذکر اور عبادت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور بندوں کے سامنے تواضع اور بے نفسی کی صورت میں۔

روزہ ایک ایسا تجربہ ہے جو بالآخر "افطار" تک پہنچتا ہے۔ بھوک کا لمبا وقفہ گزار کر آدمی اپنے آپ کو کھانے اور پانی سے سیراب کرتا ہے۔ اس طرح وہ خدا کی نعمتوں کے بارے میں اپنے اندر شکر کے احساس (بقرہ ۱۸۵) کو جگاتا ہے۔ وہ عمل کی زبان میں اپنے آپ کو بتاتا ہے کہ خدا کی وہ عنایات کتنی بڑی ہیں جو روزانہ اس کو خدا کی طرف سے ملتی رہتی ہیں۔ روزہ کے مہینہ میں قرآن کا اتارنا اس بات کا ایک اشارہ ہے کہ قرآن بھی تمھارے لئے ایک خدائی افطار کا انتظام ہے۔ تم ہدایت کے معاملہ میں بھوکے تھے۔ خدا نے اپنی نعمت ہدایت سے تم کو سیراب کیا۔

اللہ نے انسان کو پیدا کیا۔ اس کو بہترین صلاحیتیں عطا کیں۔ دنیا میں اعلیٰ ترین انتظام کر کے یہاں اس کو بسایا۔ اس کے لئے ایک ابدی جنت بنائی اور اپنی کتاب کے ذریعے پیشگی بتا دیا کہ اس جنت تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے۔ جس خدا کے اتنے احسانات ہوں اس کے ساتھ آدمی کا تعلق ایسا ہونا چاہئے کہ اس کا تصور اس کی روح کو سرشار کر دے۔ اس کی یاد آتے ہی قلب و دماغ شکر کے سجدہ میں گر پڑیں۔ زبان پر اس کی احسان مندی کے نغمے جاری ہوں۔ اس کی اندرونی ہستی اس کے احسانات کے اعتراف سے بھر جائے۔ اس کی عملی زندگی ایسی گزرے گویا کہ وہ خدا کے انعام و احسان کی بارش میں نہائی ہوئی ہے۔

تقویٰ اور تکبیر اور تشکر کا یہ ثبوت جو بندے کو دینا ہے وہ بہت بڑی قیمت مانگتا ہے، وہ اپنے نفس اور مفادات کی قربانی ہے۔ اس پر آدمی اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جب کہ اس کا ایمان اس کے لئے حقیقی معنوں میں یقین و اعتماد کے ہم معنی بن گیا ہو۔

انفاق

قرآن میں انفاق پر زور دیتے ہوئے کہا گیا ہے: تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک تم اپنی وہ چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو، اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے (آل عمران ۹۲)
اور جن کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور پھر وہ بخل کرتے ہیں، یہ خیال نہ کریں کہ یہ ان کے حق میں اچھا ہے، بلکہ یہ ان کے حق میں نہایت برا ہے۔ جس چیز میں وہ بخل کر رہے ہیں اس کا قیامت کے دن ان کو طوق پہنایا جائے گا۔ اور زمین و آسمان کی وراثت اللہ ہی کے لئے ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے (آل عمران ۱۸۰)

اے ایمان والو، جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرو، قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی اور نہ دوستی کام آئے گی۔ اور جو انکار کرنے والے ہیں وہی اصل ظالم ہیں (بقرہ ۲۵۴)

جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور اس کی ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے لئے وہ چاہتا ہے، اور اللہ بڑی وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پھر خرچ کرنے کے بعد نہ احسان جتاتے اور نہ دکھ دیتے ہیں، انھیں کے لئے اللہ کا ثواب ہے ان کے رب کے پاس۔ ان کے لئے نہ کوئی ڈر ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ نرم جواب دینا اور درگزر کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری لگی ہوئی ہو۔ اور اللہ بے پروا اور نہایت تحمل والا ہے۔ اے ایمان والو، احسان جتا کر اور دکھ دے کر اپنی خیرات کو اکارت نہ کرو، اس شخص کی طرح جو اپنا مال دکھاوے کے لئے خرچ کرتا ہے اور اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان ہو جس پر کچھ مٹی ہو، پھر جب اس پر زور کا مینھ برسا تو مٹی بہہ گئی اور صاف چٹان رہ گئی۔ ایسے لوگ اپنی کمائی سے کچھ بھی حاصل نہ کر سکیں گے، اور اللہ منکروں کو سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔ اور ان لوگوں کی مثال جو اپنے مال اللہ کی خوشی حاصل کرنے کے لئے اور اپنے دلوں کو ثابت کر کے خرچ کرتے ہیں اس باغ کی طرح ہے جو بلند زمین پر ہو، اس پر زور کی بارش ہوئی تو وہ دگنا پھل لایا اور اگر بارش نہ ہوئی تو پھوار ہی کافی ہے۔ اور اللہ خوب دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، اس کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اس باغ میں اس کے لئے ہر قسم کے پھل ہوں، اور اس پر بڑھاپا آجائے اور اس کے بچے ضعیف ہوں، اس وقت باغ پر ایک بگولا آپڑے جس میں آگ ہو اور وہ باغ جل جائے۔ اللہ اس طرح اپنی باتیں تمھارے سامنے بیان کرتا ہے تاکہ تم غور کرو۔ اے ایمان والو، اپنے کمائے ہوئے ستھرے مال میں سے خرچ کرو اور ان چیزوں میں سے خرچ کرو جو ہم نے تمھارے لئے زمین سے پیدا کی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی راہ میں دینے کے لئے بری چیز چھانٹنے لگو، حالاں کہ وہی چیز اگر تمھیں لینا ہو تو تم ہرگز اس کو لینا گوارا نہ کرو مگر یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ اور جان لو کہ اللہ بے نیاز ہے خوبیوں والا

ہے۔ شیطان تم کو تنگ دستی سے ڈراتا ہے اور بے حیائی کی راہ سجھاتا ہے اور اللہ تم کو وعدہ دیتا ہے اپنی بخشش کا اور فضل کا۔ اور اللہ بہت وسعت والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اللہ جس کو حکمت ملی اس کو بہت بڑی خوبی مل گئی، اور نصیحت وہی قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں (بقرہ ۶۹ - ۲۶۱)

آخرت کی بہتر چیز دنیا کی بہتر چیز کی قیمت ہے۔ دنیا میں جب آدمی اپنی سب سے بہتر چیز کو اللہ کے لئے خرچ کرتا ہے، اس کے بعد ہی وہ اس قابل بنتا ہے کہ وہ آخرت کی سب سے بہتر چیز کو پانے کا حق دار بن سکے۔ دنیا میں آدمی کی سب سے زیادہ محبوب چیز مال ہے۔ جب تک ایسا نہ ہو کہ وہ خالص خدا کے لئے اپنے محبوب مال کو خرچ کرے، وہ خدا کی رحمتوں کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

جو آدمی اپنے کمائے ہوئے مال کو بچاتا ہے یا اس کو اپنی دنیا بنانے میں لگاتا ہے وہ بظاہر سمجھتا ہے کہ میں ہوشیاری کر رہا ہوں، میں اپنے مستقبل کو محفوظ کر رہا ہوں۔ حالانکہ اصل صورت حال اس کے برعکس ہے۔ آدمی اگر موت کے پردہ کو ہٹا دے اور پورے دائرہ حیات کے اعتبار سے اپنے معاملہ کو دیکھے تو اس کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں اپنا "گھر" بنا کر وہ آخرت کے طویل تر مرحلۂ حیات میں اپنے کو "بے گھر" کر رہا ہے۔ وہ اپنے کو اس خطرہ میں مبتلا کر رہا ہے کہ دنیا میں اس کی مال داری آخرت میں اس کے لئے بدترین مفلسی بن کر اس سے لپٹ جائے۔ کیوں کہ آخرت میں جو کچھ کام آئے گا وہ دیا ہوا مال ہے نہ کہ دنیا میں جمع کیا ہوا مال۔

دنیا میں اللہ نے ایسی مثالیں قائم کر دی ہیں جن سے آخرت کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ کسان کھیت میں دانہ ڈالتا ہے تو ایک دانہ ایسے پودے کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس میں سات سو دانے ہوں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا کسی بندے کی محنت کا بدلہ دینے میں کتنا زیادہ فیاض ہے۔ یہی معاملہ وہ آخرت میں بھی اپنے وفادار بندوں کے ساتھ کرے گا۔ اللہ کے لئے خرچ کرنا گویا آخرت کی زمین میں "دانہ" ڈالنا ہے۔ جب آدمی مر کر وہاں پہنچے گا تو وہ دیکھے گا کہ اس کا خرچ کیا ہوا مال کس طرح بے انتہا اضافہ کے ساتھ اس کی طرف لوٹایا جا رہا ہے۔

خرچ کرنے والوں کی بقیہ قسموں کی مثالیں بھی اسی دنیا میں موجود ہیں۔

جو لوگ اپنا مال "دکھاوے" کے لئے خرچ کرتے ہیں یعنی بظاہر ان کا خرچ دین کی کسی مد میں ہوتا ہے مگر اس دینی مد سے انھیں صرف اس لئے دلچسپی ہوتی ہے کہ اس میں نمائش کا پہلو ہے اور اس سے ان کی شہرت میں اضافہ ہوتا ہے۔ دین کی خاموش مد جس میں خدا کی رضا کے سوا کوئی اور پہلو نہ ہو اس میں وہ خرچ نہیں کرتے۔ البتہ ایسی مد جس میں شہرت و عزت کی چاشنی ہو اس میں خرچ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ ایسے نمائشی لوگوں کی مثال اس پتھر کی سی ہے جس کے اوپر اتفاقاً کچھ مٹی جمع ہو جائے اور اس کی وجہ سے وہاں اوپر اوپر کچھ سبزہ اگ آئے۔ مگر جب تیز بارش آتی ہے تو ساری مٹی سبزہ کو لئے ہوئے بہہ جاتی ہے اور اس کے بعد پتھر کا پتھر باقی رہتا

ہے۔ اسی طرح جو لوگ نمائشی جذبہ کے تحت خرچ کرتے ہیں ان کا معاملہ موجودہ امتحانی دنیا میں چھپا رہ سکتا ہے۔ مگر آخرت میں جب حقیقت سے پردہ اٹھایا جائے گا تو ان کی نمائشی دین داری اچانک غائب ہو جائے گی اور وہ ڈھلے ہوئے پتھر کی طرح دین سے بالکل خالی نظر آنے لگیں گے۔

جو لوگ اپنی ساری کمائی صرف دنیا کی تعمیر میں لگاتے ہیں ان کے انجام کی مثال بھی اسی دنیا میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ایک شخص نے باغ لگایا۔ اس کے بڑھاپے کی عمر تک باغ خوب سرسبز ہو گیا۔ پھلوں کا موسم آیا تو سارا باغ پھلوں سے لد گیا۔ عین اس وقت شدید اولہ باری ہوئی یا صحرائی طوفان اٹھا اور سارا باغ جھلس کر رہ گیا۔ اپنی زندگی کی کمائی سے آدمی ٹھیک اس وقت محروم ہو گیا جب کہ اس کو سب سے زیادہ اس کی ضرورت تھی۔ اسی طرح جو لوگ اپنی ساری طاقت اپنی دنیا بنانے میں لگاتے رہے وہ مر کر جب آخرت میں پہنچیں گے تو اچانک وہ دیکھیں گے کہ وہ بالکل خالی ہاتھ ہیں۔ وہاں کے لئے ان کے پاس کچھ نہیں۔

اللہ کی راہ میں دینے کی دو بڑی مدیں ہیں۔ ایک خدا کے کمزور بندوں کی مدد کے لئے دینا، خواہ وہ اپنے رشتہ دار ہوں یا غیر رشتہ دار۔ دوسرے، خدا کے دین کی ضرورتوں میں دینا۔

یہ دینا بظاہر اگرچہ ایک انسان کو دینا ہے۔ مگر نیت کے اعتبار سے اس کا مقصد اللہ کو خوش کرنا ہوتا ہے۔ جب ایک مسلمان اپنے کو "دینے والے" کی حیثیت میں پاتا ہے اور دوسرے کو "پانے والے" کی حیثیت میں تو اس کو وہ بھاری وقت یاد آجاتا ہے جب کہ وہ میدان حشر میں اس حالت میں کھڑا ہوگا کہ دینے کی سب چیزیں خدا کے اختیار میں ہوں گی اور وہ ہمہ تن محتاج بنا ہوا اس کے سامنے کھڑا ہوگا۔ یہ احساس اس کو مجبور کرتا ہے کہ جو کچھ وہ خدا سے اپنے لئے چاہتا ہے وہی وہ دوسرے کے لئے بنے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا مومن کے لئے ایک عملی دعا ہوتی ہے۔ یہ جذبہ اگر آدمی کے اندر صحیح طور پر موجود ہو تو وہ کسی کو دینے کے لئے بہتر چیز چھانٹے گا۔ کیونکہ اصل مسئلہ سامنے کھڑے ہوئے انسان کا نہیں بلکہ خدا کا ہے۔ دیتے ہوئے اس کا جذبہ یہ نہیں ہوگا کہ وہ کسی کے اوپر احسان کر رہا ہے۔ کیونکہ وہ جو کچھ دے رہا ہے اللہ کے لئے دے رہا ہے، پھر اس کا احسان کس کے اوپر ہے۔ وہ جس کو دے گا اس کو اپنے سے کمتر نہیں سمجھے گا اور زبان سے اس کی دلآزاری کا کوئی کلمہ نہیں نکالے گا۔ سارے معاملہ کو خدا کا معاملہ سمجھنے کا ذہن اس کو ہر موقع پر متواضع بنائے رکھے گا حتی کہ جب کوئی سائل اس کے دروازہ پر کھڑا ہوگا تو اس کو ایسا محسوس ہوگا جیسے اس کو خدا نے اپنی طرف سے بھیجا ہو۔ یہ احساس اس کو کسی کو جھڑکنے سے روک دے گا۔ اگر وہ کسی کو دینے والا نہ ہو تو وہ اس کو نرمی کے ساتھ جواب دے گا نہ کہ وہ اس کو جھڑکنے لگے۔

اللہ کے لئے جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے اس کا نتیجہ فوراً دکھائی نہیں دیتا۔ اس لئے نفس بہکاتا ہے کہ یہ بے فائدہ خرچ ہے۔ دنیا کی راہ میں خرچ اس کو لوٹتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور خدا کی راہ میں خرچ ضائع ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر جن لوگوں کو صحیح سمجھ حاصل ہو جاتی ہے وہ نفس کے ان بہکاووں میں نہیں آتے۔ وہ صاف جان لیتے ہیں کہ سب سے زیادہ نفع آور مد وہی ہے جو خدا کی مد ہے۔

حج

حج کیا ہے۔ یہ اللہ کے لئے سفر کرنا ہے۔ اپنا وقت اور مال خرچ کرکے ان مقامات پر پہنچنا ہے جن سے اللہ اور اس کے سچے بندوں کی یادگاریں وابستہ ہیں۔ حج کے تمام مراسم اس بات کا ایک عملی اظہار ہیں کہ آدمی اللہ کے لئے دوڑ رہا ہے۔ اس نے اپنی زندگی اللہ کے گرد گھمار کھی ہے۔ وہ اللہ کے دوستوں کا دوست اور اللہ کے دشمنوں کا دشمن ہے۔ میدان حشر میں اللہ کے سامنے کھڑے ہونے کی حالت کو آج ہی اس نے اپنے اوپر طاری کر لیا ہے۔ وہ سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور سب سے زیادہ اللہ کی یاد کرنے والا ہے۔ وہ اسلام کو ایک عالمی حقیقت بنانے اور اس کو بین اقوامی سطح پر رواج دینے کے لئے بے قرار ہے۔ حج بظاہر ایک عبادت ہے مگر در اصل وہ ایک آدمی کی پوری مومنانہ زندگی کی تصویر اور آخری سانس تک کے لئے ایک اقرار نامہ ہے۔ آدمی اس لئے جیتا ہے کہ وہ خدا کے لئے حج کرے اور اس لئے حج کرتا ہے کہ وہ اپنے رب کے لئے جئے۔ حج اس کی موت کی تعبیر بھی ہے اور اس کی زندگی کی بھی۔

حج گویا حق تعالیٰ کی زیارت ہے۔ وہ دنیا کی زندگی میں اپنے رب سے قریب ہونے کی انتہائی شکل ہے۔ دوسری عبادتیں اگر اللہ کی یادیں ہیں تو حج خود اللہ تعالیٰ تک پہنچ جانا ہے۔ کعبہ کے سامنے کھڑا ہو کر آدمی محسوس کرتا ہے گویا وہ خود رب کعبہ کے سامنے کھڑا ہوا ہے۔ طواف اس حقیقت کا مظہر ہے کہ بندہ اپنے رب کو پاکر پروانہ وار اس کے گرد گھوم رہا ہے۔ جب وہ ملتزم کو پکڑ کر دعا کرتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے گویا اسے اپنے آقا کا دامن ہاتھ آگیا ہے جس سے وہ بیتابانہ لپٹ گیا ہے اور اپنی ساری بات اس سے کہہ دینا چاہتا ہے۔ حج کی یہ خصوصیت اس لئے ہے کہ اس کے ادا کرنے کی جگہ ایک ایسا مقام ہے جہاں تجلیات الٰہی کا نزول ہوتا ہے۔ جس کو خدا پرستانہ زندگی کے عظیم داعی سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے دعوت و عمل کا مرکز بنایا تھا۔ جہاں اسلام کی پوری تاریخ ثبت ہے۔ جس کے ہر طرف اس مثالی اسلامی قافلہ کے نشانات پھیلے ہوئے ہیں جو خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی میں چھٹی صدی عیسوی میں ظہور میں آیا تھا۔ جہاں خدا کے دین کو پہلی بار ایک تاریخی واقعہ بنایا گیا۔ ان چیزوں نے حرم کے پورے علاقہ کو ایک خصوصی اہمیت دے دی ہے۔ وہاں اسلام کے حق میں ایک خاص طرح کا تاریخی اور نفسیاتی ماحول بن گیا ہے۔ جو شخص بھی وہاں جاتا ہے وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، وہ خدا کے رزق سے ایک ایسا حصہ لے کر لوٹتا ہے جو اس کی بقیہ پوری زندگی میں اس کی دینی توانائی کا ذریعہ بنا رہے۔

حج کو اسلامی عبادات میں ہمیشہ ایک غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے۔ ایک حدیث میں اس کو افضل عبادت کہا گیا ہے۔ وہ تمام عبادات کا مجموعہ ہے اور تمام عبادات میں زندگی پیدا کرتا ہے۔ تاہم اس کی جو کچھ اہمیت ہے وہ اس کی حقیقی روح کے اعتبار سے ہے نہ کہ محض ظاہری رسوم و آداب کے اعتبار سے۔ دوسرے لفظوں میں حج صرف اس کا نام نہیں ہے کہ آدمی دیار حرم میں جائے اور کچھ مخصوص مراسم دہرا کر واپس لوٹ آئے۔ بلکہ حج ان کیفیات کے حصول کا نام ہے جن کے لئے یہ فریضہ مقرر کیا گیا ہے۔ کھانا بلاشبہ آدمی کو طاقت دیتا ہے۔ مگر کھانا اسی شخص کے لئے طاقت ہے جو اس کو قاعدہ کے مطابق اپنے پیٹ میں ڈالے۔ اگر کوئی شخص اس کو محض دیکھے یا اپنے سر پر الٹ لے تو اس کے لئے انتہائی قیمتی غذا بھی بالکل بے فائدہ ثابت ہوگی۔ اسی طرح حج کا حقیقی فائدہ بھی اس شخص کو ملے گا جو حج کو اس طرح کرے جیسا کہ اس کو کرنا چاہئے۔ حج کی حقیقت کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

الحج اشھر معلومٰت۔ فمن فرض فیھن الحج فلا رفث ولا فسوق ولا جدال فی الحج۔ وما تفعلوا من خیر یعلمہ اللہ۔ وتزودوا فان خیر الزاد التقوٰی واتقون یا اولی الالباب (بقرہ ۱۹۷)

حج کے مہینے معلوم ہیں۔ جو شخص ان میں حج کما پنے اوپر مقرر کرے تو حج میں نہ فحاشی ہے، نہ بے حکمی اور نہ جھگڑا۔ اور تم جو بھلائی کروگے، اللہ اس کو جان لے گا۔ اور زادراہ لے لیا کرو۔ سب سے بہتر زادراہ تقویٰ ہے۔ اے عقل والو مجھ سے ڈرو۔

رفث کے معنی ہیں فحش کلامی کرنا۔ فسق کا لفظ تقریباً اسی مفہوم میں آتا ہے جس کے لئے اردو میں کہتے ہیں: "اس نے انسانیت کا جامہ آتار پھینکا" جدال کے معنی ہیں ایک دوسرے سے جھگڑا کرنا۔ یہ تینوں الفاظ اس برائی کے لئے استعمال ہوتے ہیں جو عام طور پر زبان سے سرزد ہوتی ہے۔ جب مختلف لوگ اکٹھا ہوتے ہیں تو کوئی ہوس پرست آدمی فحش باتیں کرکے سنجیدہ ماحول کو بگاڑ دیتا ہے۔ کبھی کوئی عام عادت کے خلاف بات پیش آتی ہے اور آدمی اپنا ظاہری لبادہ آتار کر ناحق باتیں کرنا شروع کر دیتا ہے۔ کبھی کسی سے کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے اور آدمی برداشت نہ کرتے ہوئے اس سے جھگڑنے لگتا ہے۔ حج کا اجتماع اسی قسم کی تمام برائیوں سے بچنے کی ایک تربیت ہے۔ ایک ایسا مقام جس سے تقدس اور احترام کی یادیں وابستہ ہیں، وہاں لے جاکر آدمی کو خصوصی طور پر اس کی مشق کرائی جاتی ہے کہ وہ اجتماعی ماحول میں رہتے ہوئے ان برائیوں سے بچنے کی کوشش کرے۔ وہ اپنے آپ کو فواحش اور سطحی دلچسپیوں سے ہٹا کر سنجیدہ چیزوں کی طرف راغب کرے۔ اس کے اندر ہر حال میں حق وصلاح پر قائم رہنے کا مزاج پیدا ہو۔ اجتماعی زندگی میں ناخوش گوار تجربات پیش آنے یا دل کو ٹھیس لگنے کے باوجود وہ اپنے بھائی سے لڑنے کے لئے نہ کھڑا ہو جائے۔

جب بھی چند آدمی کہیں جمع ہوتے ہیں یا ل کرر ہتے ہیں تو ایک کو دوسرے سے کوئی نہ کوئی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی صورت حال حج میں بہت بڑے پیمانہ پر پیش آتی ہے۔ کیوں کہ حج کے موقع پر مختلف قسم کے لوگ بہت بڑی تعداد میں ایک مقام پر اکٹھا ہو جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حج کے دوران بار بار ایک کو دوسرے سے تکلیف پہنچتی ہے۔ اب اگر لوگ ذاتی شکایتوں کی بنا پر ایک دوسرے سے لڑنے لگیں تو عبادت کی فضا ختم ہو جائے اور حج کا مقصد حاصل نہ ہو سکے۔ اس لئے حج کے زمانہ میں جھگڑنے اور غصہ کرنے کو مطلق حرام قرار دے دیا گیا۔ اس طرح حج کو ایک بہت بڑی چیز کے لئے تربیت کا ذریعہ بنا دیا گیا۔ کیوں کہ لڑائی جھگڑا جس طرح حج کو باطل کر دیتا ہے اسی طرح وہ ایک مسلمان کی عام زندگی کو بھی اسلام سے دور کر دیتا ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کسی ظاہری چیز کو تقویٰ کی علامت سمجھ لیتا ہے اور اس کو اختیار کرکے سمجھتا ہے کہ اس نے متقیانہ زندگی حاصل کرلی۔ حالاں کہ اصل حقیقت کے اعتبار سے اس کا دل تقویٰ سے بالکل خالی ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں نے یہ سمجھا کہ حج کے سفر میں زادراہ نہ رکھنا تقویٰ کی علامت ہے۔ وہ اس کا خوب اہتمام کرنے لگے۔ مگر زادراہ کا تعلق ضرورت سے ہے نہ کہ تقویٰ سے۔ اس قسم کی چیزوں میں آدمی کو اپنی ضرورت کے اعتبار سے تیاری کرنا چاہئے۔ مگر تقویٰ اس سے بالکل الگ چیز ہے۔ اس کا تعلق دل سے ہے۔ اللہ کے یہاں کوئی شخص محض اس لئے مقبول نہیں ہو جاتا کہ اس نے خواہ مخواہ زادراہ کے بغیر سفر کیا اور اپنے جسم کو غیر ضروری مشقت میں ڈالا۔ اللہ کو دل کا تقویٰ مطلوب ہے۔ حج کے سفر کو تقویٰ کا زادراہ فراہم کرنے کا ذریعہ ہونا چاہئے، کیونکہ یہی وہ زادراہ ہے جو آخرت کے سفر میں آدمی کے کام آئے گا ——— حج کے مسافر اور اسی طرح زندگی کے مسافر کے لئے بہترین عقلمندی یہ ہے کہ وہ شہوانی باتوں سے بچے، وہ اللہ کی ناپسندیدہ حرکتوں اور لڑائی جھگڑے کی چیزوں سے اپنے آپ کو دور رکھے۔

اسلامی معاشرہ

سماج کیا ہے۔ بہت سے آدمیوں کا مل جل کر رہنا۔ جب بہت سے آدمی مل کر ایک ساتھ رہیں تو ان کے درمیان طرح طرح کے تعلقات قائم ہوتے ہیں۔ کوئی کسی کا رشتہ دار ہوتا ہے کوئی کسی کا پڑوسی۔ کوئی کسی کا ہم قوم ہوتا ہے کوئی کسی کا ہم وطن۔ کوئی تاجر ہوتا ہے اور کوئی گاہک۔ کوئی مالک مکان ہوتا ہے اور کوئی کرایہ دار۔ اس طرح کے مختلف تعلقات کی بنا پر لوگوں کے درمیان بار بار معاملات پیش آتے ہیں۔ ان معاملات کے دوران کبھی کسی سے نفرت کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں اور کسی سے محبت کے۔ کسی سے کچھ لینا ہوتا ہے اور کسی کو کچھ دینا۔ کسی سے اختلاف ہوتا ہے اور کسی سے اتفاق۔ کوئی اپنا بن جاتا ہے اور کوئی غیر دکھائی دیتا ہے۔ یہی چیز ہے جو لوگوں کے درمیان سماجی تعلقات پیدا کرتی ہے اور یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کیا کیا جائے اور کیا نہ کیا جائے۔ بہت سے پتھر ایک ساتھ پڑے ہوں تو ان میں باہمی تعلقات قائم نہیں ہوتے، اس لئے ان کے درمیان مذکورہ قسم کے مسائل بھی پیدا نہیں ہوتے مگر جب بہت سے انسان ایک ساتھ مل کر رہیں تو ان میں باہمی تعلقات قائم ہوتے ہیں اور اس بنا پر ان کے درمیان طرح طرح کے مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے مواقع پر اسلام کی تعلیم کیا ہے۔ مسلمان جب ایک سماج کی صورت میں مل کر رہیں تو وہ آپس میں کس طرح رہیں اور معاملات میں ایک دوسرے کے ساتھ کس قسم کا سلوک کریں، اس کی وضاحت کے لئے چند حدیثیں ملاحظہ فرمائیں۔

عن انس رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا یؤمن احدکم حتی یحبَّ لاخیہ ما یحبُّ لنفسہ (متفق علیہ) ۸۲

تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کا یہ حال نہ ہو جائے کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی پسند کرے جو وہ خود اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: کلُّ المسلم علی المسلم حرام دمُہ ومالُہ وعرضُہ (مسلم) ۸۲

ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی تین چیزیں حرام ہیں اس کا خون، اس کا مال اور اس کی آبرو

عن عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: المسلم من سَلِمَ المسلمون من لسانہ ویدہ (متفق علیہ)

مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ ہوں

عن النعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: مثل المومنینَ فی توادِّہم وتراحمِہم وتعاطفِہم مثل الجسدِ اذا اشتکیٰ منہ عُضوٌ تداعیٰ لہ سائرُ الجسدِ بالسہرِ والحمیٰ (متفق علیہ)

مسلمانوں کی مثال آپس کی محبت اور آپس کی رحم دلی اور آپس کی مہربانی کے معاملہ میں ایسی ہے جیسے ایک جسم۔ جب جسم کے کسی عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم مل کر جاگتا ہے اور سارا جسم بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

عن ابن عُمَر رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: المسلم اخو المسلم لا یظلمہ ولا

ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے نہ وہ اس پر ظلم کرتا اور نہ اس کو بے یار و مددگار چھوڑتا۔ جو شخص اپنے بھائی کی

یُسْلِمُہ، من کان فی حاجۃِ اخیہ کان اللہ فی حاجتہ ومن فرّج عن مسلم کُربۃً فرّج اللہ عنہ بھا کُربۃً من کُربِ یوم القیامۃِ ومن ستر مسلماً ستره اللہ یوم القیامۃ (متفق علیہ)

حاجت پوری کرے گا تو اللہ اس کی حاجت پوری کرے گا۔ جو شخص کسی مسلمان کی تکلیف دور کرے گا تو اللہ قیامت کے دن اس کی تکلیف دور کرے گا۔ جو شخص کسی مسلمان کو ڈھانکے گا تو اللہ قیامت کے دن اس کو ڈھانکے گا۔

عن عیاض بن حمار رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: ان اللہ تعالیٰ اوحیٰ الی ان تواضعوا حتی لا یبغیَ احد علی احدٍ ولا یفخرَ احدٌ علی احدٍ (مسلم)

اللہ نے میری طرف وحی کی ہے کہ تم لوگ تواضع اختیار کرو۔ کوئی شخص کسی کے اوپر زیادتی نہ کرے۔ کوئی شخص کسی کے اوپر فخر نہ کرے۔

عن ابی موسیٰ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: المومنُ للمومن کالبُنیانِ یَشُدُّ بعضُہ بعضاً وشبّکَ بین اصابعہ (متفق علیہ)

ایک مومن کی مثال دوسرے مومن کے لئے ایسی ہے جیسے عمارت۔ عمارت کی ایک اینٹ دوسری اینٹ کو مضبوط کرتی ہے اسی طرح سب مسلمان باہم جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کی روشنی میں اسلامی سماج کی جو تصویر بنتی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان دوسرے مسلمانوں کے درمیان اس طرح رہتا ہے کہ وہ ان کو غیر نہیں سمجھتا بلکہ اپنا ہی ایک حصہ سمجھتا ہے۔ دوسروں کے کسی رویہ سے جب اس کو خوشی محسوس ہوتی ہے تو وہ جان لیتا ہے کہ دوسرے کس بات سے خوش ہوں گے۔ اس لئے وہ خود بھی دوسروں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح جب کسی ایک کا رویہ اس کے لئے تکلیف کا باعث ہوتا ہے تو اس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ دوسرے کس چیز سے تکلیف محسوس کریں گے اور وہ اس کا سخت اہتمام کرتا ہے کہ دوسروں کو اس کی ذات سے اس قسم کے سلوک کا تجربہ نہ ہونے پائے۔ حتیٰ کہ ایک مسلم آبادی ایک واحد جسم کی مانند ہو جاتی ہے۔ جسم کے ایک حصہ میں تکلیف ہو تو ناممکن ہے کہ بقیہ جسم اس کے لئے تڑپ نہ اٹھے۔ اسی طرح ایک مسلمان کی تکلیف سارے مسلمانوں کی تکلیف بن جاتی ہے اور لوگوں کو اس وقت تک چین نہیں آتا جب تک وہ اپنے بھائی کی تکلیف دور نہ کر دیں۔ مسلمان کا سماج ایک ایسا سماج ہے کہ جب بھی ایک شخص کا دوسرے سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ اس کے اندر محبت اور رحم دلی اور مہربانی پاتا ہے۔ ہر ایک دوسرے کی حاجت برآری کے لئے اس طرح تیار رہتا ہے جیسے کہ وہ اس کا اپنا مسئلہ ہو۔ کوئی دوسرے مسلمان کو ننگا یا بے گھر دیکھتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے جیسے وہ خود ننگا اور بے گھر ہو گیا ہو۔ کسی کو برداشت نہیں ہوتا کہ وہ دوسرے بھائی کو بے سہارا چھوڑ دے۔ ایک کو دوسرے سے ظلم اور گھمنڈ کے بجائے تواضع اور انصاف ملتا ہے۔ کوئی کسی کے اوپر فخر نہیں کرتا، کوئی کسی کے اوپر حسد نہیں کرتا۔ بلکہ ہر ایک دوسرے کا خیر خواہ ہوتا ہے، ہر ایک دوسرے کا ساتھی بن جاتا ہے۔ مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح رہتے ہیں کہ ان کے لئے ناقابل تصور ہوتا ہے کہ وہ اپنے بھائی کے خون کو اپنے لئے جائز کر لیں خواہ اس سے کتنی ہی زیادہ تکلیف ان کو پہنچی ہو۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا مال لے لینے سے اسی طرح بچتا ہے جیسے کوئی شخص آگ کو ہاتھ میں لینے سے بچتا ہے۔ ایک مسلمان کے لئے دوسرے مسلمان کی آبرو پر حملہ کرنا اسی طرح ناممکن ہو جاتا ہے جیسے اپنے باپ کو سر بازار ننگا کرنا۔

اسلامی سماج میں اس قسم کی فضا کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک حد درجہ متحد سماج بن جاتا ہے جس سماج میں ہر ایک

دوسرے کے ساتھ انصاف کرے، ہر ایک دوسرے کا خیر خواہ ہو اس سماج میں اتحاد کے سوا اور کیا چیز جگہ پائے گی۔ ایک مسلم آبادی اپنے تمام افراد کے ساتھ گویا ایک بہت بڑی عمارت ہوتی ہے۔ اس کا ہر فرد اس عظیم عمارت کی ایک اینٹ ہوتا ہے۔ ہر اینٹ دوسری اینٹ سے جڑی ہوتی ہے۔ ہر اینٹ دوسری اینٹ کو مضبوط کر رہی ہوتی ہے۔ ایک اینٹ اور دوسری اینٹ کے درمیان جو تعلق ہوتا ہے وہ دوری اور ٹکراؤ کا نہیں ہوتا بلکہ جوڑ اور پیوستگی کا ہوتا ہے۔ ہر اینٹ اگرچہ ایک دوسرے سے الگ ہوتی ہے مگر الگ ہونے کے باوجود وہ سماجی اعتبار سے پوری عمارت کا ایک اٹوٹ حصہ ہوتی ہے۔ اس سے عمارت کو طاقت ملتی ہے نہ کہ کمزوری۔ وہ اپنے اوپر عمارت کو تھامے ہوئے ہوتی ہے نہ کہ خود عمارت کو اپنے اوپر کھڑا کرنے کی کوشش کرے۔ ایک مومن جس خدا کا طالب ہوتا ہے دوسرا مومن بھی اسی خدا کا طالب ہوتا ہے۔ ایک مومن کی منزل مقصود جس طرح آخرت ہوتی ہے دوسرے مومن کی منزل مقصود بھی اسی طرح آخرت ہوتی ہے ایسی حالت میں کیوں کر ممکن ہے کہ وہ ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ مزید یہ کہ وہ جانتے ہیں کہ یہ دنیا بھلائی اور برائی کی کش مکش کی جگہ ہے۔ یہاں شیطان کے ساتھی اپنے عمل کے لئے آزاد ہیں۔ جو شخص بھی بھلائی کے راستہ پر چلنا چاہے اس کو برائی کی طاقتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنا راستہ بنانا ہوگا۔ اس لئے ضروری ہے کہ سب مسلمان مل کر رہیں۔ باہم ملنے سے ان کی طاقت بہت بڑھ جائے گی اور وہ زیادہ کامیابی کے ساتھ برائی کی طاقتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے رب کی طرف بڑھ سکیں گے

اس قسم کا اسلامی سماج کس طرح بنتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ خوف خدا کے ذریعہ۔ دنیا کی تمام بھلائیوں کا راز یہ ہے کہ آدمی اللہ سے ڈرے۔ اور دنیا کی تمام برائیوں کی جڑ یہ ہے کہ آدمی کا سینہ اللہ کے ڈر سے خالی ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی شخص دوسروں کے ساتھ سب سے بہتر سلوک کر سکتا ہے جو دوسروں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرتا ہو۔ حضرت عمر تابعی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جن اصحاب سے میں ملا ان کو میں نے یہ کہتے ہوئے پایا کہ لوگوں میں تمہارا سب سے زیادہ خیر خواہ وہ ہے جو تمہارے معاملہ میں اللہ سے ڈرتا ہو (انصح الناس لک من خاف اللہ فیک، جامع العلوم والحکم ۱) یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ کی پکڑ کے اندیشہ کے سوا کوئی چیز آدمی کو روک نہیں سکتی۔ جب آدمی پر ایک حیوانی جذبہ کا غلبہ ہوتا ہے، جب کسی معاملہ میں اس کا کوئی مفاد وابستہ ہو جاتا ہے، جب کوئی چیز اس کے لئے عزت و وقار کا مسئلہ بن جاتی ہے تو اس وقت انسان وہ سب کچھ کر ڈالنا چاہتا ہے جو اس کے بس میں ہے۔ ایسے موقع پر صرف ایک ہی چیز ہے جو آدمی کو قابو میں رکھے اور اس کو انصاف کے راستہ سے ہٹنے نہ دے۔ اور وہ یہ احساس کہ ہر آدمی کا معاملہ اللہ کے یہاں پیش ہونا ہے اور ہر ایک کو اس کے کئے کا پورا بدلہ ملنا ضروری ہے۔ دنیا میں اگر کوئی شخص اپنے کو بچا بھی لے تو آخرت میں وہ اپنے آپ کو خدا کی پکڑ سے نہیں بچا سکتا۔

مسلمانوں کا سماج خیر خواہی اور انصاف کا سماج ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ان میں سے ہر شخص اللہ سے ڈرنے والا ہوتا ہے ایک مسلمان کا معاملہ جب دوسرے مسلمان سے پیش آتا ہے تو اس کو وہ محض ایک انسانی معاملہ نہیں سمجھتا بلکہ ایک خدائی معاملہ سمجھتا ہے۔ اس کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ میں ایک انسان سے نہیں بلکہ خدا سے معاملہ کر رہا ہوں جو تمام طاقتوں کا مالک ہے۔ ہر آدمی کے پیچھے اس کو خدا کھڑا ہوا نظر آتا ہے۔ ہر معاملہ اس کو ایک ایسا معاملہ دکھائی دیتا ہے جو آخرت کی عدالت میں پیش ہوگا اور تمام کھلے اور چھپے کا جاننے والا مالک اس کے بارہ میں بے لاگ فیصلہ فرمائے گا۔ مسلمان یہ سمجھتا ہے کہ اس کو لازماً مرنا ہے اور مرنے کے بعد اللہ کے یہاں حساب کتاب کے لئے حاضر ہونا ہے۔ وہ اللہ سے اس بات کی دعائیں کر رہا ہوتا ہے کہ آخرت کی پیشی کے دن وہ اس کے ساتھ

زمی کا معاملہ فرمائے۔ اس کی یہ نفسیات اس کو دوسرے انسانوں کے معاملہ میں نرم کر دیتی ہے۔ وہ اپنے ساتھ دوسروں کی زیادتیوں کو معاف کر دیتا ہے تاکہ اس کا خدا قیامت کے دن اس کی زیادتیوں کو معاف کر دے۔ وہ خدا کے بندوں کے ساتھ فیاضی کا معاملہ کرتا ہے تاکہ خدا بھی اس کے ساتھ فیاضی کا معاملہ کرے۔ بندوں کی طرف سے اس کو جتنا ملتا ہے اس سے زیادہ وہ ان کو لوٹاتا ہے تاکہ خدا اس کے حقیر عمل کے بدلے اپنے بڑے بڑے انعامات اس کے حصہ میں لکھ دے۔

اسلامی سماج میں آدمی اپنے حقوق سے زیادہ اپنی ذمہ داریوں کو دیکھتا ہے اور اختلاف و شکایت کے مواقع پر خود اپنے کو قصوروار مان لیتا ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ ایک شخص کا قرض تھا۔ وہ آیا اور آپ سے بہت بھدے انداز میں تقاضا کرنے لگا۔ آپ کے اصحاب جو اس وقت آپ کے ساتھ تھے، اس کی سخت باتوں کو سن کر بگڑ گئے اور اس کو مارنا چاہا۔ آپ نے منع فرمایا۔ آپ نے اس کے قصور کو اپنے آپ پر لیتے ہوئے فرمایا: اس کو چھوڑ دو۔ کیونکہ ایک حق دار کو کہنے سننے کا حق ہے (دَعُوہ فانّ لصاحب الحقّ مقالاً، متفق علیہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی ذات سے نمونہ قائم کر کے حق دار کو کہنے سننے کا موقع دیا اور اس طرح ہر قسم کے سماجی فساد کی جڑ کاٹ دی۔

اسلامی سماج میں یہ مزاج ہوتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ حد درجہ رعایت کی جائے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک اعرابی آیا اور مدینہ کی مسجد نبوی میں پیشاب کرنے لگا۔ لوگ اس کو پکڑنے اور مارنے کے لئے دوڑے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو آپ نے لوگوں کو منع فرمایا اور اس کو پیشاب کرنے سے نہ اٹھایا۔ آپ نے کہا: اس اعرابی کو چھوڑ دو۔ اور اس نے جہاں پیشاب کیا ہے وہاں ایک ڈول پانی کا ڈال دو۔ کیوں کہ تم آسانی پیدا کرنے کے لئے بھیجے گئے ہو، تم مشکل پیدا کرنے کے لئے نہیں بھیجے گئے (بخاری) عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نرم ہے اور سارے معاملات میں نرمی کو پسند کرتا ہے (ان اللہ رفیق یحب الرفق فی الامر کلہ، متفق علیہ) یہ نرمی اور رعایت اسلامی سماج کی اہم ترین خصوصیت ہے۔

اسلامی سماج ایک با اصول سماج ہے مگر اسی کے ساتھ وہ حد درجہ نرمی اور رعایت کا سماج ہے۔ مومن وہ ہے جو اپنے لئے شدت اور دوسرے کے لئے رعایت کو پسند کرے۔

اسلامی سماج میں کم بولنے اور زیادہ عمل کرنے کا ماحول ہوتا ہے۔ انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مسلمان کا انتقال ہوا۔ وہ ایک جہاد میں لڑ کر مرا تھا۔ ایک شخص نے کہا: اس کو جنت کی خوش خبری ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا: تم کو کیا معلوم شاید وہ شخص بے فائدہ باتیں کرتا رہا ہو اور ایسے خرچ میں بخل کرتا رہا ہو جس میں اس کا نقصان نہ تھا (لعلہ تکلم بما لا یعنیہ او بخل بما لا یغنیہ، ترمذی) اسی طرح ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا — اللہ تمہاری صورتوں کو نہیں دیکھتا وہ تمہارے عمل کو دیکھتا ہے (ان اللہ لا ینظر الی صورکم ولکن ینظر الیٰ اعمالکم) اسلامی سماج بے حد سنجیدہ سماج ہوتا ہے۔ اس لئے وہاں کوئی شخص غیر ضروری کلام نہیں کرتا۔ ہر شخص کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ضروری کاموں میں مشغول رکھے۔

اسلامی سماج میں اپنی محنت پر بھروسہ کرنے کا ماحول ہوتا ہے۔ آدمی مانگ کر حاصل کرنے کے بجائے کر کے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ آدمی یہ نہیں سوچتا کہ جو کچھ دوسروں کے پاس ہے وہ میں چھین کر یا مطالبہ کر کے حاصل کر لوں بلکہ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اللہ نے مجھ

کو ہاتھ پاؤں اور دل و دماغ کی جو صلاحیت دی ہے اس کو بروئے کار لاکر اپنی زندگی اپنے آپ بناؤں۔ ابو عبدالرحمن عوف بن مالک اشجعی رض کہتے ہیں۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھے، اور ہم تقریباً نو آدمی تھے۔ آپ نے فرمایا: کیا تم رسول خدا سے بیعت نہیں کرتے۔ چوں کہ ہم جلد ہی بیعت کر چکے تھے، ہم نے کہا اے خدا کے رسول ہم بیعت کر چکے ہیں۔ آپ نے دوبارہ فرمایا: کیا تم رسول خدا سے بیعت نہیں کرتے، ہم نے اپنے ہاتھ پھیلا دئے اور کہا: اے خدا کے رسول ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں۔ پھر ہم کس چیز پر بیعت کریں۔ آپ نے فرمایا: یہ کہ تم اللہ کی عبادت کروگے اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کروگے۔ اور پانچ وقت کی نماز اور اطاعت۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا: ولا تسألوا الناس شیئا (اور تم لوگوں سے کوئی چیز نہ مانگوگے) راوی کہتے ہیں کہ ان میں سے بعض کو میں نے دیکھا کہ وہ گھوڑے پر سوار ہے اور اس کا کوڑا گر گیا ہے تو وہ کسی سے مانگتا نہیں، بلکہ اتر کر خود کوڑے کو اٹھاتا ہے (مسلم) اس کا مطلب ہے کہ اسلامی سماج میں مانگنے اور مطالبہ کرنے کا ماحول نہیں ہوتا۔ ہر شخص اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتا ہے اور اپنی ذاتی محنت پر بھروسہ کرتا ہے۔

ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان کھڑے ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا اور اللہ پر ایمان لانا سب سے افضل اعمال ہیں۔ ایک شخص اٹھا اور اس نے کہا: اے خدا کے رسول کیا اگر میں اللہ کے راستہ میں مارا جاؤں تو میری خطائیں بخش دی جائیں گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ہاں، اگر تم اللہ کے راستہ میں مارے جاؤ، اس حال میں کہ تم صبر کرنے والے اور خالص اللہ کے لئے لڑنے والے ہو۔ آگے بڑھنے والے ہو پیچھے ہٹنے والے نہیں ہو تو تم بخش دئے جاؤگے۔ کچھ دیر کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ پوچھا: تم نے کس طرح کہا تھا۔ اس نے اپنے سوال کو دہرایا۔ آپ نے دوبارہ اپنے جواب کو دہراتے ہوئے کہا: ہاں، اگر تم اللہ کے راستہ میں مارے جاؤ، اس حال میں کہ تم صبر کرنے والے اور خالص اللہ کے لئے لڑنے والے ہو، آگے بڑھنے والے ہو پیچھے ہٹنے والے نہیں ہو تو تم بخش دئے جاؤگے۔ لیکن اگر تمہارے اوپر قرض ہے تو اس کی بخشش نہ ہوگی۔ کیوں کہ ابھی جبریل نے مجھ کو بتایا ہے (الا الدین فان جبریل قال لی ذالک، مسلم) اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی سماج میں ہر آدمی بے حد محتاط ہوتا ہے کہ اس کے ذمہ کسی کا قرض یا حقوق باقی نہ رہ جائیں۔ ایک مسلمان کا ذہن یہ ہوتا ہے کہ دین کی راہ میں خواہ میں کتنی ہی بڑی قربانی کروں مگر اللہ کی نظر میں میری قیمت اسی وقت ہوگی جب کہ میں اللہ سے اس طرح ملوں کہ میں نے کسی کا حق نہ دبایا ہو، میرے ذمہ لوگوں کے مطالبات نہ ہوں۔ اگر میرے ذمہ کسی انسان کا حق ہے اور میں اس کو ادا نہیں کرتا تو دین کی راہ میں میرا جان دے دینا بھی مجھ کو آخرت میں نجات نہ دے سکے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگو صدقہ کرو۔ ایک شخص نے پوچھا: اے خدا کے رسول اگر آدمی کے پاس مال نہ ہو۔ آپ نے فرمایا کہ پھر وہ لوگوں سے بھلی بات کہے۔ کیوں کہ وہ بھی صدقہ ہے۔ آدمی نے دوبارہ پوچھا: اے خدا کے رسول اگر اس کے پاس بھلی بات بھی نہ ہو۔ آپ نے فرمایا: پھر وہ دوسروں کو اپنے شر سے بچائے (یدع الناس من شرہ) اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی سماج میں سب سے بہتر آدمی وہ ہے جو لوگوں کے لئے سب سے زیادہ نفع بخش ہو۔ اللہ نے اس کو جو کچھ دیا ہے اس میں سے وہ دوسروں کو دیتا رہے۔ اس کے قول اور عمل سے دوسروں کو فائدہ پہنچے۔ اس کے بعد کم سے کم درجہ یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات سے کسی کو نقصان نہ پہنچنے دے۔ اگر وہ دوسروں کو کچھ نہ دے سکے تو وہ دوسروں کو محروم بھی نہ کرے۔ اگر وہ دوسروں کے کام نہ آئے تو دوسروں کے

کام بگاڑنے کی کوشش بھی نہ کرے۔ اگر دوسروں کے لئے اس کے پاس میٹھے بول نہ ہوں تو وہ ان کو کڑوا بول بھی نہ دے۔

امام مالک نے موطا میں روایت کیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: مجھے ایسی بات بتائیے جس کے ساتھ میں جیوں (یا رسول اللہ علمنی کلمات اعیش بھن) آپ نے فرمایا غصہ نہ کر (لا تغضب)۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی سماج مثبت نفسیات رکھنے والوں کا سماج ہے۔ اس کے افراد ہر قسم کی منفی نفسیات سے پاک ہوتے ہیں۔ غصہ ہر قسم کی منفی نفسیات کی جڑ ہے۔ "غصہ نہ کر" کا مطلب یہ ہے کہ منفی نفسیات میں نہ جیو بلکہ مثبت نفسیات میں جیو۔ دوسروں کی طرف سے اشتعال انگیزی ہو یا دوسروں سے تم کو تکلیف پہنچے تو اس کا جواب تم غصہ، نفرت، انتقام، حسد اور حقارت جیسے جذبات سے نہ دو بلکہ محبت، انصاف، خیر خواہی اور عفو و درگزر کا طریقہ اختیار کرو۔ جب بھی کوئی معاملہ پیش آئے تو ٹھنڈے دل سے سوچو اور صرف وہ کرو جو اللہ کی رضا کے اعتبار سے سب سے بہتر ہو نہ کہ وہ جس سے تمہارے بھڑکتے ہوئے جذبات کو تسکین مل رہی ہو۔ کسی کے خلاف تمہاری کارروائی جوابی کارروائی نہ ہو بلکہ اللہ کی جواب دہی کو سامنے رکھتے ہوئے ایک سوچی سمجھی کارروائی ہو۔ تمہاری غذا غصہ اور نفرت اور انتقام نہ ہو، بلکہ برداشت کرنا اور معاف کر دینا ہو۔ تم غصہ نہ کرنے میں جیو، نفرت نہ کرنے میں جیو، انتقام نہ لینے میں جیو، حسد نہ کرنے میں جیو۔

اسلامی معاشرہ میں جب ایک شخص دوسروں سے انصاف کرتا ہے اور ان کے حقوق ادا کرتا ہے تو یہ اس کے لئے عام معنوں میں محض ایک اخلاقی یا انسانی معاملہ نہیں ہوتا۔ یہ اس کے لئے ایسا مسئلہ ہوتا ہے جس پر آخرت میں اس کی نجات کا انحصار ہو۔ جو شخص بندوں کے ساتھ بہتر سلوک کرے وہی آخرت میں اس قابل ٹھہرے گا کہ خدا اس کے ساتھ بہتر سلوک کرے۔ اور جو شخص دوسرے انسانوں کے ساتھ بہتر سلوک نہ کرے اس کے لئے آخرت میں خدا کی رحمتوں میں کوئی حصہ نہیں۔ یہی دنیا کی زندگی میں آدمی کا امتحان ہے اور یہ امتحان خاص طور پر کمزور اور بے سہارا انسانوں کے بارے میں لیا جاتا ہے کیوں کہ ایسے افراد کے ساتھ بہتر سلوک کے لئے خدا کی رضا کے سوا اور کوئی محرک نہیں ہوتا۔ آدمی جب طاقتور کے ساتھ بہتر سلوک کرے تو اس میں یہ امید شامل رہتی ہے کہ دوسرے شخص کی طرف سے کسی نہ کسی صورت میں اس کا بدلہ ملے گا۔ اسی طرح جب کسی عوامی موقع پر آدمی انسانیت دوستی کا ثبوت دیتا ہے تو اس میں بھی یہ امید ہوتی ہے کہ اس سے آدمی کی شہرت و عزت میں اضافہ ہوگا۔ مگر جب ایک تنہا اور بے زور آدمی اس کے سامنے ہو اور اس سے مدد کی درخواست کرے تو وہاں اس قسم کی کوئی کشش موجود نہیں ہوتی۔ اور اگر یہ بے زور شخص ایک ایسا شخص ہو جس سے آدمی کو تکلیف اور شکایت پہنچی ہے تو ایسے موقع پر یہ عدم جاذبیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اس وقت جو آدمی بے غرض ہو کر اور شکایات سے اوپر اٹھ کر اس کی مدد کرتا ہے تو وہ خالص خدا کے لئے ایسا کر رہا ہے، کیونکہ خدا کی رضا کے سوا کوئی دوسری کھینچنے والی چیز وہاں موجود نہیں۔ جہاں ہر قسم کی دوسری کشش ختم ہو جائے وہاں خدا کی کشش موجود ہوتی ہے۔ اور جو شخص خالص خدا کے لئے دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک کرے وہ خدا کا محبوب ترین بندہ ہوتا ہے۔ وہ عین اس مقام پر خدا کو پالیتا ہے جہاں اس نے خالص خدا کی خاطر کسی بندے کا آنسو پونچھا تھا۔

خلاصہ تقریر بمقام بھوپال (مدھیہ پردیش) ۲۹ جنوری ۱۹۸۴

تنظیم

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان میں بارہ نقیب مقرر کئے اور اللہ نے ان سے کہا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، اگر تم نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ ادا کرو اور میرے رسولوں کو مانو اور ان کی مدد کرو اور اللہ کو قرض حسن دو، اگر تم ایسا کرو تو یقیناً میں تمہاری برائیوں کو تم سے دور کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ پس اس کے بعد تم میں سے جس نے انکار کیا تو اس نے سواء السبیل کھو دی (مائدہ ۱۲)

ایک دانہ کے اندر خدا نے ایک سرسبز و شاداب پودا چھپا رکھا ہے اور ایک گٹھلی کے اندر ایک پورا درخت موجود ہے۔ مگر یہ امکانات صرف اس وقت بروئے کار آتے ہیں جب کہ دانہ یا گٹھلی کو مٹی میں ڈالا جائے۔ اگر ان کو شیشہ کی میز پر سجا کر رکھ دیا جائے تو نہ دانہ سے پودا نکلے گا اور نہ گٹھلی کبھی درخت کی صورت اختیار کرے گی۔ اسی طرح اللہ نے دنیا کی ہر چیز کا ایک قاعدہ مقرر کر دیا ہے۔ یہ قاعدہ ہمیشہ کے لئے اٹل ہے۔ ہر چیز اسی مقررہ قاعدہ پر قائم ہوتی ہے اور اسی کے مطابق بڑھتی ہے۔ اگر اس قاعدہ کی خلاف ورزی کی جائے تو کبھی مطلوبہ نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔

یہی معاملہ انسانی زندگی کا بھی ہے۔ جو قوم آسمانی کتاب کی حامل ہو اس کے لئے اللہ تعالیٰ کا مخصوص ضابطہ ہے۔ ایسی قوم کس طرح زمین میں جڑ پکڑتی ہے اور دنیا و آخرت میں فلاح حاصل کرتی ہے، اس کا ضابطہ مذکورہ آیت میں بیان کر دیا گیا ہے۔ اس قرآنی ضابطہ کو یہاں سواء السبیل کہا گیا ہے۔

سواء السبیل (اللہ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ) یہ ہے کہ آدمی دنیا میں ایک قسم کی پابند زندگی گزارے۔ وہ اس طرح رہے گویا کہ وہ خدا کے عہد کی رسی میں بندھا ہوا ہے۔ اس عہد کی زندگی کی پہلی شرط، ایمان کے بعد، یہ ہے کہ آدمی نماز قائم کرے یعنی اللہ کے آگے اپنے کو جھکا دے، وہ اللہ کی قربت تلاش کرنے والا بن جائے۔ پھر وہ زکوٰۃ ادا کرے۔ یعنی وہ دوسرے بندوں کا اس حد تک خیر خواہ ہو کہ اپنی کمائی میں ان کا لازمی حق سمجھنے لگے۔ پھر یہ کہ اللہ کے دین کی دعوت کے معاملہ میں وہ غیر جانب دار نہ رہے، بلکہ اس میں اپنے آپ کو پوری طرح شامل کرے، وہ داعیان دین کی مدد کرے۔ اپنے بہترین اثاثہ کو اس کام کو مؤثر اور طاقت ور بنانے میں لگا دے۔ یہی وہ عہد کی زندگی ہے جو ہر فرد مسلم سے مطلوب ہے، اس زندگی کو اختیار کئے بغیر کوئی شخص خدا کی قربت و معیت حاصل نہیں کر سکتا اور نہ اس قابل قرار پا سکتا کہ خدا اس کی مدد کرے۔

اس خدا پرستانہ زندگی کو اس کی صحیح صورت میں باقی رکھنے کے لئے تنظیم کا حکم دیا گیا ہے۔ ہر مسلم معاشرہ کے اوپر خدا کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنے درمیان سمع و طاعت کا نظام قائم کرے۔ یعنی وہ اپنے اندر سے کچھ لوگوں کو

اپنا سربراہ مقرر کرے اور جب ان کا تقرر ہو جائے تو پسند ناپسند کو نظر انداز کر کے ان کی اطاعت کرے۔ نماز کی باقاعدہ اقامت، زکوٰۃ کی اجتماعی وصولی اور تقسیم، دعوت دین کا عمومی نظام، سب اسی وقت بہتر طور پر ادا ہو سکتے ہیں جب کہ مسلمانوں کے درمیان اجتماعی نظم قائم ہو، ان میں کچھ ایسے لوگ مقرر ہوں جو اس کی نگرانی کریں اور تمام لوگ اس کو ایک دینی فریضہ سمجھ کر اپنے سربراہوں کی اطاعت کریں۔

اس تنظیم سے مراد حکومتی تنظیم نہیں ہے۔ بلکہ وہ تنظیم ہے جو ہر حال میں مسلمانوں کے اپنے بس میں ہے، خواہ ان کے پاس سیاسی اقتدار ہو یا نہ ہو۔ اسلامی تنظیم حقیقۃً ایک عبادت ہے اور عبادت وہی مطلوب اور نتیجہ خیز ہے جو اختیاری طور پر ہو نہ کہ کسی خارجی دباؤ کے تحت۔ اسلامی تنظیم دراصل اس بات کی ایک دنیوی علامت ہے کہ آدمی نے اپنے آپ کو خدا کے حکم کے حوالے کر دیا ہے۔ اسلامی تنظیم میں اپنے کو باندھنا گویا خدائی اطاعت کے امتحان میں پورا اترنا ہے اور اسلامی تنظیم میں بندھنے کے لئے تیار نہ ہونا گویا اس خدائی امتحان میں ناکام ہو جانا ہے۔

مزید یہ کہ سیاسی اقتدار بذات خود تنظیم کے وجود کا ضامن نہیں ہے۔ حضرت عثمان رضؓ اور حضرت علی رضؓ کے زمانہ میں حکومتی اقتدار موجود تھا، اس کے باوجود مسلمانوں کی تنظیم منتشر ہو گئی۔ اسی طرح بعد کے دور میں بھی اس کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تنظیم سے مراد ویسی ہی ایک اختیاری تنظیم ہے جیسی کہ مسجد میں امام کی سربراہی میں نماز کی جماعت بندی کے لئے ہر روز ہوتی ہے۔ یہ اللہ کی خاطر اپنی آزادی پر پابندی لگانا ہے۔ یہ تمام تر ایک اختیاری تنظیم ہے اور اس کا ثواب کسی آدمی کو صرف اس وقت ملے گا جب کہ اس نے اپنے آزاد ارادہ سے اس کی ماتحتی قبول کی ہو۔ جبر کے تحت قائم شدہ تنظیم بعض دنیوی فائدے دے سکتی ہے مگر وہ آدمی کو خدا کے یہاں ثواب کا مستحق نہیں بناتی، نہ اس سے وہ برکتیں ظاہر ہو سکتیں جو حقیقی اسلامی تنظیم کے لئے خدا نے مقدر کی ہیں۔

دور نبوت میں اس قسم کی تنظیم کی ایک مثال وہ ہے جو ابتدائی دور میں مدینہ میں اختیار کی گئی۔ ہجرت سے پہلے مدینہ کے ۷۳ آدمی مکہ پہنچے اور آپ سے بیعت ہوئے۔ اس وقت مدینہ میں اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی۔ مگر آپ نے بیعت کے بعد ان سے کہا کہ تم لوگ بارہ آدمی منتخب کرو جن کو میں تمہارے اوپر نقیب (نگراں) بنا دوں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اندر سے بارہ آدمی چنے۔ آپ نے ان کو مدینہ کے مسلمانوں پر نگراں مقرر فرمایا اور کہا کہ تم اپنی قوم کی اجتماعی دیکھ بھال کے ذمہ دار ہو (انتم کفلاء علی قومکم) مسلمان عرب سے نکل کر جب مختلف ملکوں میں گئے تو اسی طرح وہ اپنی تنظیم بنا کر اس کی ماتحتی میں منظم زندگی گزارتے رہے۔ جب تک انھوں نے ایسا کیا ان کے اوپر خدا کا سایہ باقی رہا۔ جب انھوں نے تنظیمی پابندی قبول کرنے سے انکار کر دیا تو خدا کا سایہ بھی ان کے اوپر سے اٹھ گیا اور وہ دوسری قوموں کے حوالے کر دئے گئے۔

جو لوگ اپنے آزاد ارادہ سے اپنے کو ایک اسلامی تنظیم کا پابند کریں وہ اس بات کا ثبوت دیتے ہیں

کہ وہ بے نفس لوگ ہیں، انھوں نے اللہ کی خاطر اپنی انانیت کو ختم کر دیا ہے۔ اس طرح اپنے آپ کو بے نفس بنا لینا موجودہ دنیا کی سب سے بڑی نیکی ہے۔ اللہ کی نظر میں جو لوگ اس معیار پر پورے اتریں ان کے لیے وہ اپنی ہر قسم کی نعمتیں انڈیل دیتا ہے، وہ دنیا میں بھی عزت اور غلبہ حاصل کرتے ہیں اور آخرت کی سرفرازی بھی ان کے لیے مقدر کر دی جاتی ہے۔ جو لوگ بے نفسی کی حد تک خدا کے فرماں بردار بن جائیں ان کے سامنے جب کوئی صحیح بات آتی ہے تو وہ فوراً اس کو مان لیتے ہیں۔ ان کا باہمی اتحاد کبھی نہیں ٹوٹتا۔ وہ انصاف کے راستہ کو کبھی نہیں چھوڑتے۔ ان کی بے نفسی ان کو ہر اس چیز کی طرف بڑھنے سے روک دیتی ہے جو دنیا و آخرت میں برباد کرنے والی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا و آخرت کی تمام بھلائیوں کا راز بے نفسی ہے۔ اور کوئی آدمی بے نفس بنا ہے یا نہیں، اس کا سب سے بڑا ثبوت تنظیم کے ذریعہ ملتا ہے۔ تنظیمی زندگی میں اپنے کو باندھنا اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ آدمی نفسانی محرکات سے اوپر اٹھ گیا ہو۔ وہ تنقید اور تعریف سے بلند ہو۔ وہ اختلاف اور اتفاق کی بنیاد پر کسی کے بارے میں رائے قائم نہ کرتا ہو۔ اس کا رویہ پسند ناپسند کی بنیاد پر نہ بنتا ہو۔ وہ اس سے بے نیاز ہو چکا ہو کہ اس کو کیا ملا اور کیا نہیں ملا۔ تنظیمی زندگی میں اس طرح کے مواقع بار بار آتے ہیں۔ اگر آدمی ان چیزوں سے اوپر اٹھا ہوا نہ ہو تو وہ اسی قسم کی باتوں میں الجھ کر رہ جائے گا اور تنظیم کی پابندی کو قبول کرنے میں ناکام رہے گا۔

اللہ کے مومن بندوں پر اللہ کی دو سب سے بڑی نعمتیں نازل ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ خدا کی نصرت کے مستحق بن جاتے ہیں، وہ دنیا میں اپنے مخالفین کے مقابلہ میں خدا کی مدد سے غالب آتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ موت کے بعد وہ جہنم سے بچا کر جنت میں داخل کر دئے جاتے ہیں۔ اللہ کی یہ دونوں نعمتیں صرف ان لوگوں کے لئے ہیں جو اللہ کی خاطر اپنی انفرادیت کو ختم کر کے اجتماعیت کے بندھن میں بندھ جائیں اور اس کے تحت اپنی دینی اور اخلاقی زندگی کو منظم کریں۔

جو لوگ اپنے آپ کو اللہ میں اس طرح شامل کر لیں کہ اپنی انفرادیت کو وہ اس کے حوالے کر دیں، ان کی طاقت بے پناہ ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ ان کے درمیان وہ تمام اسباب بالکل ختم ہو جاتے ہیں جو ایک کو دوسرے سے جدا کرنے والے ہیں۔ اجتماعیت کو توڑنے والی چیز انفرادیت پر اصرار ہے اور اپنی انفرادیت کو اللہ کے حوالے کرکے پہلے ہی وہ اس سے اوپر اٹھ چکے ہیں۔ ایسے لوگوں کا پورا گروہ ایک متحدہ طاقت میں ڈھل جاتا ہے۔ اور جہاں اتحاد ہو وہاں مغلوبیت کا گزر نہیں۔

جو لوگ انفرادی قربانی کی سطح پر دین کو اختیار کر لیں، ان کی زندگی خدارخی زندگی بن جاتی ہے۔ وہ اس شاہ راہ پر چل پڑتے ہیں جو خدا کی قربت اور اس کی جنت کی طرف جانے والی ہے۔ ان کا سفر کبھی کھوٹا نہیں ہوتا۔ وہ کبھی راستہ کے دائیں بائیں نہیں مڑتے۔ وہ دین کے سیدھے راستے پر چلتے رہتے ہیں یہاں تک کہ خدا کی جنت میں پہنچ جاتے ہیں۔

دعوت

آگ کا انگارہ کسی اعلان کے بغیر بتا رہا ہوتا ہے کہ وہ گرم ہے۔ یہی حال سچے مبلغ کا ہے۔ آدمی جس دین کی تبلیغ کرنا چاہتا ہے اگر وہ اس کو اپنے اندر اتار چکا ہو تو اس کا وجود سراپا تبلیغ بن جاتا ہے۔ وہ بولنے سے پہلے بول رہا ہوتا ہے اور اعلان کے بغیر اس کی ہستی اعلان میں ڈھل جاتی ہے۔ اللہ کے وہ بندے جو واقعی طور پر اللہ کی اطاعت کو اپنی زندگی میں شامل کر لیتے ہیں، ان کا عمل ایسے ایسے پہلوؤں سے اپنے تبلیغی نقش چھوڑتا ہے اور ایسے ایسے مقامات سے اس کے دعوتی اثرات ظاہر ہو کر سامنے آتے ہیں جن کا پہلے سے کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

یہاں میں ہندوستان کی ریاست اتر پردیش کی ایک مسلم خاتون کا واقعہ نقل کروں گا۔ یہ واقعہ ۱۹۸۳ء کا ہے اور ذاتی طور پر میرے علم میں آیا ہے۔ مذکورہ خاتون ایک ڈاکٹر سے اپنا علاج کرا رہی تھیں۔ ڈاکٹر چوں کہ ان کے وطن سے پانچ سو کیلو میٹر کے فاصلہ پر رہتے ہیں، اس لئے اپنے احوال ان کو بذریعہ خط لکھ کر بھیجتی تھیں۔ یہ ایک ہومیوپیتھ ڈاکٹر ہیں اور اپنے مخصوص طریق علاج کے مطابق ان کی تاکید تھی کہ حالات بتانے میں یہ بات خاص طور پر لکھی جائے کہ مرض کیسے پیدا ہوا۔ کب بڑھتا ہے اور کب گھٹتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ خاتون کو جوڑوں کا درد تھا۔ جب وہ اچھا ہوا تو سر کا درد شروع ہو گیا۔ کسی علاج سے فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ بالآخر انھوں نے ڈاکٹر کو لکھا:

"اپنے حالات کے سلسلے میں آپ کو کچھ لکھنا تھا تاکہ آپ مرض کی نوعیت سمجھ کر صحیح دوا تشخیص کر سکیں۔ مگر کئی دن سے سوچ سوچ کر رہ جاتی تھی۔ اب چوں کہ یہ علاج کا معاملہ ہے اور طویل علالت کی وجہ سے وہ میرے لئے سخت تکلیف دہ ہو چکا ہے، اس لئے مجبوراً لکھتی ہوں۔ کہنا یہ ہے کہ جوڑوں کا درد جو مجھے پہلے ہو گیا تھا، وہ بفضلہ تعالیٰ آپ کے علاج سے بالکل ٹھیک ہے، مگر اس کے بعد دردِ سر کی مستقل پریشانی شروع ہو گئی ہے۔ یہ درد کیسے اٹھتا ہے۔ یہ لکھنے یا کہنے کی بات نہیں تھی۔ مگر مجبوراً لکھ رہی ہوں کہ اس کے بغیر شاید ہومیوپیتھک طریق علاج میں صحیح دوا تجویز نہیں کی جا سکتی۔ بات یہ ہے کہ اگر میں رات کو ساری رات آرام سے بستر پر پڑی رہوں تو سر میں قطعاً درد نہیں ہوگا اور دن بھی خیریت سے گزر جائے گا، مگر مجھ کو راتوں کی تنہائی میں اٹھ کر نماز پڑھنا بہت پسند ہے۔ انھیں رات کی نمازوں میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آخرت کا منظر یا قبر وغیرہ کی یاد شدت سے دماغ میں آتی ہے اور اس وقت بے اختیار آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں بس انھیں آنسوؤں کا نکلنا مضر ہوتا ہے۔ جیسے ہی آنکھ سے آنسو نکلے، سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ میں نے بار بار اندازہ کیا ہے کہ آنسوؤں ہی کے نکلنے سے سر میں درد شروع ہوتا ہے۔ یہ بات کسی سے کہنے کی نہیں تھی، محض علاج کی خاطر میں نے اپنے دل پر جبر کر کے آپ کو لکھ دیا ہے، براہ کرم خط کو پڑھنے کے بعد اسے پھاڑ کر ضائع کر دیں۔"

یہ سادہ سے چند الفاظ جو ایک معمولی پڑھی لکھی خاتون کے قلم سے محض ضرورت شدید کی بنا پر نکل گئے تھے۔ جب وہ تعلیم یافتہ ڈاکٹر کے پاس پہنچے تو انھوں نے حیرت انگیز کام کیا۔ ڈاکٹر نے جواب میں لکھا:

"گرامی نامہ ملا۔ آپ نے دردِ سر کی جو کیفیت بیان کی ہے وہ میرے لئے تشخیص کے سلسلے میں بہت معاون ثابت

ہو۔ چناں چہ میں نے دوا تجویز کرلی ہے۔ آپ نیٹرم میور ۔۔۔ ۳۰ بازار سے منگوا کر کھالیجئے۔ انشاء اللہ ایک ہی خوراک میں فائدہ محسوس ہوگا۔ مگر میں یہ کہنے کے لئے آپ سے معذرت چاہتا ہوں کہ آپ کے حکم کے بموجب میں آپ کے خط کو پھاڑ نہ سکا۔ کیوں کہ اس کا تعلق صرف آپ کے علاج سے نہیں ہے بلکہ خود اپنے روحانی علاج کے سلسلے میں میں نے اس کو اس قدر مؤثر پایا کہ کسی تحریر یا نصیحت کا اتنا گہرا اور فوری اثر نہ ہوا تھا۔ آپ نے خط کو پھاڑنے کی بات اس خیال سے لکھی ہوگی کہ اس کے اظہار سے آپ کے اجر میں کمی ہوگی۔ لیکن اگر مجھ جیسے کھوئے ہوئے شخص کو کوئی تحریر حرکت میں لا سکے تو وہ بلاشبہ میرے لئے آخری دم تک محبوب ہوگی۔ کاش میرے اندر بھی ایسی ہی کیفیت پیدا ہوجاتی اور رات کی تاریکی میں آخرت کی بازپرس کا ہولناک منظر دیکھنے کی توفیق ہوتی۔ اس لئے یہ اظہار محض آپ کی اجازت کے لئے ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اس لحاظ سے اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت پایا کہ اپنے ایک مریض کے جسمانی علاج سے مجھے روحانی غذا ملی۔"

یہ خاتون جن کا خط میں نے اوپر نقل کیا، وہ ایک خاموش طبیعت کی خاتون ہیں اور ان کو اپنے بارے میں اس کمی کا شدید احساس ہے کہ وہ تبلیغ و دعوت کا کام نہیں کرسکتیں، مگر آپ نے دیکھا کہ ان کے ایک خاموش عمل نے کس طرح ایک ایسی تبلیغ کا کام انجام دیا جو تقریروں پر بھی بھاری ہوگیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسروں کے اوپر تبلیغ و دعوت کا کام کرنے کا مسئلہ سب سے پہلے خود اپنے آپ کو بدلنے کا مسئلہ ہے۔ تبلیغ و دعوت کا کام ذاتی عمل سے نہایت گہرا رشتہ رکھتا ہے۔ جس اسلام کے ہم مبلغ ہیں، اگر وہ خود ہماری زندگیوں میں اترا ہوا ہے تو وہ بے شمار پہلوؤں سے دعوتی کام میں مؤثر ہوگا۔ اور اگر ہماری زندگی اس سے خالی ہو تو تقریر و تحریر کی شکل میں ممکن ہے کچھ الفاظ وجود میں آجائیں، مگر اس چیز کا وجود نہیں ہوسکتا جس کو حقیقی معنوں میں تبلیغ یا دعوت کہا جاتا ہے۔ دعوت و تبلیغ اور ذاتی عمل کے درمیان یہ رشتہ ان معنوں میں نہیں ہے جیسے کوئی شخص ریاضیات کا لکچرر بننا چاہتا ہو تو وہ پہلے ریاضی کی تعلیم حاصل کر کے اسے خود سیکھتا ہے تاکہ وہ ریاضی کے طلبہ کو اس کا درس دے سکے۔ ذاتی عمل اور تبلیغ کے درمیان اس قسم کا ارادی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ ایک فطری تعلق ہے۔ ذاتی عمل کا محرک اصلاً یہ نہیں ہے کہ آدمی کامیاب مبلغ بن جائے، ایسا ذاتی عمل کبھی وجود میں نہیں آسکتا اور اسی لئے اس قسم کا ذہن رکھنے والا شخص کبھی اچھا مبلغ بھی نہیں بن سکتا، مومن کے اندر عمل کا داعیہ اس لئے نہیں ابھرتا کہ وہ اس کے ذریعہ سے عمدہ قسم کا مبلغ بن جائے گا، بلکہ جب خدا کا خوف اور آخرت کی بازپرس کا احساس اسے باعمل بنا دیتا ہے تو اس وقت عین اس کے نتیجہ کے طور پر ایسا ہوتا ہے کہ اس کی تبلیغ ؎ اس کی زندگی کے شرارے جھلکنے لگتے ہیں۔ وہ خود بہ خود ایک کامیاب مبلغ بن جاتا ہے۔ تبلیغ و دعوت میں ذاتی زندگی کے یہ اثرات مختلف پہلوؤں سے داخل ہوتے ہیں میں یہاں صرف دو چیزوں کا ذکر کروں گا۔

۱۔ سب سے پہلا اثر تو وہ ہے جس کو میں بالواسطہ تبلیغ کہوں گا۔ یہ وہ اثر ہے جو تبلیغ تک میں نکلنے سے پہلے بلا ارادہ اپنے تبلیغی اثرات دکھانا شروع کر دیتا ہے۔ جب ایک بندۂ خدا کے دل میں اپنے رب کے سامنے حاضری کا خوف سماتا ہے تو وہ فوراً اپنی زندگی پر نظر ثانی شروع کر دیتا ہے۔ اندر سے باہر تک اس کی زندگی بدلنے لگتی ہے۔ یہ تبدیلی اگرچہ ابھی

انتہائی اور عمل شکل میں کسی انسان کے لئے ناقابل مشاہدہ ہے مگر اس کے باوجود اس کی کچھ جھلکیاں مختلف شکلوں میں لوگوں کے سامنے آتی رہتی ہیں اور دیکھنے اور سننے والوں کو متاثر کرتی ہیں۔

جب اس کو یہ احساس ستاتا ہے کہ پچھلی غفلت کی زندگی میں اس نے فلاں شخص کے ساتھ ایک ایسی زیادتی کی تھی جو اس کے لئے آخرت میں بازپرس کا سبب بن سکتی ہے اور وہ اس کے سامنے معافی مانگنے کے لئے حاضر ہوتا ہے تو اس کے کپکپاتے ہوئے ہونٹ سننے والے کو بھی ہلا دیتے ہیں اور غلطی کا اظہار کرتے وقت نکل پڑنے والے آنسو کتنے سیاہ اور غبار آلود دلوں کو دھو کر صاف کر دیتے ہیں۔ جب وہ غلط طریقے سے حاصل کئے ہوئے ایک مال کو اس اندیشے کی بنا پر واپس کرنے جاتا ہے کہ آخرت میں اس کے اصل مالک کو یہ اختیار دیا جائے گا کہ وہ اس کے بدلے غاصب کا سارا عمل لے لے اور اسے بالکل خالی چھوڑ دے، تو وہ ایک شخص کو صرف اس کا مال ہی نہیں لوٹاتا، بلکہ اسی کے ساتھ اس کو ایمان کی وہ دولت بھی واپس دلاتا ہے جو غفلت میں شیطان اس سے اچک لے گیا تھا۔ جب ایک واقعی نمازی سجدے میں ہمہ تن پڑا ہوا خدا سے اس طرح سرگوشی کر رہا ہوتا ہے کہ بقیہ دنیا کی اسے خبر بھی نہیں ہوتی، عین اس وقت اس کی اس ہیئت و فنائیت کو دیکھ کر کسی بندۂ خدا کا دل اندر ہی اندر اپنے رب کے آگے جھک جاتا ہے۔ وہ بے اختیار چاہنے لگتا ہے کہ وہ بھی اسی طرح اپنے خدا کو پا کر اس سے لپٹ جائے۔ جب زندگی کے عملی معاملات میں لوگوں کو اس سے سابقہ پیش آتا ہے اور لوگ اس کی سچائی، پاکیزگی، دیانت داری اور ایفائے عہد کا تجربہ کرتے ہیں تو وہ اپنے آپ کو بالکل مجبور پاتے ہیں کہ اس دین کی قدر کریں جس کے اندر یہ طاقت ہے کہ ایسے عمدہ انسان تیار کرے۔ حتیٰ کہ کتنے غیر مسلموں کو اس طرح کے تجربات سے اسلام کی توفیق ملتی ہے اور کتنی غافل روحوں کو دوبارہ اسلام کا شعور نصیب ہوتا ہے۔

دو پتھر باہم ملیں تو کوئی خاص بات نہیں ہوگی۔ لیکن بجلی کا ایک تار جب دوسرے تار سے مَس کرتا ہے تو فوراً سادہ تار میں برقی رو دوڑنے لگتی ہے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ ایک اچھے انسان کی خصوصیات دوسرے انسان کے لئے برقی رو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انسان کے اندر فطری طور پر یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اچھی چیز سے اثر قبول کرتا ہے اور خدا پرستی کی چیزیں اس کے دل کی آواز بن کر اس کی نفسیات میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ جب ایک شخص کوئی عمدہ عمل کرتا ہے یا اس کی زندگی سے خدا پرستی کا کوئی نور چھن کر لوگوں کے سامنے آجاتا ہے تو اس وقت دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان اسی طرح اس کو قبول کرتے ہیں جیسے بجلی کے تار سے کوئی دوسرا تار برقی رو قبول کرتا ہے۔ اس وقت فطرت کے ایک ان دیکھے تار پر ایک دل کے جذبات دوسری طرف منتقل ہونے لگتے ہیں، ایک کی ہلچل دوسرے کو لرزہ براندام کر دیتی ہے، ایک کی روشنی سے دوسرے کا باطن چمکنے لگتا ہے۔ یہ ایک بالکل فطری عمل ہے جو لازمی طور پر اس وقت وجود میں آتا ہے جب کسی کے اندر ایمان و اسلام کا شعلہ بھڑکے اور اس کے گرد و پیش ایسے لوگ موجود ہوں جن کی فطرت مسخ نہ ہو گئی ہو اور انسانی اوصاف ابھی باقی ہوں۔

۲۔ دوسری چیز وہ ہے جو براہ راست تبلیغ میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ الفاظ جن کے ذریعہ سے ہم اپنی بات دوسرے تک پہنچاتے ہیں وہ کسی مفہوم کا مجرد اظہار نہیں ہیں۔ جیسے پانچ اور دس کسی چیز کے عدد کا مجرد اظہار ہیں

بلکہ اسی کے ساتھ ان کے اندر مختلف قسم کی کیفیات پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ الفاظ اور مفہوم کے اعتبار سے دو بالکل یکساں کلام اپنی کیفیت اور اثر کے اعتبار سے بے حد مختلف ہو جاتے ہیں۔ اس فرق کو واضح کرنے کے لیے میں یہاں دو شعر نقل کرتا ہوں:۔ خرابات عالم میں ہر چار جانب چمکتے ہوئے جام و مینا دھرے ہیں

ضرورت اسی کی ہے اے اہل محفل کوئی ہاتھ اس کو بڑھا کر اٹھالے

یہ مے خانہ ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

یہ دونوں اشعار مفہوم کے اعتبار سے بالکل ہم معنی ہیں، مگر الفاظ اور دروبست کے فرق نے دونوں میں زمین آسمان کا فرق پیدا کر دیا۔ یہ فرق کی ابتدائی قسم ہے جس کو ہم ادبی فرق کہہ سکتے ہیں۔ اور وہ قدرت کلام اور فنی ذوق کا نتیجہ ہوتا ہے۔ دوسرا فرق وہ ہے جو صاحب کلام کی اپنی اندرونی کیفیات کے اعتبار سے وجود میں آتا ہے۔ اگر آپ ایک واقعہ سے متاثر ہوں تو اس کا ذکر کرتے ہوئے نہ صرف آپ کا لب و لہجہ بدل جائے گا۔ بلکہ آپ کی زبان سے ایسے ایسے الفاظ نکلیں گے جو آپ کی اندرونی کیفیات کی ترجمانی کر رہے ہوں۔ جن میں آپ کا تاثر اسی طرح بھرا ہوا ہو جیسے کسی تازہ پھل میں اس کا رس بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر آپ متاثر نہ ہوں تو آپ کا بیان واقعہ محض اخباری رپورٹ معلوم ہوگا۔

ذاتی طور پر ایمان و اسلام کی زندگی کو پالینا آدمی کے تبلیغی کلام میں یہی دوسری خصوصیت پیدا کرتا ہے۔ وہ اس کے کلام کو مجرد کلام کے مقام سے اٹھا کر موثر کلام بنا دیتا ہے۔ وہ اس میں شدت جذبات کا رس بھرتا ہے، وہ ننگے الفاظ کو کیفیات کا لباس اڑھاتا ہے۔ وہ حروف کے مجموعوں کو دل کے ٹکڑے بنا دیتا ہے وہ کلام کو خوشبو فروش کا معطر اشتہار بنا دیتا ہے جو صرف پڑھا نہیں جاتا، بلکہ اپنی خوشبو بھی مخاطب تک پہنچا دیتا ہے۔

جس کے اپنے اندر اسلام اترا ہوا نہ ہو، اس کے کلام میں بظاہر تمام شرعی باتیں موجود ہوں گی مگر وہ بس الفاظ کا ایک مجموعہ ہوگا جس میں دل کی بو بسی ہوئی نہیں ہوگی۔ وہ ایک سپاٹ کلام ہوگا جو خود اپنی حقیقتوں سے خالی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جب ایک ایسا شخص بولتا ہے جس نے فی الواقع دین کو پالیا ہو تو اس کی زبان اور اس کے الفاظ میں حیرت انگیز خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ جب لوگوں کو آخرت سے ڈراتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ اسرافیل صور لیے کھڑے ہیں اور اس بات کے منتظر ہیں کہ کس وقت حکم ہو اور پھونک مار کر دنیا کو تہ و بالا کر دیں۔ اس کے بے قرار جملے صاف بتاتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ محض کچھ الفاظ کی تکرار نہیں ہے بلکہ وہ ان ہیجان خیز واقعات سے براہ راست آشنا ہو کر بول رہا ہے۔ اس کی تحریروں میں دل کا سوز گھلا ہوا ہوتا ہے، اس کے الفاظ اندرونی تپش کی آنچ سے جل رہے ہوتے ہیں، اس کے ہر بول میں حقیقت کی خوشبو لپٹی ہوئی ہوتی ہے، اس کی سطروں کے درمیان جگہ جگہ نظر آتا ہے کہ آنسوؤں نے ٹپک کر لکھی ہوئی سیاہی کا رنگ بدل دیا ہے۔ یہ چیزیں اس کے کلام کو حقیقت بیانی کے ایک ایسے مقام پر پہنچا دیتی ہیں جہاں دیکھنے والوں کو نظر آتا ہے گویا حقیقت خود مجسم بے نقاب ہو کر سامنے آگئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تبلیغ و دعوت کے کلام کو موثر بنانے کے لئے خارج میں کوئی ہتھیار موجود نہیں ہے اس کی صرف ایک ہی تدبیر ہے —— اپنے اندرون کو مسلمان بناؤ، اسی وقت تم اپنے بیرون کو مسلمان بنا سکو گے (الفرقان محرم ۱۳۸۴ھ)